محاضرات قرآنی

ڈاکٹر محمود احمد غازی

بسم الله الرحمن الرحيم

محاضراتِ قرآنی

ڈاکٹر محمود احمد غازی

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

297.12204 Mehmood Ahmad Ghazi, Dr.
Mahazraat-e-Qurani / Dr. Mehmood Ahmad Ghazi.- Lahore: Al-Faisal Nashran, 2009.
404p.

1. Quran - Mazameen I. Title card

ISBN 969-503-344-x

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

اشاعت پنجم..........اگست 2009ء
محمد فیصل نے
آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت:-/400 روپے

AL-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com

فہرست

	پیش لفظ	7
خطبہ اول	تدریس قرآن مجید ایک منہاجی جائزہ	11
خطبہ دوم	قرآن مجید ایک عمومی تعارف	45
خطبہ سوم	تاریخ نزول قرآن مجید	85
خطبہ چہارم	جمع وتدوین قرآن مجید	119
خطبہ پنجم	علم تفسیر ایک تعارف	153
خطبہ ششم	تاریخ اسلام کے چند عظیم مفسرین قرآن	191
خطبہ ہفتم	مفسرین قرآن کے تفسیری مناہج	223
خطبہ ہشتم	اعجاز القرآن	251
خطبہ نہم	علوم القرآن ایک جائزہ	281
خطبہ دہم	نظم قرآن اور اسلوب قرآن	313
خطبہ یازدہم	قرآن مجید کا موضوع اور اس کے اہم مضامین	345
خطبہ دوازدہم	تدریس قرآن مجید دور جدید کی ضروریات اور تقاضے	375

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

قرآن کریم' تاریخ و تدوین قرآن کریم اور علوم القرآن کے چند پہلوؤں پر یہ خطبات اپریل ۲۰۰۳ء میں خواتین مدرساتِ قرآن کے روبرو دیئے گئے ان خطبات کی ضرورت کا احساس سب سے پہلے میری بہن محترمہ عذرا نسیم فاروقی کو ہوا' جو اگرچہ عمر میں مجھ سے کم لیکن دینی حمیت' اخلاص اور للّٰہیت میں مجھ سے بہت آگے اور میرے جیسے بہت سوں کے لیے قابل رشک ہیں۔ وہ خود ایک عرصہ سے درس قرآن کا اہتمام کر رہی ہیں۔ انگلستان اور ملائشیا میں اپنے قیام (بالترتیب ۱۹۸۳ تا ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ تا ۱۹۹۳) کے دوران میں ان کو اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے اجتماعات میں دروس قرآن دینے کا موقعہ ملا۔ ان دروس کی کامیابی اور تاثیر نے ان کو حوصلہ دیا اور یہ سلسلہ انہوں نے ۱۹۹۳ء سے تسلسل سے جاری رکھا ہوا ہے۔

اس پورے تجربہ کے دوران میں ان کو خواتین مدرسات کی ایک بڑی تعداد کے کام کو دیکھنے اور ان کے اثرات کا جائزہ لینے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ خواتین مدرسات کی خاص تعداد ان خواتین پر مشتمل ہے جن کا تعلیمی پس منظر خالص دینی علوم (تفسیر' حدیث' فقہ' عربی زبان اور کلام وغیرہ) میں تخصص کا نہیں ہے۔ اس تخصص کے نہ ہونے کی وجہ سے ان میں سے بعض کے درس قرآن میں بعض اوقات ایسے پہلو رہ جاتے ہیں جن میں مزید بہتری کی گنجائش محسوس ہوتی ہے۔

درس قرآن کے ان حلقوں کی افادیت کے بارہ میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ لیکن کمال

صرف اللہ کی ذات کو حاصل ہے۔ ہم جیسے کیا حیثیت رکھتے ہیں' بڑے بڑے اہل علم کے کام میں بہتری کی گنجائش ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اس لیے کسی بھی نیک اور مفید کام میں کمزوریوں کی نشان دہی اور ان کو دور کرنے کی مخلصانہ کوششوں سے اجتناب کو وسوسہ نفسانی سے پاک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ صحیح اسلامی رویہ کسی نیک اور تعمیری کام میں غیر ضروری نقائص نکالنا نہیں' بلکہ ان نقائص کو دور کرنے میں مخلصانہ تعاون اور اس کے لیے دوسرے اقدامات کے علاوہ تکمیلی کوششیں بھی ہیں۔ وہ تکمیلی کوششیں جن کا مقصد کسی اچھے اور تعمیری کام میں رہ جانے والی کسر کی تلافی ہو۔

اس جذبہ کے تحت محترمہ عذرا نسیم فاروقی نے تجویز کیا کہ راولپنڈی اور اسلام آباد میں مدرسات قرآن کے لیے ایک توجیہی (Oriantational) پروگرام منعقد کیا جائے جس میں قرآن مجید' تفسیر' تدوین قرآن اور علوم قرآن کے ان پہلوؤں پر خطبات و محاضرات کا اہتمام کیا جائے جو عموماً خواتین مدرسات قرآن کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ اس کو اپنی ہر چیز بہت اچھی بلکہ سب سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی فطری بشری کمزوری کے تحت انہوں نے مجھے ہی اس خدمت کے لیے موزوں اور مناسب سمجھا۔ ان کا یہ اصرار تو کئی سال سے جاری تھا' لیکن ان سطور کے راقم کو اپنی کم علمی اور بے مائیگی کا پورا احساس تھا' اس لیے تجویز کے پہلے حصہ سے پورے اتفاق کے باوجود تجویز کے اس آخری حصہ کو قبول کرنے میں شدید تامل تھا۔

اس تامل کی وجہ سے اس کام میں تاخیر ہوتی گئی۔ بالآخر اپریل ۲۰۰۳ء میں ۶ سے ۱۸ تک کی تاریخیں ان خطبات کے لیے طے ہوئیں۔ اسلام آباد اور راولپنڈی شہر سے کم و بیش ایک سو مدرسات قرآن نے اس پروگرام میں شرکت فرما کر ان سطور کے راقم کو عزت بخشی۔ یہ خطبات مختصر نوٹس کی مدد سے زبانی دیئے گئے تھے جن کو بعد میں محترمہ عذرا نسیم فاروقی نے صوتی مسجیل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا۔ اس کام میں ان کو بڑی محنت اور جاں فشانی سے ایک ایک لفظ کو سن سن کر ضبط تحریر میں لانا پڑا۔ یوں خطبات کا ابتدائی مسودہ جولائی ۲۰۰۳ء کے اواخر تک تیار ہو گیا۔ اس پر سرسری نظر ثانی کرنے میں مجھے کئی ماہ لگ گئے۔ اس تاخیر کی بنیادی وجہ جامعہ میں تدریسی اور انتظامی مصروفیات کے علاوہ متعدد ملکی اور غیر ملکی سفر تھے جن کی وجہ سے نظر ثانی کے کام میں تعدیق و تاخیر ہوتی گئی۔

اس ابتدائی نظر ثانی میں ناموں کی غلطیوں کی اصلاح کر دی گئی۔ کہیں کہیں زبان و بیان میں بھی ترمیم کر دی گئی۔ حتمی پروف خوانی میرے فاضل اور عزیز دوست جناب محمد شاہد رفیع نے کی جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں ٹائپ اور کمپوزنگ کا کام ذاتی محبت کے جذبہ سے جناب ضیغم محمود اور جناب حاجی محمد ظفر صاحب نے کیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

ان خطبات میں اگر کوئی خوبی اور افادیت ہے تو وہ صرف اللہ پاک کی توفیق وعنایت سے ہے۔ جو کمزوریاں ہیں وہ میری کم علمی، بے مائیگی، کم ہمتی اور سستی کی وجہ سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کمزوریوں سے درگزر فرمائے۔ ان کمزوریوں میں سے دو ایک کی میں خود ہی پیشگی نشاندہی کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

ان خطبات کی زبان تحریری نہیں تقریری ہے۔ انداز بیان عالمانہ اور محققانہ نہیں داعیانہ اور خطیبانہ ہے۔ چونکہ خطبات کا کوئی متن پہلے سے تیار شدہ نہ تھا اس لیے انداز بیان میں خطیبانہ رنگ کہیں کہیں بہت نمایاں ہو گیا ہے۔ نظر ثانی کے دوران میں اس انداز کو بدلنا طویل وقت کا متقاضی تھا اس لیے اس کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

دوران گفتگو میں جگہ جگہ بہت سی شخصیات اور کتابوں کے نام آئے ہیں جو محض یادداشت کی بنیاد پر بیان کیے گئے۔ نظر ثانی کے دوران میں ان سب کو الگ الگ دوبارہ چیک کرنے کے لیے بھی طویل وقت درکار تھا۔ اس لیے اس سے اجتناب کیا گیا۔ یہی حال سنین وفات کا ہے۔ واقعات اور وفیات کی تاریخیں بھی عموماً زبانی یادداشت ہی کی بنیاد پر ذکر کر دی گئی ہیں۔ اس لیے طلبہء تحقیق سے گذارش ہے کہ وہ محض ان خطبات میں دی گئی تاریخوں اور وفیات پر اعتماد نہ کریں، بلکہ دوسرے مستند ذرائع مثلاً الاعلام للزرکلی وغیرہ سے رجوع کریں۔

میں اپنے فاضل دوست جناب سید قاسم محمود اور جناب فیصل صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے عزت بخشی اور اس کتاب کو اپنے ادارہ سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ محاضرات قرآنی کی ایک ہمشیر جلد محاضرات حدیث بھی تیار ہے جو مکتبہ فیصل ہی سے شائع ہو رہی ہے۔ محاضرات حدیث کے بعد اب محاضرات فقہ اور اس کے بعد محاضرات سیرت وغیرہ کا بھی پروگرام ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس سلسلہ کو مقبول اور نافع بنائے اور اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

محمود احمد غازی

اسلام آباد
یکم ربیع الانور ۱۴۲۵ھ

خطبہ اول

تدریس قرآن مجید
ایک منہاجی جائزہ

۷ اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواہران مکرم!

میں اس امر کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں کہ آج مجھے ان قابل احترام بہنوں سے گفتگو کا موقع مل رہا ہے جن کی زندگی کا بڑا حصہ قرآن مجید کی تعلیم وتفہیم میں گذرا ہے، جن کی شب روز کی دلچسپیاں قرآن مجید کی نشرواشاعت سے عبارت ہیں اور جنہوں نے اپنی زندگی کے بیشتر اور قیمتی لمحات کتاب الٰہی کے فروغ اور اس کی تعلیم وتدریس اور اس کی تعلیمات اور پیغام کے سمجھنے اور سمجھانے میں بسر کیے ہیں۔ حدیث نبویؐ کی رو سے آپ سب اس دنیا میں بھی اس معاشرہ کا بہترین حصہ ہیں، اور ان شاء اللہ روز آخرت بھی آپ کا شمار امت مسلمہ کے بہترین حصہ کے طور پر ہوگا۔ اس لیے کہ ارشاد نبوی ہے: ''تم میں سے بہترین وہ ہے جس نے قرآن مجید سیکھا اور سکھایا ہو''۔ آپ نے قرآن مجید سیکھا بھی ہے اور قرآن مجید سکھانے کا فریضہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی بے پایاں توفیق سے آپ انجام دے رہی ہیں۔ اس لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مطابق آپ اس معاشرہ کا بہترین حصہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور آپ کے ان لمحات کو بابرکت بنائے۔ آپ کو دنیا اور آخرت میں بلند درجہ عطا فرمائے اور آپ کی ان تمام کوششوں کو نتیجہ خیز بنائے جن کی اس نے آپ کو توفیق عطا فرمائی ہے۔

خواہران محترم!

خواتین اسلام کی طرف سے قرآن مجید کی تعلیم وتفہیم اور پیغام قرآن کی نشرواشاعت، بالفاظ دیگر درس قرآن کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اسلام کی تاریخ۔ اسلام کی تاریخ اور مدرسات قرآن کی تاریخ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ ان کو ایک دوسرے

سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے علم میں ہے کہ واقعہ نزول قرآن کے اولین موقع پر صاحب قرآن (ﷺ) کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والی عظیم خاتون سیدہ خدیجۃ الکبری رضی اللہ تعالی عنہا مسلمانوں کی سب سے بڑی محسن ہیں۔ آپ نے سیدنا عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کا واقعہ پڑھا ہوگا کہ کس پاکباز اور حوصلہ مند خاتون کے قرآن پاک پڑھانے سے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

تو نمی دانی کہ سوز قراءت تو
دگرگوں کرد تقدیر عمر را

اے خاتون اسلام! تو نہیں جانتی کہ تیری قراءت قرآن سے پیدا ہونے والے سوز و گداز نے عمر ابن خطاب کو فاروق اعظم اور اسلام کا سب سے بڑا سپاہی بنا دیا۔

اس لیے اگر آپ اس احساس اور اس شعور کے ساتھ تدریس قرآن کی سرگرمیوں میں مصروف ہوں گی کہ آپ اس سنت پر عمل پیرا ہیں جو سیدنا عمر فاروقؓ کی بہن فاطمہ بنت خطاب کی سنت تھی اور آپ اسی طرح اپنے سوز قراءت سے بڑے بڑے لوگوں کی تقدیروں کو دگرگوں کر دیں گی جیسا کہ سیدنا عمر فاروقؓ کی بہن نے اپنے جلیل القدر بھائی کی تقدیر کو دگرگوں کر دیا تھا تو آپ کے اندر ایک ایسا غیر معمولی روحانی جذبہ پیدا ہو جائے گا جو آپ کی کوششوں کو چار چاند لگا دے گا۔

خواتین مکرم!

جہاد اسلام کا ایک بنیادی ستون ہے۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے جہاد اسلام کا **ذروۃ سنام** ہے۔ جیسا کہ آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو ایک عمارت سے تشبیہ دی ہے جس کے ستونوں اور ارکان کا تذکرہ بھی احادیث مبارکہ میں ملتا ہے۔ لیکن اس عمارت کا سب سے بڑا اور سب سے بلند برج اور سب سے اونچا کنگرہ جہاد ہے۔ جس کو **ذروۃ سنام الا سلام** سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاد صرف تلوار سے ہی نہیں بلکہ علمی اور فکری اسلحہ سے بھی لڑا جاتا ہے۔ اس کا انداز اور طریقہ کار ہر جگہ اور ہر وقت ایک جیسا نہیں ہوتا، بلکہ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے اس کا انداز بدلتا رہتا ہے۔ وہ عملی انداز کا بھی ہوتا ہے اور علمی اور فکری انداز کا بھی ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں جہاد بالسیف کا تذکرہ ہے جو جہاد کی

سب سے اعلیٰ اور ارفع قسم ہے، وہیں علمی اور فکری جہاد کا بھی تذکرہ آیا ہے، ارشاد گرامی ہے، وجاھدھم بہ جھاداً کبیرا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے خلاف یعنی کفار عرب کے خلاف قرآن مجید سے جہاد کریں۔ یہاں اس جہاد کو جہاد کبیر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے ذریعہ سے جو جہاد کیا جائے گا وہ نہ صرف نص قرآنی کی رو سے علمی اور فکری جہاد ہوگا بلکہ وہ جہاد کبیر بھی کہلائے گا۔

یہ جہاد بالقرآن وہ جہاد ہے جس کے نتیجہ میں مجاہدین کی ایک پوری نسل تیار ہوتی ہے، اسی کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ کی ایک مضبوط علمی، فکری اور روحانی بنیاد استوار ہوتی ہے اور اسی کے نتیجے میں لوگوں کے جسم خاکی نہیں بلکہ روح وقلب فتح ہوتے ہیں۔ تلوار کے جہاد سے لوگوں کی گردنوں کو فتح کیا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید کے ذریعہ سے جو جہاد کیا جاتا ہے اس سے لوگوں کے دل، ان کی روحیں اور ان کے قلب ودماغ متاثر ہوتے ہیں، اس لیے بجا طور پر یہ جہاد کبیر کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

خواتین مکرم!

جب ہم تدریس قرآن مجید کا ایک منہاجی جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید کی تدریس کے آج کل کون کون سے طریقے رائج ہیں، ان طریقوں میں کیا کیا مقاصد کارفرما ہیں اور ہمارے پیش نظر جو مقاصد ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے تدریس قرآن کے اس عمل کو زیادہ سے زیادہ بہتر کیسے بنایا جائے۔

منہاج سے مراد وہ طریقہ کار ہے جو کسی ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے یا کسی بڑے عمل کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے شریعت کے ساتھ ساتھ منہاج کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ منہاج سے مراد یہ ہے کہ شریعت کے کسی حکم پر عملدرآمد کرنے کے لیے جو طریق کار اور اسلوب اختیار کیا جائے وہ کیا ہو، اس کے تقاضے کیا ہوں اور اس کی تفصیلات کو کیسے مرتب اور مدون کیا جائے؟

تدریس قرآن کے منہاج پر گفتگو کرنے سے پہلے ایک ضروری سوال کا جواب دینا ضروری ہے جو ہمارے اس سیاق وسباق میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ آخر قرآن مجید کا مطالعہ کس لیے کیا جائے۔ ایک غیر مسلم آپ سے یہ سوال کرسکتا ہے کہ وہ قرآن مجید کا

مطالعہ کیوں کرے؟ اسی طرح ایک ایسا مسلمان جس کو قرآن مجید کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا وہ بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ اس کو مطالعہ قرآن کی کیا ضرورت ہے؟ اور آخر کیوں خواتین اس کام کے لیے اپنے گھروں کو چھوڑ کر آئیں؟ کیوں لوگ اپنی مصروفیات کو ترک کر کے اور اپنے ضروری مشاغل کو چھوڑ کر اس کام کے لیے آئیں؟ اور کیوں اس غرض کے لیے اپنے مال و دولت، وسائل اور وقت کی قربانی دیں؟

اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے، سب سے پہلے قدم کے طور پر، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ بھی دیکھیں کہ قرآن مجید کا مطالعہ ایک مسلمان کو کس نیت سے کرنا چاہیے۔ اور ہم اگر ایک غیر مسلم سے توقع کرتے ہیں کہ وہ قرآن مجید کا مطالعہ کرے تو کیوں کرے۔ جہاں تک مسلمان کے لیے قرآن مجید کے مطالعہ کے ضروری ہونے کا تعلق ہے اس پر بعد میں گفتگو کریں گے، سردست غیر مسلموں کے لیے اس کی اہمیت کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک انصاف پسند غیر مسلم اگر قرآن مجید پر نظر ڈالے گا اور قرآن مجید کی تاریخ اور انسانیت پر اس کتاب کے اثرات کا مطالعہ کرے گا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کتاب کا مطالعہ اس کے لیے بھی شاید اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ اس کی ایک بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی اور کتاب ایسی نہیں ہے جس نے انسانیت کی تاریخ پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو جتنا قرآن مجید نے ڈالا ہے۔ ہمارے ملک کے ایک مشہور قانون داں اور محترم دانشور اور ہماری بین الاقوامی یونیورسٹی کے مؤسس جناب اے کے بروہی کی ایک مختصر سی کتاب انگریزی زبان میں ہے،

The Impact of the Quran on Human History

آپ میں سے جس بہن کو دلچسپی ہو وہ اس کی کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ یہ دراصل ایک لیکچر تھا جو کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔ اگر ہو سکے تو آپ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ اس لیکچر میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید نے فی نفسہٖ انسانی تاریخ پر کیا اثرات ڈالے ہیں اور وہ کیا عطا اور بخشش ہے جو قرآن مجید کی طرف سے پوری انسانیت کو حاصل ہوئی ہے۔

اس وقت تفصیل میں جانے کا تو موقع نہیں ہے لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جو قرآن مجید کی دین ہیں، اور آج دنیا میں ان کا وجود قرآن مجید کا مرہون منت ہے۔ قرآن مجید اور صاحب قرآن کی یہ وہ عطائیں ہیں جن سے پوری انسانیت نے فائدہ اٹھایا ہے۔ میں صرف چند ایک

مثالیں دینے پر اکتفا کرتا ہوں۔

نزول قرآن سے پہلے دنیا میں ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ پائی جاتی تھی (جو کسی حد تک اب بھی پائی جاتی ہے) کہ ہر وہ چیز جو انسانوں کو کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہے وہ اپنے اندر خاص قسم کے مافوق الفطرت اثرات اور قوتیں رکھتی ہے۔ یہ غلط فہمی انسانوں میں بہت پہلے کم علمی اور جہالت کی وجہ سے پیدا ہوگئی۔ اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ ہر وہ قوت جو اس کی نظر میں مافوق الفطرت حیثیت رکھتی ہے وہ اس بات کی مستحق ہے کہ نہ صرف اس کا احترام کیا جائے بلکہ اس کی تقدیس بھی کی جائے۔ چنانچہ انسانوں نے ہر نافع اور ضار چیز کو مقدس سمجھنا شروع کر دیا۔ آگے چل کر یہ احترام اور یہ تقدیس بڑھتے بڑھتے عبادت کے درجہ تک جا پہنچا۔

یوں ہوتے ہوتے ہر کائناتی قوت محترم اور مقدس قرار پا جاتی ہے، پھر اس کی پوجا کی جانے لگتی ہے۔ اور اس کو بالآخر معبود کے درجہ پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک ایسی قوم بستی ہے جس نے کروڑوں دیوتا اور معبود بنا رکھے ہیں۔ ان کے بزرگوں نے کم علمی، جہالت، یا کسی اور سبب سے یہ عقائد اپنا لیے۔ انہوں نے اول اول بہت سی قوتوں اور مخلوقات کو دیکھا جن سے انسانوں کو نفع یا نقصان پہنچتا ہے، انہوں نے ان سب چیزوں کو محترم اور مقدس ٹھہرایا، پھر انہوں نے ان کی پوجا شروع کر دی اور یوں ان کے دیوتاؤں کی تعداد کروڑوں تک جا پہنچی۔۔ کوئی دریا ہے جس کے پانی سے لوگ سیراب ہو رہے ہیں، کوئی جانور ہے جس کے دودھ اور غذا سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، کوئی درخت ہے جس کے پھل سے لوگ متمتع ہو رہے، یا اس کے علاوہ کوئی اور قوت ایسی ہے جس کے منافع اور مضرات سے لوگ متاثر ہو رہے ہیں۔ ان سب کو ایک ایک کر کے پہلے تقدیس کے مقام پر فائز کر دیا گیا، اور بعد میں ہوتے ہوتے ان سب کو انسانوں کا دیوتا تسلیم کر لیا گیا۔

انسانی تاریخ میں قرآن مجید وہ پہلی کتاب ہے، نہ صرف مذہبی کتابوں میں بلکہ ہر قسم کی کتابوں میں، وہ پہلی کتاب ہے جس نے انسان کو یہ بتایا کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ تمہارے فائدہ اور استعمال کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ **و سخر لکم ما فی الارض جمیعا،** زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ پایا جاتا ہے، وہ اجرام فلکی ہوں، وہ گرجتے بادل ہوں، وہ بہتے دریا ہوں، وہ چمکتے ستارے ہوں، گہرے سمندر ہوں، وہ خطرناک جانور یا دیگر مخلوقات ہوں، یہ

تمام کی تمام چیزیں انسان کے فائدہ کے لیے اور اس کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اس آیت کا سابقہ غلط فہمی سے کیا تعلق ہے۔ لیکن اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ آیت سابقہ غلط فہمی کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتی ہے، اور اس غلط فہمی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتی ہے۔ جب آپ یہ یقین کر لیں کہ کوئی چیز آپ کے فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہے اور آپ اس کو ہر طرح استعمال کر سکتے ہیں، وہ آپ کے لیے بطور دوا کے، بطور غذا کے، بطور علاج کے، بطور استعمال کی چیز کے، بطور زینت کے، یا کسی بھی طرح سے آپ کے کام آ سکتی ہے تو پھر آپ اس پر تحقیق شروع کریں گے۔ اس کے ٹکڑے کریں گے، اس کے حصے بخرے الگ الگ کریں گے اور لیبارٹری میں رکھ کر اس کی تحقیق کریں گے۔

تقدیس کے ساتھ تحقیق ممکن نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ تحقیق ممکن ہے امکان تسخیر کے ساتھ۔ جس چیز کو مسخر کرنے کا آپ کے اندر جذبہ پیدا ہو اور آپ کو یقین ہو کہ آپ اسے مسخر کر سکتی ہیں وہی چیز آپ کی تحقیق کا موضوع بنے گی۔ لیکن جس چیز کے گرد تکریم و تقدیس کا ہالہ چھایا ہوا ہو اس کی تحقیق نہیں ہوتی۔ آپ میں سے بہت سی خواتین کا تعلق میڈیکل سائنس کے شعبہ سے بھی ہے۔ میڈیکل سائنس میں مردہ لاشوں کو چیر پھاڑ کر دیکھا جاتا ہے، مردہ جسم پر تحقیق کی جاتی ہے اور طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ انسانی جسم کس طرح کام کرتا ہے۔ لیکن میڈیکل سائنس کا کوئی طالبعلم اپنے باپ کی میت کو اس تحقیق کے لیے استعمال نہیں کرے گا۔ اور اگر کوئی اس سے ایسا کرنے کو کہے گا تو اس پر جھگڑے گا، فساد کرے گا، اور شاید مار پٹائی تک نوبت آ جائے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے باپ کے ساتھ جو تقدس اور احترام کا تعلق ہے وہ اس تحقیق کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ کسی اجنبی انسان کے ساتھ وہ احترام اور تقدس وابستہ نہیں ہوتا جو باپ کی مردہ لاش سے وابستہ ہوتا ہے، اس لیے اس کی dissection اور تحقیق میں کوئی شخص تامل نہیں کرتا۔

قرآن مجید نے جب یہ اعلان کر دیا کہ کائنات میں کسی چیز کے گرد تقدس کا کوئی ہالہ موجود نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے بعد کوئی چیز تقدس کے قابل ہے تو وہ خود انسان ہے جس کا درجہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے اونچا ہے۔ انسان کو تو تقدس حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کی کسی چیز کو تقدس حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب ہر چیز تحقیق کا موضوع بن گئی۔ پہاڑ بھی، سیارے بھی،

آفتاب بھی اور ماہتاب بھی، دریا بھی اور سمندر بھی، پرندے بھی اور درندے بھی۔ یہاں آپ یہ بھی دیکھ لیجیے کہ نزول قرآن سے قبل انسان کی کائنات کے حقائق سے واقفیت کا کیا حال تھا، اور نزول قرآن کے بعد کائنات کے حقائق سے انسان کی واقفیت کا کیا عالم ہے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن مجید کی عطا اور دین خالص علم اور تحقیق، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کیا ہے۔ غور فرمایئے کہ اگر قرآن مجید یہ بند دروازہ نہ کھولتا تو آج تحقیق کا قافلہ جہالت کے کن کن بیابانوں اور اوہام وخرافات کے کن کن صحراؤں میں بھٹک رہا ہوتا۔

قرآن مجید کی ایک اہم عطا جس سے پورا عالم انسانیت یکساں طور مستفید ہوا اور ہو رہا ہے انسانی وحدت اور مساوات کا وہ واضح تصور اور دوٹوک اعلان ہے جو قرآن مجید کے ذریعہ سے پہلی بار دنیا کو عطا ہوا۔ قرآن مجید سے قبل دنیا کی ہر قوم میں نسلی، لسانی، لونی، جغرافیائی بنیادوں پر امتیازی سلوک اور اونچ نیچ عام تھی۔ ایسے عوامل وعناصر کی بنیاد پر جو انسان کے اپنے اختیار میں نہ تھے انسانوں کے مابین تفریق کو ایک مستقل صورت دے دی گئی تھی۔ اقوام عالم کے مابین تفریق اور دشمنیوں کی بنیاد کسی نظری یا عقلی یا اخلاقی مصلحت کے بجائے رنگ، نسل، زبان اور جغرافیہ کے امتیازات تھے جو انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ کوئی انسان اپنی نسل خود منتخب نہیں کرتا، کوئی شخص اپنا رنگ خود پسند نہیں کرتا، کسی شخص کی مادری زبان کا انتخاب اس کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں وہ پیدائش کے وقت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ ان غیر اختیاری امور کی بنیاد پر گروہوں اور قوموں کی تشکیل کو قرآن مجید ایک وجہ تعارف کے طور پر تو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ ان چیزوں کو وحدت انسانی اور مساوات آدم میں مخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔

قرآن مجید نے سب سے پہلے یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ وحدت الٰہ کا لازمی تقاضا ہے کہ وحدت آدم کے اصول کو تسلیم کیا جائے۔ ایک معبود کے مقابلہ میں بقیہ تمام لوگوں کی حیثیت سوائے عباد کے اور کیا ہوسکتی ہے۔ ان کل من فی السماوات والارض الا آتی الرحمن عبدا۔ زمین وآسمان کی ہر ذی روح اور ذی عقل مخلوق کی ذات باری تعالیٰ کے روبرو صرف ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے عبدیت۔ اس عبدیت میں نہ صرف تمام انسان بلکہ تمام ملائکہ اور جنات ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ اس اشتراک عبدیت میں نہ کسی قبیلہ کو دوسرے قبیلہ کے مقابلہ میں کوئی برتری یا تقدس حاصل ہے، نہ کسی نسل کو دوسری نسل کے مقابلہ میں، اور نہ

کسی قوم کو دوسری قوم کے مقابلہ میں، حتیٰ کہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل (ﷺ) کے اہل قوم کو بھی دوسروں پر کوئی فضیلت یا برتری حاصل نہیں۔

یہ بات آج شاید اتنی اہم معلوم نہ ہو، لیکن اس بات کو اگر تاریخ مذاہب وملل کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی غیر معمولی انقلاب آفرینی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ دنیا کے بیشتر قدیم مذاہب کے عام رواج کے برعکس اسلام میں کسی نسل یا قبیلہ کو کوئی مذہبی تقدس حاصل نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں کوئی فرمانروا، بدتر سے بدتر حالات میں بھی، آفتاب زادہ یا ماہتاب زادہ کہلانے کی جرات نہیں کر سکا۔

طبقات کی زد میں کچلی ہوئی انسانیت اور امتیازی سلوک کی شکار اولاد آدم کے لیے یہ پیغام ایک بہت بڑی تبدیلی کی نوید تھا کہ، کلکم أبناء آدم و آدم من تراب۔ اب نہ بنی لاوی کے سے خصوصی مذہبی اختیارات کسی کو حاصل ہوں گے، اور نہ برہمنوں جیسی پیدائشی نسلی بالادستی۔ اب ہر انسان براہ راست ہر وقت، ہر لحظہ ہر جگہ اور ہر حالت میں خالق کائنات سے رابطہ قائم کر سکتا ہے، وہ ہر ایک کی سنتا ہے اور ہر ایک کی پکار کا براہ راست جواب دیتا ہے: اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔ اب نہ تو دعائیں اور مناجاتیں قبول کروانے والے واسطوں کی ضرورت ہے، نہ معاوضہ لے کر گناہوں کو بخشوانے والوں کی۔ قرآن مجید نے یہ سب وسائط وحواجز ختم کر دیے۔

وحدت انسانی ہی کی برکات میں ایک اہم برکت اور قرآن مجید کی ایک اور عطا کرامت آدم کا وہ تصور ہے جس میں کوئی اور مذہبی یا غیر مذہبی کتاب قرآن مجید کی شریک وسہیم نہیں۔ یہ کتاب آغاز ہی میں وحدت بشر اور خلافت آدم کے تصورات کی تعلیم دیتی ہے۔ وہ تعلیم جو آگے چل پوری کتاب میں جگہ جگہ نئے نئے انداز اور نئے اسلوب میں بیان کی گئی ہے۔ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ شریعت اسلامیہ کے پورے دفاتر اور فقہ اسلامی کے سارے ذخائر اسی کرامت آدم کی عملی تفصیلات سے عبارت ہیں۔

قرآن پاک کی ایک بڑی دین عقل ووحی اور مذہب وعلم کے درمیان وہ توازن اور امتزاج ہے جو قرآن اور قرآن کی لائی ہوئی شریعت کے علاوہ ہر جگہ ناپید ہے۔ دنیا آج بھی اس توازن سے ناواقف ہے جو انسانی زندگی کو صدیوں سے جاری اس کشاکش سے نجات دلا سکے جس میں مذہب وعلم کے قدیم تعارض وتصادم نے اس کو مبتلا کر رکھا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کچھ مذاہب

نے اپنی دانست میں وحی اور روحانیت کا دامن تھاما، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ عقل و دانش کے سارے تقاضے دھرے کے دھرے رہ گئے اور مذہب آخر کار ہر قسم کی بے عقلیوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ اس کے ردعمل میں عصر جدید نے عقل و دانش سے وابستہ رہنے کا فیصلہ کیا اور عقلیت پسندی کے جوش میں مذہب کو ہر جگہ سے دیس نکالا دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج انسانی زندگی ہر قسم کی اخلاقی اور روحانی قدروں سے تیزی سے محروم ہوتی چلی جارہی ہے۔

قرآن مجید وہ واحد کتاب ہے جس نے خالص دینی معاملات میں عقل کو اور خالص دنیاوی معاملات میں دینی راہنمائی کو مناسب اور موثر کردار عطا کیا۔ عقل و تدبر اور علم و دانش پر جتنا زور اس کتاب میں دیا گیا ہے کسی بھی مذہبی کتاب میں نہیں دیا گیا۔ خالص دینی معاملات، عقائد اور عبادات کی لم اور حکمت بیان کرنے میں عقلی استدلال قرآن کے صفحہ صفحہ پر بکھرا ہوا ہے۔ دوسری طرف خالص دنیاوی اور انتظامی امور میں مذہب و اخلاق اور روحانیات کے اصولوں کا حوالہ قرآن کے اسلوب استدلال کی ایک امتیازی شان ہے۔

دنیائے علم و دانش پر قرآن پاک کا ایک بہت بڑا احسان اس کا وہ علمی منہاج اور طرز استدلال ہے جس نے آگے چل کر منطق استقرائی کو فروغ دیا۔ قرآن مجید نے توحید اور حیات بعد الموت کے عقائد کو لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے جو اسلوب استدلال اختیار فرمایا وہ جزئیات کے مطالعہ سے کلیات تک پہنچانے کا اسلوب ہے۔ قرآن مجید ایک بڑی حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے لیے روزمرہ کی زندگی سے بہت سی مثالیں بیان کرتا ہے۔ یہ وہ مثالیں ہوتی ہیں جن پر غور کرنے سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ یہ وہ نتیجہ ہوتا ہے جو بالآخر اس حقیقت کبریٰ کی نشان دہی کرتا ہے جو قرآن پاک کے پیش نظر ہوتی ہے۔

یہ اسلوب مکی سورتوں میں عقائد کے مضامین کے ضمن میں کثرت سے نظر آتا ہے۔ اس نے علم و فکر کا واسطہ زمینی حقائق سے جوڑا اور یونانی انداز کی فکر مجرد کے مقابلہ میں براہ راست مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہ وہ چیز ہے جس نے یونانی انداز کی منطق استخراجی کے مقابلہ میں ایک نئی منطق، منطق استقرائی، کو جنم دیا۔ یوں بھی قرآن مجید جیسی انقلابی کتاب کے لیے جو خیال اور مجرد فکر سے زیادہ عمل اور جدوجہد پر زور دیتی ہے، استخراجی اسلوب کے مقابلہ میں استقرائی اسلوب ہی موزوں اور مناسب ہوسکتا تھا۔

قرآن مجید کی ان عطاؤں کی مثالیں اور بھی دی جاسکتی ہیں، لیکن ان سے گفتگو طویل ہو جائے گی اور اصل موضوع سے دور چلی جائے گی۔ اس لیے ایک اور مثال دے کر یہ موضوع ختم کرتا ہوں۔ اسی ایک مثال پر اکتفا کریں۔ اس سے اس بات کا مزید اندازہ ہو جائے گا کہ اگر ایک غیر مسلم انصاف پسندی کے ساتھ یہ دیکھنا چاہے کہ قرآن مجید کے اثرات انسانیت پر کیا پڑے ہیں تو اس کو بہت جلد یہ احساس ہو جائے گا کہ یہ کتاب عالم انسانیت کی سب سے بڑی محسن کتاب ہے۔ یہ احساس ہی اس کو قرآن مجید کا مطالعہ کرنے پر سنجیدگی سے متوجہ کر سکتا ہے۔

وہ پہلو یہ ہے کہ اسلام سے پہلے انسانوں کی مذہبی زندگی کی ساری باگ ڈور بعض خاص طبقات کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ مذہبیات کی تاریخ کا ہر طالب علم یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام سے قبل ہر مذہب میں مذہبی زندگی پر متعین گروہوں اور مخصوص طبقات کی اجارہ داری ہوتی تھی۔ یہ اجارہ داری یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ آخرت میں گناہوں کی معافی تک کے اختیارات مذہبی طبقوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ مذہبی پیشوا رشوتیں لے کر گناہوں کی معافی کے پروانے جاری کیا کرتے تھے۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں آج بھی مذہبی پیشوا خصوصی اختیارات اور اجارہ داری کا دعویدار ہے۔ وہ کسی بت خانہ کا پنڈت یا پروہت ہو، کسی گرجا کا پادری ہو، کوئی ربی ہو، یا کوئی اور مذہبی عہدہ دار ہو، اپنے مذہب میں وہی مذہبی زندگی کا اجارہ دار ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کوئی رشتہ براہ راست قائم نہیں ہونے دیتا۔ کہنے کو تو وہ گویا گنہگار انسانوں اور ان کے خالق کے درمیان سفارشی کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن دراصل وہ اللہ اور بندے کے درمیان ایک رکاوٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے بھی دنیا میں ہر جگہ یہی رواج تھا، اور آج بھی یہی رواج ہے۔ کل بھی یہی غلط فہمی پائی جاتی تھی اور آج بھی بہت سی جگہ یہی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید وہ پہلی کتاب ہے جس نے ان تمام رکاوٹوں کو ختم کر کے اعلان کیا کہ ادعونی استجب لکم۔ مجھے پکارو، میں تمہاری پکار سنوں گا۔ ہر انسان جب دل کی گہرائیوں کے ساتھ دعا کرتا ہے تو براہ راست روشنی سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اس کی دعا اللہ تعالیٰ کے پاس جا پہنچتی ہے۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔ جب بھی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی دو آیات ہیں۔ لیکن ان کی اہمیت پر جتنا

زیادہ غور کریں گے تو پتہ چلے گا کہ کائنات میں ان دو آیات نے کتنا بڑا انقلاب برپا کیا ہے۔ غور کرنے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے لائے ہوئے اس انقلاب کی عظمت کیا ہے۔ اس اعلان نے مذہبی غلامی کی ایک بدترین قسم کو فنا کر کے رکھ دیا ہے۔ قرآن مجید کے اسی انقلاب آفریں اعلان کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

نقش قرآن تا دریں عالم نشست
نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

یعنی جب سے اس دنیا میں قرآن کا نقش قائم ہوا ہے اس نے کاہنوں اور پاپاؤں کے نقش کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کا آج غیر مسلم بھی اعتراف کرتے ہیں۔ غیر مسلم قومیں جو نئے سائنسی تصورات سے آشنا ہوئیں وہ نزول قرآن کریم کے بعد کے واقعات ہیں۔

یہ قرآن مجید کے ان پہلوؤں کی صرف چند سرسری مثالیں ہیں جن کی وجہ سے ایک غیر مسلم کو بھی قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیے ان مثالوں سے ایک غیر مسلم کو بھی یہ احساس ہو جانا چاہیے کہ یہ کتاب عام کتابوں کی طرح کی کوئی کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ تو ایک ایسی کتاب ہے جس نے دنیا کو ایک نئے انقلاب، نئی تہذیب، نئے تمدن، نئے قانون، نئے عقیدے، نئی ثقافت اور پوری انسانی زندگی کو ایک نئے چلن اور نئی روش سے متعارف کروایا ہے۔ اگر لوگ اس نئی روش اور نئے چلن کو جاننا چاہتے ہیں تو پھر انہیں قرآن مجید کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

اب اس سوال کے دوسرے حصہ کو لیجیے کہ ایک مسلمان کو قرآن مجید کا مطالعہ کیوں کرنا چاہیے؟ مسلمان کو قرآن کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہیے کہ قرآن مجید ہی مسلمانوں کی زندگی کی اساس ہے۔ جس عالمی برادری کو ہم امت مسلمہ کہتے ہیں (جس کے لیے کبھی کبھی ملت اسلامیہ کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے) اس کی اساس صرف قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ امت مسلمہ کی اور کوئی اساس نہیں ہے۔ قرآن مجید ہمارے پاس دو شکلوں میں آیا ہے:۔

۱۔ قرآن ناطق، یعنی بولتا قرآن

۲۔ قرآن صامت، یعنی خاموش قرآن

قرآن صامت (یعنی خاموش قرآن) تو یہ کتاب ہے جو خود تو نہیں بولتی لیکن ہم اسے پڑھتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہم سے مخاطب ہوتا ہے۔ قرآن ناطق یعنی بولتا قرآن

وہ ذات گرامی ہے، علیہ الصلوۃ والتحیہ، جس نے قرآن کو دنیا تک پہنچایا، اس کی تفسیر وتشریح کی، اور اس قرآن پر عمل کر کے دکھایا، جس کے بارے میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا تھا کان خلقه القران کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق بعینہٖ قرآن مجید کے مطابق تھا۔ کسی نے ان سے پوچھا تھا کہ اماں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں کچھ بتایئے۔ آپؓ نے سوال کرنے والے سے پوچھا: کیا تم قرآن مجید نہیں پڑھتے؟ اس نے عرض کیا کہ جی ہاں پڑھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کان خلقه القران، آپ کا اخلاق اور کردار بالکل وہی تھا جو قرآن مجید کہتا ہے اور جو ہمیں قرآن مجید میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید قرآن صامت ہے اور آپ کی ذات گرامی قرآن ناطق ہے۔

آج ہمارے پاس قرآن صامت بھی بعینہٖ اس طرح موجود ہے اور قرآن ناطق کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ارشادات، آپ کی دی ہوئی تشریحات اور آپ کی قائم کردہ سنت ثابتہ، سب کچھ اسی طرح موجود ہے جس طرح آپ امت کو دے کر گئے تھے۔ اس کے باوجود آج مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن مجید کو وہ مقام حاصل نہیں جس کی یہ کتاب مستحق ہے۔ ہمارا یہ دور اس اعتبار سے انتہائی افسوسناک اور اندوہناک ہے کہ قرآن مجید سے آج ہمارا وہ مضبوط تعلق منقطع ہوتا نظر آتا ہے، جس نے ہمارے جسد ملی کو تحفظ بخشا۔ آج ہم میں سے بہت سوں کا قرآن مجید سے وہ تعلق نہیں رہا جو ہونا چاہیے۔ اس کی پیشین گوئی بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔

وقال الرسول یارب ان قومی اتخذوا هذا القران مهجورا۔ غور کرو! اس وقت کیا حال ہوگا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے کہ "اے پروردگار! میری اس قوم نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا تھا"۔

قرآن مجید کو چھوڑنے کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔ یہ سمجھنا کہ قرآن مجید کو چھوڑنے کا کوئی خاص پیمانہ یا معیار ہوتا ہے، اور وہ ابھی تک سامنے نہیں آیا، ایک بڑی خطرناک غلط فہمی ہے۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ ہجر قرآن کی منزل ابھی نہیں آئی۔ ہجر قرآن یا ترک قرآن کا یہ خطرناک مرحلہ آچکا ہے، ترک قرآن آخر کیا ہے؟ یہی نا کہ قرآن مجید کے الفاظ سے تعلق ختم ہو جائے، قرآن مجید کے متن کو لوگ یاد کرنا چھوڑ دیں، قرآن مجید کو سمجھنے کی ضرورت کا احساس نہ رہے، قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے سے دلچسپی ختم ہو جائے، لوگ قرآن مجید کے احکام پر

عمل درآمد کرنا چھوڑ دیں، قرآن مجید کو قانون کا اولین اور برتر ماخذ تسلیم کرنے سے عملاً انکار کر دیں۔ یہ ساری چیزیں قرآن مجید کو چھوڑنے ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کو روئے زمین کے کونے کونے میں پھیلایا۔ اس موضوع پر کل یا پرسوں انشاءاللہ تفصیل سے گفتگو ہوگی، جس میں ہم یہ دیکھیں گے کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کو کس کس انداز اور کس کس محنت سے محفوظ رکھا، اور کن کن طریقوں سے کام لے کر اس کو عام کیا۔ لیکن سردست صرف یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ صحابہ کرامؓ نے تابعین کی جو نسل تیار کی اور پھر تابعین نے تبع تابعین کی جو نسل تیار کی، انہوں نے مسلمانوں کے مزاج، مسلمانوں کے رگ و پے اور مسلم معاشرہ کی بنیادوں میں قرآن مجید کو اس طرح رچا بسا دیا کہ جو شخص اس معاشرہ میں داخل ہو گیا وہ قرآن مجید کے رنگ میں رنگا گیا۔ ایک پوری نسل چین سے لے کر مراکش تک اور سائبیریا کی حدود سے لے کر سوڈان کے جنوب تک ایسی پیدا ہوگئی جس کے سوچنے سمجھنے کا انداز قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق، جس کی فکر اور عقیدہ قرآن مجید کے دیے ہوئے تصورات سے ہم آہنگ، جس کا طرز عمل قرآن مجید کے احکام پر مبنی، اور جس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر پہلو قرآن مجید کے نور سرمدی سے مستنیر تھا۔ وہاں ہر گھر قرآن کی درسگاہ تھا، وہاں ہر مسجد قرآن کی یونیورسٹی تھی، وہاں ہر بستی قرآنی تربیت گاہ تھی، وہاں ہر درسگاہ میں علم و بصیرت کی بنیاد کتاب الٰہی تھی۔

اگر اس اعتبار سے مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے کہ قرآن مجید کو بنیاد بنا کر انہوں نے علوم وفنون کو کتنی ترقی دی اور کس طرح قرآنی فکر کو عام کیا تو محیر العقول انسانی کاوشوں کے عجیب و غریب نمونے سامنے آئیں گے۔ جب ابن بطوطہ نے دنیا کا سفر کیا اور سفر کرتے ہوئے وہ دہلی پہنچا تو دہلی شہر میں اس نے دیکھا کہ ایک ہزار مدرسے تھے جہاں نہ صرف قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی تھی، بلکہ تمام علوم وفنون جو ان مدارس میں سکھائے جاتے تھے وہ قرآن مجید کے دیے ہوئے پیغام کی تفسیر و تشریح سے عبارت تھے۔ یہ تو ابن بطوطہ کے زمانہ کی بات ہے جو آج سے کم وبیش آٹھ نو سو سال پہلے یہاں آیا تھا۔ لیکن آج سے کم وبیش ڈیڑھ سو دو سو سال قبل جب انگریز شروع شروع میں اس علاقے میں آنا شروع ہوئے تو ٹھٹھہ جیسے شہر میں، جو مرکز حکومت سے ہزاروں کوس دور، ثقافت کے مراکز سے بعید اور معاشی اعتبار سے نسبتاً ایک پس ماندہ علاقہ تھا،

سینکڑوں مدارس قائم تھے، جہاں ہزارہا جید علماء علوم وفنون کی درس وتدریس میں مصروف تھے۔ خود انگریز سیاحوں نے بیان کیا کہ اس زمانہ میں چار سو مدرسے ٹھٹہ میں موجود تھے۔ یہ اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے۔ اس حیرت انگیز اور بے مثال علمی پیش رفت اور تعلیمی سرگرمی کا واحد سبب یہ ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کے رگ وپے میں اس طرح رچ بس گیا تھا کہ ان کی پوری زندگی قرآن مجید کی تعلیمات سے عبارت تھی۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ مسلمان ادارے ایک ایک کر کے کمزور پڑ گئے، مسلمانوں کا تمدن دھندلا گیا، مسلمانوں کا تعلق قرآن مجید سے کمزور ہوتا گیا اور ایک ایسی نسل سامنے آ گئی جو قرآن مجید سے اسی طرح نامانوس اور ناواقف تھی جیسے کوئی غیر مسلم ناواقف ہوتا ہے۔ صرف سوسوا سو سال کے اندر اندر کیا سے کیا ہو گیا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے میوات کی حالت کا جائزہ لیجیے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں، کہیں دور نہیں بلکہ دہلی کے قرب وجوار میں جو مسلمانوں کا مرکز تھا، اس کے قریبی علاقہ میوات کے بارہ میں سنا گیا ہے کہ وہاں ایک پوری نسل ایسی بستی تھی جو اپنے بارے میں یہ دعویٰ تو کرتی تھی کہ وہ مسلمان ہے، لیکن اس دعویٰ کے علاوہ ان کے اندر کوئی چیز اسلام سے متعلق باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس زمانے میں تبلیغی جماعت کے بانی اور مشہور بزرگ مولانا محمد الیاس کو وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ تم مسلمان ہو یا غیر مسلم؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ مولانا نے پوچھا: نماز پڑھتے ہو؟ بولے: نماز تو ہم نے کبھی نہیں پڑھی۔ جب ان سے نام پوچھے گئے تو ایسے نام بتائے گئے جو یا تو پورے کے پورے ہندوانہ نام تھے، یا جن میں آدھے نام اسلامی اور آدھے ہندوانہ تھے، جیسے محمد سنگھ، حسین سنگھ وغیرہ۔ مولانا نے پوچھا کہ تم لوگوں نے کبھی قرآن پاک پڑھا ہے۔ جواب ملا: پڑھا تو نہیں لیکن ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا: لا کر دکھاؤ۔ جب انہوں نے قرآن مجید کا نسخہ لا کر پیش کیا تو وہ گائے کے گوبر میں لپٹا ہوا تھا۔ ہندو گوبر کو مقدس مانتے ہیں، اس لیے کہ وہ گائے کا فضلہ ہے جو ان کے ہاں تقدس کا مرکز ہے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ قرآن کے مقدس مقام اور مرتبہ کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے اوپر اس مقدس فضلہ کو لپیٹ دیا جائے۔

یہ کیفیت تھی بیسویں صدی کے آغاز سے ذرا پہلے، جس سے یہ واضح طور پر معلوم

ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کا قرآن مجید سے تعلق کتنا اور کس نوعیت کا رہ گیا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل بلکہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کا، بالخصوص عامۃ الناس کا، قرآن مجید سے تعلق کمزور پڑتا جا رہا ہے تو اس زمانہ کے اہل علم نے عامۃ الناس کو قرآن مجید سے مانوس اور متعارف کروانے کے لیے اسی طرح کے عوامی دروس کو رواج دیا جس طرح کے عوامی دروس دینے کا شرف آپ میں سے اکثریت کو حاصل ہو رہا ہے اور انشاء اللہ ہوتا رہے گا۔ برصغیر کی تاریخ میں پہلا عوامی درس قرآن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے شروع کیا تھا، وہ دہلی میں تقریباً ساٹھ سال درس قرآن دیتے رہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کا پورا خاندان اس اعتبار سے برصغیر کے مسلمانوں کا محسن ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کا رشتہ قرآن پاک اور حدیث نبوی سے جوڑا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے والد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآن مجید کے مطالعہ کو عوامی سطح پر متعارف کرانے میں بے پناہ خدمات انجام دیں۔ دونوں بڑے مفسر قرآن تھے۔

شاہ عبدالعزیز کی تفسیر تفسیرِ عزیزی شاید آپ نے دیکھی ہو، وہ قرآن پاک کی چند بہترین تفاسیر میں سے ایک ہے، یہ ایک نامکمل تفسیر ہے۔ شروع میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کے تقریباً نصف یعنی دوسرے پارہ کی آیت وعلی الذین یطیقونہ تک ہے۔ اور پھر آخر میں انتیسویں اور تیسویں پارے کی تفسیر ہے جو دستیاب ہے۔ باقی اجزاء کی تفسیر یا تو حضرت شاہ صاحب نے لکھی نہیں، یا اب ناپید ہو گئی ہے۔ لیکن جو اجزاء دستیاب ہیں وہ علوم قرآن کے بے بہا ذخیرہ پر مشتمل ہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے صرف تفسیر قرآن ہی لکھنے پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ انہوں نے سب سے پہلے برصغیر میں عوامی سطح پر درس قرآن بھی شروع کیا۔ لیکن شاہ عبدالعزیز کے انتقال کے چند سال بعد فوراً ہی جنگ آزادی کی تحریک شروع ہو گئی، بالآخر **1857** کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انگریز مکمل طور پر قابض ہو گئے اور مسلمانوں کے سارے ادارے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے اور یہ درس جو شاہ عبدالعزیز نے اپنی نوعیت کے منفرد انداز میں شروع کیا تھا برصغیر میں جاری نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد کم و بیش ساٹھ ستر سال کا عرصہ گذرا کہ قرآن سے تعلق کی وہ کیفیت برصغیر میں پھر ختم ہو گئی۔

پھر ہمارے موجودہ پاکستان کے علاقوں میں بیسویں صدی کے اوائل میں بعض بزرگوں نے اس کام کو از سرِ نو شروع کیا۔ جن میں بڑا نمایاں نام حضرت مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے نامور شاگرد حضرت مولانا احمد علی لاہوری کا ہے۔ مولانا احمد علی لاہوری نے سب سے پہلے لاہور میں **1925** کے لگ بھگ عوامی درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا، جو تقریباً چالیس پینتالیس سال تک، جب تک مولانا زندہ رہے، جاری رہا۔ اس کے بعد سے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ پاکستان کے چپے چپے میں درس قرآن کی محفلیں جاری ہیں اور مختلف سطحوں اور مختلف انداز سے یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں کو بالعموم اور پاکستان کے مسلمانوں کو بالخصوص قرآن مجید کے پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔

آپ نے سنا ہوگا' میں نے بھی سنا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا' میں نے بھی دیکھا ہے کہ ہمارے بعض روایتی علماء کرام کو عوامی انداز کے اس درس قرآن کے بارے میں کچھ تحفظات ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً ان تحفظات کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان تحفظات کے اظہار میں بعض اوقات ان میں سے کچھ کا انداز بیان سخت اور نامناسب بھی ہوتا ہے۔ لیکن آپ اس سے متاثر نہ ہوں۔ اپنا کام جاری رکھیں۔ ان شاء اللہ لوگوں کو جو تحفظات ہیں وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائیں گے۔ درخت اپنے ثمر سے پہچانا جاتا ہے، اپنے نام اور شکل سے نہیں پہچانا جاتا ہے، جب آپ کی اس مبارک کاوش کے بابرکت ثمرات لوگوں کے سامنے آئیں گے تو یہ سارے تحفظات خود بخود ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے۔

جب ہم درس قرآن کے اسلوب اور منہاج کی بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دو چیزیں رہنی چاہئیں۔ سب سے پہلی چیز جو سنجیدہ توجہ اور گہرے غور و خوض کی مستحق ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے درس قرآن کے مقاصد کیا ہیں۔ یعنی اگر آپ قرآن پاک کا درس دے رہی ہیں تو کیوں دے رہی ہیں۔ اور اگر کہیں درس شروع کرنے کا ارادہ ہے تو کیوں ہے؟ یعنی درس دیں تو کیوں دیں۔

پھر جب ایک مرتبہ مقصد کا تعین ہو جائے تو پھر یہ بھی طے کرنا چاہیے کہ آپ کے اس مجوزہ درس قرآن کے مخاطبین کون ہیں۔ مخاطب کا تعین کرنا سب سے بنیادی اور سب سے اہم بات ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک آپ کی کسی تحریر یا تقریر کا کوئی مخاطب متعین نہ ہو، یا کم از کم یہ طے نہ ہو کہ آپ کے مخاطبین کی علمی اور فکری سطح کیا ہے اس وقت تک آپ کے لیے اپنے

درس، تقریر، تحریر یا گفتگو کا کوئی معیار مقرر کرنا اور اسے برقرار رکھنا بڑا دشوار بلکہ ناممکن ہوگا۔ جتنا اونچا معیار آپ کے مخاطب کا ہوگا اتنا ہی اونچا معیار آپ کی علمی کاوش کا ہوگا۔ قرآن مجید کے اولین مخاطب سرکار دو عالمؐ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ حضور سرور کونین علیہ السلام نے سماعت فرمایا۔ نزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المنذرين۔ آپؐ کے قلب مبارک پر جبریل امین لے کر نازل ہوئے۔ لہٰذا قرآن مجید کے اولین مخاطب کا جو درجہ اور مقام ہے ویسی ہی قرآن مجید کی شان اور مقام ہے۔

آپ نے غالباً مثنوی مولانا روم پڑھی ہوگی۔ اور اگر نہیں پڑھی تو نام تو یقیناً سنا ہوگا۔ ایک زمانے میں مثنوی مولانا روم دنیائے اسلام کی ادبیات کی شاید سب سے مقبول کتاب تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غالباً غلط نہ ہوگا کہ قرآن مجید کے بعد جو چند کتابیں مسلمانوں میں مقبولیت کی انتہا اور معراج پر فائز ہوئیں ان میں سے ایک مثنوی مولانا روم بھی تھی۔ اس کے بارے میں کسی نے کہا تھا۔ ہست قرآں در زبان پہلوی۔

جب مولانا مثنوی لکھ رہے تھے تو ان کے مخاطبین ان کے دو عظیم دوست تھے۔ ایک خواجہ حسام الدین چلپی اور ایک شیخ ضیاء الدین زرکوب۔ انہی دونوں سے خطاب کر کے انہوں نے پوری مثنوی لکھی، اور پھر پوری مثنوی میں ان کا وہ معیار برقرار رہا، جو ان کے ان دونوں مخاطبین کا تھا۔

لہٰذا درس قرآن کے اسلوب اور منہاج پر بات کرتے ہوئے ہمیں یہ ضرور خیال رکھنا اور دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اس درس کے مخاطبین کون ہیں۔ مخاطبین کا لحاظ رکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ مخاطبین کی بہت سی علمی اور فکری سطحیں ہوتی ہیں، بہت سے پس منظر ہوتے ہیں، اور ان سب کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات درس قرآن کا مخاطب ایک عام تعلیم یافتہ شہری ہوتا ہے۔ اس کے تقاضے اور ضروریات اور ہوتے ہیں۔ اگر درس قرآن کا مخاطب کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہے تو اس کے تقاضے اور ہوں گے اور اس کا معیار بھی اور ہوگا۔ اگر فنی تعلیم کے متخصص لوگ آپ کے درس کے مخاطب ہیں، مثال کے طور پر ایک قانون کا متخصص ہے، ایک فلسفے کا متخصص ہے، تو ایسے لوگوں کے تقاضے اور ہوں گے۔ لیکن اگر آپ کے درس کے مخاطبین قرآن مجید کے متخصصین، مثلاً درس نظامی کے طلباء یا علماء کرام ہیں تو ان کی ضروریات اور تقاضے اور ہوں گے۔ اس لیے پہلے یہ تعین کر لینا چاہیے کہ ہمارا ہدف کیا ہے اور ہم کس طبقہ کو خطاب کرنا چاہتے

ہیں۔ جس طبقہ اور جس معیار کے لوگوں سے بات کرنی ہو اس طبقہ کے فکری پس منظر، اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے شبہات، اس طبقہ میں اٹھائے جانے والے سوالات، اور ان شبہات و سوالات کا منشا پہلے سے ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔

لہٰذا اگر آپ کے مخاطبین عام تعلیم یافتہ لوگ ہیں تو ان کے لیے درس کا پیمانہ اور معیار اور ہوگا اور اگر اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہیں تو ان کے لیے پیمانہ اور معیار اور ہوگا۔ متخصصین کے لیے اور ہوگا، اور علوم اسلامیہ کے ماہرین کے لیے اور ہوگا۔ پھر جس طبقہ کے لیے جس پیمانہ اور معیار کا درس ہوگا اسی طرح کی تیاری بھی اس درس کے لیے کرنی پڑے گی۔ یہ سمجھنا کہ قرآن مجید کو ایک مرتبہ پڑھ لیا، یا سن لیا، یا ایک مرتبہ کسی کورس میں شرکت کا موقع مل گیا تو گویا علم کی معراج حاصل ہوگئی اور قرآنی حقائق و معارف کا سارا ذخیرہ ہمیں مکمل طور پر حاصل ہوگیا، اور اب اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں رہی، یہ ایک بہت بڑی غلطی اور غلط فہمی ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ فہم کی کمزوری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن مجید کا عالم کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی اور شخص علم قرآن میں صاحب قرآن سے بڑھ سکے۔ آپ کو اولین و آخرین کے علوم و معارف سے نوازا گیا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی ''رب زدنی علما''۔ اے رب میرے علم میں مسلسل اضافہ فرما۔ علم میں زیادتی کی دعا بظاہر تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی ہے، لیکن دراصل سکھائی ہمیں یہ تعلیم دینے کے لیے ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی کسی بھی وقت قرآن مجید کے علم کی اس سطح تک نہیں پہنچ سکتا کہ پھر اسے مزید کسی علم کے حصول کی ضرورت نہ رہے۔

قرآن مجید کی حکمت اور قرآن مجید کے عجائب و غرائب لامتناہی ہیں۔ ان لامتناہی عجائب و غرائب کی نوعیت کا تذکرہ آئندہ ہوگا اور اس کی چند جھلکیاں ہم آئندہ کسی گفتگو میں دیکھیں گے۔ یہ سلسلہ تا قیامت جاری و ساری رہے گا، سنریهم آياتنا فی الآفاق وفی انفسهم حتى يتبين لهم انه الحق۔ قرآن مجید کی حقانیت کی نشانیاں کائنات میں اور انسانوں کے اندر اللہ تعالیٰ دکھاتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ لوگوں کے لیے یہ بات واضح ہوجائے گی کہ یہی کتاب حق ہے۔ اب یہ جو نئی نئی نشانیاں اور نئے نئے رموز اللہ تعالیٰ انسانوں کے سامنے کھولتا جائے گا ان سے واقفیت اور ان کا مسلسل مطالعہ ناگزیر ہے۔

مزید برآں ہر آنے والا دن نئے سوالات لے کر آتا ہے۔ آپ کا ہر آنے والا شاگرد ایک نئی الجھن اور ایک نیا اعتراض لے کر آئے گا۔ ہر آنے والے ماحول میں لوگ قرآن پاک کے بارے میں نئے نئے شبہات پیدا کریں گے اور اس سے انسانوں کے ذہن متاثر ہوں گے۔ ان سب کا اجمالی اور اصولی جواب قرآن مجید میں موجود ہے۔ ان سب آنے والے سوالات اور شبہات کا جواب اللہ کے رسولؐ نے بھی دے دیا ہے۔ لیکن اس اصولی اور اجمالی جواب کو اس انداز سے سمجھنے اور موجودہ صورت حال پر منطبق کرنے کی ضرورت ہے جس سے دور حاضر کے معترض اور متشکک کی الجھن دور ہو جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پہلے اعتراض اور شبہ کی بنیاد سے واقفیت اور قرآن مجید کی متعلقہ ہدایت کا گہرائی سے مطالعہ ضروری ہے۔ جب تک اس مسئلہ کو جو قرآن مجید میں موجود ہے اس سوال سے وابستہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک وہ جواب ہمارے سامنے اس طرح واضح، منقح اور متشکل نہیں ہوگا کہ اسے ہم اس مسئلہ کی وضاحت کے حوالے سے دوسروں تک پہنچا سکیں اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے سکیں۔

قرآن مجید کا یہ کام کہ بقول اقبال: بہ آیاتش آساں بمیری۔ (جان آسانی سے نکلنے کے لیے قرآن پڑھنا) یہ قرآن مجید کو اس کے درجہ سے کم کرنے کے مترادف ہے۔ اگر کوئی انسان دنیا سے رخصت ہو رہا ہے تو یقیناً حدیث پاک کی تعلیم یہ ہے کہ اس موقع پر سورۃ یسین شریف کی تلاوت کی جائے۔ لیکن قرآن مجید کا صرف یہی ایک مصرف رہ جائے کہ اس کی آیات کی برکت سے لوگوں کے لیے مرنا آسان ہو جایا کرے تو قرآن مجید کا یہ استعمال قرآن مجید کے مقام اور مرتبہ کے خلاف ہے۔ اس لیے مخاطبین کی مختلف سطحوں اور معیارات کے لحاظ سے درس قرآن کے مقاصد اور درس قرآنی کا منہاج مقرر کیا جائے گا۔

البتہ کچھ مقاصد ایسے ہیں جو عمومی انداز کے ہیں۔ وہی قرآن پاک کے نزول کے بھی مقاصد ہیں۔ ان کو ہم تین الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ یہ تین الفاظ شاہ حضرت ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ہیں۔ جن کی علوم قرآن کے موضوع پر ایک کتاب بہت معروف ہے۔ آپ میں سے جن بہنوں کو عربی زبان آتی ہے ان کے لیے میرا مشورہ یہ ہوگا کہ وہ اس کتاب کو عربی زبان میں ضرور پڑھیں اور نہ صرف پڑھیں بلکہ مستقل حرز جان بنالیں۔ اور وقتاً فوقتاً اسکا مطالعہ کیا کریں۔ وہ کتاب ہے ''الفوز الکبیر فی علم التفسیر''۔ اس کتاب کا اردو اور انگریزی ترجمہ بھی ملتا ہے، جو بہنیں

عربی نہیں جانتی وہ اس کو اردو میں پڑھ لیں۔ اس کتاب میں شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کے نزول کا مقصدِ اصلی یہ تین چیزیں ہیں۔

۱۔ تہذیب نفوس البشر، کہ انسانوں کے نفوس کی اندر سے تہذیب ہو اور انسانی نفوس اس قدر پاکیزہ اور صاف ستھرے ہو جائیں کہ وہ تمام اخلاقی اور روحانی ذمہ داریاں انجام دے سکیں جو اللہ رب العزت نے ان کے اوپر عائد کی ہیں۔

۲۔ دوسری چیز جو شاہ صاحب نے بیان کی ہے وہ ہے دمغ العقائد الباطلہ، یعنی وہ تمام باطل عقائد جو لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ذہن ہوں یا غیر مسلموں کے۔ ان سب باطل عقائد کی تردید کی جائے۔ بعض اوقات ایک غلط خیال آپ کے مخاطب کے ذہن میں ہوتا ہے اور اس کے دماغ کے مختلف گوشوں میں انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ لیکن وہ غلط خیال اس کے ذہن میں اتنا واضح نہیں ہوتا کہ وہ سوال کی شکل میں اس کو آپ کے سامنے پیش کر سکے۔ اس لیے وہ خود تو اس سوال کو پیش نہیں کرے گا۔ اگر آپ از خود اس کی تردید نہیں کریں گی تو وہ سوال اس کے دماغ کے گوشوں میں کلبلاتا رہے گا، اور وہ الجھن اس کے ذہن میں قائم رہے گی، اور آپ کے درس قرآن کے باوجود اس کی وہ الجھن صاف نہیں ہوگی۔ اس لیے آپ پہلے سے اس کا اندازہ اور احساس کر لیں کہ مخاطب کے ذہن میں کیا کیا شبہات آسکتے ہیں۔ اگر درس دینے والی خاتون ان سے واقف ہو۔ اور اپنے درس میں وہ اس شبہ یا اعتراض کا تذکرہ کیے بغیر اور یہ کہے بغیر کہ لوگوں کے ذہن میں اس قسم کا شبہ موجود ہے، وہ از خود اس شبہ یا اعتراض کا جواب ایسے انداز سے دے کہ وہ اعتراض خود بخود ختم ہو جائے تو اس طرح وہ تمام عقائد باطلہ جو لوگوں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عقیدہ قرآن مجید کی رو سے غلط عقیدہ ہے، اور ایک غلط خیال قرآن مجید کی رو سے غلط خیال ہے، اور ایک تصور جو لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے وہ غلط تصور ہے۔ لیکن کسی وجہ سے اس غلط عقیدہ، غلط خیال یا غلط تصور کے حق میں اس کے ماننے والوں میں کوئی عصبیت بھی پیدا ہو گئی اور اس عصبیت کا کوئی خاص پس منظر ہے، تو ایسی صورت حال میں مناسب یہ ہے کہ عمومی انداز اختیار کیا جائے اور قرآن پاک کے موقف کی تشریح و تفسیر اس انداز میں کی جائے کہ وہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ اگر آپ نام لے کر تردید کریں گی کہ فلاں شخص

یا فلاں گروہ کے لوگوں میں یہ خیال یا یہ چیز غلط ہے تو اس سے ایک ردِ عمل پیدا ہوگا اور ایک ایسا تعصب پیدا ہو جائے گا جو حق کو قبول کرنے میں مانع ہوگا۔ تعصب سے ضد پیدا ہوتی ہے۔ ضد بالآخر عناد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر انسان کے لیے حق بات قبول کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں انسان کا نفس اس کے غلط خیال کو نئے نئے انداز میں سامنے لانا شروع کر دیتا ہے۔ اس لیے اس اعتراض کا ذکر کیے بغیر اگر آپ اس کا جواب دیں تو پھر تعصب کی دیوار سامنے نہیں آتی۔ قرآن مجید کا یہی اسلوب ہے۔ قرآن مجید نے اکثر و بیشتر سوال کا ذکر کیے بغیر اور اعتراض کو دہرائے بغیر اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن خود بخود صاف ہو جاتا ہے اور معترض کے ذہن کی کجی آپ سے آپ دور ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید کے اس اسلوب پر بھی ہم آگے چل کر بات کریں گے۔ لیکن مثال کے طور یہاں صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ ہم نے زمین اور آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے۔ ولم یعی بخلقھن۔ اللہ تعالیٰ ان کو پیدا کر کے تھکا نہیں۔ ایک اور جگہ ہے وما مسنا من لغوب، ہم پر کوئی تھکن طاری نہیں ہوئی۔ اب یہ یہودیوں کے ایک غلط عقیدے کی تردید ہے۔ یہودی نعوذ باللہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں فلاں فلاں چیزیں بنائیں، جیسا کہ بائبل کے عہد نامہ قدیم کے آغاز میں صراحت کی گئی ہے، اور نعوذ باللہ ساتویں دن وہ تھک کر لیٹ گیا اور اس نے پورے دن آرام کیا۔ یہودیوں کے نزدیک وہ ساتواں دن سبت کا دن تھا۔ جس میں یہودی چھٹی کیا کرتے تھے۔ جب عیسائیوں کا دور آیا تو انہوں نے سوچا کہ یہودی ہفتہ یا سبت کے دن چھٹی کرتے ہیں، اس لیے ہمیں اس سے اگلے دن یعنی اتوار کے روز چھٹی کر لینی چاہیے۔ اس لیے عیسائیوں نے اتوار کے دن چھٹی کرنی شروع کر دی۔ لیکن آپ غور فرمائیے قرآن مجید نے یہودیوں کے اس عقیدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا، اور نہ کوئی ایسا اشارہ کیا جس سے یہ پتہ چلے کہ یہودی ایسا کوئی عقیدہ رکھتے ہیں۔ بس ایک اشارہ ایسا دے دیا کہ یہ غلط فہمی اپنے آپ ہی ختم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ایسے انداز میں بیان فرما دیا کہ قرآن کے طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ قرآن مجید کا اسلوب استدلال اور طرز مخاصمہ ہے جو ہمیں بھی اپنانا چاہیے ہمارا اسلوب بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

۳۔ شاہ صاحب کی زبان میں قرآن پاک کا تیسرا مقصد نفی الاعمال الفاسدہ ہے، یعنی جو اعمال

فاسدہ انسانوں میں رائج ہیں، چاہے ان کی بنیاد کسی غلط عقیدے پر ہو یا نہ ہو، ان اعمال کی غلطی کو واضح کیا جائے، اور ان کو مٹانے اور درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی غلط رواج انسانوں میں رائج ہو جاتا ہے اور بہت سے لوگ قرآن مجید کا علم رکھنے کے باوجود یہ محسوس نہیں کرتے کہ ان کا یہ رواج قرآن مجید کے احکام کے منافی ہے، یا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ انہیں کبھی اس بات کا خیال ہی نہیں آتا۔ اب اگر آپ نے بطور مدرس قرآن درس کے پہلے ہی دن لٹھ مارنے کے انداز میں یہ کہہ دیا کہ اے فلاں فلاں لوگو: تم شرک کا ارتکاب کر رہے ہو، اور اے فلاں فلاں لوگو! تم بدعت کا ارتکاب کر رہے ہو، اور تم ایسے ہو، اور ایسے ہو، تو اس سے نہ صرف ایک شدید ردعمل پیدا ہوگا۔ بلکہ اس کے امکانات بہت کمزور ہو جائیں گے کہ آپ کا مخاطب آپ کے پیغام سے کوئی مثبت اثر لے۔ اس انداز بیان سے مضبوط گروہ بندیاں تو جنم لے سکتی ہیں، کوئی مثبت نتیجہ نکلنا دشوار ہے۔ اس طرز گفتگو سے آپ کے اور مخاطب کے درمیان تعصب کی ایک دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ صرف قرآن مجید کی تعلیم بیان کرنے پر اکتفاء کریں کہ قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے، اس میں یہ حکمت ہے اور اس تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ فلاں فلاں قسم کے کام نہ کیے جائیں، تو اگر فوری طور پر نہیں تو آگے چل کر ایک نہ ایک دن قرآن مجید کا طالب علم آپ کی دعوت کو قبول کر لیتا ہے۔ اور قرآن مجید کے مطابق آہستہ آہستہ اس کے غلط طور طریقے اور فاسد عمل درست ہوتے چلے جاتے ہیں۔

یہ تین تو وہ مقاصد ہیں جو درس قرآن کے اصل مقاصد ہیں اور یہی اصل مقاصد رہنے چاہئیں۔ چاہے درس قرآن کسی بھی سطح کا ہو، چاہے وہ امام رازیؒ کی سطح کا درس قرآن ہو، یا ہماری اور آپ کی سطح کا، اس کے یہ تین مقاصد لازماً ہوں گے۔ انسان کے نفس کی تہذیب کی ہر وقت ضرورت ہے اس لیے کہ تہذیب نفس اور تزکیہ روح کی کوئی انتہا نہیں۔ نفس کی جتنی بھی تہذیب اور روح کا جتنا بھی کا تزکیہ ہوتا چلا جائے گا، اس سے اونچا ایک معیار ہمیشہ موجود رہے گا۔

اسی طرح سے جب تک انسان دنیا میں ہے عقائد باطلہ بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور نئے نئے شبہات بھی سامنے آتے رہیں گے۔ انسانی دماغ اور شیطان مل کر نئے نئے اعتراضات اختراع کرتے رہیں گے، اور ان اعتراضات کو کچلنے کی ضرورت بھی پیدا ہوتی رہے گی۔ اسی طرح اعمال فاسدہ بھی روز روز نئے نئے پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہمارا اور آپ کا سب کا مشاہدہ ہے کہ

آئے دن ایک نیا فساد معاشرہ میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔آئے دن عقیدہ اور عمل میں نئی نئی خرابیاں اور کمزوریاں جنم لیتی رہتی ہیں۔مثال کے طور پر بہت سے اعمال فاسدہ ایسے ہیں جو ہمارے بچپن میں نہیں تھے، اب پیدا ہو گئے ہیں، بلکہ ابھی چند سال پہلے تک بہت سے فاسد اعمال کا وجود نہیں تھا،لیکن اب یہ ہر جگہ کثرت سے نظر آتے ہیں۔اس لیے اعمال فاسدہ کی مسلسل تردید بھی ہمیشہ ناگزیر رہے گی۔

ان تینوں چیزوں کے ساتھ ساتھ اگر ہمارے سامنے تین چیزیں اور بھی رہیں تو خود بخود ہمارے درس قرآن میں معنویت اور بلند سطح پیدا ہوتی چلی جائے گی۔مخاطب کی جو سطح ہوگی،اس کے حساب سے آپ کا انداز خطاب اور اسلوب بلند ہوتا چلا جائے گا۔سب سے پہلے تو اس بات کا پختہ عزم اور صاف نیت ہونی چاہیے کہ اس درس کا مقصد وحید رضائے الٰہی کا حصول اور پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے۔خود پیغام الٰہی کی تبلیغ، کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے پیغام کو جوں کا توں دوسروں تک پہنچا دینا ہے، یہ ہمارا اولین ہدف ہونا چاہیے۔اللہ تعالیٰ کا پیغام قرآن مجید میں اس کے اپنے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔اس کی آیات کی تلاوت اور اس کے معانی و مطالب کی تشریح خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض چہارگانہ میں شامل ہے۔جیسا کہ خود قرآن مجید میں کئی جگہ صراحت کی گئی ہے۔

پیغام الٰہی کی یہ تبلیغ مخاطب کی سطح کے لحاظ سے ہوگی۔اگر آپ کو کسی دیہات میں ایسے لوگوں سے خطاب کا موقع ملتا ہے جنہوں نے کبھی پڑھا لکھا نہیں ان کے لیے آپ کا اسلوب اور ہوگا۔لیکن اگر آپ کو کسی جامعہ میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سطح کے لوگوں کو خطاب کرنا ہو تو آپ کا معیار اور انداز و اسلوب بالکل مختلف ہونا چاہیے۔یہ بات اتنی ظاہر اور بدیہی ہے کہ اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔البتہ پیغام الٰہی کا ایصال اور ابلاغ ان دونوں جگہوں پر ایک مشترک مقصد کے طور پر ہمارے سامنے رہے گا۔پھر جیسے جیسے قرآن مجید کی تدریس کا کام آگے بڑھتا جائے گا،تو اس کے ساتھ ساتھ ہمارے مخاطب کی اور خود ہماری فہم قرآن کی سطح بلند ہوتی چلی جائے گی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ درس قرآن کے مخاطب اور ہدف صرف آپ کے سامعین ہی نہیں ہیں بلکہ مدرس خود بھی اس کا مخاطب ہے۔اگر میں درس قرآن دے رہا ہوں تو سب سے پہلے اپنے درس کا مخاطب میں خود ہوں، اور اگر آپ درس دے رہی ہیں تو سب سے پہلے آپ خود اس کی مخاطب ہیں۔

مخاطِب اور مخاطَب دونوں کی ذہنی تشکیل، دونوں کے ذہنی مزاج کی تیاری اور دونوں کی اس انداز سے تربیت کہ غیر اسلامی انداز اور قوت ان کے اوپر اثر انداز نہ ہو سکے۔ یہی ہمارے درس قرآن کا ہدف اور مقصد ہونا چاہیے۔ اگر ہمارے درس قرآن کے سامعین کا ایمان، عقیدہ، جذبہ اور شعورِ اسلام اتنا مضبوط ہو جائے کہ کوئی بیرونی قوت اس کو متزلزل نہ کر سکے تو سمجھ لیں کہ درس قرآن نتیجہ خیز ہو رہا ہے۔۔ گویا قرآن مجید ایک ایسا قلعہ ہے جس کے اندر مسلمان قلعہ بند ہو جاتا ہے۔ پھر باہر کی کوئی قوت اس کے دل و دماغ کے اوپر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ پھر جب ایک مرتبہ دینی ذہن اور اسلامی مزاج کی تشکیل ہو جائے تو پھر تعلق مع اللہ کی وہ کیفیت بھی حاصل ہو جاتی ہے جو ہر مسلمان کا مقصود اور منظور نظر ہے۔

یہاں تک تو عام تعلیم یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ سامعین کے لیے دیے جانے والے درس قرآن کے مقاصد و اہداف مشترک تھے۔ یہ مقاصد سب کے لیے ہیں۔ ان میں عام مسلمان بھی شامل ہیں اور اعلیٰ ترین مہارتیں رکھنے والے متخصصین بھی۔ لیکن جب آپ کو کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے خطاب کا موقع ملے، اور اکثر ملے گا انشاءاللہ، اور یقیناً ملتا بھی رہتا ہوگا، تو تین چیزیں آپ کو مزید پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ یہ تین چیزیں ایسی ہیں جو خاص طور پر ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے حوالے سے ناگزیر ہیں۔

ا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم سب ایک ایسے فکری اور تعلیمی ماحول میں جی رہے ہیں جس پر مغربی افکار، تمدن اور ثقافت کا حملہ روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کے خیالات اور طرز معاشرت پر مغرب کی اتنی گہری چھاپ پڑ چکی ہے کہ درس قرآن میں اس کا نوٹس نہ لینا حقیقت کے انکار کے مترادف ہے۔ مغربی افکار کا اتنا گہرا اثر مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں پر چھا گیا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ مسلمان کے لیے اسلام کے عقائد اور تعلیمات میں جو چیز بالکل بدیہی ہونی چاہیے تھی وہ اب بدیہی نہیں رہی، بلکہ محض ایک نظری اور خیالی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ ایسے لوگ بھی ناپید نہیں ہیں جن کے لیے اسلامی عقائد و احکام میں سے بہت سے پہلو نظری سے بھی بڑھ کر ایک مشکوک چیز بن گئے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ اس لیے جب بھی ایک دینی ذہن کی تشکیل کا سوال پیدا ہوگا تو یہ بات ناگزیر ہوگی کہ عقیدہ اور فکر کی اس کمزوری اور انحلال کو پیش نظر رکھا جائے۔ آج مغربی افکار سے متاثر لوگوں کے دلوں اور ذہنوں سے مغرب

کے منفی اثرات کو دھونا اور اس کے دھبوں کو مٹا کر صاف کرنا اور وہ قلب و بصیرت پیدا کرنا جو قرآن مجید کا مقصود ہے ایک بہت بڑے چیلنج کے طور پر ہم سب کے سامنے ہے۔

افسوس کہ اس وقت کہیں بھی کوئی مثالی اسلامی معاشرہ موجود نہیں۔ اس وقت ہم کسی مثالی مسلم معاشرہ میں نہیں رہتے۔ ہمارا معاشرہ بعض اعتبار سے مسلم معاشرہ نہیں رہا، اگرچہ بعض اعتبار سے یہ اب بھی ایک مسلم معاشرہ ہے۔ لیکن بعض اعتبار سے ہمارے اس معاشرہ میں بہت سی خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ غیر اسلامی قوتوں نے ہمارے معاشرہ، ہماری ثقافتی زندگی، حتیٰ کہ ہماری عائلی زندگی میں اس طرح مداخلت کر لی ہے کہ جگہ جگہ نہ صرف بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، بلکہ کئی جگہ فکری، ثقافتی اور تمدنی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اس خلا کو پر کرنا اور ایک مکمل، متکامل اور متناسق اسلامی نقطۂ نظر کی تشکیل کرنا ہم سب کا مشترکہ فریضہ ہے۔ مغربی افکار اور نظریات کے منفی حملہ کا سدباب صرف اسی وقت کیا جاسکے گا جب ایک مکمل، متکامل اور متناسق اسلامی متبادل پیش کر دیا جائے گا۔ متبادل اسلامی فکر کی عدم موجودگی میں محض مواعظ اور تقریروں سے اس سیلاب کے آگے بند نہیں باندھا جاسکتا۔

یہ گفتگو اور یہ بحث اس درس قرآن کا ایک لازمی عنصر ہونی چاہیے، جس کے مخاطبین مغربی تعلیم یافتہ لوگ ہوں۔ پھر یہ بھی یاد رکھیے کہ جس انسان کی جو فکری سطح ہوتی ہے اسی سطح کے لحاظ سے اس کی فکری الجھن بھی ہوتی ہے۔ اس طرح کی ہر فکری الجھن کا حل قرآن پاک میں موجود ہے۔ کوئی فکری الجھن انسان کی ایسی نہیں ہے چاہے، وہ کسی سطح کی ہو، جس کا حل قرآن پاک میں موجود نہ ہو۔ لیکن جیسے ایک ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے پیغام کو آپ کا ٹرانسسٹر اس وقت تک گرفت میں نہیں لاسکتا جب تک وہ اسی سطح (فریکونسی) پر کام نہ کر رہا ہو جس سطح پر پیغام کی لہریں نشر کی جاری ہیں۔ جو تعلق آپ میں اور آپ کے مخاطب میں ہے یہ وہی تعلق ہے جو ریڈیو اسٹیشن اور آپ کے ٹرانسسٹر میں ہے۔ آپ کے پاس قرآن مجید کا علم موجود ہے۔ آپ اس کو ریڈیو اسٹیشن سمجھ لیجے۔ آپ کا جو مخاطب ہے، وہ گویا ریڈیو سیٹ ہے۔ جب تک دونوں کی برقی لہر ایک نہیں ہوگی اس وقت تک وہ آپ کی طرف سے دی جانے والی اس راہنمائی سے استفادہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے دونوں کا ایک سطح موج **(Wave length)** پر ہونا ضروری ہے۔ دونوں ایک زبان اور ایک اسلوب میں بات کریں گے تو افہام و تفہیم کا مقصد حاصل ہوگا۔ یہی مفہوم ہے

قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ کا جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے: وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه، اللہ تعالیٰ نے جو رسول بھی بھیجا ہے وہ اس قوم کی لسان میں بھیجا۔ لسان میں زبان بھی شامل ہے۔ محاورہ اور ثقافت بھی شامل ہے۔ دلائل اور استدلال کے انداز بھی شامل ہیں۔ ان پر ان شاء اللہ آئندہ دنوں میں گفتگو کریں گے کہ قرآن پاک نے کیا اسلوب اپنایا اور کیسے اپنے مخاطبین کے اسلوب کو اپنی بات پہنچانے کے لیے پیش نظر رکھا۔

۲۔ دوسری اہم بات جو خاص طور پر تعلیم یافتہ سامعین کے لیے پیش نظر رکھنی چاہیے وہ قرآن مجید اور دوسرے علوم وفنون کے مطالعہ میں فرق کو ملحوظ رکھنا ہے۔ جب ہم درس قرآن کا عمل شروع کرتے ہیں، بالخصوص جب وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے لیے ہو اس میں ایک بڑی بنیادی شرط قرآن پاک کی خصوصی نوعیت اور اس کے مطالعہ کی خصوصی اہمیت کا احساس اور شعور ہے۔ ہر اس کاوش میں جس کا مقصد قرآن پاک کی افہام وتفہیم ہو اس میں انسان کی عقلی اور دماغی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی قلبی اور روحانی صلاحیتوں کو بھی پورے طور پر شریک ہونا چاہیے۔ جب تک قاری پورے کا پورا قرآن کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے موتی نہیں رولے گا اس کے ہاتھ حکمت قرآن کا بہت تھوڑا سا ہی حصہ آئے گا۔ یہ وہ فرق ہے جو قرآن مجید کے افہام وتفہیم کو دوسری ہر قسم کی علمی کاوش سے ممیز کرتا ہے۔

آپ فلسفے کی طالبہ ہوں، یا اکنامکس کی، سائنس کی طالبہ ہوں، یا ٹیکنالوجی کی۔ ان میں سے ہر علمی سرگرمی کا خالص علمی یا عقلی مقصد ہوسکتا ہے۔ یعنی علمی سرگرمی بذات خود مطلوب ہوتی ہے۔ قرآن پاک کا مطالعہ اس طرح کی مجرد علمی سرگرمی نہیں ہے۔ یہ کوئی علمی چاٹ یا علمی چٹنی نہیں ہے جسے انسان کبھی کبھار مزے یا چٹخارے کی خاطر پڑھ لیا کرے، جیسے وہ ادب پڑھتا ہے۔ مثلاً دیوان غالب کا مطالعہ کرتا ہے۔ نعوذ باللہ قرآن مجید اس قسم کی کتاب نہیں ہے۔ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کی فہم کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ یقیناً اس کے مطالعہ اور فہم کے لیے فکر بھی ضروری ہے، عقل بھی درکار ہے اور غور وخوض کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ درکار ہے۔ اگر یہ محض عقلی سرگرمی ہوتی، یا محض کوئی ایسی علمی سرگرمی ہوتی، جیسی عام تعلیمی اداروں میں ہوتی ہے تو پھر قرآن مجید اپنے بارہ میں یہ نہ کہتا کہ یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے سے بہت سے لوگوں کو گمراہی کے راستے پر

ڈال دیتا ہے، جبکہ بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعہ سے ہدایت عطا فرماتا ہے۔ گمراہی کے راستہ پر ہمیشہ وہ لوگ پڑتے ہیں جو اسے کسب فیض کے لیے نہیں بلکہ کسی مادی مفاد یا محض علمی مشغلہ کے لیے پڑھتے ہیں۔ اور جن کی نظر میں دیوان غالب اور قرآن مجید نعوذ باللہ برابر ہیں، کہ اپنی دلچسپی کی خاطر کبھی کوئی کتاب اٹھا کر پڑھتا ہے اور کبھی کوئی۔

اگر قرآن مجید کو اسی انداز سے پڑھا گیا تو گمراہی کا راستہ ہی کھلے گا۔ ہدایت کا راستہ کھلنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والا ایک قلبی اور روحانی تعلق قرآن مجید کے ساتھ قائم کرے۔ اور جب تک قاری اس گہرے تعلق کے ساتھ قرآن مجید کی طرف رجوع نہیں کرے گا، اور جب تک پورے عزم اور ارادہ کی گہرائی کے ساتھ کتاب اللہ سے ربط نہیں کرے گا کہ اسے اللہ تعالیٰ کے کلام کو سمجھنا ہے اور سمجھنے کے بعد اس پر عمل کرنا ہے۔ اس وقت تک قرآن مجید اپنے دروازے کسی پر وانہیں کرتا۔ غالباً یہی وہ چیز ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے اشارہ کیا ہے۔ اس شعر میں جو ابھی تعارفی کلمات میں آپ نے سنا ہے:۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحب کشافؔ

اس کا قصہ یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے والد ایک بزرگ اور صوفی مزاج شخص تھے، ان کے بارے میں علامہؒ نے لکھا ہے کہ نوجوانی کے زمانے میں میرا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ ایک روز تلاوت میں مشغول تھا کہ میرے والد برابر سے گذرے اور فرمانے لگے کہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہوں۔ وہ یہ سن کر خاموش ہو کر چلے گئے۔ اگلے روز پھر ایسا ہی ہوا کہ میں تلاوت کر رہا تھا تو گزرتے ہوئے پوچھا کیا کر رہے ہو؟ میں نے پھر وہی جواب دیا کہ جی تلاوت کر رہا ہوں۔ اس طرح کئی دن تک پوچھتے رہے۔ آخر ایک دن اقبال نے عرض کیا کہ آپ روزانہ پوچھتے ہیں، جبکہ آپ خود دیکھتے ہیں کہ میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہوں۔ انہوں نے فرمایا: دیکھو جب تم کلام پاک پڑھا کرو تو اس شعور اور احساس کے ساتھ پڑھا کرو کہ اللہ تعالیٰ خود براہ راست تم ہی سے ہم کلام اور تم ہی سے مخاطب ہے۔ جب تم یہ سمجھ کر پڑھو گے تو اس تلاوت قرآن کا جو اثر پیدا ہوگا، وہ عام مطالعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔

بس یہی فرق ہے قرآن پاک کے مطالعہ میں اور ایک عام کتاب کے مطالعہ میں۔ کوئی عام کتاب جو اعلیٰ سے اعلیٰ انداز کی ہو اور اونچی سے اونچی سطح کی ہو، اس میں اللہ تعالیٰ آپ سے مخاطب نہیں ہوتا۔ جب قرآن مجید کا مطالعہ یہ سوچ کر کریں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو میرے ہی لیے اتارا ہے اور مجھے ہی اس میں خطاب کیا ہے تو پھر خود بخود اس کا اثر دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جائے گا۔ یہ کیفیت صرف اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب قرآن مجید کے کتاب ہدایت ہونے پر کامل ایمان ہو، بلکہ یہ چیز ایمان کامل بھی پیدا کرتی ہے۔ جتنا روحانی تعلق کے ساتھ اور قلب کی گہرائی کے ساتھ پڑھنے والا اس کو پڑھے گا اتنا ہی اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اور جتنا ایمان پختہ ہوتا چلا جائے گا اتنی ہی اس کتاب سے اس کا وجود، اس کی فکر، اس کا نظریہ، غرض ہر چیز کی قلبی وابستگی بڑھتی چلی جائے گی، اور روحانی طور پر اس کا وجود، قرآن مجید سے ہم آہنگ ہوتا چلا جائے گا۔

تیسری شرط جو لازمی ہے وہ یہ کہ درس قرآن کے ذریعہ سے قرآن مجید کی عظمت کا احساس پیدا کیا جائے۔ جب تک قرآن کے قاری کے دل میں اس کتاب کی عظمت کا احساس پیدا نہیں ہوگا، اس وقت تک قاری نہ اس کتاب کے رنگ میں رنگا جا سکتا ہے، نہ اس کتاب کے سانچے میں ڈھل سکتا ہے۔ قرآن مجید کی عظمت کے احساس کے لیے وہ آیات کافی ہیں جو ابھی ہماری بہن نے تلاوت کی ہیں کہ اگر اس کتاب کو پہاڑ پر اتارا جاتا تو تم دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کی خشیت سے وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ اس آیت مبارکہ سے کیا مراد ہے، عظمت قرآن کا مطلب کیا ہے، اس کا ایک ابتدائی اور سرسری اندازہ کرنے کے لیے کل یا پرسوں اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔ لیکن اس آیت سے قرآن مجید کی عظمت کا عمومی اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ یہ کتنی عظیم الشان کتاب ہے۔ شرط یہی ہے کہ پوری پوری کوشش اور پختہ ارادے اور عزم کے ساتھ کتاب الٰہی سے رجوع کیا جائے تو پھر دیکھیے اس کتاب کے دروازے اور کھڑکیاں کس طرح ایک ایک کر کے کھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔

آخری چیز یہ کہ جتنے وسائل بھی ہمیں حاصل ہیں ان سب کو قرآن مجید کے سمجھنے اور اس کا عمیق فہم حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ جو وسائل ہمیں دستیاب ہیں ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے دو تو اللہ تعالیٰ نے خود ہمارے اندر رکھ دیے ہیں۔ ایک تو یہ

ظاہری حواس خمسہ ہیں جو قرآن پاک کو سمجھنے اور یاد کرنے کے کام آتے ہیں۔ان پانچ میں سے دو یعنی قوت سامعہ اور قوت باصرہ کا حفظ قرآن اور فہم قرآن سے خصوصی رشتہ ہے۔ان میں بھی قوت سامعہ زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔یہ بات یاد رکھیے گا کہ انسان کے پاس سماعت کی حس سب سے تیز ہوتی ہے۔چیزوں کو یاد رکھنے میں یہی حس سب سے زیادہ اس کے کام آتی ہے۔سن کر جو چیز یاد ہوتی ہے وہ بہ نسبت پڑھ کر یاد کرنے کے زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔اس لیے قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے اور حفظ کرنے میں قوت سماعت سے زیادہ کام لینا چاہیے۔آج کل تو ریکارڈنگ کا ذریعہ بہت آسان اور ہر جگہ دستیاب ہو گیا ہے۔ایک چیز کو پانچ دس مرتبہ سن لیں تو وہ آپ کو پچھتر فیصد یاد ہو جائے گی۔یا کم از کم اس کے اہم مندرجات ضرور یاد ہو جائیں گے۔اس کے برعکس اگر دس مرتبہ خود پڑھیں گے جب بھی وہ چیز اتنی یاد نہیں ہوگی جتنی چار پانچ مرتبہ سن کر یاد ہو جائے گی۔

یہ تو ظاہری حواس ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہی ہمیں عطا فرمائے ہیں۔علاوہ ازیں پانچ حواس باطنی بھی مرحمت فرمائے ہیں۔انسان کی یادداشت ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے، وجدان اور حس مشترک وغیرہ ہیں۔یہ باطنی حواس ہیں جن سے کام لے کر ظاہری حواس سے حاصل کیے ہوئے علم کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔یہ تمام وسائل دنیا کے ہر انسان کو میسر ہیں۔وسائل کی تیسری قسم مادی وسائل کی ہے۔جو بقدر ضرورت ہر انسان کو ملتی ہے۔جس کے پاس جتنے وسائل موجود ہیں ان کو اس راہ میں استعمال کرنے کا وہ اتنا ہی مکلف ہے۔درس قرآن میں بھی اور تدریس قرآن میں بھی، مطالعہ قرآن میں بھی اور تعلیم قرآن میں بھی۔

لیکن جب تک ذوق طلب نہ پیدا ہو انسان ان تمام وسائل کو استعمال کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔بعض اوقات آپ نے دیکھا ہوگا کہ سننے والی آپ کے درس میں بیٹھی ہے۔بظاہر اس کی نگاہیں آپ کے اوپر ہیں، لیکن اس کے کان کہیں اور ہیں، اس کا جسم تو یہاں ہے، لیکن اس کا دماغ کسی دوسری جگہ مصروف عمل ہے۔پورا درس سننے کے بعد بھی اس کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ کہنے والے نے کیا کہا ہے اور سننے والوں نے کیا سنا ہے۔اس لیے کہ وہاں ذوق طلب نہیں تھا۔اگر ذوق طلب ہو تو تمام حواس خمسہ ظاہری اور حواس خمسہ باطنی ایک جگہ مجتمع ہو کر ایک ہی نشست میں انسان کو وہ کچھ سکھا دیتے ہیں جو دوسری صورت میں دس نشستوں میں بھی نہیں سیکھا جا سکتا۔اس کے لیے ذوق طلب کی ضرورت ہے، ہر مسلمان کے پاس ذوق طلب ہونا بے حد ضروری ہے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا:۔

صاحب قرآن و بے ذوق طلب

العجب ثم العجب ثم العجب

یہ بات کتنی عجیب ہے کہ قرآن مجید کا طالبعلم ہو اور اس میں ذوق طلب نہ ہو۔

آخر میں مختصر طور پر ایک اور چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ قرآن مجید کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ وحی الٰہی کیا ہے؟ اس کی نوعیت اور ماخذ کیا ہے؟ یہ انتہائی اہم سوالات ہیں۔ فی الحال مختصر طور پر اتنا سمجھ لیں وحی الٰہی سب سے قطعی، سب سے مکمل، سب سے سچے اور سب سے دیر پا علم کا ماخذ ہے۔ لیکن خود وحی الٰہی کیا ہے، اس پر خدا بیزار مفکرین بہت سے شبہات اور اعتراضات پیش کرتے ہیں۔ ہم وحی الٰہی کو کس طرح سمجھیں اور بیان کریں؟ اور ان اعتراضات کی فضا میں ہم کیسے اپنے دل کو مطمئن کریں؟ یہ گفتگو ذرا طویل ہوگی۔ اس پر ان شاءاللہ کل گفتگو کریں گے۔ کل کی گفتگو کا موضوع ہوگا قرآن مجید کا ایک عمومی تعارف، یعنی قرآن مجید کیا ہے اور اس کے عمومی تعارف کی ضرورت کیوں ہے؟ اس پر بھی کل بات کریں گے اور چونکہ وحی الٰہی قرآن پاک کا ماخذ ہے اس لیے تھوڑی سی گفتگو وحی پر بھی کرنا ضروری ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سوال و جواب

سوال: آپ نے فرمایا کہ الھدیٰ کے بارے میں بہت سے علماء کو تحفظات ہیں! اس کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟

جواب: دراصل میں کوئی مخصوص نام نہیں لینا چاہتا تھا۔ میری جو بہنیں الھدیٰ سے وابستہ ہیں اور دین کا کام کر رہی ہیں میں ان کے لیے ہر وقت دعا کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی کاوش کو قبول فرمائے۔ میرا تعلق ان کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر رہتا ہے۔ دراصل کچھ علماء کرام کی تحریریں میں نے پڑھیں جو میرے لیے انتہائی احترام کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے الھدیٰ کے پروگراموں کے بارہ میں کچھ منفی خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سے کم از کم ایک نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا ہے۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ اگر اس قسم کی کوئی چیز آپ کے سامنے آئے تو آپ اس کو نظر انداز کر دیجیے۔ نیک کام کے اپنے اثرات اور برکات ہوتے ہیں۔ اثرات و برکات کو دیکھنے کے بعد لوگوں کے اعتراضات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

بعض علماء کرام کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ ان کا یہ کہنا ہے کہ تدریس قرآن کے لیے پہلے مدرسہ کا دس سالہ نصاب مکمل کرنا بے حد ضروری ہے، اس کے بعد ہی تدریس قرآن میں مصروف ہونا چاہیے۔ ان حضرات کی رائے میں چوں کہ جدید تعلیم یافتہ اور نو آموز لوگوں کی بنیاد اس دس سالہ نصاب کے بغیر پختہ نہیں ہوتی، جو فہم قرآن لیے ناگزیر ہے، اس لیے عام لوگوں میں اس طرح درس قرآن کے حلقے منظم کرنا درست نہیں ہے۔ میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید کو نہ کسی بنیاد کی ضرورت ہے، نہ بیساکھیوں کی۔ قرآن مجید بنیاد بھی فراہم کرتا ہے، دیواریں بھی فراہم کرتا ہے اور تعلیم کی تکمیل بھی کر دیتا ہے۔

قرآن مجید خود اپنی جگہ ایک مکمل کتاب ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ باقی علوم قرآن مجید کے محتاج ہیں۔ اس لیے مجھے اس دلیل سے اتفاق نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ آپ سے کہیں کہ آپ نے فقہ اور اصول فقہ کا علم حاصل نہیں کیا، یا آپ نے علم الکلام نہیں پڑھا۔ اس لیے آپ کو درس قرآن کی ذمہ داری نہیں اٹھانی چاہیے۔ میرا ناچیز کا مشورہ یہی ہے کہ آپ اس وسوسہ میں نہ پڑیں اور اپنا کام جاری رکھیں۔ میں خود فقہ کا طالب علم ہوں۔ فقہی موضوعات پر ہی پڑھتا پڑھاتا ہوں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قرآن فہمی فقہ کی محتاج نہیں۔ یہ تمام علوم قرآن پاک کے محتاج ہیں، قرآن ان میں سے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس لیے آپ کسی کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھیں۔

سوال: لوگوں کو قرآن مجید کے قریب کس طرح لایا جائے؟

جواب: ہر شخص کے فکری پس منظر کو دیکھ کر اس کے ساتھ الگ معاملہ کرنا پڑے گا۔ کچھ لوگ منطقی اور فلسفیانہ انداز پسند کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کسی اور انداز کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن ایک چیز ضرور ہے کہ کوئی انسان تھوڑا سا بھی قرآن مجید کے قریب آ جائے تو اس کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہمارا کام صرف قریب لانا ہے، ہدایت دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔ قریب لانے کے لیے مخاطب کے مزاج اور افتادِ طبع کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی سائنس کا طالب علم ہے تو اسے موریس بکائی کی کتاب پڑھنے کے لیے دیجیے۔ بڑی اچھی کتاب ہے۔

موریس بکائی فرانس کے نومسلم عالم ہیں، پیشہ کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ ایک زمانہ میں فرانس کی میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ وہ شاہ فیصل مرحوم کے ذاتی معالج تھے۔ میری ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ انہوں نے خود مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ انہیں ایک مرتبہ شاہ

فیصل کا طبی معائنہ کرنے کے لیے پیرس سے بلایا گیا۔ وہ ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ اس دوران میں انہوں نے وہاں قرآن پاک کا ایک نسخہ رکھا ہوا دیکھا۔ سرسری ورق گردانی کی تو پتہ چلا کہ قرآن مجید میں کچھ بیانات سائنسی نوعیت کے بھی ہیں۔ انہوں نے وہ تمام بیانات اپنے پاس نوٹ کر لیے۔ اس وقت ان کا کوئی ارادہ اسلام قبول کرنے کا نہ تھا۔ پھر جب وہ پیرس واپس گئے تو انہوں نے بائبل سے بھی اس قسم کے تمام بیانات نوٹ کر لیے جو سائنسی نوعیت کے تھے۔ بعد ازاں ان سب بیانات کا تقابلی مطالعہ کیا تو دیکھا کہ قرآن مجید کے تمام بیانات سو فیصد درست تھے اور بائبل کے تمام بیانات سو فیصد غلط۔ یوں ان کو اسلام اور قرآن سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ انہوں نے اسلام کا مطالعہ جاری رکھا۔ بالآخر انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس دوران میں انہوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی "بائبل، قرآن اور سائنس" آپ ان کی یہ کتاب کسی سائنس کے طالب علم کو پڑھنے کے لیے دے سکتی ہیں۔

اگر کوئی ادب کا طالب علم ہو تو اس قرآن مجید کے ادبی محاسن کی کوئی کتاب دیجیے۔ مثلاً سید قطبؒ کی کتاب ہے "مشاہد القیامہ فی القران" اس کو پڑھ کر قرآن مجید کی ادبی عظمت کا اعتراف ہوگا۔ علامہ اقبالؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن مجید کے لغوی اور معنوی حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بشرطیکہ ایک مرتبہ وہ اس کے دائرے میں آ جائے۔

ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، ہمارے اور آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ لیکن کسی بھی شخص کو جب آپ قرآن کے قریب آنے کی دعوت دیں تو ترجمہ اور تفسیر اس کے ذہنی معیار، مزاج اور اس کے علمی ذوق کو سامنے کر دیں۔ ترجمہ اور تفسیر ہر انداز کی موجود ہے۔ ہماری اردو زبان میں قرآن مجید کے سینکڑوں تراجم اور تفاسیر موجود ہیں۔ اگر کسی نے مغربی افکار اور نظریات کا گہرا مطالعہ کیا ہو تو آپ اسے مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر پڑھنے کا مشورہ دیں جو ایک جلد میں ہے، لیکن بڑی غیر معمولی اور عمدہ تفسیر ہے۔ اگر کوئی شخص تقابل ادیان میں دلچسپی رکھتا ہے تو ایک تفسیر حقانی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر کے ایک بزرگ تھے مولانا عبدالحق حقانی، یہ ان کی تفسیر ہے۔ اگر کوئی انگریزی ادب کا دلدادہ ہے اور مغرب کی نفسیات کا طالب علم ہے تو پھر آپ اسے عبداللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ اور تفسیر دیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پہلے آدمی کا ذوق اور مزاج دیکھ لیں اور اس کے مطابق اسے پڑھنے کے لیے کتابیں دیں۔ اگر اس کے دل میں ہدایت کا بیج ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے تو یقیناً اسے ہدایت حاصل ہوگی۔

خطبہ دوم

قرآن مجید

ایک عمومی تعارف

۱۸ اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن مجید کا ایک عمومی تعارف اس لیے ضروری ہے کہ ہم میں سے اکثر نے قرآن مجید جزوی طور پر تو بار ہا پڑھا ہوتا ہے، تراجم اور تفاسیر دیکھنے کا موقعہ بھی ملتا ہے، لیکن ہم میں سے بہت سے لوگوں کو یہ موقع بہت کم ملتا ہے کہ قرآن مجید پر بہ حیثیت مجموعی عمومی انداز سے غور کیا جائے، اور پوری کتاب الٰہی کو ایک متحد الموضوع کتاب سمجھ کر اس پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے۔ یوں ہم میں سے اکثر کو ایک طویل عرصہ یہ سمجھنے میں لگ جاتا ہے کہ اس کتاب کا بنیادی موضوع اور ہدف کیا ہے۔ اس کے اہم اور بنیادی مضامین کیا ہیں، اس کی ترتیب اور اندرونی نظم کیا ہے، یہ کتاب دوسری آسمانی کتابوں سے کس طرح ممیز ہے؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے ضروری سوالات کا جواب ایک عرصہ دراز کے بعد کہیں جا کر ملتا ہے۔ اور وہ بھی کسی کسی کو۔

پھر بعض صورتوں میں یہ عرصہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ اس میں قرآن پاک کے مضامین پر جزوی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ اگر کسی نے تین چار سال کے طویل عرصہ میں پورے قرآن پاک کے ترجمہ اور اور تفسیر کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے تو جب تک وہ مطالعہ مکمل ہوتا ہے اس وقت تک ابتدائی مراحل میں مطالعہ میں آنے والی بہت سی چیزیں نظروں سے اوجھل ہو چکی ہوتی ہیں۔ اور یہ اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ قرآن پاک کی ترتیب بحیثیت مجموعی کیا ہے، اس کی سورتوں کی ترتیب کیا ہے، اس کے اندرونی مضامین کی تشکیل اور ساخت کیا ہے؟ نظم کلام اور عبارت کی اندرونی ڈھانچہ کیا ہے؟۔ یہ سب چیزیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مطالعہ قرآن کے آغاز ہی میں قرآن مجید کے طالب علم کو جہاں کتاب الٰہی کے مضامین سے واقفیت اور اس کے مندرجات سے آشنائی حاصل

ہو وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ قاری کے ذہن میں بحیثیت مجموعی یہ بات مستحضر رہے کہ کتاب الٰہی کے مضامین ومندرجات کی اندرونی ترتیب کیا ہے۔ اس کتاب کے مضامین کا آپس میں ربط کیا ہے۔ ربط اور نظم پر ذرا مفصل گفتگو ایک مستقل خطبہ میں ہوگی، لیکن آج کی نشست میں قرآن مجید کے عمومی تعارف کے سیاق میں نظم قرآن پر بھی عمومی اور تعارفی گفتگو ہوگی۔

قرآن مجید کی بنیاد وحی الٰہی ہے اور یہ بات ہم سب جانتے ہیں۔ لیکن وحی کی تعریف کیا ہے، وحی کی حقیقت کیا ہے، وحی کی نوعیت اور اس کی اقسام کیا ہیں۔ ان پر عموماً درس قرآن کے حلقوں میں گفتگو نہیں ہوتی۔ اور اس موضوع سے متعلق بہت سے ضروری اور اہم سوالات لوگوں کے ذہنوں میں باقی رہتے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے میں اسی موضوع پر چند اہم اور ضروری گذارشات پیش کرتا ہوں۔

یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی مختلف شکلوں میں اور مختلف انداز میں نازل ہوتی تھی۔ وحی کا ایک حصہ وہ ہے جو قرآن مجید میں محفوظ ہے، اور ایک حصہ وہ ہے جو سنت اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے، اور ایک حصہ وہ ہے جس کا ذکر سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وحی کی کتنی اقسام ہیں اور قرآن مجید کا تعلق وحی کی کس قسم سے ہے۔ قرآن مجید کی تعریف علمائے اصول نے جو کی ہے سب سے پہلے وہ میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں۔

> القران هو كلام الله المنزل على محمد ﷺ المعجز بسورة منه، المتعبد بتلاوته، المكتوب في الصاحف، المنقول الينا، بين دفتي المصحف نقلا متواترا۔
>
> یعنی قرآن مجید سے مراد ہے الکلام المنزل، اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نازل ہوا ہے جس کی ایک ایک سورت اپنی جگہ ایک معجزہ ہے،، وہ جس کی تلاوت کی جائے تو عبادت سمجھی جائے گی جو نسخوں میں لکھا ہوا ہمارے پاس موجود ہے، اور ایک تواتر کے ساتھ صحابہ کرام سے لے کر آج تک مصاحف کی شکل میں نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔

اس کو قرآن مجید کہتے ہیں۔ اس تعریف کی تفصیلات پر انشاء اللہ آگے چل کر گفتگو ہوگی۔

اس تعریف میں آپ نے دیکھا کہ قرآن مجید کا ابتدائی تعارف ہی کلام منزل سے کرایا گیا ہے، یعنی وہ کلام جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے جانے کا ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کا مصدر اور ماخذ وحی الٰہی ہے۔ وحی کسے کہتے ہیں؟ قرآن مجید کا نزول وحی کی کون سی شکل سے ہوا ہے۔ یہ آج کی ابتدائی اور تمہیدی گذارشات کا موضوع ہے۔

وحی کے لفظی معنی کلام عرب میں خفی اور سریع اشارہ کے آتے ہیں، یعنی خاموشی کے ساتھ کسی کو جلدی سے اس طرح کوئی اشارہ کر دینا کہ وہ اشارہ کرنے والے کا پورا پیغام اور مطلب سمجھ لے۔ اس لطیف ابلاغ کو عربی زبان میں وحی کہتے ہیں۔ اصحاب لغت کے الفاظ میں: الاشارة السريعة بلطف۔ یعنی جلدی سے لطیف انداز میں کوئی ایسا اشارہ کر دیا جائے کہ سمجھنے والا مطلب سمجھ لے۔ لغت میں وحی کا لفظ جس مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس کی مثالیں کلام عرب میں کثرت سے ملتی ہیں۔ یہی لفظ اپنے لغوی مفہوم میں کلام پاک میں بھی کئی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ واوحى ربك الى النحل۔ تمہارے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: وا حينا الى ام موسى ان ارضعيه، ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں فوراً یہ بات ڈال دی کہ بچے کو دودھ پلانا شروع کر دو۔ یہ اور اس طرح کی کئی دوسری آیات میں وحی کا لفظ لغوی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اصطلاحی مفہوم میں وحی سے مراد وہ پیغام ہے جو اللہ رب العزت کی طرف سے براہ راست یا اللہ تعالیٰ کے فرشتے کی وساطت سے انبیاء علیہم السلام کے قلب مبارک پر القا ہوتا ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس پیغام کو وہ دوسرے انسانوں تک پہنچا دیں۔

وحی تین بنیادی عناصر سے عبارت ہے۔ سب پہلی چیز تو یہ ہے کہ وحی ایک ایسا ذریعہ علم ہے جو براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اور جس ذریعہ سے آتا ہے وہ عام انسانوں کو میسر نہیں، وہ ذریعہ صرف اور صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے۔ گویا یہ وہ ذریعہ علم ہے جو ایک مابعد الطبیعی نوعیت رکھتا ہے۔ اگر آپ قرآن مجید کے حوالے سے کسی کو اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم بتائیں تو اس کو وحی نہیں کہا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ علم آپ کو انسانی ذرائع سے حاصل ہوا ہے۔ آپ نے اپنے اساتذہ سے یا خود مطالعہ کر کے حاصل کیا ہے۔ یہ ذریعہ دوسرے انسانوں کو بھی

حاصل ہے۔لہٰذا آپ کا یہ علم وحی نہیں ہے۔وحی سے مراد وہ ذریعہ علم ہے جو مابعد الطبیعی ہو اور دوسرے انسانوں کو حاصل نہ ہو۔وہ صرف نبی کو حاصل ہوتا ہے۔

دوسری بنیادی چیز وحی کی حقیقت میں یہ ہے کہ وہ یقینی اور قطعی ہوتی ہے۔اس کا یقین اور اس کی قطعیت دنیا کی ہر قطعی اور یقینی چیز سے بڑھ کر اور ہر قسم کے شک اور ظن وتخمین سے ماوراء ہے۔قطعیت اور یقین وحی الٰہی کے بنیادی عناصر اور خصائص میں سے ہے اور اس کی ماہیت اور حقیقت میں شامل ہے۔قطعیت پر زور اور اس کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ وحی کو دوسرے ذرائع علم سے ممیز کیا جاسکے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے عام انسانوں کے دل میں بھی کوئی بات ڈال دی جاتی ہے۔ جسے القاء کہتے ہیں۔ آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ کبھی درس قران دیتے وقت یا پڑھاتے وقت کوئی طالب علم آپ سے سوال کرتا ہے۔اور آپ کو پہلے سے اس کا جواب معلوم نہیں ہوتا۔لیکن اچانک' طالب علم کے سوال کرتے ہی آپ کے دل میں جواب آ جاتا ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈال دیا ہے۔یہ القاء ہے۔لیکن یہ قطعی اور یقینی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں نہ ڈالی ہو، بلکہ آپ ہی کے نفس نے آپ کو سمجھا دی ہو اور غلط ہو۔اور یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ بات واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور صحیح ہو۔ اس فرق کا پتہ نصوص سے چلے گا کہ کون سا القاء صحیح اور من جانب اللہ ہے، اور کون سی بات نفس کی سرگوشی اور وہم ہے۔ جو چیز قرآن پاک اور سنت ثابتہ کے مطابق ہے وہ القاء ہے اور من جانب اللہ ہے۔ اور اگر قرآن مجید، سنت ثابتہ اور عقل سے متعارض ہے تو محض وسوسہ اور وہم ہے اور ناقابل قبول ہے۔اس کے برعکس وحی الٰہی ہمیشہ قطعی اور یقینی ہوتی ہے۔وحی الٰہی خود میزان ہے جس میں تول کر دوسری چیزوں کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔خود وحی الٰہی کو کسی خارجی میزان کی ضرورت نہیں۔

تیسرا بنیادی عنصر جو وحی کی حقیقت میں شامل ہے وہ یہ ہے کہ وحی اپنے وصول کرنے والے کے لیے اور دوسرے انسانوں کے لیے واجب التعمیل ہوتی ہے۔نزول وحی کے بعد کسی انسان کے پاس یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔وحی کے احکام اور ہدایات پر عمل کرنا لازمی ہے۔القاء میں اختیار ہوتا ہے۔آپ چاہیں تو اس پر عمل کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔

یہ تین بنیادی عناصر ہیں جن سے وحی کی حقیقت مکمل ہوتی ہے۔ وحی ایک ایسا تجربہ ہے جو انتہائی غیر معمولی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ اتنا غیر معمولی کہ اس کو انسانی الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تجربہ سارے انسانی تجربات سے الگ اپنی ہی نوعیت کا ایک منفرد تجربہ ہے۔ یہ تمام مادی تحدیدات اور انسانی وسائل سے ماوراء ایک حقیقت ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کے نزول کا سلسلہ شروع ہوا تو دوسری یا تیسری وحی کے دوران میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس بات سے پیشگی آگاہ کردیا کہ انا سنلقی علیك قولاً ثقیلا، ہم آپ پر بہت ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ یہ ثقل قول، یہ بھاری پن کئی پہلوؤں سے ہے۔ ایک تو عملاً وحی کی تلقی اور وصولی ایک انتہائی مشکل اور دشوار عمل ہے۔ یعنی رسول اللہؐ کلام الٰہی کو جس طرح وصول کرتے تھے وہ انتہائی غیر معمولی اور انتہائی مشکل تجربہ ہوتا تھا۔ نزول وحی کے پہلے واقعہ یا تجربے کے بارے میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر آکر حضرت خدیجۃؓ الکبری سے فرمایا تھا: لقد خشیت علی نفسی، یعنی مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ آپؐ نے اس تجربے کو اتنے غیر معمولی طریقے سے محسوس فرمایا اور اس سے وہ غیر معمولی جسمانی بوجھ محسوس ہوا کہ آپؐ نے اس کو جان کے خطرے سے تعبیر فرمایا۔ پھر جب آپ گھر تشریف لائے تو فرمایا زملونی، زملونی، دثرونی دثرونی۔

جن صحابہ کرامؓ کے سامنے اور جن کی موجودگی میں یہ تجربہ پیش آتا تھا ان کو یہ اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک، روح مبارکہ اور جسم مبارک پر کیا گزر رہی ہے اور آپ کا قلب وروح کس کیفیت سے گذر رہے ہیں۔ لیکن بعض لوگوں نے ان کیفیات کا تھوڑا سا اندازہ ضرور کیا ہے جو آپؐ کے قلب وروح اور ذہن اور جسم مبارک پر نزول وحی کے وقت گزرتی تھیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتبان وحی میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں ایک مرتبہ ایک محفل میں وہ آپؐ کے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ کا گھٹنا ان کے گھٹنے کے اوپر تھا۔ جب لوگ فرشی نشست پر قریب قریب بیٹھتے ہیں تو اکثر ایسا ہوجاتا ہے کہ ایک کا گھٹنا دوسرے کے گھٹنے کے اوپر آجائے۔ اس موقع پر آپؐ کے اوپر اچانک نزول وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔ زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے احد پہاڑ جیسا بوجھ لاکر میرے گھٹنے پر رکھ دیا ہے اور ابھی میرا گھٹنا چورا چورا ہوجائے گا۔ تاہم یہ کیفیت صرف چند لمحے جاری رہی، اور جوں ہی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سے یہ کیفیت ختم ہوئی تو ان کے گھٹنے پر سے یہ بوجھ بھی فوراً ختم ہو گیا۔ اس لمحہ آپؐ نے فرمایا کہ سورۃ نساء کی آیت مبارکہ: لا یستوی القاعدون من المومنین کے بعد غیر اولی الضرر کا اضافہ کرو۔ یہ صرف ایک لفظ تھا غیر اولی الضرر، جس کے حصول اور تلقی میں آپؐ پر یہ کیفیت طاری ہوئی۔

ایسا ہی ایک اور مشاہدہ بعض دوسرے صحابہ کرام کا بھی ہے۔ آپؐ عموماً جس اونٹنی پر سفر فرماتے تھے۔ اس کا نام قصواء تھا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ وہ عرب کی طاقتور اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی تھی۔ آپؐ نے اس پر ہجرت کا سفر بھی فرمایا تھا۔ اسی پر آپؐ فتح مکہ کی مہم پر روانہ ہوئے۔ لیکن ابھی شہر مکہ میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپؐ کا قافلہ رک گیا اور آپؐ کی اونٹنی جس پر آپؐ سوار تھے اچانک رک کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں اس طرح لرز رہی ہیں جیسے اس کے اوپر کوئی بہت بڑا بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ وہ اس بوجھ کو برداشت نہیں کر سکی اور فوراً ہی بیٹھ گئی۔ لیکن بیٹھ کر بھی اس طرح ہانپتی رہی کہ جیسے ایک بہت بڑے بوجھ تلے دب گئی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی یہ کیفیت ختم ہو گئی، اور وہ کھڑی ہو گئی اور کھڑے ہو کر چلنے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبان وحی کو یاد فرمایا جو اس وقت ہمراہی میں تھے اور یہ آیت لکھنے کا حکم فرمایا: وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقاً۔

ان دو مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تلقی وحی کا تجربہ جہاں اور کئی اعتبار سے بڑا بھاری تجربہ تھا۔ وہاں اس میں ایک اہم پہلو جسمانی بھاری پن کا بھی تھا۔ جسمانی بھاری پن سے کہیں بڑھ کر ذمہ داری کے اعتبار سے یہ ایک بہت بھاری کلام تھا۔ احکام کی تبلیغ اور ان پر عملدرآمد کے اعتبار سے یہ ایک بہت بھاری فریضہ تھا۔ جن احکام و ہدایات پر یہ کتاب الٰہی مشتمل تھی ان کو انسانوں تک پہنچانا اور ان احکام کو بالفعل نافذ کرانا ایک بہت ہی بھاری کام تھا۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر پوری انسانیت کی جو ذمہ داری اس کلام کے لانے والے اور منتقل کرنے والے پر تھی اس کا شدید احساس، ان تمام چیزوں نے مل کر اس کو ایسا بھاری کلام بنا دیا تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی دن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیار کر دیا تھا۔

قرآن مجید میں ایک جگہ وحی کے اسالیب کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وحی کس طرح نازل ہوتی تھی۔ ارشاد ربانی ہے: ما كان لبشر ان يكلمه الله الا وحيا او من وراء حجاب.

او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشاء۔ کسی بشر کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے براہ راست کلام فرمائے، سوائے وحی کے، یا پردے کے پیچھے سے یا کسی ایلچی کے ذریعے سے قرآن پاک میں یہ تین طریقے بیان فرمائے گئے ہیں۔ ان کی مزید تفصیلات کتب تفسیر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ انہی تین طریقوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے جو صحیح بخاری کے پہلے باب کی دوسری حدیث ہے۔ باب کا عنوان ہے کیف کان بدء الوحی علی رسول الله صلی الله علیه و سلم۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے نزول کا آغاز کیسے ہوا؟ اس باب میں امام بخاریؒ نے دو احادیث شامل کی ہیں ایک تو مشہور حدیث انما الا عمال بالنیات ہے۔ دوسری حدیث ایک طویل روایت ہے جو عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے۔

وہ کہتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا، احیا نا یاتینی مثل صلصلة الجرس۔ بعض اوقات تو ایک ایسی آواز براہ راست دل اور دماغ میں اترتی ہے جس میں تسلسل ہوتا ہے، کوئی نشیب و فراز نہیں ہوتا، کوئی انقطاع نہیں ہوتا۔ اور وہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بارے میں کہ سب سے سخت تجربہ یہی ہوتا ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ شدید سردی میں بھی میں نے آپ کو دیکھا کہ نزول وحی کے وقت آپؐ کی پیشانی مبارک سے پسینہ اس طرح جاری ہو جاتا تھا جیسے کسی کی فصد کھول دی جائے۔ یعنی جیسے رگ کاٹنے سے خون بہنے لگتا ہے اس طرح پسینہ جاری ہو جاتا تھا۔ اس سے اس بات کی مزید وضاحت ہوتی ہے کہ تلقی وحی کا سخت ترین اسلوب یہی ہوتا تھا۔ دوسرا اسلوب یہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ ہم کلامی ہو اور اس کے نتیجے میں آپ تک پیغام پہنچ جائے، یعنی من وراء حجاب، پردہ کے پیچھے سے۔ اور تیسرا طریقہ وہ جس کا قرآن میں ذکر فرمایا گیا، یعنی بعض اوقات فرشتہ میرے سامنے انسانی شکل میں آتا ہے، پیغام پہنچاتا ہے اور میں اس کو یاد کر لیتا ہوں۔

ان تینوں طریقوں میں سے زیادہ تر نزول وحی پہلے طریقے کے مطابق ہوتا تھا۔ اس کے برعکس وہ وحی جو قرآن پاک میں محفوظ نہیں ہے اور وہ قرآن پاک کا حصہ نہیں ہے، یعنی وحی غیر متلو، جو حدیث مبارک کا حصہ ہے، وہ عموماً دوسرے یا تیسرے طریقے سے منتقل ہوتی تھی۔ لیکن

بعض اوقات قرآن بھی ان دو طریقوں سے آ سکتا تھا۔ براہ راست مکالمہ الٰہی کا شرف بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا۔ یہ سعادت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی کئی بار حاصل ہوئی۔ لیکن جب تورات نازل ہوئی تو وہ ایک ہی مرتبہ یکبارگی نازل ہوئی، نزول تورات کی نوعیت ان تینوں طریقوں سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ سینا پر بلایا گیا اور لکھی ہوئی تختیاں ان کے حوالے کر دی گئیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ تختیاں کسی فرشتے نے حوالے کیں، یا کسی اور طریقے سے جناب کلیم اللہ کے حوالے کی گئیں؟ اس بارے میں قرآن مجید بھی خاموش ہے اور تورات بھی خاموش ہے۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ نزول تورات کی نوعیت کیا تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یکبارگی وہ تختیاں وصول فرمائیں اور لے کر آ گئے اور اللہ تعالیٰ نے جو علم ان تختیوں کے ذریعہ سے عطا فرمایا تھا، اور وہ نور بصیرت جس سے ان کے سینہ کو منور فرمایا تھا وہ انہوں نے لوگوں تک پہنچانا شروع کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بعض مفسرین اور محدثین نے لکھا ہے کہ آپؐ کے اوپر وحی کا نزول چوبیس ہزار مرتبہ ہوا۔ ان چوبیس ہزار مرتبہ کی نوعیت اور کیفیات کے بارے میں بھی علماء اسلام نے بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں اور بہت سی بحثیں بھی کی ہیں۔ تاہم یہ تفصیلات اکثر و بیشتر علمائے کرام کی اپنی بصیرت اور فہم پر مبنی ہیں۔ ان کی صحت اور عدم صحت کے بارہ میں کوئی قطعی اور یقینی بات کہنا مشکل ہے۔ کیا ان تمام چوبیس ہزار مرتبہ کے تجربات میں صرف قرآن مجید کا نزول شامل ہے؟ یا ہدایت اور رہنمائی کے بقیہ امور بھی ان تجربات شامل ہیں؟ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قرآن پاک، احادیث اور ان دونوں کے علاوہ جتنی رہنمائی اللہ بارک وتعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی وہ سب شامل ہے۔ حدیث قدسی اور حدیث رسولؐ دونوں س میں شامل معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ اس کی کوئی صراحت قرآن پاک یا حدیث میں موجود نہیں ہے اس لیے ان تفصیلات کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ تو وحی کی نوعیت اور قطعیت کی بات تھی۔ جہاں تک وحی کی قسموں کا تعلق ہے تو، جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، وحی کی دو اقسام ہیں: ایک وحی تو وہ ہے جو اپنے معانی، الفاظ اور کلام کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور معجزہ ہے۔ اس کو بطور معجزہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور جس کے معجزہ ہونے کا قرآن پاک میں بھی

بار بار ذکر ہے۔

دوسری وحی وہ ہے جو الٰہی الفاظ میں نازل نہیں ہوئی، بلکہ اس کے معنی اور مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کیا گیا۔ پھر اس کو آپؐ نے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا۔ اس دوسری قسم کی وحی کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے صیغہ واحد متکلم میں کلام میں فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک راوی کی حیثیت سے اس کو اپنے الفاظ میں گویا روایت بالمعنی کے طریقہ سے ادا فرمایا۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں خود اللہ تعالیٰ نے صیغہ واحد متکلم میں کلام نہیں فرمایا بلکہ ایک عمومی ہدایت یا راہنمائی عطا فرمائی۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت راوی کی نہیں، بلکہ خود متکلم کی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی ہدایات، تعلیمات اور راہنمائی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں اور اپنی زبان میں بیان فرما دیا۔ پہلی کو حدیث قدسی کہتے ہیں اور دوسری کو حدیث رسول کہا جاتا ہے۔ وحی کی سب سے پہلی قسم کو وحی متلو اور وحی جلی بھی کہتے ہیں۔ اسے وحی ظاہر بھی کہتے ہیں۔ وحی کی دوسری دونوں قسموں کے لیے وحی غیر متلو، وحی خفی اور اس جیسی دوسری اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔

وحی کی بنیادی خصوصیت کے بارہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے ذریعہ سے حاصل ہونے والا علم انتہائی قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وحی علم کا انتہائی قطعی اور یقینی مصدر و ماخذ ہے۔ وحی کے نتیجے میں علم حضوری عطا ہوتا ہے۔ علم حصولی حاصل نہیں۔ حکماء اسلام نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک علم حصولی ہے۔ جو انسان اپنی کاوش سے حاصل کرتا ہے۔ آپ نے درسگاہ سے، استدلال سے، منطق سے، لیبارٹری میں بیٹھ کر، عقلی کاوشوں سے جو علم حاصل کیا ہے یہ علم حصولی ہے، جو اکثر ظنی ہوتا ہے اور کبھی کبھی قطعی بھی ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آج آپ کو اپنا علم استدلالی قطعی معلوم ہوتا ہے، لیکن کچھ دنوں کے بعد مزید تجربہ، مزید مشاہدہ اور مزید غور و فکر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ علم قطعی نہیں تھا، بلکہ اس میں فلاں فلاں کمزوریاں، فلاں فلاں خامیاں اور فلاں فلاں غلطیاں موجود تھیں۔ اس کے برعکس جو علم حضوری ہوتا ہے وہ ہمیشہ قطعی ہوتا ہے، اس کے لیے کسی خارجی یا بیرونی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ایک مریض کے پیٹ میں درد ہے اور وہ درد کی وجہ سے تڑپ رہا ہے، اس کو یقین ہے کہ اس کو درد ہو رہا ہے۔ درد کا یہ علم، علم حضوری ہے جو اس کو حاصل ہے۔ اس علم کے حصول کے

لیے مریض کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کو یہ بتایا جائے کہ درد ہے یا نہیں۔ ایک شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ سورج کیسے کہتے ہیں، وہ سائبیریا میں پیدا ہوا، اس نے کبھی سورج نہیں دیکھا۔ ہمیشہ یہی دیکھتا آیا ہے کہ بادل چھائے رہتے ہیں۔ سنتا ہے کہ سورج نکلتا ہے اور جب نکلتا ہے تو خوب گرمی ہوتی ہے۔ جب تک وہ سائبیریا میں ہے اور برفانی علاقے میں رہتا ہے۔ آپ کو سمجھانے اور دلیل دینے کی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ اس کو دلائل دیں گے اور سمجھائیں گے، جغرافیہ پڑھائیں گے، ان چیزوں سے اسے سورج کے وجود کا علم حصولی حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ اسے کچھ کہے بغیر مئی جون کے مہینہ میں سبی یا جیکب آباد میں لا کر بٹھا دیں تو پھر اسے آفتاب کے وجود کا علم حضوری حاصل ہو جائے گا۔ اب اس کے سامنے آفتاب کا وجود ثابت کرنے کے لیے آپ کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ یہ فرق ہے علم حضوری اور علم حصولی میں۔

وحی کے نتیجے میں جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم قطعی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ علم حضوری ہے۔ علم حضوری یا حصولی، دونوں کے جو مصادر وماٰخذ ہیں۔ وہ کچھ مشترک ہیں اور کچھ الگ الگ ہیں۔ جو مصادر مشترک ہیں وہ انسانی حواس ہیں۔ انسان ان سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ آپ نے ایک چیز دیکھ کر معلوم کر لی، ایک چیز سن کر معلوم کر لی۔ ایک چیز سونگھ کر دیکھ لی، کوئی چیز چکھ کر دیکھ لی۔ یہ علم بالحواس ہے۔ انسان بعض اوقات یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ علم بالحواس یقینی ہوتا ہے۔ حالانکہ ضروری نہیں کہ حواس ظاہری سے حاصل ہونے والا علم ہمیشہ سو فیصد یقینی ہو۔ جس شخص کی آنکھوں کا عدسہ ٹھیک نہ ہو اس کو رنگوں میں دھوکہ ہو سکتا ہے۔ اس کو کوئی رنگ نظر آتا ہے اور آپ کو وہی رنگ کوئی اور نظر آتا ہے۔ ایسی مثالیں بے شمار ہیں کہ حواس کے ذریعے سے حاصل ہونے والا علم ہمیشہ یقینی نہیں ہوتا وہ اکثر و بیشتر ظنی ہی ہوتا ہے۔ کبھی یقینی بھی ہوتا ہے۔

دوسرا وہ علم ہے جو عقل کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے۔ عقلی استدلال کے ذریعے سے حاصل ہونے والے علم کے بارہ میں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خالص قطعی اور یقینی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کا بارہا کا مشاہدہ ہے کہ عقل مند سے عقل مند انسان کی عقل بھی دھوکہ کھا سکتی ہے، لہٰذا عقل کے ذریعے سے حاصل ہونے والا علم بھی بعض اوقات یقینی ہوتا ہے اور بعض اوقات یقینی نہیں ہوتا۔ ایک عام تاثر یہ ہے کہ عقل اور مشاہدہ کے ذریعے سے جو

علم حاصل ہوتا ہے یہ انسانی علم کا بیشتر حصہ ہوتا ہے۔ یہ تاثر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ آپ کو یا کسی انسان کو آج تک جتنا علم بھی حاصل ہوا ہے اس کا بڑا حصہ نہ حواس سے حاصل ہوا ہے اور نہ عقل سے۔

اگر آپ اپنی معلومات کا جائزہ لیں اور ان تمام معلومات اور ذخیرہ علم کی فہرست بنائیں جو آپ کو حاصل ہے، اور پھر ایک ایک معلوم چیز یا حقیقت کا جائزہ لیں کہ یہ علم آپ کو کہاں سے حاصل ہوا تو پتہ چلے گا کہ ان معلومات وحقائق کا اکثر و بیشتر حصہ نہ حواس کے ذریعہ سے آپ کے پاس آیا ہے نہ عقل کے راستہ سے۔ مثال کے طور پر آپ کے علم میں ہے کہ امریکہ نے عراق پر حملہ کیا، آپ جانتے ہیں کہ ہٹلر جرمنی کا حکمران تھا، آپ کے علم میں ہے کہ ٹوکیو جاپان کا دارالحکومت ہے اور سائبیریا میں بارہ مہینے برف باری رہتی ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ امام ابو حنیفہؒ بہت بڑے فقیہ تھے، امام بخاریؒ بہت بڑے محدث تھے۔ لیکن کیا ان میں سے کوئی ایک چیز بھی آپ نے اپنے حواس سے معلوم کی ہے؟ آپ نے امریکہ کو حملہ کرتے دیکھا؟ آپ نے ہٹلر کو دیکھا؟ آپ نے ٹوکیو دیکھا؟ آپ نے نہ امام ابوحنیفہ اور امام بخاریؒ کو ان آنکھوں سے دیکھا اور نہ ہی اپنی عقل سے ان کے وجود کو دریافت کیا۔ ان چیزوں کو عقل سے معلوم کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ تمام چیزیں جو آپ کو معلوم ہیں یا کسی کو معلوم ہوتی ہیں یہ سب کسی کی خبر یا کسی کے اطلاع دینے سے معلوم ہوتی ہیں، اس کے لیے آپ خبر کی اسلامی اصطلاح استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ علم جو ہمیں اور آپ کو حاصل ہوا ہے یہ تمام تر نہیں تو اکثر و بیشتر خبر کے ذریعے سے حاصل ہوا ہے۔ کسی نے خبر دی کہ امریکہ نے عراق پر حملہ کر دیا، کسی مورخ نے کتاب میں لکھ کر خبر دی کہ ہٹلر جرمنی کا حکمران تھا۔ کسی اخبار نویس نے خبر دی کہ ٹوکیو جاپان کا دارالحکومت ہے۔ کسی جغرافیہ دان یا سیاح نے بتایا کہ سائبیریا میں بارہ مہینے برف پڑتی ہے۔

گویا معلومات کا بیشتر ذخیرہ اور بہت بڑا حصہ خبر کے ذریعہ سے ہم تک منتقل ہوتا ہے۔

یہ بات کہ ہماری معلومات اور علم کا بیشتر ماخذ خبر ہے خود اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے ہر شخص معلوم کر سکتا ہے۔ جب ہم خبر کا جائزہ لیں گے تو پتہ چلے گا کہ خبر غلط بھی ہوتی ہے اور درست بھی ہوتی ہے۔ بہت سے خبر دینے والے غلط بیانی بھی کرتے ہیں، بعض اوقات جان بوجھ کر غلط بیانی کرتے ہیں اور بعض اوقات غلط فہمی سے غلط بات کو خبر کے طور پر منتقل کر دیتے ہیں۔ لہٰذا صحیح خبر کو

غلط خبر سے ممیز کرنے کا کوئی پیمانہ بھی ہونا چاہیے۔ وہ پیمانہ کیا ہے؟۔ وہ پیمانہ جو ہر مسلمان اور غیر مسلم، مغربی اور مشرقی، عالم اور جاہل اپنے سامنے رکھتا ہے وہ بہت آسان اور سیدھا سادھا پیمانہ ہے۔ وہ یہ کہ ہر انسان سب پہلے یہ دیکھتا ہے کہ جس نے خبر دی ہے وہ خود سچا ہے یا جھوٹا۔ آپ سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ خبر دینے والا ابتدائی اندازہ میں آپ کو سچا معلوم ہوتا ہے یا جھوٹا۔ اگر آپ کے اندازہ میں وہ سچا ہے تو آپ اس کی بات مان لیتی ہیں۔ لیکن اگر آپ کے اندازے میں وہ شخص جھوٹا ہے تو آپ اس کی دی ہوئی خبر کو درست نہیں مانتیں، مشکوک ہونے پر بھی نہیں مانتیں۔ اور یہ تین ہی شکلیں ہیں: یا سچا ہے، یا جھوٹا ہے، یا مشکوک ہے۔

دوسری بات یہ دیکھی جاتی ہے کہ وہ شخص امانتدار ہے یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سچ تو بول رہا ہو لیکن امانتدار نہ ہو۔ سچ بات کسی بری نیت سے بتا رہا ہو۔ اگر سچا بھی ہو اور امانتدار بھی ہو تو اس کی بات فوراً مان لی جاتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ آپ یہ بھی جاننا چاہیں گی کہ جو شخص کوئی خبر دے رہا ہے اس خبر کے معاملہ سے اس کا براہ راست کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں۔ بالفاظ دیگر اس کا ذریعہ علم کیا ہے، کیا اس کو اس معاملہ کا پورا اور قطعی علم حاصل ہے؟ اگر وہ اس خبر کے بارے میں پورا پورا علم رکھتا ہے تو آپ کی نظر میں اس کی دی ہوئی خبر اور اس کی بتائی ہوئی بات قابل قبول ہے۔ اور اگر اسے علم ہی نہیں ہے تو پھر اس کی دی ہوئی خبر قابل قبول نہیں ہے۔ جب یہ تینوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں یعنی سچائی، امانتداری اور علم تو آپ کو اس شخص کی دی ہوئی خبر پر پورا پورا اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ اب اس ذریعہ سے آنے والی ہر خبر کو ہر انسان مان لیتا ہے اور اس کو قطعی اور یقینی خبر سمجھتا ہے۔ پھر اس کے مقابلہ میں اپنے عقلی استدلال کو رکاوٹ نہیں بننے دیتا۔ اپنے مشاہدہ اور حواس کو نظر انداز کر کے اس کو قطعی اور یقینی خبر کو مان لیتا ہے۔

ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ کسی کی طبیعت خراب ہو اور وہ ڈاکٹر کے پاس علاج کی غرض سے جائے۔ ڈاکٹر مشہور طبیب ہے اور ماہر فن ہے۔ آپ کو یقین ہے یہ اپنے فن کا پورا علم رکھتا ہے، دیانتدار ہے، کوئی دھوکہ باز شخص نہیں ہے، اس کے بارہ میں آپ کو یہ بھی یقین ہے کہ آپ کے مرض کے بارہ میں وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔ جب یہ تینوں چیزیں جمع ہو گئیں تو اب وہ آپ کو جو انجکشن یا دوا دے گا آپ میں سے ہر ایک اسے خوشی خوشی قبول کر لے گا۔ کوئی نہیں پوچھے گا کہ یہ کیا دوا ہے اور مجھے کیوں دے رہے ہو؟ اس لیے کہ آپ کو اس کے علم پر بھی

اعتماد ہے، اس کی صداقت پر بھی اعتماد ہے۔ اوراس کی دیانت پر بھی اعتماد ہے۔ اب اگر وہ کوئی ایسی دوا بھی دیتا ہے جس پر سرخ الفاظ میں ''زہر'' لکھا ہوا ہے تب بھی آپ کو اس دوا کے استعمال کرنے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہوتا۔

اب انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی خبر پر ان تینوں معیارات کی روشنی میں غور کیجیے۔ ان کی لائی ہوئی خبر کو جب لوگوں نے قبول کیا تو اس اعتماد کی بنیاد پر کیا کہ ان کا صدق، ان کی امانت اوران کا علم یہ تینوں چیزیں مکمل طور پر بھروسہ کے لائق تھیں۔ وہ الصادق بھی تھے، الامین بھی اور اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم وحکیم بھی۔ یہ سب صفات ان میں اس قدر بھرپور طریقے سے موجود تھیں کہ دشمن بھی ان کے معترف تھے۔ وہ ایسا علم رکھتے تھے کہ اس کے چشمے آج تک جاری اور ساری ہیں، اور روز بروز ان کے ثمرات وبرکات میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

یہاں ایک سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً حضرت صدیق اکبرؓ کو کیسے یقین کامل کا یہ مقام حاصل ہوا کہ آپؐ جو بات کہہ رہے ہیں وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں میں دوبارہ علم حضوری اور علم حصولی کی طرف آتا ہوں۔ علم حصولی جو عقلی استدلال کی بنیاد پر ہوتا ہے وہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ آپ نے مولانا رومؒ کا مشہور شعر سنا ہوگا:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

جو لوگ اپنے علم کی اساس عقلی استدلال پر رکھتے ہیں ان کا پاؤں لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ (وہ کمزور بیساکھیوں پر کھڑے ہوتے ہیں اس لیے کہ) لکڑی کا پاؤں سخت ناپائیدار ہوتا ہے۔ کسی جگہ بھی صحیح طور پر جمتا نہیں ہے۔ کوئی مصنوعی پاؤں لگا کر دوڑ نہیں لگا سکتا۔ واقعتاً بھی یہ بات درست ہے کہ استدلال کی بنیاد پر جو علم حاصل ہوتا ہے وہ وقتی طور پر کام چلانے کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے اگر کسی لنگڑے کے مصنوعی پاؤں لگا دیے جائیں تو وہ وقتی طور پر ان سے کام تو چلا لے گا، لیکن اس کا مقابلہ کسی پاؤں والے سے نہیں کیا جا سکتا، مثال کے طور پر وہ کرکٹ نہیں کھیل سکتا۔ اس کے برعکس اصل تمکین اور بنیاد علم حضوری والے ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ ایک شخص محسوس کر رہا ہے کہ اس کے سر میں درد ہے اور دوسرا شخص استدلال کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے سر میں درد نہیں ہے۔ یہاں علم یقینی اور قطعی اسی کا ہے جو بذات خود اس تجربہ سے گذر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی شخصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ رہنے والوں کے قلب ونظر میں اور رگ و پے اور روح اور ذہن میں ایسا قطعی علم حاصل ہو جاتا ہے کہ ان کو پھر کسی ظاہری استدلال کی ضرورت نہیں رہتی۔

ایک چھوٹی سی مثال دے کر بات کو آگے بڑھاتا ہوں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ عقلی دلائل اور منطقی استدلال کی بنیاد پر جو چیزیں آج ثابت ہوتی ہیں وہ کل غلط ہو جاتی ہیں۔ ہر ذہین آدمی جو مناظرہ اور لفاظی کے فن سے واقفیت رکھتا ہو وہ جس چیز کو چاہے دلائل اور زبان آوری کے زور سے صحیح یا غلط ثابت کر سکتا ہے۔ سر سید احمد خان کے صاحبزادے سید محمود کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ وہ اپنے زمانہ میں ہندوستان کے سب سے بڑے قانونی دماغ سمجھے جاتے تھے۔ وہ اپنی مصروفیات اور بعض مشاغل کی وجہ سے بہت سی چیزیں بھول جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ کسی عدالت میں کسی فریق مقدمہ کی طرف سے پیش ہوئے۔ اور بھول چوک کی عادت کی وجہ سے یہ بھول گئے کہ وہ کون سے فریق کے وکیل ہیں۔ انہوں نے فریق مخالف کی طرف سے دلائل دینے شروع کر دیئے اور مسلسل دیتے رہے۔ یہاں تک کہ دلائل کا انبار لگا دیا۔ جس فریق نے انہیں اپنا وکیل مقرر کیا تھا وہ گھبرا گیا۔ لیکن کچھ کہنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی، اس لیے کہ بہت بڑے وکیل تھے۔ جب ان کے مؤکلین بے حد پریشان ہوئے تو انہوں نے خاموشی سے کسی کے ذریعہ سے کہلوایا کہ آپ تو ہمارے وکیل ہیں۔ انہوں نے کہا بہت اچھا! اور پھر عدالت سے مخاطب ہو کر بولے کہ جناب والا! فریق مخالف کے حق میں بس یہاں تک کہا جا سکتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ سب غلط اور بے بنیاد ہے۔ اور پھر دوسری طرف سے دلائل دے کر اس سارے سلسلہ گفتگو اور استدلال کی تردید کر دی جو وہ اب تک کہہ رہے تھے اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دنیا عش عش کر اٹھی۔ تو دلائل کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ آپ اپنے زور بیان، قوت استدلال اور زبان آوری سے کام لے کر جس چیز کو چاہیں سچا اور صحیح اور جس چیز کو چاہیں جھوٹا اور غلط ثابت کر دیں۔

آپ نے اے کے بروہی صاحب کا نام تو سنا ہوگا جو ہمارے ملک کے مشہور قانون داں تھے اور ہماری بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے بانی بھی تھے۔ کسی نے ان سے ایک مرتبہ پوچھا کہ آپ نے اپنی زندگی میں سب سے بڑا وکیل کون دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا میں نے اپنی

زندگی میں سب سے بڑا وکیل سہروردی صاحب کو دیکھا ہے، وہ بہت ماہر وکیل تھے۔ جب وہ بولتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ جس نقطۂ نظر کی وہ تائید کر رہے ہیں ہر چیز اسی کی تائید کر رہی ہے۔ زمین و آسمان، در و دیوار اور کمرہ عدالت، کرسی، میز، غرض ہر چیز ان کی تائید کرتی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ اس طرح سماں باندھ دیتے تھے کہ جس چیز کو چاہتے تھے صحیح ثابت کر دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی کوئی ذاتی دلچسپی تو ہوتی نہیں تھی۔ جو فریق پیسے دیتا تھا اس کے حق میں دلائل بیان کر دیا کرتے تھے۔ تو عقلی اور استدلالی دلائل تو اس شان کے ہوتے ہیں کہ دلائل دینے والا جب چاہے جس چیز کو چاہے غلط ثابت کر دے۔

انسانی زندگی کے برتر اور نازک حقائق اس طرح کی لفاظی اور زبان آوری کی بنیاد پر ثابت نہیں ہوتے۔ انسانی زندگی میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کے اندر سے اس کا کوئی ضمیر، اس کا دل اور اس کی روح اور اس کا ذہن گواہی دیتا ہے کہ یہ چیز اس طرح ہے۔ خواہ عدالت میں اس کے حق میں ثابت ہو یا اس کے خلاف ثابت ہو۔ آپ نے اپنے والدین کو والدین مانا، والدہ کو والدہ مانا، اور بہن بھائیوں کو بہن بھائی مانا۔ آپ کی زندگی کا سارا نظام اس بلا دلیل ماننے پر چل رہا ہے۔ آپ کی والدہ کے والدہ ہونے کی کوئی عدالتی دلیل یا قانونی ثبوت آپ میں سے بیشتر کے پاس نہیں ہے۔ لیکن آپ کی غیر معمولی جذباتی اور روحانی وابستگی اپنی والدہ کے ساتھ قائم ہے۔ دنیا کا کوئی استدلال اس وابستگی کو کمزور نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی عدالت میں جا کر آپ سے دلیل مانگے کہ ثابت کریں کہ یہی خاتون آپ کی والدہ ہیں تو شاید آپ کے لیے یہ ثابت کرنا خاصا دشوار ہو۔ لیکن اگر آپ کوئی دلیل دے بھی دیں تو کوئی ماہر وکیل اس دلیل کے پرخچے اڑا سکتا ہے۔ لیکن کسی کے پرخچے اڑانے سے آپ کے اس یقین اور اس قلبی تعلق پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، جو آپ کو اپنی والدہ محترمہ اور ان کی وجہ سے ان رشتوں کے ساتھ ہے۔ یہ علم جو آپ کو حاصل ہوا یہ کیسے حاصل ہوا؟ یہ یقین اور شعور جو قلب و روح کے اندر سے ابل رہا ہے اور یہ اطمینان قلب جو آپ کو حاصل ہے یہ کہاں سے حاصل ہوا؟ یہ کسی عقلی استدلال کی بنیاد پر نہیں ہے۔ اس کے لیے کسی وقتی دلیل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ یہ اطمینان قلبی تو اس پورے عمر بھر کے تعلق، عمر بھر کی محبت اور عمر بھر کی قربانی اور جذبہ کی بنیاد پر آپ کو حاصل ہوا ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت ہلا نہیں سکتی، اس عمر بھر کے تعلق کو کوئی نام نہاد عقلی یا منطقی دلیل ختم نہیں کر سکتی۔ حضرت ابوبکر

صدیقؓ کے دل میں اسی قسم کا یقین پیدا ہوا تھا، جس کے بعد کسی مزید دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنی نبوت کی تائید میں جس چیز کو سب سے زیادہ پیش کیا وہ ان کی اپنی ذاتی زندگی تھی، ولقد لبثت فیکم عمرا، میں ایک طویل عمر تمہارے درمیان رہا ہوں اور تم میری شخصیت اور میرے کردار سے خوب اچھی طرح واقف ہو۔

یہ مفہوم ہے وحی کے علم قطعی کا ذریعہ ہونے کا۔ قرآن مجید اس علم قطعی اور علم یقینی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچا ہے۔ وحی الٰہی ایک مابعد الطبیعی ذریعہ ہے۔ انسان کو جتنے بھی طبعی وسائل دستیاب ہیں۔ جتنے حواس ہیں اور انسانوں کو چیزوں کے جاننے کے لیے جو جو ذرائع اور اسباب حاصل ہیں وحی الٰہی ان سب سے ماوراء ہے۔ وحی الٰہی کو انسانی وسائل سے ماوراء ہی ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی رہنمائی اور قیادت کے منصب پر فائز ہوتا ہے تو وہ اپنے ذاتی احساسات سے کبھی بھی آزاد نہیں ہوسکتا۔ کوئی بڑے سے بڑا انسان، انبیاء کرام کے علاوہ، اپنے ذاتی احساسات سے عاری نہیں ہوتا۔ صرف انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے ذاتی احساسات سو فیصد وحی الٰہی اور رضائے الٰہی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

یہ صرف وحی الٰہی ہے جو ہر قسم کے انسانی احساسات اور تحدیدات سے ماوراء ہے۔ اس لیے ایسا نظام فراہم کرنے کے لیے جو تمام انسانوں کو عادلانہ اور مساویانہ اصول دے سکے وحی الٰہی کے علاوہ کوئی اور طریقہ ممکن نہیں ہے۔ دنیا کے جتنے بھی قوانین اور نظام ہیں وہ ایک یا ایک سے زائد انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ بسا اوقات کوئی ایک فرد، یعنی بادشاہ یا حکمران، اور بعض اوقات انسانوں کا ایک مجموعہ قوانین بناتا ہے۔ لیکن انسانی تاریخ کے ایک طویل تجربہ نے یہ بات سکھائی ہے کہ کوئی بھی انسان، وہ ایک فرد ہو، یا سینکڑوں افراد ہوں، یا ہزاروں افراد ہوں، وہ کبھی بھی اپنے ذاتی مفادات، ذاتی تعصبات اور ذاتی میلانات ور جحانات سے آزاد نہیں ہوتے۔

قانون بنانے کی ذمہ داری اگر زمینداروں کو دی جائے گی تو وہ زمینداروں کے مفاد کا لحاظ کریں گے، قانون دانوں کو دی جائے گی تو وہ قانون دانوں کے مفاد کا تحفظ کریں گے، اور اساتذہ کو دی جائے گی تو وہ طبقہ اساتذہ کے مفادات کا لحاظ کرتے ہوئے قوانین کی تشکیل کریں گے۔ دنیا کا کوئی شخص اس جانبداری سے کلی طور پر مبرا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے انسانوں کے ذاتی رجحانات کا مجوزہ قوانین میں راہ پا جانا ناگزیر ہے۔ اس لیے یہ ذمہ داری اللہ تبارک وتعالیٰ نے

اپنے ہاتھ میں رکھی ہے کہ انسانوں کی ایسی رہنمائی کی جائے جس میں کسی خاص طبقہ کی مصلحت کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو، بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کی بھلائی اس میں یکساں طور مضمر ہو۔ ایسی رہنمائی ایک مرتبہ دے دی جائے، پھر اس کی حدود کے اندر انسان آزاد ہوں۔ جس طرح چاہیں اس کی دیگر جزئیات اور تفصیلات طے کر لیں

وحیٔ حق بینندہ ' سود ہمہ

درنگاہش سود و بہبود ہمہ

وحی حق وہ ہے جو سب کے مفاد کو دیکھتی ہے اور اس کی نگاہ میں ہر ایک کا مفاد برابر ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں جو عقل ہے وہ اپنے ہی کو دیکھتی ہے اور اپنے ہی مفاد کی خدمت کرتی ہے۔ ہر انسان کو اپنی عقل سب سے اونچی لگتی ہے۔ کوئی یہ اعتراف نہیں کرتا کہ میں سب سے کم عقل ہوں۔ سوائے شاذ و نادر بندوں کے۔ علامہ فرماتے ہیں

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر

سو د خود بیند نہ بیند سود غیر

وہ اپنی بہبود تو خوب دیکھتی ہے دوسرے کی بہبود اسے نظر نہیں آتی، اپنا فائدہ دیکھتی ہے دوسرے کا فائدہ نہیں دیکھتی۔ یہ خوبی صرف وحی الٰہی میں ہے کہ

عادل اندر صلح وہم اندر مصاف

وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

صلح ہو یا جنگ ہو وہ اپنے عادلانہ طریق کار کو نہیں چھوڑتی۔ وہ لوگوں کو جوڑ رہی ہو یا علیحدہ کر رہی ہو، دونوں صورتوں میں وہ نہ کسی کی رعایت کرتی ہے اور نہ کسی سے ڈرتی ہے۔ انسان خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔، رعب میں آجاتا ہے، دباؤ میں آتا ہے، کسی دوست، رشتہ دار یا محبوب ہستی کی رعایت کرتا ہے، وحی الٰہی نہ کسی کی رعایت کرتی ہے اور نہ کسی کے دباؤ میں آتی ہے۔

غیر حق چوں ناہی و آمر شود

زور ور بر ناتواں قاہر شود

اللہ تعالیٰ کے علاوہ جب کوئی اور ذات آمر اور ناہی بنے گی۔ یعنی امر و نہی کے اختیارات کو استعمال کرے گی۔ تو اس کا نتیجہ صرف یہ نکلے گا کہ جو زور آور ہے وہ کمزور پر قاہر ہو جائے گا اور ہر قسم کی

زیادتی کرے گا۔ جیسا کہ دنیا میں نظر آتا ہے۔ یہ ہے وحی کی تفصیل اور وحی کی اقسام، قرآن مجید اسی وحی کے ذریعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

یہ بات قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ دوسری آسمانی کتابوں کے برعکس یہ کتاب یکبارگی نازل نہیں ہوئی، بلکہ **23** سال کے طویل عرصہ میں نازل ہوئی ہے۔ ابھی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر کیا کہ جب وہ طور سینا پر تشریف لے گئے تو توریت کی تختیاں انہیں لکھی ہوئی مل گئیں اور وہ یہ تختیاں لے کر آ گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً انہیں ہم کلامی کا جو شرف عطا فرمایا اس کی نوعیت یا تو حدیث قدسی کی ہے یا عام حدیث کی۔ وحی جلی یعنی کتاب الٰہی کی شکل میں جو وحی دینی تھی وہ ایک مرتبہ دے دی۔ اس کے بعد اس میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ بعض اوقات ایک لفظ بھی نازل ہوا ہے جیسے غیر اولی الضرر۔ اور بعض اوقات پوری پوری سورتیں بھی بیک وقت نازل ہوئی ہیں۔ اس میں کیا حکمتیں ہیں اور کیا سبق پوشیدہ ہے؟

نزول قرآن کے لیے علماء کرام اور مفسرین قرآن نے نجماً نجماً نازل ہونے کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ یعنی قرآن کی ہر آیت درخشاں ستاروں کی شکل میں اتاری جا رہی ہے اور ایک ایک ستارہ کر کے ہدایت اور رہنمائی کا کہکشاں مکمل کر دیا گیا ہے۔ فقہاءِ کرام نے قرآن کے احترام میں نجم یعنی ستارے کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ کلام الٰہی کو کہکشاں سے اور نازل ہونے والے اجزاء کو ستاروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ گویا ایک ایک کر کے چمکتے ہوئے ستارے آسمان سے نازل کیے جا رہے تھے۔

اس تھوڑا تھوڑا نازل کیے جانے کی ایک حکمت تو وہی معلوم ہوتی ہے، جو میں نے "قول ثقیل" کے عنوان سے بیان کی کہ اگر ایک لفظ اور آیت کے صرف ایک ٹکڑے کے نازل ہونے کی وہ کیفیت تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کی اور بیان فرمائی اور صحابہ کرامؓ نے اس کا نہایت قریب سے مشاہدہ کیا تو اگر پورا قرآن یکبارگی نازل کیا گیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس کا تھوڑا سا اندازہ ہم اس آیت سے کر سکتے ہیں۔ جو ہماری بہن نے کل تلاوت کی تھی کہ اگر اس قرآن پاک کو ہم کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ خشیت الٰہی سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ زید ابن ثابتؓ کے ذاتی تجربہ اور اونٹنی کے احوال کو دیکھ کر اور دیگر صحابہ کرامؓ کے مشاہدہ سے بھی اس کی تائید ہوتی

ہے۔قولِ ثقیل کا تقاضا یہ تھا کہ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہو۔

دوسری حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کتاب اس دنیا میں رہنے کے لیے آئی ہے۔ یہ کسی محدود وقت یا محدود زمانے کے لیے نہیں آئی، جیسا کہ سابقہ کتب آتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کی متقاضی نہیں تھی کہ سابقہ کتابیں ایک متعین مدت اور محدود زمانہ سے زیادہ دیر تک زندہ رہ سکیں۔ انہیں اٹھا لیا گیا، یا لوگوں نے ان کو بھلا دیا، فراموش کر دیا، یا خلط ملط کر دیا، ان میں لفظی اور معنوی تحریف کر دی۔ لیکن ان کتابوں کے برعکس قرآن مجید وہ کتاب ہے جو ہمیشہ باقی رہے گی۔ جب تک اللہ تعالیٰ اس دنیا کو باقی رکھنے کا فیصلہ کرے گا۔ یہ کتاب بھی باقی رہے گی۔ اس لیے اس کتاب کی حفاظت کے لیے بے مثال اور بے نظیر بندوبست کیا گیا۔ اس کتاب کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان ہی کو ذریعہ اور وسیلہ بنایا، کیونکہ انسان کے لیے ہی اسے باقی رہنا تھا۔

کسی کلام یا تحریر کی حفاظت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اسے تھوڑا تھوڑا کر کے یاد اور محفوظ کیا جائے۔ اگر آپ بچے کو قرآن پاک حفظ کروانا چاہیں اور پورا نسخہ اسے اٹھا کر دے دیں کہ اس کتاب کو سارا یاد کر لو تو کوئی بچہ بھی حافظ نہیں بن سکتا۔ کسی بچہ یا طالب علم کو پورا قرآن جب ہی یاد ہو سکتا ہے جب اس کو روزانہ ایک آیت، دو آیتیں یا تین آیتیں یاد کرائی جائیں۔ حفاظت قرآن کے نقطۂ نظر سے اس کو تھوڑا تھوڑا نازل کرنا اس امر کو یقینی بنانے کے مترادف تھا کہ قرآن مجید کو مکمل طور پر لوگوں کے دلوں اور سینوں میں محفوظ کر دیا جائے۔ حفاظت قرآن پر مزید گفتگو انشاء اللہ آئندہ کسی دن کریں گے۔

تیسری حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ سے ایک حقیقی اور دیرپا تبدیلی پیدا کرنا مقصود تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب کسی خلا میں نازل نہیں ہوئی تھی، بلکہ یہ کتاب ایک تبدیلی کو پیدا کرنے کے لیے اور ایک تبدیلی کی رہنمائی کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ جب تک تبدیلی کا عمل مکمل نہیں ہوا کتاب کا نزول جاری بھی رہا، اور جوں ہی تبدیلی کا عمل مکمل ہو گیا تو کتاب کا نزول بھی مکمل ہو گیا۔ یہ دونوں عمل ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ یہ دو مختلف لیکن متوازی عمل تھے، روئے زمین پر تبدیلی کا عمل اور آسمان پر نزول کتاب کا عمل جاری تھا۔ دونوں ایک ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچے۔ تبدیلی کا یہ عمل اسی وقت ممکن تھا جب نزول آہستہ آہستہ اور تھوڑا تھوڑا

کر کے ہوتا۔ کسی انسان میں بھی اچانک مکمل تبدیلی نہیں آتی۔ ایسے لوگ بہت ہی شاذ و نادر ہوتے ہیں جو اچانک اور یک بارگی اپنے اندر ایک مکمل تبدیلی لے آئیں۔ بالفرض اگر کسی کے رویہ میں تبدیلی اچانک آ بھی جائے تو پھر بھی روزمرہ کی تفصیلات کو بدلنے میں وقت لگتا ہے۔ قرآن مجید کے زیرِ ہدایت اور آپؐ کی رہنمائی میں تبدیلی کا یہ عمل شروع ہوا اور تیئیس سال مسلسل جاری رہا۔ جب ضرورت پیش آئی رہنمائی نازل ہوگئی اور اس کے نتیجے میں تبدیلی آ گئی۔ کسی جگہ قوانین کی تبدیلی آئی، کسی جگہ عقائد میں تبدیلی آئی اور کہیں عقائد اور کردار دونوں کو بہتر بنایا گیا۔ کہیں سابقہ انبیاء کی وہ شریعتیں جنہیں لوگوں نے بھلا دیا تھا ان کے بنیادی عناصر دوبارہ یاد دلائے گئے۔ اس طرح بائیس سال چند ماہ کے عرصے میں یہ تبدیلی مکمل ہوئی۔ اس تبدیلی کو یقینی اور دیرپا بنانے کے لیے ضروری تھا کہ یہ عمل تھوڑا تھوڑا کر کے کیا جائے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے اسباب ہیں جن کا مزید ذکر کل کی گفتگو میں آئے گا۔ یہ اسباب اس بات کے متقاضی ہوئے کہ کتابِ الٰہی کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا جائے۔

رمضان المبارک کے مہینہ کو نزولِ قرآن سے خاص نسبت معلوم ہوتی ہے۔ ایک مشہور حدیث ہے جس کو حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ توریت، زبور اور انجیل یہ تینوں کتابیں رمضان میں اتاری گئیں۔ اس سے ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ شاید بقیہ کتابیں بھی جن کا یہاں ذکر نہیں ہے وہ بھی رمضان میں ہی اتاری گئی ہوں گی۔ اس روایت میں رمضان کی ان تاریخوں کا ذکر بھی ہے، جن میں یہ آسمانی کتب نازل ہوئیں۔ توریت ۶ رمضان کو، انجیل ۱۳ رمضان کو، زبور ۱۸ رمضان کو اور قرآن پاک ۲۷ رمضان کو اتارا گیا ہے۔ گویا رمضان المبارک کو وحیِ الٰہی کے ساتھ ایک خاص تعلق اور ایک خاص نسبت ہے۔ یہاں اس کی طرف مختصراً اشارہ کر دیتا ہوں کہ وہ کیا نسبت ہے اور کیوں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں کے نزول کے لیے رمضان کے مہینے کو منتخب فرمایا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اور ایک الگ باب حجۃ اللہ البالغۃ میں اس مضمون پر گفتگو کے لیے مخصوص فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسان جن قوتوں سے عبارت ہے وہ دو قسم کی ہیں۔ بالفاظِ دیگر انسان جن بے شمار قوتوں کا مالک ہے ان سب کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک زمرہ وہ ہے جس کو شاہ صاحب ملکوتی خصائص کے

نام سے یاد کرتے ہیں۔یعنی فرشتوں کے خصائص۔اور دوسرا زمرہ وہ ہے جس کو وہ بہیمیت کا نام دیتے ہیں، یعنی حیوانی عادات وخصائص۔ عام انسانوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ حیوانی خصائص پر زیادہ زور دیتے ہیں، ان کو بھوک بھی بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے، پیاس کا بھی احساس ہوتا ہے، گرمی اور سردی بھی بہت لگتی ہے اور نیند کا بھی شدید غلبہ ہوتا ہے۔ دیگر جسمانی تقاضے بھی شدت سے طاری ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک عام انسان اپنی زندگی کے ان پہلوؤں پر بہت زور دیتا ہے۔لیکن ملکوتی خصائص پر عام لوگ کم توجہ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اللہ کے خاص بندے اور ملائکہ روحانی خصائص پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ان دونوں خصائص کے درمیان توازن برقرار رکھنے کا نام ہی شریعت ہے، ارشاد ربانی: فالھمھا فجورھا و تقوٰھا۔ قد افلح من زکھا۔ وقد خاب من دساھا۔ جو شخص اپنے اس روحانی پہلو کو سنوارے اور ترقی دے وہ کامیاب ہے اور جو اس کو بگاڑے وہ ناکام ہے۔یہی دراصل شریعت کا مقصد ہے، اور اسی توازن کو حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے شریعت اتاری گئی ہے۔

اب جب کوئی شخص اپنی ملکوتی صفات کو ترقی دیتا ہے اور اپنے اندر کے فرشتہ صفت رجحانات کو سامنے لاتا ہے اور حیوانی رجحانات کو ان کے تابع کر کے ان کو اعلیٰ روحانی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔تو اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے روز افزوں ہوتا رہتا ہے، اور ایک ایسا روحانی قرب اسے بارگاہ الٰہی سے، جس کو شاہ صاحب ملاءِ اعلیٰ کا نام دیتے ہیں، حاصل ہو جاتا ہے جو بڑھتا جاتا ہے۔انبیاء علیہم السلام کو خاص طور پر اس کام کے لیے تیار کیا گیا اور منتخب کیا گیا۔ان کی مزید روحانی تیاری اور روحانی ارتقاء کے لیے رمضان المبارک کے مہینے کا انتخاب کیا گیا۔تا کہ وہ ملکوتیت کے بلند ترین مقام سے بھی آگے بڑھ جائیں اور وحی الٰہی کا نزول ان پر آسان ہو سکے۔

یہ خلاصہ ہے شاہ صاحب کی اس بحث کا جو انہوں نے اس موضوع پر کی ہے کہ رمضان المبارک میں قرآن پاک کا نزول کیوں ہوا۔

ایک دوسرا سوال جس پر مفسرین اور محدثین نے بحث کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن مجید ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل ہوا۔ دوسری طرف خود قرآن پاک میں ذکر ہے کہ یہ رمضان میں نازل ہوا۔ اب ان دونوں بظاہر متعارض حقائق میں تطبیق کیسے ہو۔ محدثین کی بڑی تعداد اور مفسرین کی غالب اکثریت نے اس سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے

نزول قرآن کا فیصلہ فرمایا تو اس کو پہلے لوح محفوظ سے سماءِ دنیا پر نازل فرمایا اور وہاں اس کو ایک خاص مقام پر رکھا جس کے لیے حدیث میں بیت العزۃ کا لفظ آیا ہے۔ عزت کے معنی عربی میں بہت وسیع ہیں، غلبہ، اعزاز، بلندی، رفعت وغیرہ۔ گویا بیت العزۃ سے مراد وہ بلند مقام ہے جو ہر غلبہ، اعزاز اور رفعت کا سزاوار ہے۔ وہاں سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جبریل امین اسے لاتے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے رہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جبریل امین براہ راست بھی اس جگہ سے لے سکتے تھے جہاں سے آسمان دنیا پر نازل کیا گیا۔ لیکن اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اپنی کسی اور مخلوق کو اس مقام تک رسائی عطا نہیں فرمائی جہاں سے قرآن پاک نازل کیا گیا۔ ہمارے مفسرین، محدثین اور مفکرین اور صوفیاء سب نے لکھا ہے کہ معراج کے موقع پر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ جبریل امین نے کہا کہ اب آپ تنہا تشریف لے جائیے، میری پہنچ یہاں ختم ہوگئی ہے۔ ایک مشہور صوفی شاعر نے اپنے محدود پیرایہ بیان میں جبریل کے احساسات کی یوں ترجمانی کی ہے:

اگر یک سرموئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

چنانچہ قرآن پاک کا جو پہلا نزول ہے اس کے لیے قرآن پاک میں لیلۃ القدر، شہر مبارک کے اشارے کیے گئے ہیں۔ اس کو ہم ابتدائی یا اجمالی نزول کہہ سکتے ہیں۔ اور بقیہ نزول جس کو تفصیلی نزول کہا جاسکتا ہے، جس کے بارے میں کل تفصیل سے گفتگو ہوگی وہ ۲۳ سے کچھ کم سال کے عرصہ میں مکمل ہوا۔

آپ میں سے تقریباً سب ہی بہنیں عربی زبان کی طالب علم اور مزاج شناس ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ عربی زبان میں مختلف اوزان کے صیغوں میں خاص مفہوم پایا جاتا ہے، اور اس وزن پر جتنے الفاظ ہوتے ہیں ان میں اسی طرح کا مفہوم مشترک ہوتا ہے۔ اس وزن کے الفاظ کے معانی میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ تنزیل جو تفعیل کے وزن پر ہے اس میں دوام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ تکریم تحریم اور تکبیر یہ سارے الفاظ ایک ہی اسکیل اور وزن پر ہیں۔ ان سب میں تسلسل اور دوام کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یعنی جس فعل کو تھوڑا تھوڑا کر کے طویل عرصہ تک کیا جائے وہ فعل اس وزن میں آتا ہے۔ اور افعال کے وزن میں جو مفہوم پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ فعل کو ایک

ہی مرتبہ یکبارگی کر دیا جائے، اگر کوئی فعل ایک مرتبہ آپ نے کر دیا اور وہ ہو گیا۔ اس سے قطع نظر کہ بعد میں ہوا' یا نہیں ہوا' اس کے لیے افعال کا وزن آتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآن پاک میں جہاں لیلۃ القدر کا ذکر ہے وہاں انا انزلنا۔ یعنی انزال کا لفظ ہے، افعال کے وزن پر جو ایک ہی وقت میں ہو جاتا ہے۔ اور جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اتارے جانے کا ذکر ہے وہاں نزّل کا ذکر ہے جو تنزیل کا فعل ہے یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا۔

یہ کتاب جو قطعی علم، یقینی حقائق، حتمی ہدایات اور ختمی مرتبت شریعت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل ہوئی' اس کا نام عرف عام میں تو قرآن ہے لیکن اصل نام القرآن ہے، القرآن، الف لام کے ساتھ۔ اس کے لفظی معنی کیا ہیں؟ یہ نام اس کتاب کے لیے کیوں اختیار کیا گیا؟ اس پر بھی مفسرین قرآن نے بہت تفصیل سے کلام کیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ قرا، یقرأ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی پڑھنے کے ہیں۔ اور قرآن، فعلان، غفران اور فرقان کے وزن پر ہے، جو بظاہر تو مصدر ہے، لیکن اس میں اسم آلہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ جو دوام اور تسلسل پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے قرآن سے مراد وہ چیز ہوگی جو بار بار اور تسلسل سے پڑھی جائے۔ بیشتر اہل علم نے قرآن کو قرء یقرء یعنی پڑھنے ہی کے مفہوم سے مشتق قرار دیا ہے۔ کچھ اور لوگوں نے قرآن کے لفظ کا کچھ اور اشتقاق اور مفہوم بھی بیان کیا ہے۔ لیکن دوسرے مفاہیم لغوی اعتبار سے کمزور ہیں اور عربی زبان کے قواعد اور محاورہ ان میں سے اکثر کا ساتھ نہیں دیتے۔ عربی زبان کے قواعد اور صرف کے اصولوں کی بنیاد پر جو مفہوم زیادہ قرین عقل اور قرین فہم ہے وہ یہی پڑھنے کا مفہوم ہے۔ اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک اعتبار سے جو کتاب بار بار پڑھی جائے وہ قرآن کہلا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے لغوی اعتبار سے قرآن کا لفظ ہر اس کتاب یا تحریر پر صادق آ سکتا ہو جو بار بار پڑھی جائے۔ لیکن یہاں صرف قرآن نہیں القرآن کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی وہ واحد کتاب اور وہ متعین کتاب جو تسلسل اور تکرار کے ساتھ بار بار پڑھی جا رہی ہے۔ یہ نام قرآن مجید کے علاوہ کسی اور کتاب پر صادق نہیں آتا۔

دنیا کی ہر کتاب کا نام دنیا کی اور بہت سی کتابوں کو دیا جا سکتا ہے۔ ایسی کوئی کتاب نہیں ہے کہ اس کا نام کسی دوسری کتاب کو نہ دیا جا سکے۔ اگر آپ شاعر ہیں اور آپ کا تخلص غالب ہے تو آپ اپنے دیوان کا نام دیوان غالب رکھ سکتے ہیں۔ کوئی اعتراض نہیں کرے گا کہ آپ نے یہ نام

غلط رکھا ہے۔ لغوی، عرفی اور ادبی ہر اعتبار سے اسے دیوان غالب کہنا جائز ہوگا۔ اگر آپ معاشیات کی استاد ہوں اور جرمن زبان میں سرمایہ کے موضوع پر کتاب لکھیں تو آپ اپنی کتاب کا نام Das Capital رکھ سکتی ہیں۔ کوئی نہیں کہے گا کہ اس سے کارل مارکس کا حق متاثر ہوا ہے۔ کسی بھی کتاب کو جو جرمن زبان میں ہو اور سرمایہ کے موضوع پر لکھی گئی ہو اس کو Das Capital کہا جاسکتا ہے۔ لیکن القرآن وہ واحد نام ہے جو قرآن مجید کے علاوہ کسی اور کتاب کو نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے کہ دنیا میں کوئی کتاب اتنی کثرت اور اتنے تواتر کے ساتھ نہ ماضی میں پڑھی گئی ہے، نہ حال میں پڑھی جارہی ہے اور نہ آئندہ مستقبل میں پڑھے جانے کا کوئی امکان ہے۔

ممکن ہے آپ کو لگے کہ یہ ایک بے دلیل دعویٰ ہے، یا کوئی یہ کہے کہ یہ تو ایک ایسا دعوی ہے جو ہر شخص کرسکتا ہے، اور ہر خوش گمان عقیدت مند اپنی پسندیدہ، محبوب اور محترم چیزوں اور شخصیتوں کے بارہ میں اس طرح کے دعوے کرسکتا ہے۔ لیکن ذرا غور کریں تو معلوم ہوجائے گا کہ ایسا نہیں ہے۔

ذرا روئے زمین کا نقشہ لے کر بیٹھیں۔ یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالی نے زمین گول بنائی ہے، سورج اس کے چاروں طرف طلوع ہوتا ہے، دن رات بدلتے ہیں، زمین بھی گھومتی ہے۔ سورج بھی گھومتا ہے، اس مسلسل حرکت کا نام کائنات ہے۔ آپ کو یہ بھی علم ہے کہ مسلمان روئے زمین کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ روئے زمین کے انتہائی مشرق میں ایک علاقہ ہے جسے فجی کہتے ہیں۔ یہاں مسلمان تقریباً ایک لاکھ کی تعداد میں بستے ہیں۔ یہ وہی علاقہ ہے جس کے قریب سے انٹرنیشنل ڈیٹ لائن گزرتی ہے یعنی وہ خط جہاں سے نئی تاریخ پہلی مرتبہ شروع ہوتی ہے۔ آج اپریل کی آٹھ تاریخ ہے تو سب سے پہلے آٹھ اپریل ۲۰۰۳ء دنیا کی تاریخ میں فجی میں آئی ہے۔ اس سے پہلے کہیں نہیں آئی۔ وہاں مسلمان بستے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں اور قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتے ہیں۔ وہاں مدرسے اور دارالعلوم بھی کھلے ہوئے ہیں۔ وہاں ہزاروں مسلمان نماز فجر میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں نماز فجر کے بعد بھی مصروف تلاوت رہتے ہیں۔

ان کے ہاں جب فجر کا وقت ختم ہوجاتا ہے تو آسٹریلیا میں فجر کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔ آسٹریلیا میں پانچ لاکھ مسلمان بستے ہیں۔ وہ بھی فجی کے مسلمانوں کی طرح نماز فجر سے پہلے،

نماز فجر کے دوران میں اور نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن کرتے ہیں۔ جب آسٹریلیا میں فجر کا وقت ختم ہوتا ہے تو انڈونیشیا میں شروع ہو جاتا ہے۔اب انڈونیشیا میں کروڑوں مسلمان اسی طرح قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح ابھی تھوڑی دیر قبل فجی اور آسٹریلیا کے لاکھوں مسلمان کر رہے تھے۔ پھر جب انڈونیشیا میں نماز فجر کا وقت اور مرحلہ ختم ہوتا ہے تو ملائیشیا میں شروع ہو جاتا ہے۔ ملائیشیا میں ختم ہوتا ہے تو بنگلا دیش میں شروع ہو جاتا ہے۔ بنگلا دیش کے بعد بھارت میں بیس کروڑ مسلمان نماز فجر ادا کرتے ہیں۔

جب ہم پاکستان میں فجر کی نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں اس وقت فجی کے مسلمان ظہر کی نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ جس کا دل چاہے وہ فجر کے وقت فجی فون کر کے معلوم کر لے اور خود سن لے کہ وہاں تلاوت ہو رہی ہے اور نمازوں، بالخصوص نماز فجر اور نماز ظہر کے بعد مکتبوں میں بچے اور بڑے تلاوت میں مصروف ہیں۔ جب مصر کے مسلمان فجر کی نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں تو فجی کے مسلمان عصر کی نماز پڑھتے ہیں۔ اور جب لیبیا اور الجزائر کے مسلمان فجر پڑھتے ہیں تو فجی کے مسلمان نماز مغرب پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ پھر جب مراکش کے مسلمان نماز فجر پڑھ رہے ہوں تو فجی کے لوگ عشاء پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اور درمیان میں باقی چاروں نمازوں کے اوقات درجہ بدرجہ آتے ہیں۔

لہٰذا پانچوں نمازوں کے یہ اوقات مسلسل روئے زمین کے گرد پھر رہے ہوتے ہیں۔ آپ نے اشتہار کے گرد گھومنے والی روشنی دیکھی ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ روشنی چاروں طرف گھوم رہی ہے، وہ تو گھومتی ہے یا نہیں گھومتی، ہوسکتا ہے کہ نظر کا دھوکہ ہو، لیکن نمازوں کے اوقات روئے زمین کے گرد مسلسل گھومتے رہتے ہیں۔ اور یہ تلاوت قرآن کی ایک زنجیر ہے جو دنیا کے گرد ہالہ بنائے ہوئے ہے۔ اس میں کبھی کوئی انقطاع اور توقف نہیں ہوتا ہے۔ اس مسلسل عمل میں توقف یا انقطاع اسی وقت ہوسکتا ہے جب زمین اپنے محور پر چلنا چھوڑ دے، یا سورج گردش کرنا چھوڑ دے، یا سارے مسلمان یک دم اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ اس کے علاوہ کوئی شکل اس تلاوت مسلسل کو روکنے کی نہیں ہے۔

دنیا میں کوئی اور کتاب ایسی نہیں ہے جو اتنے تواتر اور اتنے تسلسل اور اتنی کثرت سے پڑھی جا رہی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ انجیل کو بھی لوگ پڑھتے ہوں

گے۔ یا بائبل کو بھی اس طرح پڑھتے ہوں گے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ یہ کتابیں صرف ہفتے میں ایک دن پڑھی جاتی ہیں۔ وہ بھی پادری پڑھتا ہے اور باقی سب لوگ خاموش رہتے ہیں۔ پورے ہفتہ کے بقیہ دنوں میں یہ کتابیں نہیں پڑھی جاتیں یا بہت ہی اکادکا کوئی آدمی ہوگا جو پڑھتا ہوگا۔

تلاوت قرآن کا یہ تواتر اور تسلسل جو کم از کم گذشتہ بارہ تیرہ سو سال سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔ یہ بے مثال اور بے نظیر ہے۔ اسی تسلسل اور تواتر کی وجہ سے اس کتاب کو القران کا نام دیا گیا۔ یہ ہے القرآن کا مفہوم۔ اس مفہوم میں کسی اور کتاب کو القرآن نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی کوئی کتاب اس کی مستحق ہے کہ اسے القرآن کہا جا سکے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں ۶۶ مرتبہ آیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا نام الکتاب ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں **The Book** اگر آپ لغت دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دی بائبل کے معنی بھی ہیں **The Book**۔ ببلیو گرافی کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا۔ اس کے معنی ہیں کتابوں کی فہرست۔ یہ لفظ بائبل سے ماخوذ ہے اور بائبل کے معنی ہیں کتاب۔ فرنچ زبان میں آپ نے سنا ہوگا کہ کتب خانہ کو ببلیو تیک کہتے ہیں۔ یعنی وہ مرکز جہاں کتابیں رکھی جائیں۔ لہٰذا **The Bible** کے معنی الکتاب اور الکتاب کے معنی **The Bible** ہیں۔ یوں یہ دونوں ایک ہی لفظ ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں الکتاب کا لفظ آیا ہے ان آیات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس زمانے میں جو کتاب اتاری اس کے لیے الکتاب یعنی **The Book** کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے، یعنی جس وقت جس آسمانی کتاب کی فرمانروائی تھی اور جس کتاب الٰہی کا سکہ چل رہا تھا، جو کتاب اس وقت روحانیت اور شریعت کے باب میں فرمانروا اور قول فیصل کی حیثیت رکھتی تھی اس کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے الکتاب کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ توریت الکتاب تھی، پھر انجیل الکتاب ہوگئی اور اب قرآن مجید الکتاب ہے۔ اور اب رہتی دنیا تک لیے قرآن مجید ہی الکتاب ہے۔ توریت اب کتاب ہے الکتاب نہیں۔ انجیل کتاب ہے الکتاب نہیں۔ اسی لیے قرآن مجید کو الکتاب کہا گیا ہے۔

آپ سے شاید کبھی کسی نے یہ سوال کیا ہو، اور اگر نہیں کیا تو شائد آئندہ کچھ لوگ یہ سوال کریں کہ قرآن مجید میں بہت سی چیزیں بائبل سے لی گئی ہیں۔ مغربی مصنفین جو قرآن مجید کو کلام الٰہی نہیں مانتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھتے ہیں وہ بار بار اپنی کتابوں میں یہ

لکھتے ہیں کہ آپؐ نے بائبل سے بہت سے چیزیں نقل کرلی ہیں۔ جس کو انگریزی میں plagiarism یعنی سرقہ ادبی کہتے ہیں۔نعوذباللہ آپؐ نے اس کاارتکاب کیا۔

آج سے تقریباً ۲۲ سال قبل مجھے ایک بہت بڑے پادری سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ ان سے اسلام، قرآن مجید، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ تو تم جانتے ہو کہ میں قرآن کو کلام الٰہی نہیں مانتا، بلکہ اس کو محمدؐ کی تصنیف سمجھتا ہوں۔ لیکن میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ محمدؐ نے بائبل سے یہ چیزیں کیوں نقل کیں اور ان کا اس نقل سے کیا مقصد تھا؟ یہ سوال انہوں نے مجھ سے کیا۔ میں نے جواباً ان سے کہا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں بھی آپ سے ایک سوال کروں۔ انہوں نے کہا جی ضرور کیجیے۔

میں نے کہا اس معاملہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ بقول آپ کے انہوں نے کچھ چیزیں بائبل سے نقل کرلیں۔ لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ بائبل میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ چیزیں کیوں چھوڑ دیں۔ اگر بائبل نامی کتاب ان کو مل ہی گئی تھی اور وہ اس میں سے نقل کر کے لوگوں کو بتا رہے تھے اور لوگ ان باتوں کو بطور وحی الٰہی مان بھی رہے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو چھوڑا وہ کیوں چھوڑا۔ وہ بھی بیان کر دیتے۔ شاید پادری صاحب اس فوری سوال کے لیے تیار نہیں تھے۔ کہنے لگے کہ اس پر تو میں نے کبھی نہیں سوچا۔ میں نے کہا اب سوچیے۔

پھر جواب میں میں نے ان سے کہا کہ قرآن مجید اپنے کو کوئی نئی کتاب نہیں کہتا۔ قرآن کا لانے والا تو کہتا ہے، ما کنت بدعا من الرسل۔ میں کوئی نیا یا انوکھا نبی نہیں ہوں، بلکہ اسی پیغام کو لے کر آیا ہوں جو پہلے آیا تھا، اور توریت اور انجیل جو کچھ کہتی ہے میں اسی کی یاد دہانی کے لیے آیا ہوں۔ اس لیے قرآن پاک میں بائبل سے جو چیز لی گئی وہ تو قابل اعتراض نہیں ہے، اس لیے کہ جس چیز کی یاد دہانی مقصود ہوتی ہے اس کو بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ لیکن جو چیز نہیں لی گئی وہ قابل غور ہے کہ وہ کیوں نہیں لی گئی۔

پھر میں نے کہا کہ قرآن مجید اپنے کو الذکر بھی کہتا ہے۔ اس کے معنی ہیں یاد دہانی۔ یاد دہانی اسی چیز کی ہوتی ہے جو پہلے بھی کہی گئی ہو۔ آج آپ کسی کو پہلی مرتبہ خط لکھیں اور یہ کہیں کہ

میں تم کو یاد دہانی کے طور پر خط بھیج رہا ہوں یا reminder بھیج رہا ہوں تو وہ خط یاد دہانی نہیں کہلائے گا۔ یاد دہانی وہ ہوتی ہے جب آپ نے پہلے سے ایک خط لکھا ہو۔ وہ یا تو گم ہو جائے، یا مکتوب الیہ اس پر عمل کرنا بھول جائے، یا کسی وجہ سے اس پر عمل نہ کرے۔ یا اس خط میں تحریف کردی گئی ہو۔ ان چار میں سے کوئی ایک چیز ہو تو یاد دہانی کی ضرورت پیش آئے گی۔ لیکن اگر پہلا خط محفوظ ہے، جوں کا توں موجود ہے، اور لوگ اس پر عمل کر رہے ہیں تو یاد دہانی کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس لیے یاد دہانی کے لفظ میں ہی یہ بات پوشیدہ ہے کہ پہلے بھی جو پیغام بھیجا گیا تھا۔ وہ بھی اللہ کا پیغام تھا۔ آپ لوگوں نے یا تو اسے بھلا دیا، یا گم کر دیا، یا اس میں ملاوٹ کر دی یا اس پر صحیح طریقہ سے عمل درآمد کرنا چھوڑ دیا، ان چاروں میں سے کوئی ایک شکل ہوئی یا ساری شکلیں ہوئیں تو یاد دہانی کے لیے یہ نئی کتاب بھیجی گئی۔ اب یاد دہانی میں کوئی چیز اگر ایسی ہے جو پچھلی کتاب میں بھی تھی تو یہ ایک فطری بات ہے۔ اب کوئی کہے کہ reminder میں یہ مضمون کیوں دہرایا گیا۔ تو اس سے کہا جائے گا کہ یہ ایک یاد دہانی ہے۔ اس میں پرانی تحریر کے مندرجات تو لازماً دہرائے جائیں گے۔ پرانے خط کا پیغام تو دوبارہ لکھا ہی جائے گا۔ اس لیے کہ اسی کی تو یاد دہانی مقصود ہے۔ لہٰذا جو کچھ اس موجودہ تحریر میں نہیں لکھا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بعد میں کسی نے ملایا۔ جو نہیں لکھا وہ زیادہ اہم ہے۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئے، اور بولے کہ فی الحال تو میرے پاس ان سب باتوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔

اس لیے قرآن مجید کو الکتاب کا جو نام دیا گیا وہ انتہائی بامعنی ہے اور اس کا ایک خاص مفہوم اور پس منظر ہے۔

قرآن پاک کا ایک وصف 'الذکر' بھی ہے۔ یہ وصف سابقہ کتابوں سے اس کتاب کے تعلق کی نوعیت کو بتاتا ہے۔ الذکر کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو سابقہ کتب کے پیغام کی یاد دہانی اور دوسرا خود قرآن مجید کے مضامین کی بار بار تکرار اور یاد دہانی۔ یہ بار بار آنے والے مضامین بھی عموماً وہی ہیں جو دین کی اساسات اور مکارم اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی رنگ میں، اجمالی انداز میں، سابقہ کتابوں میں بھی بیان ہوئے تھے۔

قرآن مجید میں سابقہ کتب کا جہاں انفرادی طور پر ذکر آیا ہے تو الکتاب کے نام سے آیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سیاق وسباق میں الکتاب کا ذکر

ہے۔لیکن جہاں سابقہ کتب کا بغیر کسی نبی کے سیاق کے مجموعی طور پر تذکرہ ہے وہاں کتب کا لفظ بہ صیغہ جمع آیا ہے۔اس میں ایک بات غور طلب ہے۔وہ یہ کہ ان سب کتابوں کا بعض جگہ تو جمع کے صیغے سے ذکر کیا گیا ہے جیسے۔ کل آمن باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسلہ۔یہاں کتب کا لفظ صیغہء جمع میں آیا ہے جو بلا شبہ بہت مناسب اور برمحل ہے کہ یہ سب بہت سی کتابیں تھیں،جن کا ذکر مقصود ہے۔ایک روایت میں آیا ہے کہ نازل کی جانے والی کل کتابیں ۱۰۴ تھیں۔اور ایک دوسری روایت سے پتا چلتا ہے کہ یہ سب ملا کر ۳۱۵ کتابیں تھیں۔ہوسکتا ہے کہ ۱۰۴ بڑی کتب ہوں اور چھوٹے صحیفے ملا کر یہ تعداد ۳۱۵ بنتی ہو۔بہرحال یہ ایک الگ گفتگو کا موضوع ہے۔لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو صیغہ جمع میں بیان کرنا بالکل برموقع اور برمحل ہے۔لیکن ایک جگہ سورہ مائدہ میں ان سب کتابوں کے لیے واحد کا صیغہ یعنی الکتاب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مصدقا لمابین یدیہ من الکتاب۔گذشتہ کتاب کی تصدیق کرنے والا اور اس کو سچا بتانے والا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر سابقہ نوشتے ملا کر سب ایک ہی کتاب تھی تو دوسرے مقامات پر کتب کا لفظ بصیغہ جمع کیوں استعمال کیا گیا،اور اگر یہ سب بہت سی کتب تھیں تو یہاں کتاب بصیغہ واحد کیوں فرمایا گیا۔یہ بہت اہم سوال ہے اور قرآن مجید کے گذشتہ کتابوں کے ساتھ تعلق کی ایک اور نوعیت کو بیان کرتا ہے۔

قرآن مجید کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ کوئی نئے نبی ہیں اور گذشتہ انبیاء کی تعلیم کی نفی کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔انہوں نے تو بار بار یہ اعلان فرمایا کہ وہ گذشتہ انبیاء کی تعلیمات کی تصدیق کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ان کی لائی ہوئی کتابوں اور ان کی عطا کردہ شریعتوں کی تصدیق کرنے کے لیے تشریف لائے ہین۔ان کی لائی ہوئی کتابوں اور ان کی دی ہوئی شریعتوں کے تسلسل اور تکمیل کی غرض سے تشریف لائے ہیں۔مکارم اخلاق موجود تھے،ان کی تکمیل کے لیے آئے،وحی الٰہی موجود تھی،اس کی تکمیل اور بھولا ہوا سبق دوبارہ پڑھانے اور یاد دلانے کے لیے تشریف لائے۔گذشتہ ساری کتابوں کو تسلیم کرنا اور ان کی حقانیت کا اعتراف کرنا اسلام کی بنیادی تعلیمات کا حصہ ہے۔لیکن ان سب کتابوں میں ایک اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے،اور ایک دوسرے اعتبار سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ایک اعتبار سے ان سب کے لیے صیغہ واحد استعمال کیا گیا،اور

دوسرے اعتبار سے ان کی طرف صیغہ جمع سے اشارہ کیا گیا۔اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے۔

مثال کے طور پر اگر آپ سے کہا جائے کہ آپ ایک کتاب لکھیں، پاکستان میں تدریس قرآن کے مسائل، آپ اردو میں اس موضوع پر کتاب لکھ کر تیار کر دیں۔ اللہ کا کرنا ایسا ہو کہ آپ کی کتاب بے حد مقبول ہو جائے۔اسے دیکھ کر مصر کے مسلمان آپ سے درخواست کریں کہ آپ ان کے لیے بھی ایسی ہی ایک کتاب عربی زبان میں لکھ دیں: مسائل تدریس القرآن فی مصر، اس کے بعد امریکہ کے مسلمان خواہش ظاہر کریں کہ آپ ایسی ہی ایک کتاب ان کے لیے بھی لکھ دیں۔اس پر آپ ان کے لیے ایک کتاب انگریزی میں بھی تصنیف کر دیں Problems of Teaching The Quran in America' اب یہ تین کتابیں جو تیار ہوئی ہیں ان کا آپس میں کیا تعلق ہوگا۔ یہ تینوں کتابیں اس اعتبار سے ایک ہی کتاب کہلائیں گی، یا ایک ہی کتاب کے تین ایڈیشن کہلائیں گی کہ آپ نے دور جدید میں مسلمانوں کو قرآن پڑھانے کے مسائل بیان کیے ہیں۔ تینوں کتابوں میں مسلمانوں سے ہی خطاب کیا ہے، مقصد بھی تینوں کتابوں کا ایک ہی ہے کہ مسلمان کلام الٰہی کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ان مشترک اوصاف و مقاصد کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے ایک کتاب لکھی، اور اس ایک کتاب کے تین ایڈیشن تیار کیے ہیں۔ ایک پاکستانی مسلمانوں کے لیے، دوسرا مصری مسلمانوں کے لیے اور تیسرا امریکی مسلمانوں کے لیے۔ لیکن ان تینوں کتابوں میں ایک اعتبار سے بڑا فرق ہوگا۔ جو مقامی مثالیں ہیں وہ ہر کتاب یا ہر ایڈیشن میں الگ الگ ہوں گی۔ مثلاً آپ کتاب کے اردو ایڈیشن میں یہاں کے دینی مدارس کی مثالیں دیں گی، امریکہ میں دینی مدارس کی مثال نہیں دی جا سکتی، وہاں کے کسی دینی ادارے کی مثال دینی پڑے گی، یہاں مثلاً آپ علی گڑھ اور دارالعلوم دیو بند کی مثالیں دیں گی۔ مصر میں جامعہ ازہر کی مثال دیں گی۔ مثالیں مختلف ہوں گی، مسائل مختلف ہوں گے۔ جن شخصیات کا ذکر یہاں کے اردو ایڈیشن ہوگا ان کا ذکر انگریزی یا عربی ایڈیشنوں میں نہیں ہوگا۔ مثلاً یہاں کے مفسرین قرآن کے تذکرہ میں مولانا مودودی، مولانا اصلاحی، مولانا تھانوی، مولانا احمد علی لاہوری وغیرہ کی، وہاں کی کتاب میں سید قطب شہید، رشید رضا، مفتی محمد عبدہٗ وغیرہ کی مثالیں آئیں گی۔

اس اعتبار سے یہ مختلف کتابیں ہوں گی۔ کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ آپ نے تین

مختلف کتابیں لکھیں ہیں، ایک اردو میں، دوسری عربی میں اور تیسری انگریزی میں۔ یہی مثال گذشتہ آسمانی کتابوں کی ہے کہ وہ اس اعتبار سے الکتاب ہیں (مصدقالما بين يديه من الكتاب)، کہ ان کا مقصد ایک، ان کا بھیجنے والا ایک، ان کی دعوت ایک۔ لیکن اس اشتراک کے باوجود ان میں سے ہر کتاب کو الگ الگ کتاب بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ کتابیں مختلف زمانوں میں بھیجی گئیں، مختلف علاقوں میں ان کو اتارا گیا، ان کو لانے والے انبیاء الگ الگ تھے، یہ کتابیں، متعدد زبانوں میں بھیجی گئیں، ان میں بیان کردہ تفصیلات میں فرق تھا۔ اور ماحول اور سیاق وسباق میں فرق تھا۔ اس لیے ان کو الگ الگ کتاب بھی کہا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کا ایک اور نام الفرقان بھی ہے۔ تبارك الذى نزل الفرقان علىٰ عبده ليكون للعالمين نذيرا۔ آپ دیکھیں کہ قرآن اور فرقان دونوں کا وزن ایک ہے۔ فرقان کے مفہوم میں بھی دوام اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ فرقان وہ دائمی کسوٹی ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہو۔ اس دائمی کسوٹی کا نام قرآن ہے۔ باقی جتنی کسوٹیاں ہیں وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔ یا تو وہ زمانے کا ساتھ نہیں دے پاتیں، یا زمانہ ان کا ساتھ نہیں دے پاتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ماضی میں فرقان الٰہی رہی ہوں اور ماضی میں ان سے حق و باطل کے درمیان فرق کرنے میں مدد ملی ہو۔ لیکن ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ حق و باطل میں تمیز کرنے میں ان سے مدد نہیں ملے گی۔ یا ایک علاقہ میں مدد ملے گی اور دوسرے علاقہ میں نہیں ملے گی۔ وہ چیز جو دائمی اور مسلسل انداز میں حق و باطل کے درمیان فرق کرے وہ الفرقان ہے۔ افسوس کہ اردو زبان میں انگریزی کے **The** اور عربی کے ال کا مترادف موجود نہیں ہے۔ اس لیے ال اور **The** میں جو زور پایا جاتا ہے اسے عربی اور نگریزی سے ناواقف اردوداں حضرات کے لیے سمجھنا دشوار ہے۔

اس کتاب کا ایک نام الھدیٰ بھی ہے۔ یعنی کتاب ہدایت اور لوگوں کی رہنمائی کرنے والا ضابطہ ہدایت۔ لیکن ھدیٰ کے مفہوم میں دو مختلف سطحیں ہیں جو ہدایت اور راہنمائی کی دو قسموں یا سطحوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ قرآن پاک میں ہدایت کا لفظ دونوں سطحوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ قرآن پاک میں آیا ہے هدى للمتقين، یعنی یہ کتاب ہدایت ہے اہل تقویٰ کے لیے۔ اور ایک دوسری جگہ آیا ہے هدى للناس، یعنی یہ کتاب ہدایت ہے تمام انسانوں کے لیے۔ سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ یہ کتاب اگر صرف متقین کے لیے ہدایت اور رہنما

ہے تو پھر دوسری جگہ ھدی للناس کہہ کر تمام انسانیت کا نام کیوں لیا گیا، اور اگر پوری انسانیت کے لیے کتاب ہدایت ہے تو پھر یہاں صرف متقین تک کیوں محدود کیا گیا۔ بظاہر یہ تعارض محسوس ہوتا ہے، لیکن دراصل یہ کوئی تعارض یا تناقض نہیں ہے۔ بلکہ ہدایت کے دو پہلو ہیں، یا راہنمائی کی دو مختلف سطحیں ہیں۔ آپ ان کو سمجھ لیجیے۔

ہدایت کے لغوی معنی راستہ بتانے کے آتے ہیں۔ راستہ بتانے کے ہر جگہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک راستہ بتانا ہوتا ہے عام انسانوں کے لیے۔ اور ایک راستہ بتانا ہوتا ہے خاص لوگوں کے لیے۔ مثال کے طور پر اگر آپ اپنے گھر میں تشریف فرما ہوں اور کوئی شخص فون کر کے آپ سے پوچھے کہ قرآن مجید کے متعلق یہ جو گفتگو ہو رہی ہے وہ کہاں ہو رہی ہے۔ تو آپ اسے فون پر ہی بتا دیں گی کہ آپ فلاں فلاں جگہ چلی جائیے۔ شہزاد ٹاؤن آئے گا، وہاں فلاں جگہ فلاں مکان میں یہ گفتگو رہی ہے، آپ نے راستہ بتا دیا۔ اور رہنمائی کر دی۔ یہ ہدایت کا عام مفہوم ہے۔ قرآن مجید اس مفہوم میں ہر انسان کے لیے کتاب ہدایت اور راہنما ہے۔ اس کا بتایا ہوا یہ راستہ ہر انسان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ لیکن فرض کیجیے آپ کی کوئی بہت قریبی عزیز اور قابل احترام ہستی، مثلاً آپ کی والدہ محترمہ، آپ سے پوچھیں کہ یہ پروگرام کہاں ہو رہا ہے، اور وہ اس میں شرکت کرنے کی خواہش ظاہر کریں تو آپ انہیں محض زبانی راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کریں گی۔ بلکہ گاڑی میں بٹھا کر یہاں چھوڑ جائیں گی۔ یہ بھی رہنمائی کی ایک سطح ہے گویا عربی زبان میں رہنمائی کا ایک درجہ تو ہے اراءۃ الطریق، راستہ بتا دینا، اور دوسرا درجہ ہے ایصال الی المطلوب، یعنی مطلوب تک پہنچا دینا۔ قرآن پاک ہدایت ہے تمام انسانوں کے لیے پہلے مفہوم میں کہ راستہ سمجھا دیتا ہے۔ جو سمجھنا چاہے سمجھ لے۔ لیکن ہدایت کا دوسرا درجہ مطلوب تک پہنچا دینے کا ہے۔ جب کوئی انسان راستہ کو سمجھ کر تقویٰ اختیار کر لیتا ہے تو پھر یہ کتاب ہاتھ پکڑ کر اسے منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ جیسے آپ نے اپنے خاص آدمی کو اس کی منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے خاص لوگ ہو جاتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب صرف راستہ بتانے پر اکتفاء نہیں کرتی، بلکہ ہاتھ پکڑ کر منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔

اس کتاب کا نام النور بھی ہے۔ یعنی روشنی، یہ وہ خاص اور واحد روشنی ہے جو اس سفر میں راستہ بتاتی ہے جس کا راستہ کوئی دوسرا نہیں بتا سکتا۔ کسی اور جگہ سے اس راستے کے لیے روشنی نہیں

مل سکتی۔ کفر اور شرک کے اندھیروں میں اور ظلم اور ناانصافی کی تاریکیوں میں، یہ کتاب ایک مشعل نور ہے۔ اسلام کی تعلیم کی رو سے ایمان روشنی ہے اور کفر تاریکی۔ علم روشنی ہے اور جہالت تاریکی۔ عدل روشنی ہے، اور ظلم تاریکی۔ یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے، بلکہ حدیث میں آیا ہے۔ الظلم ظلمات یوم القیامة، ظلم قیامت کے دن ایک اندھیرے کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اس تاریکی میں جو کتاب روشنی فراہم کرے گی وہ یہی قرآن مجید ہے، اس لیے اسے النور کہا گیا ہے۔

یہ تو قرآن پاک کے وہ نام ہیں جو بغیر کسی صفت کے استعمال ہوئے ہیں۔ گویا اس کے اپنے نام ہیں۔ ان ناموں کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں اس کے بہت سے اوصاف اور بھی بیان ہوئے ہیں جو تقریباً پچاس کے قریب ہیں۔ ان سب کا تذکرہ کرنے اور ان کی معنویت بیان کرنے کے لیے بڑا طویل وقت درکار ہے۔ ان میں سے ہر صفت کا ایک خاص پس منظر اور ایک خاص مفہوم ہے، کتاب مجید، کتاب عظیم، کتاب مبین، وغیرہ وغیرہ ان میں سے ہر صفت قرآن مجید کے کسی نہ کسی اہم اور بنیادی وصف کو ظاہر کرتی ہے۔

قرآن مجید کے ان تمام اوصاف میں ایک صفت بے حد اہم ہے اور وہ ہے مہیمن۔ اسی آیت میں ہے جس کا ابھی حوالہ دیا گیا۔ یعنی مصدقالما بین یدیه من الکتاب و مهیمنا علیه۔ یہ صفت بیان ہوئی ہے۔ مہیمن کے لغوی معنی تو ہیں حاوی یا محافظ، سرپرست اور نگراں، هیمن عربی زبان کا صیغہ ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں کسی چیز پر حاوی ہو جانا۔ لیکن اصل عربی لغت میں یہ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ جب مرغی اپنے چوزوں کو لے کر پھر رہی ہو اور کوئی جانور اس پر حملہ آور ہو اور مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں دبا لے تو اس کیفیت کو هیمنة کہتے ہیں۔ یعنی اس عمل کے لیے عربی زبان میں هیمنة استعمال ہوا ہے، جس میں حفاظت کا مفہوم بھی شامل ہے، خطرات سے بچانے کا بھی، محبت کے تعلق کے اظہار کا بھی اور جن چیزوں کی حفاظت کی جاری ہے ان سے گہری اپنائیت اور ملکیت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یہ سارے مفاہیم اس ایک لفظ کے اندر موجود ہیں۔

جب قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ وہ گذشتہ تمام آسمانی کتابوں پر مہیمن ہے تو اس کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ گذشتہ آسمانی کتب میں جو شریعتیں دی گئیں ان سب شریعتوں کی بنیادی اساس، ان کی روح اور ان کا جوہر اس کتاب میں محفوظ ہے۔ یہاں اس بات کی تھوڑی سی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح ایک فرد کی تعلیم ہوتی ہے، اسی طرح

ایک قوم کی تعلیم بھی ہوتی ہے، اور جس طرح ایک قوم کی تعلیم ہوتی ہے، اسی طرح پوری انسانیت کی تعلیم بھی ہوتی ہے۔

فرد کی تعلیم کیسے ہوتی ہے؟ آیئے دیکھتے ہیں۔ پہلے بچے کو اب ت پڑھائی جاتی ہے، پھر وہ پرائمری اسکول میں داخل ہوتا ہے اور اس کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں اخلاقی تعلیمات سکھائی جاتی ہیں، سچ بول، بڑوں کا کہنا مان، ادب کر، وغیرہ وغیرہ یہ سب کچھ بہت آسان الفاظ میں سکھایا جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ دیگر علوم آہستہ آہستہ پڑھتا ہے اور اسی طرح ہوتے ہوتے جب وہ پی ایچ ڈی کر لیتا ہے تو پھر اسے کسی استاد کی ہر قدم پر رہنمائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسے جو علم اب حاصل ہو گیا ہے اس کی روشنی میں وہ اب خود ہی پڑھتا رہتا ہے، اور اپنا کام خود ہی چلاتا رہتا ہے۔ یہ ایک عام انسانی مشاہدہ ہے۔ پوری انسانیت کی تعلیم بھی اسی طور پر ہوئی اور یہی مفہوم ہے ختم نبوت کا۔

شروع میں جب انبیاء کرام بھیجے گئے تو وہ انسانیت کو دین کی ابجد کی تعلیم دینے کے لیے بھیجے گئے، اللہ کو ایک مانو، اسی کو پوجو، سچ بولو، قیامت برحق ہے، سرکش مت بنو، اس طرح کی ابتدائی ہدایات دینے پر اکتفاء کیا گیا۔ پھر جیسے جیسے انسانیت ترقی کرتی گئی پرائمری، سکینڈری اور ہائر سکینڈری کی تعلیم اسے دی جاتی رہی، انسانیت اور انسانوں کی فکری، عقلی اور روحانی سطح بلند ہوتی گئی، یہاں تک کہ جب انسانیت اپنی پختگی کو پہنچ گئی تو پھر اسے پی ایچ ڈی کروا دیا گیا۔ اور یہ بتا دیا گیا کہ اب اس آخری اور تکمیلی تعلیم کے بعد اس رہنمائی کی روشنی میں خود اپنا کام چلاؤ، اب مزید کسی استاد کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب تمہیں اتنا علم دے دیا گیا ہے اور تم میں اب اتنی پختگی آ گئی ہے کہ تم خود اپنے علم واجتہاد سے کام لے سکتے ہو اور دین کی عمومی راہنمائی اور شریعت کے احکام کی حدود میں اپنے مسائل خود حل کر سکتے ہو۔ ختم نبوت تقریباً اسی انداز کی چیز ہے۔

جب انسانیت کی تعلیم کا یہ عمل جاری تھا تو مختلف قوموں اور قبیلوں کی ضروریات اور مزاج کے مطابق ان کو تعلیم دی جا رہی تھی۔ انسانوں میں مختلف مزاج کے لوگ ہوتے ہیں، کوئی سخت ہیں اور کوئی نرم ہیں، کچھ لوگ شریعت کے ایک پہلو سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اور کچھ دوسرے پہلو سے۔ کچھ لوگوں کے اندر مادیت کا بہت غلبہ ہوتا ہے اور کچھ لوگ روحانی جذبہ زیادہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب انبیاء کرام کو بھیجا تو جس قوم کا جو مزاج تھا اس کے حساب سے انہیں

شریعت دی گئی۔ اگر آپ توریت کا مطالعہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں احکام بہت سخت ہیں۔ لیکن انجیل کے احکام نہایت نرم ہیں۔ توریت میں مخصوص احکام پر زیادہ زور ہے اور انجیل میں عمومی احکام پر۔ زبور میں مناجاتیں اور دعائیں ہیں۔

جب یہودیوں کو ڈسپلن کرنا مقصود تھا جو کہ سخت سرکش قوم تھی، تو ان کو اسی قسم کے احکام دیے گئے جن کا مجموعہ توریت ہے۔ یہودیوں نے جب کئی ہزار سال کے انحراف کے بعد ایک ایسا انداز اپنایا جس میں قانون و شریعت کے ظاہری پہلو پر تو بہت زور تھا لیکن اس کی روح پر زور نہیں تھا۔ وہ احکام شریعت کی ظاہری پابندی تو کرتے تھے، لیکن ان احکام کی اصل روح اور ان کا اصل مقصد فوت کر دیتے تھے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ہفتے کے دن شکار مت کرو تو انہوں نے طے کیا کہ پانی کے حوض اس طرح سے بنائے جائیں کہ دریا سے نالی یہاں نکال کر حوض تک لے آئیں تاکہ مچھلیاں اس میں آ جائیں، اور ظاہر یہ ہو کہ ہم نے شکار نہیں کیا، مچھلیاں خود ہی ہمارے تالاب میں آ گئی ہیں۔ گویا ظاہری طور پر عمل کر لیتے تھے لیکن اس کی روح سے غافل تھے۔ حکم کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس ایک دن کو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے خاص کر لو اور کسی دنیاوی سرگرمی میں حصہ نہ لو۔ اس حیلہ بازی سے وہ مقصد فوت ہو گیا۔

اس کے مقابلے میں عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ تعلیم دی کہ قانون کے ظاہری الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کی روح پر بھی عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ عیسائیوں نے روح شریعت پر اتنا زور دیا اور عمومیات پر اتنا زیادہ عمل کرنا شروع کیا کہ پہلے شریعت کے ظاہری اور جزوی احکام کو چھوڑا اور بالآخر ساری شریعت ہی منسوخ کر دی اور اپنی دانست میں صرف شریعت کے باطن پر عمل کرنے لگے۔ اس دوران میں ایک مرحلہ ایسا آیا کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام مناجاتیں لے کر آئے۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام جب دنیا میں مادیت کا غلبہ ہوا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کمزور ہو گیا تو اس کو دوبارہ استوار کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی۔ اس موقع پر مناجاتیں نازل کی گئیں تاکہ وہ کمزور پڑتا ہوا تعلق دوبارہ مستحکم ہو سکے۔

یہ گویا تین مشہور آسمانی کتابوں کے تین بنیادی اوصاف ہیں۔ اسی پر آپ بقیہ کتابوں کو بھی قیاس کر لیں۔ قرآن مجید میں یہ تینوں چیزیں موجود ہیں۔ سخت احکام بھی ہیں، نرم ہدایات بھی ہیں اور روح دین پر بھی زور ہے۔ عمومیات کا بیان بھی ہے، شریعت کے مظاہر اور حدود اللہ بھی

بتائے گئے ہیں' مناجاتیں بھی ہیں۔ سخت احکام ان کے لیے' جن کو ڈسپلن کرنے کی ضرورت ہے۔ نرم احکام ان کے لیے جنہیں نرمی درکار ہے۔ دعائیں اور مناجاتیں ان کے لیے جنہیں تعلق مع اللہ استوار کرنے کی ضرورت ہو۔ اس لیے کہ قرآن مجید ہر زمانہ، ہر دور، ہر علاقہ اور ہر مزاج کے انسان کے لیے ہے، جب ان سب چیزوں کو ملا کر ان پر بیک وقت عمل درآمد کیا جائے گا تو سارے تقاضے بیک وقت پورے ہوتے جائیں گے۔ اس مفہوم میں قرآن پاک مہیمن ہے' گذشتہ تمام کتب پر، اور ان کتابوں کے تمام بنیادی اوصاف اور مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔

مہیمن کا ایک دوسرا مفہوم یہ ہے کہ گذشتہ کتب میں جو کچھ پیغام دیا گیا تھا وہ سارا قرآن مجید میں موجود ہے۔ ایک اعتبار سے ان کتابوں کے حاملین نے اس پیغام کو ضائع کر دیا۔ لیکن اس اعتبار سے قرآن مجید نے ان کتابوں کے اس پیغام کو محفوظ رکھا۔ اگر آج آپ یہ جاننا چاہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کی کیا تھی تو قرآن سے معلوم ہو جائے گا۔ واذکر فی الکتاب موسیٰ، واذکر فی الکتاب ابراھیم، واذکر فی الکتاب اسمعیل، وغیرہ وغیرہ۔ یوں جتنے بھی کتاب الٰہی کے علمبرداران گذرے ہیں ان تمام کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ اور ان کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیمات کا خلاصہ اور عطر بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یوں قرآن مجید نے ان تمام کتابوں کی بنیادی تعلیمات کا جوہر اپنے اندر اسی طرح محفوظ کر لیا ہے۔ جیسے مرغی اپنے بچوں کو ضائع ہونے سے محفوظ کر لیتی ہے۔

یہ تھا قرآن مجید کا ایک انتہائی مختصر اور عمومی تعارف۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

سوال وجواب

سوال: آج کل بہت سے لوگ دہریت کے مرض میں مبتلا ہیں۔ انہیں کس طرح تبلیغ کی جائے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دہریت کے فتنے میں گرفتار ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اس فتنہ میں کیوں مبتلا ہوا، اور وہ کون سے اسباب اور محرکات تھے جو اس فتنہ کا ذریعہ بنے۔ سبب معلوم کرنے کے بعد علاج آسان ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ کسی چیز کی ظاہری چمک اور چکا چوند سے

بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ، یورپ گئے، وہاں کا ظاہری حسن دیکھ کر بعض لوگ بہت جلدی متاثر ہو جاتے ہیں۔ ان کی ہر چیز اچھی اور اپنی ہر چیز بری لگنے لگتی ہے۔ لیکن چند سال بعد خود بخود عقل ٹھکانے آ جاتی ہے (اور اب تو بہت تیزی سے آنے لگی ہے)۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ چند مغربی افکار اور تصورات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ جس پہلو سے غلط فہمی ہوئی ہو اسی پہلو سے اسے دور بھی کیا جائے۔ لیکن جدید تعلیم یافتہ نوجوان لوگوں کو اسلام سے متاثر کرنے کا بہترین اور سب سے موثر طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ان کارناموں سے متعارف کرایا جائے جو اسلامی تاریخ میں مسلمانوں نے سائنس، تہذیب، تمدن اور علوم وفنون کے میدان میں انجام دیے۔ اس سے ان کے اندر اعتماد پیدا ہوگا۔ ہوتا یہ ہے کہ مغربی افکار اور ثقافت کی چمک بہت گہری ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے ورثہ اور تاریخ کی واقفیت بھی نہیں ہوتی۔ اس عدم واقفیت کی وجہ سے اپنے ورثہ پر اعتماد نہیں ہوتا اور اس عدم اعتماد کی وجہ سے اپنے مستقبل سے مایوسی طاری رہتی ہے۔ دوسروں کے ورثہ سے خوب آگاہی ہوتی ہے۔ اس لیے اعتماد بھی انہی کے مستقبل سے وابستہ رہنے پر ہوتا ہے۔ آپ ایک بچے سے شیکسپیر کے بارے میں پوچھیں تو وہ خوب بتائے گا، شاید اس کے بہت سے اشعار بھی سنا دے، لیکن ذرا اس سے مولانا رومؒ کے بارے میں دریافت کر کے دیکھیں تو شاید اس نے نام بھی پہلی مرتبہ سنا ہوگا۔

میں ایک صاحب سے ملا ہوں۔ اسپینی مسلمان ہیں۔ نومسلم ہیں اور اسلام کے بہت پرجوش مبلغ ہیں۔ ان کے اثر ورسوخ سے تقریباً بیس بائیس ہزار اسپینی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ ان کا اسلام سے واسطہ اس طرح پڑا کہ ان سے اسپینی حکومت نے کہا کہ ۱۴۹۲ میں اسپین میں مسلمانوں کا زوال ہوا تھا۔ اس لیے ۱۹۹۲ میں مسلمانوں کے زوال کا پانچ سو سالہ جشن منایا جائے اور اس بات کی خوشی منانے کا اہتمام کیا جائے کہ مسلمان یہاں سے پانچ سو سال قبل نکالے گئے تھے۔ ان صاحب سے کہا گیا کہ اس سلسلے میں آپ ایک کتاب مرتب کریں جس میں اس دور کے مسلمانوں کے مظالم اور ناانصافیوں کا تذکرہ ہو۔ جب انہوں نے مطالعہ شروع کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ عربی زبان سیکھے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انہوں نے عربی زبان سیکھ لی اور مسلمانوں کی تاریخ پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کام کے دوران میں وہ اپنے ذاتی مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچے

کہ اسپین کی تاریخ کا سنہری اور زریں دور وہ تھا جب مسلمان یہاں حاکم تھے۔ علوم وفنون کا چرچا ہوا، ادارے بنے، بہترین عمارتیں تعمیر ہوئیں' مفید کتابیں لکھی گئیں۔ نہ مسلمانوں سے پہلے اس قدر کام ہوا تھا اور نہ مسلمانوں کے بعد ہوا۔ یوں انہیں اسلام سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں کے کارنامے جاننے کا موقع ملا اور اس طرح اسلام پر اعتماد پیدا ہونا شروع ہوا۔ اب انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ شروع کیا۔ پھر حدیث کا مطالعہ کیا اور بالآخر اسلام قبول کرلیا۔ اپنا سابقہ منصوبہ ادھورا چھوڑ کر اسلام کی تبلیغ میں لگ گئے۔ انہوں نے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ پورا نام عبدالرحمٰن مدینہ مولیرا ہے۔ میں ان سے کئی بار ملا ہوں۔ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ ان کے تجربہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل کمزوری ناواقفی اور اعتماد کا فقدان ہے۔

بعض اوقات ایسے عجیب وغریب راستے سے بھی ایک انسان اسلام کی جانب آجاتا ہے کہ بظاہر اسلام کی مخالفت پر کام شروع کیا جو اسلام کی منزل پر منتج ہوا۔ ایک اور صاحب کو میں جانتا ہوں جو امریکی ہیں، انتہائی پرجوش مسلمان ہیں، وہ دراصل فلسفے کے طالب علم تھے۔ فلسفہ کا مطالعہ کرتے کرتے مسلم فلاسفہ سے متعارف ہوئے۔ پھر تصوف اور شیخ محی الدین ابن عربی سے مانوس ہوئے۔ عربی کی کتابیں پڑھتے پڑھتے تصوف کی طرف مائل ہوگئے اور صوفیائے اسلام کا مطالعہ کرنا شروع کردیا۔ ان کا مطالعہ کرنے سے محدثین کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور محدثین سے مفسرین تک آگئے اور بالآخر اسلام قبول کرلیا۔ اس لیے کسی بھی راستہ سے کوئی شخص دین اسلام کے قریب آسکتا ہے۔

خطبہ سوم

تاریخ

نزول قرآن مجید

۱۹ اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج کی گفتگو کا عنوان ہے "تاریخ نزول قرآن مجید" اس گفتگو میں بنیادی طور پر جو چیز دیکھنی ہے وہ قرآن مجید کے نزول کی تفصیل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مجید کی ترتیب و تدوین اور قرآن مجید کے موضوعات کی اندرونی تشکیل اور وحدت ہے۔ جیسا کہ ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ قرآن مجید کا نزول تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال سے کچھ کم مدت میں مکمل ہوا۔ دوسری آسمانی کتابوں کے برعکس نزول قرآن یکبارگی نہیں ہوا۔ حالات کے تقاضوں اور ضرورت کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا۔ مکہ مکرمہ میں دعوت و تبلیغ کے دوران میں پیش آنے والے مسائل اور پھر مدینہ منورہ اور اس کے گردونواح میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست و معاشرہ کی تاسیس و تشکیل کے عمل کا براہ راست تعلق نزول قرآن اور اس کے اسلوب سے تھا۔ نزول قرآن کو عرب میں واقع ہونے والی تبدیلیوں سے براہ راست مربوط کیا گیا۔ مدینہ منورہ کے نئے اسلامی معاشرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی اور صحابہ کرامؓ کے تعاون سے جو حیرت انگیز اور زبردست تبدیلی رونما ہو رہی تھی، نزول قرآن کا اس تبدیلی سے گہرا اور براہ راست تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے مختلف حصے اور مختلف اجزاء وقتاً فوقتاً نازل ہوتے رہے۔ کبھی کسی سوال کے جواب میں قرآن مجید کا ایک حصہ نازل کیا گیا، کبھی کسی چیلنج کے جواب میں کوئی سورت اتاری گئی، کبھی کسی خاص پیدا ہونے والی صورتحال میں ہدایات اور قانون کی تفصیلات جاری کی گئیں، اس طرح جیسے جیسے حالات تقاضا کرتے گئے قرآن مجید کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے۔

اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ چند آیات یا آیات کا مجموعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا تھا۔ لیکن یہ ترتیب موجودہ ترتیب سے بہت مختلف تھی۔ اس لیے قرآن مجید کی آیات اور

سورتوں کی ترتیب پر گفتگو کے ضمن میں دو اصطلاحات بہت کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ ایک ترتیب نزولی، یعنی وہ ترتیب جس کے مطابق آیات نازل ہوئیں۔ دوسری ترتیب تلاوت، یعنی وہ ترتیب جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کو مرتب فرمایا، اس ترتیب کو ترتیب رسولی بھی کہا جاسکتا ہے۔ سورتوں کے باب میں بھی ایسا نہیں تھا کہ پہلے ایک سورۃ مکمل طور پر نازل ہوگئی ہو، اور پھر اس کے بعد دوسری سورۃ کا نزول ہوا ہو، بلکہ بیک وقت کئی کئی سورتیں ایک ساتھ نازل ہوتی رہتی تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت صحیح بخاری میں ہے، **وانه لینزل علیه السور ذوات العدد**۔۔۔ آپؐ کئی کئی سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں، یعنی بیک وقت کئی سورتیں زیر نزول رہتی تھیں۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمادیا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں فلاں آیت سے پہلے اور فلاں آیت کے بعد لکھ لیا جائے۔

اس زمانے میں مکہ مکرمہ میں اور عرب میں لکھنے پڑھنے کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ البلاذری جو ایک مشہور مورخ ہیں، ان کی روایت ہے کہ جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو مکہ میں تقریباً ١٧ اشخاص لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اور غالباً اتنی ہی تعداد مدینہ منورہ میں ہوگی۔ اگرچہ اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی کہ مدینہ منورہ میں لکھنے پڑھنے کا کتنا رواج تھا۔ لیکن اگر قبیلہ قریش کا یہ عالم تھا جو پورے مکہ میں قیادت کے مقام پر فائز تھا، تو پھر یثرب کے لوگوں کا حال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ لکھنے والے بہت محدود تعداد میں تھے اور اکثریت ان لوگوں کی تھی جو لکھنے پڑھنے سے زیادہ مانوس نہیں تھے۔ جب لکھنے پڑھنے کا زیادہ رواج نہیں تھا، تو ظاہر ہے کہ سامان نوشت وخواند بھی زیادہ دستیاب نہیں تھا۔ اس زمانے میں عرب میں کاغذ مل تو جاتا تھا لیکن بہت کم دستیاب تھا۔ عام طور پر لکھنے پڑھنے کے لیے دوسرے وسائل ہوتے تھے۔ جب کبھی کسی کو کچھ لکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی تو جن لوگوں کے پاس مادی وسائل وافر تھے وہ چین سے اور دوسرے ممالک سے درآمد شدہ کاغذ حاصل کرلیا کرتے تھے۔ یہ کاغذ بہت قیمتی ہوتا تھا اور اس کے لیے قرطاس کی اصطلاح خود قرآن پاک میں موجود ہے۔

عرب میں عام طور پر جس چیز پر لکھنے کا رواج تھا اس کو رق کہتے تھے، یہ ایک بڑی سی چیز ہوتی تھی جس کو ہرن کی جھلی سے بنایا جاتا تھا۔ اس کو انگریزی میں **parchment** کہتے ہیں۔ اور آج بھی اس پر لکھے ہوئے پرانے تحریری نمونے دستیاب ہیں۔ مصر میں یہ ایک پوری

صنعت ہے۔ جولوگ آثار قدیمہ کے شائق ہوتے ہیں وہ ان سے واقف ہیں۔ رق کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے، رق منشور، پھیلی ہوئی جھلی پر لکھی ہوئی کتاب کی قسم کھائی گئی ہے۔ جھلی کے لفظ سے یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ کوئی بہت بری یا خام قسم کی جھلی ہوتی ہوگی۔ بلکہ اس کو پھیلا کر ایک عمل سے گزار کر اسے کاغذ کی شکل دے دی جاتی تھی اور اس کی شکل تقریباً ویسی ہو جاتی تھی جیسا موٹا کاغذ' جو آج کل چیزوں کو لپیٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ عام طور پر لکھنے پڑھنے کا سامان نہیں رکھتے تھے وہ عموماً چمڑے کے پارچوں پر، ہڈی پر، یا اونٹ کے شانے کی ہڈی پر لکھا کرتے تھے۔ اس ہڈی سے تقریباً ایک فٹ کی تختی بنائی جاتی تھی۔ جس پر ضروری یادداشتیں اور اہم تحریریں لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک کو بھی انہی چیزوں پر لکھنا شروع کیا گیا۔ ان میں سے کچھ چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جیسے ہی وحی نازل ہوتی فوراً ہی آپ کاتبانِ وحی میں سے جو حضرات دستیاب ہوتے ان کو بلا بھیجتے اور فوراً انہیں لکھوا دیا کرتے تھے۔ آپ ؐ کا طریقہ یہی تھا کہ لکھوا کر عام کرنے سے پہلے اس کو خود سنا کرتے تھے اور سننے کے بعد جب یہ بات یقینی ہو جاتی تھی کہ قرآن پاک کی یہ آیت یا سورت اب درست طور پر لکھ لی گئی ہے تو اس کو عام کرنے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ اس طرح سے مختلف سورتیں اور آیتیں نازل ہوتی رہتی تھیں۔ جب کوئی سورت مکمل ہو جاتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امر کی نشاندہی فرما دیا کرتے تھے کہ اب فلاں سورت مکمل ہو گئی ہے۔ جو سورت مکمل ہو جاتی تھی اس کو صحابہ کرامؓ علیحدہ بھی لکھ لیا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے مختلف سورتیں مکمل ہوتی جاتی تھیں صحابہ کرام ان کو نئے سرے سے اب آخری اور حتمی ترتیب کے مطابق الگ الگ کتابچوں (صحف) کی صورت میں لکھ لیا کرتے تھے۔ اس کا اشارہ خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ رسول من الله يتلو صحفا مطهرة فيها كتب قيمة، یعنی یہ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں جو ایسے پاکیزہ صحیفے (کتابچے) تلاوت کر کے سناتے ہیں جن میں قیمتی تحریریں درج ہیں۔ یہاں کتابچوں اور صحیفوں کی صراحت موجود ہے۔ نامکمل اور زیرِ نزول سورتوں کو الگ کتابچوں میں لکھنا نا قابلِ فہم ہے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ مکمل سورتیں ہی ان کتابچوں یا صحیفوں میں لکھی جاتی ہوں گی۔

اگر آپ تھوڑا سا چشمِ تصور سے دیکھیں اور ذرا اندازہ کریں کہ اس کا طریقہ کیا ہوتا ہوگا

تو بڑی حد تک اس سارے عمل کی ترتیب کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات ایک تختی پر لکھی ہوئی ایک صحابی کے پاس موجود ہیں۔ بقیہ آیات جو اس کے بعد کی ہیں۔ وہ ایک اور جگہ کسی اور تختی یا ہڈی پر لکھی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی آیات شروع میں نازل ہوئیں اور سورۃ کا بقیہ حصہ بعد میں کبھی نازل ہوا۔ ایک حصہ کہیں لکھا ہوا ہے اور دوسرا کہیں اور۔ اسی طرح جب سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں تو انہیں علیحدہ لکھ لیا گیا۔ اور بقیہ حصہ جو بعد میں نازل ہوا اس کو علیحدہ لکھ لیا گیا۔ اس طرح یہ سارا ذخیرہ الگ الگ پرزوں، تختیوں اور جھلیوں پر لکھا ہوا صحابہ کرامؓ کے پاس جمع ہوتا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے روز سے اس کا اہتمام فرمایا کہ قرآن مجید کے جو حصے نازل ہوتے جائیں صحابہ کرامؓ ان کو زبانی بھی یاد کرتے جائیں۔ چنانچہ نماز کا حکم پہلے دن سے دے دیا گیا تھا۔ ابتدائے اسلام ہی سے کوئی دن ایسا نہیں تھا جب مسلمانوں پر نماز فرض نہ ہو۔ معراج کے موقع پر جب موجودہ پانچ اوقات کی نمازیں فرض ہوئیں تو اس سے پہلے سے مسلمان نماز پڑھتے چلے آرہے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دن میں دو وقت کی نماز فرض تھی اور غالباً دو دو رکعت۔ ایک فجر کی اور ایک شام کے کسی وقت کی غالباً عصر کی۔ اس لیے نئے مسلمان ہونے والے صحابی قرآن مجید کو یاد کرنا شروع کر دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو تو غیر معمولی حافظہ دیا ہی تھا، ان کے علاوہ بھی ماضی میں دیگر اقوام ایسی گذری ہیں جن کے ہاں بہت سی چیزوں کو زبانی یاد کرنے کی روایت موجود تھی۔ اس روایت کی وجہ سے لوگوں کے حافظے تیز ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس طرح تخلیق فرمایا ہے کہ وہ جس صلاحیت سے زیادہ کام لیتا ہے۔ وہ صلاحیت اتنی غیر معمولی ترقی کر جاتی ہے کہ دوسرے انسان دنگ رہ جاتے ہیں۔

آج کل ہمارے ہاں یونیورسٹی میں چین سے ایک وفد آیا ہوا ہے۔ ان کے ساتھ سات آٹھ سال کا ایک بچہ ہے جو جوڈو کراٹے کا بہت بڑا ماہر ہے۔ رات اس نے اسلام آباد ہوٹل میں ایک کرتب دکھایا۔ اس نے لوہے کی ایک سلاخ لی، ایسی سلاخ جس سے کہ عام طور پر چھت ڈالی جاتی ہے اور اسے اپنے سر پر اس طرح مارا کہ آہنی سلاخ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یہ میں نے خود اپنی آنکھوں نے دیکھا ہے۔ اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو لامتناہی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ وہ جس صلاحیت کو چاہے بے پناہ ترقی دے کر ایسے مقام تک لے

جا سکتا ہے جہاں دوسرا نہیں جا سکتا۔

عربوں میں غیر معمولی حافظہ کی قوت موجود تھی۔ لوگوں کو سینکڑوں ہزاروں اشعار از بر ہوتے تھے۔ محدثین کرام نے جس طرح احادیث کو یاد کیا اور بیان کیا اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، لیکن یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ محدثین کرام کے بے پناہ حافظہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ عربوں کو اللہ تعالیٰ نے کس غیر معمولی حافظہ سے نوازا تھا۔ جس میں حفظ قرآن اور صحبت رسول کی برکت سے مزید ترقی ہوئی۔ صحابہ کرام نے نہایت تیزی کے ساتھ اس حافظے سے کام لیا اور قرآن مجید کی آیات کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ جتنے اکابر صحابہ کرام تھے ان میں تقریباً سب ہی پورے قرآن مجید کے حافظ تھے۔ بقیہ صحابہ میں جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنا قریب تھا اور جسے بارگاہ رسالتؐ میں حاضری کے جتنے زیادہ مواقع ملتے تھے اتنا ہی زیادہ اسے قرآن مجید یاد تھا۔ بلا استثناء تمام صحابہ کرامؓ کو پورا قرآن مجید یاد ہونا اس لیے بھی مشکل تھا کہ وہ سفر پر بھی آتے جاتے تھے۔ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت بھی وحی نازل ہوتی تھی جب آپؐ مدینہ سے باہر کسی سفر پر ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ نئی نازل ہونے والی وحی مدینہ میں رہنے والے صحابہ کرامؓ کو فوراً معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ اس تازہ نازل شدہ آیت یا سورۃ کو مدینہ منورہ پہنچنے میں وقت لگتا تھا۔ اس لیے تمام صحابہؓ کو تو پورا قرآن یاد نہیں تھا لیکن اکابر صحابہ بیشتر پورے قرآن کے حافظ تھے۔ ان صحابہ کرامؓ کی تعداد بھی ہزاروں میں تھی جن کو پورا قرآن یاد تھا اور لکھے ہوئے قرآن کا پورا ذخیرہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف لوگوں کو زبانی یاد کرا دینے، لکھوا دینے اور چند نسخے تحریر کروا دینے پر ہی اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ اس کا بھی اہتمام فرمایا کہ مکہ مکرمہ کے ان نازک حالات میں جب مسلمانوں پر سختیاں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں، تازہ ترین نازل شدہ آیات کی تحریری نقلیں ہر ہر مسلمان گھر میں پہنچ جائیں اور تعلیم یافتہ صحابہ لوگوں کے گھروں میں جا کر ان کو یہ تازہ آیات اور سورتیں پڑھا دیں۔

جب آپؐ دار ارقم میں تشریف فرما تھے اور سیدنا عمر فاروقؓ وہاں کسی غلط ارادے سے جانے کے لیے نکلے تو اپنی ہمشیرہ کے گھر انہوں نے کیا منظر دیکھا تھا۔ یہ آپ سب کے علم میں ہے کہ حضرت خباب بن ارتؓ دوپہر کے وقت وہاں موجود تھے اور حضرت عمر فاروقؓ کی بہن اور بہنوئی کو سورۃ طٰہٰ کی آیات پڑھا رہے تھے جو ایک کاغذ پر لکھی ہوئی تھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دار ارقم جیسے مشکل زمانہ میں بھی جب لوگوں کے لیے یہ بتانا بھی دشوار تھا کہ وہ اسلام قبول کر چکے ہیں، گھر گھر تعلیم قرآن کا انتظام کیا ہوا تھا۔

آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کے قبول اسلام کا حال تو سنا ہوگا۔ انہوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سنا اور آپ کی نبوت کا شہرہ یمن تک پہنچ گیا، تو حضرت ابوموسیٰ یمن سے تشریف لائے اور کئی دن اس تلاش میں رہے کہ کسی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں پوچھیں کہ آپ کون سے ہیں اور کہاں ہیں۔ لیکن کوئی بتانے والا نہیں ملتا تھا۔ خوف اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ کسی سے کھل کر نہیں پوچھ سکتے تھے۔ کسی طرح انہیں حضرت علیؓ کے بارے میں علم ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں۔ جب حضرت ابوموسیٰ اشعری نے حضرت علی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آپ خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے آ جائیں، کسی کو یہ محسوس نہیں ہونا چاہیے کہ آپ میرے ساتھ جا رہے ہیں۔ ورنہ کفار مکہ آپ کو تنگ کریں گے۔ یہ تھی وہ حالت اور کیفیت جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں تشریف فرما تھے۔

اس حالت میں بھی یہ انتظام اور اہتمام موجود تھا کہ قرآن مجید کا جتنا حصہ نازل ہوتا جائے اسے صحابہ کرامؓ کو زبانی بھی یاد کروایا جائے، تحریری شکل میں لکھوا بھی دیا جائے اور اس کے نسخے تیار کروا کر گھر گھر خواتین کو بھی پہنچائے جائیں اور یوں گویا ایک موبائل درسگاہ قائم ہو جائے اور استاد گھر گھر جا کر لوگوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک فاصلاتی تعلیم کا نظام تھا جیسا کہ آج کل اوپن یونیورسٹیوں کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ یہ نظام اس وقت دار ارقم سے چلایا جا رہا تھا۔ مکہ مکرمہ کے مختلف حصوں میں مختلف فاصلوں پر بیٹھے ہوئے خواتین و حضرات ان موبائل اساتذہ کے ذریعے سے گھر بیٹھے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اور قرآن کے لکھے ہوئے اجزاء ان کو گھروں میں فراہم کیے جا رہے تھے۔ کسی روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عمر فاروقؓ کی بہن کے پاس قرآن مجید کے لکھے ہوئے جو اجزاء موجود تھے وہ کس چیز پر لکھے ہوئے تھے۔ لیکن عموماً اندازہ یہی ہے کہ وہ کاغذ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے وہ کاغذ کا ٹکڑا اپنے تکیے کے نیچے چھپا لیا، یا وہ کاغذ کا ٹکڑا اپنی ران کے نیچے دبا لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کاغذ کا ٹکڑا ہوگا یا **Parchment** کا ٹکڑا ہوگا۔ وہ غالباً کوئی لکڑی کی تختی یا ہڈی کی بنی

ہوئی یا کسی سخت چیز کا ٹکڑا نہیں تھا۔

بہرحال یہ سلسلہ ہجرت تک جاری رہا۔ جب مدینہ منورہ کے لیے ہجرت کا فیصلہ ہوا اس سے قبل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سے زائد معلمین کو دوسرے حضرات سے پہلے ہی مدینہ منورہ روانہ فرمادیا کہ وہاں لوگوں کو اسلام کی دعوت بھی دیں اور اسلام میں داخل ہونے والوں کو قرآن پاک کی تعلیم بھی دیں۔

مکہ مکرمہ میں قیام کے ۱۳ سالہ دور میں جو سورتیں نازل ہوئیں وہ مکی سورتیں کہلاتی ہیں۔ مکی سورت کی تعریف یہ ہے کہ وہ سورت جو ہجرت سے قبل نازل ہوئی وہ مکی سورت ہے۔ اور مدنی سورت وہ ہے جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہو۔ ان دونوں سورتوں کا جغرافیائی طور پر مکہ یا مدینہ شہر میں نازل ہونا ضروری نہیں۔ اگر مدینہ سے باہر بھی نازل ہوئی ہو تو مدنی ہی کہلائی جائے گی۔ چنانچہ آپؐ تبوک کے سفر پر تشریف لے گئے، وہاں نازل ہونے والی آیات یا سورتیں بھی مدنی ہی کہلائیں گی۔ یا مثال کے طور پر آپؐ ہجرت کے بعد تین مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لائے تو ان تینوں مواقع پر مکہ مکرمہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں وہ بھی مدنی ہی کہلاتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔

مکہ مکرمہ میں قرآن مجید کا جتنا حصہ نازل ہوا وہ کم و بیش ۸۶ سورتوں پر مشتمل ہے۔ یہ سورتیں اکثر و بیشتر چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں اور دین کی بنیادی تعلیم اور بنیادی عقائد سے بحث کرتی ہیں۔ ان سورتوں میں توحید، رسالت، آخرت اور مکارم اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔ ان چار موضوعات کے ساتھ ساتھ جن کی تفصیل ایک الگ گفتگو میں بیان ہوگی، مکی سورتوں میں سابقہ انبیاء علیہم السلام میں سے بعض کا تذکرہ ہے، ان کے نمایاں اوصاف بتائے گئے ہیں، ان کی تعلیم و تبلیغ کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے اور ان لوگوں کا بھی تذکرہ ہے جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں دین کی تعلیم کو قبول کیا اور انبیاء کی پیروی کی۔ پھر ان لوگوں کا تذکرہ بھی ہے جنہوں نے دین کی تعلیم کو نہ مانا اور برے انجام سے دوچار ہوگئے۔ یہ وہ نمایاں مباحث اور موضوعات ہیں جو مکی سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔

مکی سورتوں میں روانی اور زور بیان، اسلوب کی غیر معمولی بلاغت اور فصاحت اپنی انتہاء اور معراج کو پہنچی ہوئی ہے۔ عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں فصاحت و بلاغت، روانی

اور زور بیان کا وہ معیار ممکن نہیں ہے، جو مکی سورتوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک بالغ نظر مفسر قرآن نے ان سورتوں کو کڑ کتے ہوئے بادلوں اور متلاطم دریاؤں سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح پہاڑوں میں دریا کی رو ایک تلاطم کے ساتھ گذرتی ہے، یا بادلوں کی گرج اور چمک سوتوں کو بیدار کر دیتی ہے۔ اسی طرح مکی سورتوں کا زور بیان اور مضامین کی روانی سوتوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دیتی ہے۔ یہی انداز ہے مکی سورتوں کا۔ پڑھنے والا خواب غفلت سے بیدار ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ دل کی آنکھوں سے ان سورتوں کو پڑھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو جو صحابہ آپؐ کے ساتھ آئے وہ اپنے ساتھ قرآن مجید کے لکھے ہوئے ذخائر بھی لائے اور مدینہ منورہ میں انصاری صحابہؓ نے بھی یہ سلسلہ شروع کر دیا۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد جو تین کام پہلے سے ہو رہے تھے یعنی آیات کو زبانی یاد کرنا، انہیں زیر تحریر لا کر فوری طور پر محفوظ کر لینا اور دوسروں تک پہنچا دینا، یہ سب کام مدینہ میں بھی برابر جاری رہے۔ مدینہ پہنچ کر صحابہؓ کو نسبتاً پہلے سے زیادہ آسانی اور آزادی حاصل ہوگئی اور اس کو مزید بہتر بنانے کے لیے سرکاری یا ریاستی سرپرستی بھی حاصل ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑا مرکز تو مسجد نبوی میں قائم فرمایا جو صفہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں شب و روز بڑی تعداد میں صحابہ مقیم رہتے اور دن رات تعلیم حاصل کرتے۔ لیکن صفہ کے ساتھ ساتھ مدینہ منورہ کے مختلف حصوں میں تقریباً ایک درجن مساجد قائم ہوئیں جن میں سے نو کا نام تذکرہ محدثین اور ارباب سیر نے کیا ہے۔ ان مساجد میں مختلف صحابہ کرام کو خواتین، بچوں، اور بالغ حضرات کی تعلیم کے لیے مقرر کیا گیا، ان تمام قرآن مراکز کی نگرانی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو مقرر فرمایا جن کی ذمہ داری یہ تھی کہ روزانہ ان مراکز کا جائزہ لیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روزانہ ایک رپورٹ پیش کریں۔ ایک زمانہ میں یہ ذمہ داری حضرت عبادہ بن صامتؓ اور ایک زمانہ میں حضرت ابی ابن کعبؓ نے انجام دی۔ حضرت ابی ابن کعب کا شمار ان صحابہ کرام میں ہوتا ہے جو قرات قرآن اور تفسیر قرآن میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کی تلاوت کی تعریف فرمائی ان میں حضرت ابی بن کعبؓ بھی شامل ہیں۔ ایک مشہور روایت ہے جس میں آپؐ مختلف صحابہ کرام کے بیے

مختلف خصائص بیان فرمائے۔ اسی میں آپؐ نے فرمایا، و اقرأ هم ابی، میری امت میں سب سے بڑے قاری ابی ابن کعبؓ ہیں۔

اس سلسلہ تدریس وتحفیظ قرآن یا قرآنی نیٹ ورک کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور انتظام بھی فرمایا جو ہر سال رمضان کے مہینے میں ہوتا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ آپؐ ہر رمضان میں قرآن مجید کا ایک دور جبریل امین کے ساتھ فرماتے تھے جس کو عرضہ کے لفظ سے حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ عرضہ یا معارضہ دونوں الفاظ حدیث میں آئے ہیں۔ ان کے لغوی معنی تو پیش کش یا کسی چیز کو دوسرے کے سامنے پیش کرنے کے ہیں۔ لیکن یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل امین ایک دوسرے کو قرآن سناتے تھے۔ گویا اپنا یاد کیا ہوا قرآن دوسرے کے سامنے پیش کرتے تھے۔ جتنا حصہ قرآن مجید کا اس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا وہ آپؐ جبریل امین کو سناتے اور جبریل امین سنتے تھے۔ اس کے بعد جبریل امین سنایا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے تھے۔ یہ ایک دور تو جبریل علیہ السلام کے ساتھ ہوتا تھا۔ پھر ایک دوسرا دور صحابہؓ کے ساتھ ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سناتے تھے اور صحابہ کرامؓ جمع ہو کر سنا کرتے تھے اس کے بعد صحابہ کرامؓ سناتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے تھے۔ تاکہ ہر شخص اپنی یادداشت کو درست کر لے۔ پھر صحابہ کرامؓ کے پاس جو نسخے لکھے ہوئے موجود ہوتے تھے انہیں آپؐ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سب کی سماعت فرمایا کرتے۔ اگر کہیں لکھنے میں کسی سے کوئی غلطی یا بھول چوک ہوگئی ہو تو اس کی اصلاح فرما دیا کرتے تھے۔ گویا ایک تصدیق شدہ اور سرکاری طور پر مستند نسخہ ہر صحابی کے پاس موجود ہوتا تھا۔ جس میں قرآن پاک کی آیات اور اجزاء لکھے ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان تحریر شدہ اجزاء میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ایک سال یہ عمل جہاں تک مکمل ہوتا اور اس سے اگلے سال تک اس میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ تو پھر آئندہ رمضان میں اس عمل کو دہرایا جاتا تھا۔ یوں یہ عمل ہر سال ہوتا تھا۔

حضورؐ نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری سال جبریل امین کے ساتھ دو مرتبہ یہ دوَر فرمایا۔ آپ نے اس کا تذکرہ بعض صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ ہر سال جبریل امین میرے ساتھ قرآن مجید کا ایک دور کیا کرتے تھے۔ اس سال انہوں نے دو مرتبہ دور کیا ہے، غالباً یہ اس امر کی

اطلاع ہے کہ آئندہ رمضان میں میں اس دنیا میں موجود نہیں ہوں گا۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد صحابہ کرامؓ کی تعداد میں تیزی کے ساتھ اضافہ شروع ہوگیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ تقریباً تین چار سو میل روزانہ کے حساب سے سرزمین عرب کا رقبہ اسلام کی حدود میں داخل ہونا شروع ہوگیا۔ اور نئے نئے قبائل بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہونا شروع ہوگئے۔ اب ان مختلف قبائل کے کثیر تعداد میں اور تیزی کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ وہ یہ کہ عرب کے مختلف قبائل میں مختلف لہجے رائج تھے۔ عربی زبان تو سب میں مشترک تھی، اس کے قواعد بھی ایک ہی تھے، صرف ونحو بھی ایک تھی، محاورہ اور روزمرہ بھی قریب قریب ایک ہی تھا، ذخیرہ الفاظ بھی کم وبیش مشترک تھا۔ لہجے البتہ مختلف تھے۔ ان لہجوں کی تقریباً وہی شکل تھی جو اردو اور انگریزی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

میں مثال دے کر عرض کرتا ہوں کہ اردو زبان کے بہت سے الفاظ ہیں جنہیں مختلف علاقوں کے لوگ مختلف طرح بولتے ہیں۔ لیکن لکھتے ایک ہی طرح ہیں۔ ہمارے حیدرآباد دکن اور مشرقی یوپی کے لوگ انیس کو ونیس کہتے ہیں۔ اور انتیس کو ونتیس کہتے ہیں۔ اب بظاہر جب یہ لفظ لکھا جائے گا تو ایک ہی طرح لکھا جائے گا۔ لیکن بولا مختلف طرح جائے گا۔

عرب میں بھی اس طرح کا رواج تھا۔ عرب میں بڑے بڑے قبائل کے سات مختلف گروپ تھے۔ ان میں مختلف لہجے مروج تھے۔ مثلاً قبائل کا ایک گروہ تھا جو ال کی جگہ ام بولتا تھا۔ مثال کے طور پر الحمد کو امحمد پڑھتا تھا کہ یہی ان کا لہجہ تھا۔ مشہور حدیث ہے: لیس من البر الصیام فی السفر۔ اس کو وہ اس طرح بولتے تھے :لیس من امبر ام صیام فی ام سفر۔ یہی لہجہ ان کے ہاں رائج تھا۔ اسی طرح ایک اور قبیلہ تھا جو مخاطب کے ک کو (مثلاً کتابک، قلمک، اس کاف کو) شین بولتے تھے۔ لکھتے کاف تھے۔ لیکن پڑھتے شین تھے۔ یہ یاد رہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ لکھتے کاف تھے اور پڑھتے شین تھے تو ہماری مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس قبیلہ میں پڑھے لکھے لوگ ہوتے تھے۔ جو ظاہر ہے بہت تھوڑے ہوتے تھے۔

لہجوں اور تلفظ کا یہ اختلاف انگریزی زبان میں بھی ہے۔ بہت سے الفاظ کا تلفظ انگلستان میں اور ہے، امریکہ میں اور ہے۔ لکھتے دونوں ایک ہی طرح ہیں۔ انگلستان میں often کو آفن بولتے ہیں امریکہ جائیں تو یہی often آفٹن پڑھا جائے گا۔ ہم بچپن سے

multi کوملٹی پڑھتے تھے۔امریکہ جانا ہوا تو سنا کہ ملطائی بولا جاتا ہے۔لفظ ایک ہے،لکھا بھی ایک ہی طرح جاتا ہے لیکن اسے انگریز اور طرح پڑھے گا اور امریکی اور طرح پڑھے گا۔تقریباً اسی طرح تلفظ اور لہجوں کا اختلافِ مختلف عرب قبائل کے مابین بھی پایا جاتا تھا۔اس زمانے میں قبائلی عصبیت اور منافرت اس قدر شدید تھی کہ کسی ایک قبیلے سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنے تلفظ کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلہ کے تلفظ اور لہجے کو اختیار کرلے اور اپنے لہجے کو چھوڑ دے ایک غیر حقیقت پسندانہ بات ہوتی۔آغاز میں اس طرح کا مطالبہ کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ محسوس فرمایا کہ اگر اس موقع پر قبائل سے یہ کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے لہجے چھوڑ کر قریش کے لہجے کو اختیار کرلیں تو ایک نئی بحث اور ایک نیا اختلاف کھڑا ہو جائے گا۔اور یہ کہا جائے گا کہ آپ نعوذ باللہ اپنے قبیلے کی بالادستی چاہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست کی کہ قرآن مجید کو ایک سے زیادہ حرف پر پڑھنے کی اجازت دی جائے،اس لیے کہ ایک لہجہ کی پابندی سے میری قوم کو مشکلات پیش آسکتی ہیں۔اس پر لہجوں کی اجازت دے دی گئی۔حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کے اصرار پر پہلے تین کی، پھر بالآخر سات لہجوں (حروف) میں قرآن پاک پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ پر قرآن مجید سات لہجوں (حروف،احرف میں اتارا گیا ہے۔اصل اور سرکاری لہجہ تو قریش ہی کا رہا ہے، جو عربی زبان کا معیاری اور ٹکسالی لہجہ مانا جاتا تھا،لیکن یہ اجازت دے دی گئی کہ بقیہ لہجوں میں بھی قرآن مجید کو پڑھا جاسکتا ہے۔یہ اجازت جیسا کہ احادیث میں تصریح ہے، امت کی سہولت کی خاطر دی گئی،تاکہ اس وقت فوری طور پر کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو جائے۔چونکہ یہ بات سب لوگ مانتے تھے کہ معیاری زبان قریش ہی کی ہے اور جب کسی جگہ اختلاف ہوتا تو قریش ہی کے ادیبوں اور قریش ہی کے شعراء کے حوالے سے اختلاف کو طے کیا جاتا تھا۔

یہ سلسلہ جاری رہا اور صحابہ کرامؓ میں جس کا تعلق جس لہجے والے قبیلہ سے تھا اس لہجہ میں انہوں نے قرآن پاک کو پڑھنا سیکھ لیا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ قریش کے لہجے سے مانوس ہوتے چلے گئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور کبار صحابہ کرامؓ سے ارتباط اور اختلاط، یہ سب وہ چیزیں تھی جن کی وجہ سے قریش کا لہجہ بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔لیکن اس لہجہ اور تلفظ کو پوری طرح پھیلنے اور اچھی طرح عام ہونے میں ابھی وقت لگنا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے ہجرت کیے تقریباً نو برس گزر گئے تو اس وقت تک قرآن مجید کا بیشتر حصہ مرتب کیا جا چکا تھا۔ لیکن اس کے لکھے جانے کی کیفیت یہ تھی کہ اس کے مختلف اجزاء مختلف چیزوں پر لکھے ہوئے محفوظ تھے۔ چھوٹی چھوٹی سورتیں الگ الگ کتابچوں اور صحیفوں کی صورت میں بھی محفوظ تھیں۔ طویل سورتیں الگ الگ کاغذوں، جھلیوں اور تختیوں پر ٹکڑوں کی صورت میں لکھی ہوئی تھیں۔ ایک صحابی کی روایت ہے کہ میرے پاس قرآن مجید ایک صندوق میں محفوظ تھا۔ ایک اور صحابی کے بارہ میں لکھا ہے کہ ان کے پاس ایک بڑے تھیلے میں محفوظ تھ، اور ایک اور صحابی نے الماری قسم کی کسی چیز میں ان تمام پلندوں کو محفوظ کیا ہوا تھا۔ ان سب سے مراد یہ ہے کہ وہ تمام اجزاء، کاغذ کے ٹکڑے، تختیاں، ہڈیاں اور **parchment** ایک ڈھیر یا مجموعہ کی شکل میں محفوظ کیے ہوئے تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مسلمانوں کے امور کی ذمہ داری سنبھال لی تو اس وقت قرآن پاک کے کم و بیش ایک لاکھ حفاظ موجود تھے۔ یہ وہ حضرات تھے جنہیں پورا قرآن مجید زبانی یاد تھا اور ان کے پاس پورا قرآن پاک اسی طرح کے ذخیروں کی صورت میں لکھا ہوا بھی موجود تھا۔ اور ایسے حضرات تو لاکھوں کی تعداد میں تھے جن کے پاس قرآن مجید کے مختلف اجزاء لکھے ہوئے موجود تھے۔ اور قرآن پاک کا بڑا حصہ ان کو زبانی یاد تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ہی صحابہ کرامؓ کو اس بات کا علم ہوا کہ اب قرآن مجید مکمل ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ آپؐ نے کسی موقع پر اپنی زندگی میں یہ نہیں فرمایا کہ اب قرآن مجید مکمل ہو گیا ہے، اب مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ایسا اعلان فرما دینے کے معنی یہ ہوتے کہ آپؐ لوگوں کو یہ بتا دیتے کہ اب میرا کام مکمل ہو گیا ہے۔ اور میں اب اس دنیا جانے والا ہوں۔ یہ بات شاید اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف ہوتی۔ اس لیے آپؐ نے ایسا بیان کرنے سے احتراز فرمایا۔

آپؐ صحابہؓ کرام کو قرآن مجید عطا فرما کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ قرآن پاک کی موجودہ ترتیب آپؐ ہی کی مقرر کردہ ہے۔ آیات کی ترتیب بھی آپؐ ہی کی دی ہوئی ہے۔ آیات اور سورتوں کی بنیادی ترتیب آپؐ نے خود قائم فرمائی۔ قرآن پاک کی ۱۱۴ سورتیں اور ان کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔سورتوں کے ناموں کا سورتوں کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ جو سورۃ کا نام ہے وہ سورۃ کا موضوع بھی ہے' یہ درست نہیں ہے۔مثلاً سورۃ بقرہ کا نام یہ صرف پہچان کرنے کے لیے ہے کہ وہ سورت جس میں گائے کا ذکر ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سورت میں گائے کے مباحث ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ قرآن مجید کی مختلف آیات اور آیات کے اجزاء وقتاً فوقتاً نازل ہوتے رہتے تھے۔لیکن بعض سورتیں ایسی بھی ہیں جو پوری کی پوری بیک وقت بھی نازل ہوئیں۔بعض سورتیں خاص اہتمام سے نازل کی گئیں تا کہ یہ بتایا جائے کہ ان سورتوں کو قرآن مجید میں ایک نمایاں اور منفرد مقام حاصل ہے۔ ویسے تو پوری کتاب الٰہی نمایاں ترین مقام رکھتی ہے،لیکن جب کتاب کے بھیجنے والے نے خود یہ بتایا ہو کہ یہ سورت منفرد نوعیت کی ہے تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ خاص سورت کا مقام اور مرتبہ کیا ہوگا۔

بعض سورتیں ایسی ہیں کہ جب انہیں نازل کیا گیا تو ملائکہ کی ایک بڑی تعداد کے جلو میں وہ سورت نازل ہوئی۔ ویسے تو روایات میں آتا ہے کہ جب جبریل امین نازل ہوتے تو کئی فرشتے ان کی ہمراہی میں ہوتے تھے۔ بلاشبہ قرآن مجید کی عظمت کے اظہار کے طور پر ایسا ہوتا تھا۔لیکن کچھ سورتیں ایسی ہیں جن کے ساتھ کثرت سے فرشتے اتارے گئے۔سورۃ فاتحہ، جس کا نزول ایک سے زائد بار ہوا ہے، جب وہ پہلی مرتبہ نازل کی گئی تو اس کے جلو میں اسی ہزار فرشتے اتارے گئے۔سورۃ فاتحہ نبوت کے آغاز میں بھی نازل کی گئی، اس لیے کہ نماز پہلے دن سے فرض تھی اور سورۃ فاتحہ نماز کا لازمی حصہ ہے۔ پھر ایک مرتبہ اور مکہ میں نازل ہوئی، آخری مرتبہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔یہ تعدد نزول مختلف سورتوں کی عظمتوں کو ظاہر کرتا ہے۔یعنی یہ سورت اس شان کی ہے کہ اسے بار بار نازل کیا جائے۔ ہر نزول میں ایک نئی معنویت ہو، اور ہر نزول میں ہزاروں فرشتے ایک بار پھر اس کے ساتھ نازل ہوں۔

بڑی سورتوں میں سورۃ انعام ہے جو پوری بیک وقت نازل ہوئی۔سورۃ انعام کے علاوہ بیک وقت نازل ہونے والی اکثر سورتیں چھوٹی ہیں۔لیکن بڑی سورتوں میں سورۃ انعام وہ پوری سورت ہے جو بیک وقت نازل ہوئی۔دوسری بڑی سورۃ جو بیک وقت نازل ہوئی وہ سورۃ یوسف ہے۔اسی طرح سورۃ کہف ہے جو کفار مکہ کے ایک سوال کے جواب میں پوری کی پوری

بیک وقت نازل ہوئی۔ علامہ طبریؒ جو مشہور مفسرِ قرآن، فقیہہ اور مورخ اسلام ہیں۔ انہوں نے روایت کیا ہے کہ کفار مکہ نے ایک مرتبہ آپس میں مشورہ کیا اور سوچا کہ یہ کیسے طے کریں کہ محمدؐ سچے ہیں یا نہیں ہیں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ مدینہ کے یہودیوں سے ان کے بارے میں رائے لی جائے، اس لیے کہ وہ آسمانی کتب، نبوت، اور آخرت وغیرہ سے واقف ہیں۔ اگر وہ تصدیق کریں کہ ان کی نبوت سچی اور حقیقی ہے تو پھر ہم بھی ان کی بات ماننے پر غور کریں گے۔ چنانچہ ایک وفد یہودیوں کے پاس بھیجا گیا اور انہیں پوری تفصیل سے یہ بات بتائی گئی۔ یہودیوں نے کہا: آپ لوگ ان صاحب سے تین سوال دریافت کریں۔ اگر وہ ان تینوں سوالات کے جواب دے دیں تو وہ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ اور اگر وہ یہ جواب نہیں دے سکتے تو وہ اللہ کے رسول نہیں ہیں، پھر آپ جو چاہیں کریں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ وہ سات آدمی کون تھے جو غار میں جا کر سو گئے تھے۔ دوسرے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک سفر پر کچھ سیکھنے کے لیے روانہ فرمایا تھا وہ کیا واقعہ تھا؟ اور تیسرا وہ کون سا بادشاہ تھا جس نے روئے زمین کے مشرق اور مغرب کو فتح کر لیا تھا؟ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک چوتھا سوال یہ بھی تھا کہ روح کیا چیز ہے؟ چنانچہ ان تمام سوالات کے جوابات دینے کے لیے سورۃ کہف بیک وقت نازل کی گئی اور ستر ہزار فرشتے اس سورت کو لے کر نازل ہوئے جن میں ان تمام سوالات کے جوابات موجود ہیں۔ اس سورت میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ یہ آیات کفار مکہ کے سوالات کے جواب میں نازل کی گئی ہیں۔ بڑی سورتوں میں بیک وقت نازل ہونے والی ایک اور سورت سورۃ یوسف بھی ہے۔ ان کے علاوہ متعدد چھوٹی سورتیں بھی ایسی ہیں جو یک وقت نازل ہوئیں مثلاً سورۃ اخلاص، سورۃ لھب، سورۃ نصر وغیرہ۔

قرآن کی آیات اور سورتوں کی موجودہ ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ ہے۔ آپؐ جبریل امین کے ساتھ تلاوت کرتے تو اسی ترتیب سے کرتے۔ جبریل امین بھی اسی ترتیب سے سناتے، اور صحابہ کرامؓ بھی اسی ترتیب سے سناتے۔ یہ ترتیب اور آیات کا یہ نظم قطعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا ہے۔ سورتوں کے علاوہ بھی قرآن مجید کی کئی اندرونی ترتیبیں اور تقسیمیں ہیں۔ مثلاً پاروں کی تقسیم ہے، مثلاً رکوعات کی یا احزاب کی تقسیم ہے، منزلوں کی تقسیم ہے۔ یہ تمام تقسیمیں کب کی گئیں؟۔ ان سب کے بارہ میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے۔ یہ سب تقسیمیں بعد میں پڑھنے والوں کی سہولت کی خاطر کی گئیں۔ ان میں سب سے قدیم تقسیم

منزلوں کی ہے۔ منزلوں کی تقسیم کے بارے میں دو روایات ہیں۔ ایک روایت تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب روزانہ خود تلاوت فرمایا کرتے تھے تو سات دن میں قرآن مجید کی تلاوت کو مکمل فرمایا کرتے تھے۔ سات دن سے کم کی تلاوت کو حضورؐ نے نہ پسند فرمایا اور نہ اس کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اس لیے کہ اس طرح قرآن مجید پر نہ تو صحیح غور وفکر ہوسکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کی تلاوت کا حق ادا ہوسکتا ہے۔ اگر کچھ لوگ حق ادا کر بھی سکیں تو پھر بھی ایسے لوگ بہت کم اور برائے نام ہوں گے جو اس کو نباہ سکیں۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ عبادت وہ اختیار کی جائے جس کو آدمی نباہ بھی سکے۔ اور پھر اس پر کاربند بھی رہ سکے۔ یہ چیز اسلام کے مزاج کے خلاف ہے کہ آج وقتی جوش میں آکر بہت کچھ کرنا شروع کر دیا اور چند دن میں ہمت ہار بیٹھے۔ جب جوش ختم ہوا تو پھر جو تھوڑا بہت کرتے تھے اس کی بھی ہمت نہیں رہی۔ حضورؐ نے فرمایا: بہترین عمل وہ ہے جس کو دوام حاصل ہو یعنی جس کو ہمیشہ کیا جاسکے۔

یہ سات منازل جو حضورؐ نے اپنی تلاوت کے لیے اور آپؐ کو دیکھ کر بعض صحابہ کرامؓ نے اختیار فرمائیں ان کو یاد رکھنے کا آسان فارمولا ہے: فمی بشوق۔ اس میں ف سے مراد فاتحہ، م سے مراد مائدہ، ی سے مراد یونس، ب سے مراد بنی اسرائیل، ش سے مراد شعراء، و سے مراد والصّٰفّٰت، اور ق سے مراد سورۃ ق ہے۔ یہ ساتوں منازل کا آغاز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا بعض روایات کے مطابق حضرت عثمان غنیؓ نے تقسیم فرمائی تھیں۔ یہ تقسیم بھی گویا سورتوں کے بعد ایک مزید ذیلی تقسیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے یا اجازت سے صحابہؓ کرام نے تجویز فرمائی اور بعض حضرات نے اپنے اپنے نسخوں میں ان منزلوں کی نشاندہی بھی کرلی۔

پھر جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا اور نئے نئے لوگ اسلام میں داخل ہوتے گئے تو لوگوں نے آیات کے بھی الگ الگ گروپ بنانے شروع کیے تاکہ یاد کرنے میں آسانی رہے۔ اس میں ایک چیز کا رواج تو دوسری صدی ہجری سے عرب دنیا میں ہوا، جس کو تخمیس اور تعشیر کہتے تھے۔ تخمیس کے معنی پانچ کا مجموعہ اور تعشیر کے معنی ہیں دس کا مجموعہ۔ یعنی صحابہ کرامؓ اور تابعین نے اپنے اپنے استعمال اور تلاوت کے لیے جو نسخے تیار کیے ان میں کسی نے اپنی سہولت کی خاطر پانچ پانچ آیات پر اور کسی نے دس دس آیات پر نشان لگایا۔

علوم قرآن کی پرانی کتابوں میں یہ بحث ملتی ہے کہ تخمیس اور تعشیر جائز ہے یا ناجائز

ہے۔ بعض صحابہ کرامؓ اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور بعض جائز سمجھتے تھے۔ جو لوگ جائز سمجھتے تھے ان کا موقف غالباً یہ تھا کہ یہ تقسیم ہماری سہولت کی خاطر ہے کہ ہمیں خود بھی یاد کرنے میں آسانی رہے اور بچوں کو یاد کرانے میں بھی سہولت رہے۔ جو حضرات اس تخمیس یا تعشیر کو ناجائز سمجھتے تھے ان کا شاید کہنا یہ تھا کہ جب رسول اللہؐ نے اس تقسیم کو متعین نہیں فرمایا تو ہمیں اپنی طرف سے کوئی نئی تقسیم قرآن مجید میں متعارف کروانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بہرحال یہ احتیاط اور تقوی کا ایک نمونہ ہے۔ بعض لوگوں نے اس تخمیس اور تعشیر کے اشارات متن کے اندر ہی دیے، اور بعض نے حاشیہ کے بیرونی جانب دیے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ تعشیر کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ یعنی آیات کو دس دس کے گروپوں میں تقسیم کرنے کو وہ ناپسند کرتے تھے۔

اس کے بعد قرآن مجید کا جو سب سے چھوٹا ذیلی یونٹ ہوتا ہے وہ ایک آیت کہلاتا ہے۔ جیسے طٰہ، یہ بھی ایک آیت ہے۔ الم، یہ بھی ایک آیت ہے۔ حالانکہ یہ صرف دو یا تین حروف ہیں۔ بعض جگہ بہت لمبی لمبی آیات ہیں جو تقریباً آدھے صفحے پر آتی ہیں۔ آیات کا تعین اکثر و بیشتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی فرمایا تھا۔ ایسی بہت تھوڑی آیات ہیں جن کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے درمیان بعد میں اختلاف پیدا ہوا کہ آیت یہاں ختم ہوتی ہے یا وہاں، اور یہ اختلاف خاص طور پر مکی سورتوں میں ہے۔

مکی سورتوں میں ایک خاص انداز کا نغمہ یا سجع پایا جاتا ہے۔ ایک خاص انداز کی لے اور نغمہ کی شان پائی جاتی ہے۔ اور جہاں آیات کا خاتمہ ہوتا ہے وہاں ایک خاص انداز کا قافیہ اور ردیف ملتی ہے۔ جو شاعرانہ انداز کا قافیہ اور ردیف نہیں ہے، مگر اس کا اپنا ایک خاص اور منفرد انداز ہے۔ اس پر اسلوب کے عنوان سے بعد میں گفتگو کریں گے۔ اس نغمہ یا صوتی حسن کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ میں سے کسی کے ذوق نے محسوس کیا کہ یہاں آیت ختم ہونی چاہیے، اور کسی اور کے ذوق نے محسوس کیا کہ آیت وہاں ختم ہونی چاہیے۔ اس وجہ سے کہیں کہیں اختلاف پیدا ہوا۔

بعض اوقات ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں تلاوت کرتے ہوئے ایک جگہ وقف نہیں فرمایا اور مسلسل تلاوت فرمائی تو سننے والے صحابی نے سمجھا کہ یہاں آیت ختم نہیں ہوئی۔ کبھی آپؐ نے اس جگہ وقف فرمایا تو اس وقت جو صحابی سن رہے تھے انہوں نے سمجھا کہ یہاں آیت ختم ہو گئی ہے۔ اس وجہ سے صرف کہیں کہیں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی سے آ

یات کی تعداد میں مختلف روایات ہیں۔ کسی جگہ کوئی تعداد لکھی ہے اور کسی جگہ کوئی۔ لیکن عام طور پر جو روایت سب سے زیادہ تسلیم شدہ ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں کل ۶۶۶۶ آیات ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ آیت اور سورت میں کیا فرق ہے۔ آیت کے عربی زبان میں دو معنی آتے ہیں۔ ایک معنی نشانی اور معجزہ کے ہیں۔ ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات، یہاں آیت کا لفظ معجزہ کے معنی میں آیا ہے۔ لغوی اعتبار سے آیت کا ایک اور مفہوم جگہ یا ٹھکانہ کا بھی ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے آیت وہ جگہ ہے جہاں آپ رات گزاریں۔ یعنی مبیت آوی یووی کے معنی پناہ دینا اور اوی یاوی کے معنی پناہ لینا ہے۔ جب آدمی اپنے بستر پر لیٹتا ہے تو اس کے لیے عربی زبان میں آتا ہے آوی الی فراشہٗ اس نے اپنے بستر پر جا کر ٹھکانہ پکڑ لیا۔ لہٰذا وہ جگہ جہاں رات کو آدمی اپنا ٹھکانہ پکڑے۔ اس کو بھی لغت میں آیت کہا جا سکتا ہے۔

سورت کے لفظ کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک معنی تو ہیں رفعت اور بلندی کے، جس سے سورت کے معانی کی بلندی، اس کے پیغام کی بلندی اور مطالب کی بلندی مراد ہے۔ اس لیے ہر سورت کو سورت کہا گیا ہے۔ سورت کے ایک دوسرے معنی شہر پناہ کے بھی ہیں۔ پرانے زمانے میں شہر کے چاروں طرف مضبوط دیوار اور فصیل ہوتی تھیں۔ اس کو سور کہتے ہیں۔ اور اس حصے اور علاقے کو جو اس فصیل اور شہر پناہ کے درمیان واقع ہوتا تھا' اس کو سورت کہا جاتا تھا۔ اس لیے سورت کے معنی اس شہر کے بھی ہو سکتے ہیں جس کو چاروں طرف سے مضبوط فصیل، شہر پناہ اور دیوار نے گھیرا ہوا ہو۔ اگر سورت کے یہ معنی لیے جائیں تو پھر آیت کے وہ معنی بڑے برمحل معلوم ہوتے ہیں جو بستر یا ٹھکانہ کے ہیں۔ شہر میں بہت سے گھر ہوتے ہیں اور گھروں میں جو خاص آرام کی جگہ ہوتی ہے وہ آدمی کی آرام گاہ ہوتی ہے۔ گویا دونوں میں ایک نسبت پائی جاتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ جس طرح ایک شہر ایک مستقل بالذات یونٹ ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک سورت بھی ایک مکمل یونٹ ہے۔ قرآن مجید کی رہنمائی کو مکمل طور پر فراہم کرنے کے لیے ہر سورت ایک مستقل بالذات مضمون ہے۔

قرآن مجید کے طلبہ اس امر سے واقف ہیں کہ قرآن مجید نے جب کفار مکہ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو چیلنج کیا تو پہلے ان سے کہا کہ اس جیسی ایک کتاب بنا لاؤ۔ پھر کہا گیا کہ اس جیسا کلام بنا کر لاؤ۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اس جیسی دس سورتیں بنا لاؤ۔ اس کے بعد کہا کہ اچھا اس جیسی

ایک ہی سورت بنا کر دکھاؤ۔ گویا ایک سورت بھی اپنی جگہ اسی طرح ایک معجزہ ہے جس طرح پورا قرآن پاک ایک معجزہ ہے۔ اسی طرح ہر سورت ویسا ہی نمایاں اور بلند مقام رکھتی ہے جیسے پورا قرآن مجید رکھتا ہے۔

جہاں تک ترتیب تلاوت کا تعلق ہے یعنی جس ترتیب سے قرآن مجید آج تک پڑھا اور لکھا جا رہا ہے۔ یہ ترتیب 'ترتیب رسولی یا ترتیب تلاوت کہلاتی ہے۔ لیکن ترتیب نزولی یعنی جس ترتیب سے قرآن مجید نازل ہوا وہ ترتیب بھی ایک علمی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ بہت سے معاملات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے یہ علم ہونا ضروری ہو جاتا ہے کہ کون سی آیت یا سورت پہلے نازل ہوئی اور کون سی بعد میں۔ اس لیے کہ ہر بعد میں آنے والا حکم پہلے آنے والے حکم سے ملا کر پڑھا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں کوئی تعارض یا تضاد نہیں ہے۔ لیکن تدریج کے اصول کے تحت بہت سے احکام ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ نازل ہوئے۔ پہلے ایک عمومی ہدایت دی گئی، جب اس ہدایت پر عملدرآمد شروع ہو گیا تو پھر اس میں مزید تخصیص کی گئی۔ جب لوگوں کی طبیعتیں اس سے مانوس ہو گئیں تو پھر مزید تخصیص کی گئی۔ اب ان سب کو ایک ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا تو بات کو سمجھنے میں صحیح مدد ملے گی۔

اگر بیک وقت پورا قانون ایک ساتھ لاد دیا جاتا تو عمل بھی مشکل ہو جاتا اور اس کو زندگی میں آسانی سے جاری و ساری بھی کیا جا سکتا۔ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے قوانین دیئے گئے تاکہ لوگ بتدریج ان پر عمل کرتے جائیں اور وہ قوانین لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا حصہ بنتے جائیں، اور یوں پوری شریعت معاشرہ کے رگ و پے میں شامل ہوتی جائے۔ اس لیے احکام جو تھوڑے تھوڑے کر کے نازل کئے گئے اور عقائد کی تفصیلات جو تھوڑی تھوڑی کر کے نازل ہوئیں' اس کی وجہ یہی تھی کہ لوگوں کو پہلے ہی دن سے متکلم بنانا مقصود نہیں تھا، بلکہ مقصود یہ تھا اسلام کے عقائد اور تعلیم آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ جائے۔

ان سب تفصیلات کو جاننے کے لیے سورتوں کے نزول کی تاریخی ترتیب سے واقفیت ضروری ہے۔ اس ترتیب کو ترتیب نزولی کہتے ہیں۔ اور صحابہ کرامؓ میں سے متعدد حضرات نے اس بارے میں معلومات جمع کیں اور لوگوں تک پہنچائیں۔ دو صحابی اس باب میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ سیدنا علی ابن ابی طالبؓ اور سیدنا عبداللہ ابن مسعودؓ۔ سیدنا عبداللہ ابن مسعودؓ ایسے

صحابی ہیں جن کے بارے میں حضورؐ کا فرمان ہے: قرآن پڑھو تو ام ابن عبد کی قراءت پر پڑھو۔ جس طرح وہ پڑھتے ہیں اسی طرح پڑھا کرو۔ حضرت عمر فاروقؓ نے جب ان کو کوفہ بھیجا اور پورے عراق کی دینی تربیت اور رہنمائی ان کے سپرد کی تو عراق کے لوگوں کو اس موقع پر ایک خط بھیجا، جس میں لکھا کہ اے عراق کے لوگو! میں ایک بہت بڑی قربانی دے رہا ہوں اور ایک ایسے آدمی کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں جس کی یہاں موجودگی کی مجھ کو سب سے زیادہ ضرورت ہے لیکن میں اپنی ضرورت پر تمہاری ضرورت کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ تمہیں قرآن مجید اور شریعت کی تعلیم دیں گے۔ یہ عبداللہ ابن مسعودؓ ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ایک بار فرمایا کہ اللہ کی قسم! میں یہ جانتا ہوں کہ قرآن مجید کی کون سی سورت کب نازل ہوئی، کہاں نازل ہوئی اور کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ کون سی آیت کب، کہاں اور کس کیفیت میں نازل ہوئی اور کن احکام کے ساتھ نازل ہوئی۔ خدا کی قسم اگر مجھے یہ پتہ چلتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ ان تمام باتوں کا جاننے والا ہے تو میں سفر کر کے اس کے پاس جاتا اور اس سے یہ معلومات جمع کرتا۔

دوسرے بزرگ سیدنا علی ابن ابی طالب ہیں جن کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کس درجے کے انسان ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں کوفہ میں فرمایا: اے اہل کوفہ! مجھ سے پوچھ لو جو پوچھنا ہے، اس لیے کہ بہت جلد وہ دور آنے والا ہے کہ پوچھنے والے ہوں گے' جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ سلونی عما شئتم، جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو۔ آنجناب کے اسی ارشاد گرامی کی بناء پر اسلامی ادبیات میں خطیب منبر سلونی کا لقب آپؓ کی ذات گرامی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے ترتیب نزولی کی بڑی علمی اہمیت ہے اور شریعت کے بعض احکام کو سمجھنے کے لیے اس سے واقفیت ضروری ہے۔

نزول قرآن کی کل مدت ۲۲ سال ۲ ماہ اور ۲ دن ہے جس میں مکی دور ۱۲ سال ۵ ماہ اور ۱۳ دن پر مشتمل ہے اور مدنی دور ۹ سال ۹ ماہ اور ۹ دن پر مشتمل ہے۔ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو اس کے بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے اور متعدد صحابہ کرامؓ سے یہ مروی ہے کہ یہ سورۃ علق کی ابتدائی ۵ آیات ہیں۔ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک قمری حساب سے ۴۰ سال ۶ ماہ اور ۱۵ دن تھی۔ اور شمسی حساب سے ۳۹ سال ۳ ماہ اور ۱۶ دن تھی۔

فلکیات کے بعض ماہرین نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ جس رات وحی مبارک نازل ہوئی اس کے بعد آنے والا دن سوموار کا دن تھا، اور بظاہر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ آدھی رات کے بعد دو ڈھائی بجے کا وقت ہوگا۔ شمسی تاریخ اس دن ۲۸ جولائی ۶۱۰ء کی تھی۔ پیر کا دن شروع ہو چکا تھا۔ غار حراء میں علی الصباح دو اڑھائی بجے کے وقت سورۃ علق کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں۔

جس وقت وحی نازل ہوتی تھی (جس کی بعض کیفیات کا ہم نے کل اندازہ کیا تھا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ اتنا زوردار کلام ہے اور اتنا غیر معمولی اثر اس تجربہ کا طبیعت مبارک پر ہوتا ہے' ایسا نہ ہو کہ اس کلام کو بھول جاؤں۔ اس خیال سے آپؐ اسی وقت جلدی جلدی اس کی تلاوت بھی فرمایا کرتے تھے جو طبیعت مبارک پر ایک دوہرا بوجھ ہوتا تھا۔ ایک خود اس تجربہ کا بوجھ، دوسرا دہرانے کا بوجھ۔ اس پر دو مرتبہ بارگاہ ربانی سے آپؐ کو بتایا گیا کہ آپ ایسا نہ کریں۔ وحی کے بھول جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کو یاد کرانا اور آگے چل پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

لا تحرک به لسانک لتعجل به ان علینا جمعه و قرانه. فاذا قراناه. فاتبع قرآنه ثم ان علینا بیانه.

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا:

ولاتعجل بالقران من قبل ان یقضی الیک وحیه

جہاں تک آخری وحی کا تعلق ہے اس کے بارے میں صحابہ کرام کے درمیان آپس میں خاصا اختلاف پیدا ہوا۔ اس اختلاف کی وجوہ بھی بدیہی ہیں۔ اس اختلاف کی ایک بڑی بلکہ سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ حضورؐ نے خود کہیں یہ نہیں فرمایا کہ یہ آخری وحی ہے اور اب قرآن مجید مکمل ہوگیا۔ بلکہ جب آپؐ دنیا سے تشریف لے گئے اس وقت صحابہ کرامؓ کو پتہ چلا کہ آج قرآن مجید مکمل ہوگیا۔ اس وقت جس کے پاس جو آیت یا سورت سب سے آخر میں پہنچی تھی اس نے اسی کو آخری وحی سمجھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے سے تقریباً ۸۶ روز قبل حجۃ الوداع کے موقع پر جب آپؐ میدان عرفات میں جبل رحمت سے اپنا مشہور و معروف خطبہ

منشور حقوق ومقام انسانیت ارشاد فرما رہے تھے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا.

اس وقت ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ کے سامنے آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ان صحابہ کرامؓ میں سب کا تعلق مدینہ منورہ سے نہیں تھا۔ وہ مختلف شہروں سے آئے تھے۔ انہوں نے آخری وحی جو زبان رسالتؐ سے سنی وہ یہی آیت مبارکہ تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے اپنے علاقوں اور گھروں کو واپس چلے گئے۔ اس کے بعد ان کو سرکار رسالت مآبؐ کی زبان مبارک سے کوئی اور آیت یا سورت سننے کا موقع نہیں ملا۔ انہوں نے اسی کو آخری وحی سمجھا۔ کچھ صحابہ کرامؓ نے جو اس موقع پر موجود نہیں تھے انہوں نے جو وحی آخری مرتبہ سنی وہ کوئی اور آیت تھی۔ لیکن جو صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین اعزہ میں سے تھے، آپؐ کے چچازاد بھائی تھے جو کثرت سے آپؐ کے گھر جایا کرتے تھے، وہ حضرت عبداللہ ابن عباس تھے، جنہیں صحابہ کرام ہی کے دور میں ترجمان القران کا لقب دے دیا گیا۔ وہ اور ان کے علاوہ کئی اور قریبی حضرات اس بات کے گواہ ہیں کہ آخری وحی جو نازل ہوئی وہ یہ آیت مبارکہ تھی:

واتقوا یوما ترجعون فیه الی الله، ثم توفی کل نفس ما کسبت وهم لایظلمون۔

ڈرو اس دن سے جس دن تم سب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ پھر ہر نفس کو اس کا پورا صلہ دے دیا جائے گا جو اس نے کیا تھا اور ان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا۔ یہ وحی لکھنے کی سعادت حضرت ابی ابن کعبؓ کو حاصل ہوئی، یہ واقعہ ۳ ربیع الاول ۱۱ھ کا ہے۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو یعنی اس واقعہ کے آٹھ روز بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے۔

کچھ سورتوں کے آغاز میں حروف مقطعات آئے ہیں۔ الم، الر، المر۔ حم وغیرہ۔ ان حروف اور ان کے معانی ومفاہیم کے بارہ میں مفسرین قرآن نے بہت مفید اور علمی بحثیں کی ہیں۔ کج فہم اور کج بحث مستشرقین بھی اوہام وخیالات کے گھوڑے دوڑانے میں ایک دوسرے سے پیچھے نہیں رہے۔ ان سب مباحث کی طرف مختصر اشارہ بھی کیا جائے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اس لیے صرف دو اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفاء کرتا ہوں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں یہ اسلوب عرب کے بعض قبائل میں مانوس اور معروف تھا کہ لوگ اپنی گفتگو یا تقریر سے پہلے کچھ مخففات استعمال کیا کرتے تھے۔ اگر اس اسلوب سے جاہلیت کے لوگ مانوس نہ ہوتے تو دیگر اعتراضات کے ساتھ وہ یہ اعتراض بھی ضرور کرتے کہ ان بے معنی الفاظ کا مطلب کیا ہے۔ کوئی انہیں کچھ قرار دیتا اور کوئی کچھ۔ لیکن کفار مکہ نے ان حروف پر کبھی نہ کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی ان کے بارہ میں کوئی سوال اٹھایا۔ یاد رہے کہ یہ تمام حروف مقطعات مکی سورتوں ہی کے آغاز میں آتے ہیں۔ مدنی سورتوں کے آغاز میں یہ حروف موجود نہیں۔ لہٰذا یہ ایک مانوس اسلوب تھا اور کلام عرب میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں حروف مقطعات پر خاصی بحث کی ہے۔ ان کی تفسیر علمی اعتبار سے انتہائی بلند پایہ تفسیر ہے۔ پورے تفسیری ادب کو اگر کھنگال کر دس بہترین اور بڑی تفسیریں علیحدہ کی جائیں تو ان میں لازماً علامہ قرطبی کی تفسیر بھی شامل ہوگی۔ الجامع لاحکام القران کے نام سے یہ تفسیر ۲۰ جلدوں میں ہے۔ اس میں انہوں نے بہت سے ایسے نظائر اور مثالیں جمع کی ہیں جن سے اس اسلوب کا پتہ چلتا ہے جو حروف مقطعات میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے ایک شاعر کا ایک مصرعہ نقل کیا ہے: قلت لها قفي ، فقالت ق۔ گویا اقف کا مخفف انہوں نے ق استعمال کیا۔ اس طرح سے انہوں نے مشہور جاہلی شاعر زہیر کا ایک شعر نقل کیا ہے جس میں ف اور ت حروف کو مخفف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے:

بالخير خيرات وان شرافا

ولا اريد الشرالا أن تا

پہلے مصرعہ میں (فا) دراصل فشر کا مخفف ہے، دوسرے مصرعہ کا (تا) الا ان تشاء کا مخفف ہے۔ ایک اور شعر انہوں نے نقل کیا ہے جس کے آخر میں تا اور فا آئے ہیں، نادوهم الا الجموا الا تا۔ قالو ا جميعا كلهم الافا۔ یہاں پہلے مصرعہ میں تا تر کبون کا اور دوسرے مصرعہ میں ف فار کبوا کا مخفف ہے۔ یوں یہ دو حروف ایک پورے مفہوم کو بیان کرتے ہیں۔

ان مثالوں سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اسلوب کلام عرب میں رائج تھا اور عرب اس سے واقف اور مانوس تھے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں اس اسلوب کو استعمال کیا گیا۔ لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہا کہ کیا ان حروف کا کوئی صحیح اور حقیقی مفہوم ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے۔

اہل علم میں احتیاط پسند بزرگوں نے یہی کہنا مناسب سمجھا کہ ان کی حقیقی مراد سے صرف اللہ تعالیٰ ہی باخبر ہے۔

تاہم بہت سے اہل علم نے ان حروف میں پنہاں معانی کا کھوج لگانے کی کوشش کی اور بہت سے معانی کی نشاندہی کی۔ صحابہ کرامؓ میں کچھ حضرات نے، خاص طور پر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے اور بعد میں بھی متعدد دوسرے مفسرین نے، ان حروف کے الگ الگ معانی نکالنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے ساتھی اور شاگرد مجاہد ابن جبر، جو ان کے ساتھیوں میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے، (اور بظاہر یہ بات انہوں نے اپنے استاد سے سیکھی ہوگی۔) کہ الم میں الف سے مراد اللہ، لام سے مراد جبریل اور میم سے مراد محمد ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے یہ کلام محمدؐ پر اتارا۔ کسی اور تابعی سے روایت کر کے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ کہ الم کے معنی ہیں انا اللہ اعلم۔

اس طرح بعض لوگوں نے حروف مقطعات میں کچھ اور بھی نکتے نکالے ہیں۔ جیسے سورۃ نون کے آغاز میں آنے والا حرف ن ہے۔ نون عربی زبان میں مچھلی کو بھی کہتے ہیں۔ **وذا النون اذ ذهب مغاضباً**، وہ مچھلی والا جب ناراض ہو کر چلا گیا۔ گویا چونکہ مچھلی کو نون کہتے ہیں اس لیے مچھلی والے کو ذوالنون کہہ سکتے ہیں۔ سورۃ نون میں حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ گویا ن کے لفظ میں مچھلی کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ اس طرح کے بعض نکتے کچھ اور لوگوں نے بھی نکالے ہیں۔ اور اس پر لمبی لمبی بحثیں کی ہیں۔ برصغیر کے مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی نے بھی اس موضوع پر وقیع اور دلچسپ کام کیا ہے۔

قرآن مجید کی سورتیں یوں تو مکی اور مدنی میں تقسیم کی گئی ہیں۔ مکی وہ ہیں جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں اور مدنی وہ ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔ چاہے جغرافیائی طور پر جہاں بھی نازل ہوئی ہوں۔ لیکن کم از کم ایک آیت ایسی ہے جس کے بارے میں بہت سے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آسمانوں پر نازل ہوئی ہے۔ سفر معراج کے دوران میں یہ آیت نازل ہوئی:

وا سئل من ارسلنا من قبلک من رسلنا۔ أجعلنا من دون الرحمن الهة يعبدون.... گویا آپ جملہ انبیاء سے ملنے تشریف لے جا رہے ہیں وہاں سب پوچھ لیجیے گا، سب رسول موجود ہوں گے۔ یہ بظاہر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے لیکن دراصل

کفارِ مکہ کو سنانا مقصد ہے۔

مکی سورتیں دین کے بنیادی مضامین سے بحث کرتی ہیں۔ ان میں ایمان اور اخلاق پر زور ہے۔ مدنی سورتیں جن کی تعداد اٹھائیس ہے، یہ تعداد میں تو کم ہیں، لیکن مواد اور کمیت کے اعتبار سے زیادہ ہیں۔ اس لیے کہ یہ سورتیں اکثر و بیشتر لمبی ہیں۔ مکی سورتیں چونکہ چھوٹی ہیں اس لیے گو وہ تعداد میں زیادہ ہیں، لیکن مواد اور کمیت میں مدنی سورتوں سے کم ہیں۔ مدنی سورتیں عمارت سے مشابہ ہیں۔ اور مکی سورتیں بنیاد سے مشابہ ہیں۔ جس طرح بنیاد پر عمارت بنائی جاتی ہے، اسی طرح مکی سورتوں کی اساس پر مدنی سورتوں کی عمارت اٹھائی گئی ہے۔ مدنی سورتوں میں تفصیلی ہدایات اور قوانین دیئے گئے ہیں شریعت کے احکام کا تذکرہ ہے۔ ایک مفسر کے بقول مدنی سورتوں میں سمندر کا سا ٹھہراؤ اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ مدنی سورتوں میں عمل صالح کا ذکر ہے۔ مکی سورتوں میں ایمان کا تذکرہ ہے۔ وہاں اخلاق کا ذکر ہے، یہاں شریعت کا بیان ہے۔ گویا یہ مضامین مدنی اور مکی سورتوں کے بنیادی مضامین ہیں۔ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے بلکہ اکثر و بیشتر ایسا ہے۔

مکی سورتوں کے مضامین اور بنیادی خصائص:

۱۔ زورِ بیان اور فصاحت و بلاغت کی معراج
۲ مضامین کی آمد میں دریا کی سی روانی
۳ دین کی بنیادوں اور کلیات کا تذکرہ
۴۔ ایمان اور اس کے تقاضوں کی بار بار یاددہانی
۵۔ اخلاق اور اخلاقی اصولوں پر زندگی کی تشکیل
۶۔ شریعت کے عمومی اصولوں کی طرف اشارے
۷۔ عموماً اجمال سے کام لیا گیا ہے۔
۸۔ زیادہ زور عقائد اور مکارمِ اخلاق پر دیا گیا ہے۔
۹۔ اہلِ عرب اور اہلِ کتاب اور مسلمانوں کے مابین مشترکہ عقائد اور مسلمات کو بار بار دہرایا گیا ہے۔
۱۰۔ اکثر و بیشتر مشرکینِ عرب سے خطاب کیا گیا ہے۔

جبکہ مدنی سورتوں کے بنیادی مضامین اور اہم خصائص یہ ہیں:

۱۔ شریعت کے احکام کی تفصیل
۲۔ اسلام کی ثقافتی اور تہذیبی عمارت کی تکمیل
۳۔ اسلوب میں ٹھہراؤ اور دھیما پن
۴۔ مضامین میں سمندر سی گہرائی
۵۔ عمل صالح کی تفصیلات
۶۔ مکہ میں نازل ہونے والے کلیات کی تفصیلات
۷۔ مسلمات مشترکہ کا تذکرہ مدنی سورتوں میں بھی بار بار کیا گیا ہے۔
۸۔ اکثر و بیشتر اہل کتاب سے خطاب کیا گیا ہے۔
۹۔ نظام و منہاج دین کی تکمیل
۱۰۔ مکارم اخلاق کو شریعت کے عملی احکام کی اساس کے طور پر دہرایا گیا ہے۔

قرآن مجید کی سورتوں کے مختلف نام بھی ہیں اور پھر ان سب کے الگ الگ گروپ بھی ہیں۔ جو پہلی سات سورتیں ہیں ان کو طوال کہا گیا ہے۔ یعنی لمبی سورتیں، بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف، انفال اور برأت۔ سورت برأت چونکہ سورت انفال کا تتمہ ہے اس لیے بعض نے اس گروپ کی سورتوں کی تعداد سات بیان کی ہے، بعض نے آٹھ۔ یہ طوال کہلاتی ہیں۔ اس کے بعد مئین کا گروپ آتا ہے، یعنی وہ سورتیں جن میں ۱۰۰ سے زائد آیات ہیں۔ اردو میں چونکہ سو کی جمع نہیں آتی اس لیے مئین کا لفظی ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ مئین کے بعد مثانی کا درجہ ہے جن میں ۱۰۰ سے کم آیات پائی جاتی ہیں۔ مثانی کے بعد مفصل ہیں۔ یہ وہ سورتیں ہیں جو حجرات سے لے کر قرآن مجید کے آخر تک پائی جاتی ہیں۔ مفصل کی پھر تین قسمیں ہیں۔ طوال مفصل، اوساط مفصل اور قصار مفصل۔

امام احمدؒ جو مشہور محدث اور فقیہہ ہیں انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ مجھے تورات کی جگہ سات طویل سورتیں دی گئی ہیں۔ آپ دونوں کے مندرجات پر غور کریں تو طوال کے مضامین اور تورات کے مضامین میں بڑی مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ اکثر و بیشتر شریعت کی تفصیلات اور قانونی احکام طوال میں آئے ہیں۔ توریت میں بھی قانونی احکام آئے

ہیں۔اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ مئین مجھے زبور کے مقابلے میں دی گئی ہیں۔جس طرح زبور میں مناجاتیں دی گئی ہیں اسی طرح مئین میں بھی مناجاتیں اور تعلق باللہ کو مضبوط کرنے والی آیت کثرت سے آئی ہیں۔پھر آپؐ نے فرمایا کہ انجیل کی جگہ مجھے مثانی دی گئی ہیں۔انجیل میں اخلاقی ہدایات بہت زیادہ ہیں۔انسان کو اندر سے متحرک کرنے کے مضامین ہیں۔یہی مضامین مثانی میں بھی پائے جاتے ہیں۔**وفضلت بالمفصل**۔اور مفصل سورتیں مجھے بطور فضیلت' اضافی طور پر دی گئی ہیں۔

سورتوں کی تعداد تو سب ہی جانتے ہیں کہ ۱۱۴ ہیں۔آیات کی تعداد ۶۶۶۶ کثرت روایت سے ثابت ہے۔اگرچہ اس میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔قرآن مجید کے الفاظ بھی لوگوں نے شمار کر لیے ہیں۔مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے ۸۶۴۳۰ اور ایک دوسرے مفسر نے ۷۷۹۳۴ لکھا ہے۔اس میں جو اختلاف ہے' یہ اس لیے نہیں ہے کہ خدانخواستہ قرآن مجید کے الفاظ میں کچھ کمی بیشی ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ کچھ حروف پڑھنے میں آتے ہیں۔لکھنے میں نہیں آتے۔کچھ لکھنے میں آتے ہیں پڑھنے میں نہیں آتے۔اب گننے والوں میں سے بعض نے صرف پڑھنے والوں کو گنا۔بعض نے دونوں کو گن لیا۔بعض نے لکھے جانے والے تمام حروف کو گن لیے۔اس اعتبار سے گنتی میں فرق آ گیا۔مثال کے طور پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں الرحمٰن اور الرحیم کے الف اور لام شمار ہوں گے یا نہیں۔اس لیے کہ اللہ کے آخر کی ہ جا کر الرحمٰن کی ر میں مل گئی علیٰ ھذا القیاس۔یوں تھوڑا سا اختلاف حروف کی تعداد میں ہوا ہے۔

یہ بات کہ کون سی سورت مکی ہے اور کون سی مدنی۔اس کا حتمی اور قطعی تعین تو صرف صحابہ کرامؓ ہی کے بتانے سے ہوگا۔لیکن بعض اوقات سورۃ کے اندرونی مضامین سے بھی کسی حد تک اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی۔مثال کے طور پر سورۃ انفال جس میں مال غنیمت، اس کی تقسیم اور جنگ وغیرہ کے احکام کا ذکر ہے' مدنی سورت ہے۔ظاہر ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل نہیں ہو سکتی تھی۔یہ مدینہ ہی میں نازل ہونی چاہیے۔یا سورۃ توبہ جس میں تبوک کے سفر کا ذکر ہے اور منافقوں کے رویہ کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ سورت مثلاً بدر کے موقع پر نازل نہیں ہو سکتی۔تو اس طرح کے شواہد کے ذریعے سے بھی بعض سورتوں کے زمانہ نزول کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ان اندرونی شواہد کے علاوہ قرآن کے مزاج شناس مفسرین نے کچھ ایسی

نشانیاں بھی مقرر کی ہیں کہ جن کی مدد سے بڑی حد تک سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔ مثلاً جن سورتوں میں کلا کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ سب مکی ہیں۔ جن سورتوں میں سجدہ آیا ہے وہ اکثر مکی ہیں۔ صرف ایک سجدہ مکی سورتوں سے باہر ہے، وہ بھی صرف امام شافعی کے نزدیک۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سو فیصد سجدے مکی سورتوں میں ہیں۔ جن سورتوں میں حروف مقطعات آئے ہیں وہ تمام مکی ہیں، سوائے ایک کے۔ جن سورتوں یا آیات کا آغاز یاایھاالناس سے ہوا ہے۔ وہ اکثر مکی ہیں۔ جن سورتوں میں انبیاء کرام کے واقعات بیان ہوئے ہیں وہ اکثر مکی ہیں۔ جن سورتوں میں ابلیس و آدم کا واقعہ بیان ہوا ہے وہ مکی ہیں۔

مدنی سورتوں کی پہچان یہ ہے کہ ان میں جہاد کے احکام بیان ہوئے ہیں، فقہی تفصیلات ہیں۔ مدنی سورتوں اور آیات کا آغاز یا ایھاالذین آمنوا سے ہوتا ہے۔ مدنی سورتوں میں منافقین کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ یہ چند علامات ہیں۔ جن کے ذریعے سے مکی اور مدنی سورتوں کو پہچانا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اتاری جس میں بہت سی آیات تو محکمات ہیں اور بعض متشابہات ہیں۔ جن کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ ہوتی ہے وہ محکمات کو چھوڑ دیتے ہیں، اور متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اور مزید کجی کا شکار ہوتے ہیں۔ متشابہات سے مراد مختصر طور پر وہ آیات ہیں کہ جن میں عالم غیب اور عالم آخرت کے مضامین و حقائق کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی تشبیہات اختیار فرمائی ہیں جو انسانی فہم سے قریب تر ہیں۔ مثال کے طور پر روز قیامت کے واقعات انسان کے لیے سمجھنا مشکل ہے، یا نبوت کی تفصیلات اور جنت دوزخ کے حالات انسان کی سمجھ سے بالاتر ہیں، اسی طرح روز قیامت اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی نوعیت کیا ہوگی ان سب امور کی کنہ اور حقیقت کو سمجھنا انسانوں کے لیے مشکل ہے۔ اس لیے ان چیزوں کو سمجھانے کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ جیسے ایک بہت چھوٹے بچے کو اس کی فہم سے قریب ہو کر اس کی زبان میں کوئی بات سمجھائی جائے۔ انسان کو سمجھانے کے لیے غیبیات کے بارے میں یعنی ان چیزوں کے بارے میں جو انسان کی فہم اور بصیرت سے ماوراء ہیں' جو اسلوب اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمایا وہ گویا تشبیہ اور استعارہ و مجاز کا اسلوب ہے۔ ان آیات کو جن میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا متشابہات کہا

جاتا ہے۔جن کے دل میں کجی ہے وہ محکمات پر توجہ نہیں دیتے۔ جہاں نماز روزہ کا حکم دیا گیا ہے، جہاں شریعت کے احکام دیے گئے ہیں، زکوۃ کی فرضیت بتائی گئی ہے، مکارم اخلاق سکھائے گئے ہیں۔ان سب چیزوں کی پیروی اور تعمیل کرنے کے بجائے کج دماغ لوگ متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں، مثلاً وہ اس طرح کے سوالات پر بہت توجہ دیتے ہیں کہ پل صراط کی کیا کیفیت ہوگی؟ وہ کس طرح کا ہوگا؟ وغیرہ۔

لسان العرب میں متشابہات کی تعریف میں لکھا ہے کہ وہ آیات جو قیامت اور حشر نشر کے احوال سے متعلق ہیں وہ متشابہات کہلاتی ہیں۔

ایک آخری سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے نزول کے لیے عربی زبان کیوں اختیار کی گئی۔ اللہ تعالیٰ تمام زبانوں کا خالق ہے۔ وہ انسان کا بھی خالق ہے اور اس کی زبان کا بھی۔ نزول قرآن کے وقت بڑی بڑی ترقی یافتہ زبانیں موجود تھیں، یونانی، سریانی، عبرانی وغیرہ۔ ان سب زبانوں میں مذہبی ادب بھی موجود تھا۔ ان سب کو چھوڑ کر عربی زبان کا انتخاب کس بنیاد پر عمل میں آیا۔ اس سوال پر اگر تھوڑا سا غور کریں تو دو چیزیں سامنے آتی ہیں۔

چونکہ قرآن مجید رہتی دنیا تک کے لیے نازل کیا جانا تھا اور اس کے ذریعے سے بے شمار نئے تصورات دیے جانے تھے۔ اس لیے قرآن مجید کے لیے ایک ایسی زبان کا انتخاب کیا گیا جو ایک طرف تو اتنی ترقی یافتہ ہو کہ قرآن جیسی کتاب کے اعلیٰ ترین مطالب کا تحمل کر سکے اور انہیں اپنے اندر سمو سکے۔ اور انہیں آنے والی نسلوں تک پہنچا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ اس زبان میں پہلے سے کوئی غیر اسلامی تصورات نہ پائے جاتے ہوں اور نہ اس زبان پر کسی غیر اسلامی نظریہ کی چھاپ ہو۔

ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کا ایک مزاج ہے، فرانسیسی، ہندی، سنسکرت وغیرہ زبانوں کے اپنے اپنے مزاج ہیں۔ کسی زبان کا یہ مزاج اس قوم کے عقائد، تصورات، اور خیالات کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان کا مزاج ایسا ہے کہ اگر آپ اس میں ایک گھنٹہ بھی بات کریں اور کوئی صاف بات نہ کرنا چاہیں تو آپ کر سکتے ہیں۔ سننے والا سمجھ نہیں سکے گا کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ آپ کی بات مثبت ہے، منفی ہے، تائید میں ہے، تردید میں ہے، دوستی ہے، دشمنی ہے' کچھ ظاہر نہ ہوگا۔ یہ حیلہ گری اور شعبدہ

بازی صرف انگریزی زبان میں ہی ممکن ہے۔ کسی اور زبان میں ممکن نہیں۔ اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ صدر بش کے ساتھ ہیں یا صدر صدام کے تو اگر آپ اس کا جواب اردو میں دیں تو آپ کو ہاں یا نہیں میں واضح اور دوٹوک انداز میں کہنا پڑے گا۔ لیکن انگریزی ایسی زبان ہے کہ آپ اس کے جواب میں ایک گھنٹہ بھی بولیں تو کسی کو پتہ نہیں چل سکے گا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہ اس زبان کا خاصہ ہے۔ اسی طرح ہر زبان کا ایک خاصہ ہوتا ہے۔

نزولِ قرآن کے لیے ایسی زبان کا انتخاب ضروری تھا جو ایک طرف تو مکمل طور پر ترقی یافتہ ہو اور دوسری طرف اس پر کسی غیر اسلامی عقیدے یا تصور کی چھاپ نہ ہو۔ عربی کے علاوہ اس وقت کی تمام زبانوں پر غیر اسلامی عقائد و خیالات کی گہری چھاپ موجود تھی۔ عربی زبان ترقی یافتہ بھی تھی، اور ایسی ترقی یافتہ تھی کہ آج تک کوئی زبان اس مقام تک نہیں پہنچ سکی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس پر کسی غیر قرآنی عقیدہ یا نظریہ یا قبل قرآنی خیالات کی چھاپ نہیں تھی۔ ایک اعتبار سے یہ ایک کنواری زبان تھی۔ اس کنواری زبان پر قرآن کی چھاپ جتنی گہری، جتنی دیرپا اور جتنی پختہ ثابت ہوئی وہ کسی اور زبان میں نہیں ہو سکتی تھی۔

عربی زبان کو اختیار کرنے کی دوسری وجہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ یہ کہ لسانیات کی تاریخ میں یہ زبان اپنی نوعیت کی منفرد زبان ہے۔ اس کی ایک انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زبانی گذشتہ سولہ سو سال سے بغیر کسی ردوبدل کے آج تک موجود ہے۔ دنیا کی ہر زبان دو تین سو سال بعد تبدیلی کے عمل سے گزرنے لگتی ہے۔ اور پانچ سو سال بعد تو مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہے۔ آپ سب نے انگریزی پڑھی ہے۔ جب میں نے بی اے کا امتحان دیا تھا تو نصاب کی کتاب میں چوسر کی نظمیں ہوا کرتی تھیں جن کا کوئی سر پیر سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ نہ ان کا کوئی لفظ لغت کی کتابوں میں ملتا تھا۔ نہ گرامر کا کوئی اصول اس پر چلتا تھا اور نہ ہی اسپیلنگ وہ ہوتی تھی جو آج ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا زبان ہے۔ انگریزی کی کتاب میں لکھا تھا اس لیے مجبوراً مانتے تھے کہ یہ انگریزی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان نظموں کو انگریزی زبان کی نظمیں مانا جائے۔ آج اگر چوسر دنیا میں آ جائے تو انگلستان میں بھی کوئی اس کی بات کو سمجھنے والا نہیں ملے گا۔ یہ تو انگریزی کا حال ہے جو آج کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان سمجھی جاتی ہے۔ یہی حال اردو زبان کا ہے۔ آج سے تین سو سال قبل جو اردو بولی جاتی تھی۔ وہ آج نہیں بولی

جاتی۔اور جواردو آج بولی جاتی ہے وہ تین سو سال بعد نہیں بولی جائے گی۔

لیکن اس عام قاعدہ سے واحد استثناء عربی زبان ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تین سو سال قبل جو زبان بولی جاتی تھی وہ وہی زبان ہے جو آج بولی اور لکھی جا رہی ہے۔آپ میں بہت سے لوگوں نے اس زبان کو آسانی سے سیکھا اور سمجھا ہے۔میں نے کئی مرتبہ اندرون ملک اور بیرون ملک لوگوں سے یہ بات کہی ہے کہ اگر آج جناب عبد مناف ابن قصی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کے دادا، یعنی جناب عبدالمطلب کے دادا، دنیا میں تشریف لے آئیں تو روئے زمین پر جہاں ان کا جی چاہے چلے جائیں انہیں ان کی زبان بولنے اور سمجھنے والے مل جائیں گے۔یہاں تک کہ ماسکو اور واشنگٹن میں بھی ایسے لوگ مل جائیں گے جو وہ زبان بولتے ہوں گے۔جو جناب قصیٰ بولا کرتے تھے۔لیکن آج اگر چوسر نکل کر آجائے جو جناب عبد مناف کے بارہ سو سال بعد کا ہے تو اسے انگلستان میں بھی کوئی راستہ بتانے والا نہیں ملے گا، اس لیے کہ وہ زبان جو چوسر بولتا تھا وہ عرصہ ہوا مٹ گئی۔لسانیات کی تاریخ میں عربی وہ واحد زبان ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تین سو سال قبل تیار کر کے رکھ دیا گیا تھا کہ اس زمان میں قرآن مجید نازل کیا جائے گا۔اور پیغمبر آخر الزمان ؐ مبعوث کیے جائیں گے جو اس زبان کو بولیں گے۔اس وقت سے لے کر آج تک اس زبان کے قواعد، ضوابط، اس کی لغت، اس کے الفاظ، اس کے ضرب الامثال، اس کی گرامر، اس کا محاورہ، اس کا اسلوب، غرض اس کی ہر چیز جوں کی توں چلی آرہی ہے۔دنیا کی ہر بڑی علمی لائبریری میں آپ کو عربی زبان کی کتابیں ملیں گی۔اٹھا کر دیکھ لیں معلوم ہو جائے گا کہ عربی زبان کی یہ انفرادیت کہاں تک برقرار ہے۔اسی کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے: **انا انزلنا ہ قرانا عربیا لعلکم تعقلون**. ہم نے اس قرآن کو عربی میں اس لیے نازل کیا کہ تم سمجھو۔ظاہر ہے کہ **لعلکم تعقلون** کا یہ اعلان ہمارے لیے ہے۔اس زمانہ کے عرب تو سمجھ ہی رہے تھے۔

قرآن کی زبان ایک زندہ زبان ہے۔رہتی دنیا تک کے لیے اسلامی زبان ہے۔جو گذشتہ ۱۶سو سالوں سے جوں کی توں چلی آرہی ہے۔حال ہی میں ایک عرب محقق نے ایک کتاب لکھی ہے اس کتاب میں عرب شاعری کے قدیم ترین نمونوں کی جمع کیا گیا ہے۔سب سے قدیم نمونہ جو اس کتاب میں فراہم کیا گیا ہے وہ ۲۴۰ء یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت

مبارک سے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل کا ہے۔ چار پانچ اشعار ہیں۔ آپ بھی سنیے:

اذا الجوزاً اردفت الثریا
ظننت باآل فاطمة الظنونا
ظننت بهم وظن المرء حوب
وان اوفی وان سکن الحجونا
وحالت دون ذلک من همومی
هموم تخرج الشجن الدفینا
اری ابنة یذکر ظعنت فحلت
جنوب الحزن یا شحطا مبینا

عربی تو عربی! یہ الفاظ آج بھی اردو میں مروج ہیں۔ پہلے ہی شعر کو دیکھ لیں جوزا اور ثریا تو وہ ستارے ہیں جن کا ذکر آپ آٹھویں دن اخبار میں پڑھتے ہیں۔ ظن بھی اردو کا لفظ ہے۔ ردیف بھی اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ آل کا لفظ بھی اردو میں بولا جاتا ہے۔ فاطمہ نام کی بچیاں اور خواتین ہر مسلم بستی میں موجود ہیں۔

تراجم قرآن کے بارے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے زندگی بھر تحقیق کی اور ایک کتاب لکھی **القران فی کل لسان**۔ یہ کتاب عربی، انگریزی، فرانسیسی، اور اردو میں دستیاب ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ دنیا بھر کی کل ۲۰۵ زبانوں میں قرآن مجید کے کلی یا جزوی تراجم موجود ہیں۔ اسی طرح ایک اور صاحب علم ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوغلو جو ترکی میں ایک علمی ادارے کے سربراہ ہیں، انہوں نے قرآن مجید کے تراجم کی ایک ببلوگرافی شائع کی ہے جس میں انہوں نے تقریباً ۲۱۰ یا ۲۱۵ زبانوں میں ہونے والے تراجم کا ذکر کیا ہے۔ لیکن انہیں جتنے تراجم دستیاب ہوئے ان کی تعداد ۲۰۰ سے کم تھی۔ جن کا تذکرہ سنا وہ تعداد زیادہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے جو تراجم دیکھے ان کی تعداد ۲۰۵ ہے۔ صرف ایک اردو زبان میں ۳۰۰ سے زائد تراجم موجود ہیں۔ انگریزی میں ۱۵۰ سے زائد تراجم موجود ہیں۔۔ فارسی اور ترکی میں ۱۰۰ سے زائد، فرانسیسی میں ۵۸۱ جرمن میں ۵۵، لاطینی میں ۵۳ اور بقیہ زبانوں میں درجنوں کے حساب سے قرآن مجید کے تراجم موجود ہیں۔ کچھ زبانیں ایسی ہیں کہ جن میں ترجمے مکمل ہیں۔ اور کچھ

ایسی ہیں کہ جن میں ترجمے نامکمل ہیں۔ یہ معلومات اگرچہ ہمارے لیے بہت خوش کن ہیں، لیکن یہ بھی یاد رکھیے گا کہ بائبل کے ۱۸سو زبانوں میں ترجمے موجود ہیں۔ یہ خبر ہم مسلمانوں کو بہت کچھ بتا رہی ہے اور بہت کچھ کرنے کی دعوت بھی دے رہی ہے۔

و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆☆☆☆☆

خطبہ چہارم

جمع و تدوین

قرآن مجید

۱۰ اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نزول قرآن کے سلسلہ میں کل ہماری گفتگو اس نکتہ پر ختم ہوئی تھی کہ جب حضورؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور قرآن مجید کا نزول مکمل ہو گیا، تو اس وقت کم و بیش ایک لاکھ صحابہ کرامؓ کو قرآن مجید کو مکمل طور پر حفظ تھا، لاکھوں صحابہ کرامؓ ایسے تھے جن کو پورا قرآن مجید تو نہیں، البتہ قرآن مجید کا بیشتر حصہ حفظ تھا۔ ہزاروں کے پاس پورا قرآن مجید لکھا ہوا محفوظ تھا، لاکھوں صحابہ اور تابعین کے پاس اس کے مختلف اجزاء لکھے ہوئے موجود تھے۔ یہ تمام صحابہ کرامؓ اور تابعین نمازوں میں قرآن مجید کی تلاوت فرمارہے تھے۔ نمازوں کے علاوہ روزانہ اپنے دور کے طور پر تین دن میں، سات دن میں، مہینہ میں، یا بعض صحابہ روزانہ ایک بار کے حساب سے پورے قرآن مجید کی تلاوت بھی فرمارہے تھے، اور کسی سابقہ آسمانی کتاب کی یہ پیشین گوئی پوری ہورہی تھی کہ جب پیغمبر آخرالزماںؐ تشریف لائیں گے تو ان کے صحابہ اس درجہ کے ہوں گے کہ ان کے سینے ان کی انجیلیں ہوں گی۔ یعنی وحی الٰہی جس طرح انجیل کے نسخوں میں لکھی ہوئی ہے اسی طرح قرآن مجید ان کے سینوں میں لکھا ہوا ہوگا۔

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو سطور میں بھی جمع کروادیا اور لکھوا کر محفوظ کرادیا، اور صدور میں بھی جمع کروادیا۔ اور لاکھوں سینوں کو نور قرآن کی قندیلوں سے منور کردیا۔ قرآن مجید کے صدور میں محفوظ ہونے کا اشارہ خود قرآن مجید میں بھی موجود ہے۔ بل هو آیت بینات فی صدور الذین اوتو ا العلم، یہ تو قرآن مجید کی وہ آیات بینات ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ یہ بات کہ قرآن مجید کے مختلف اجزاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ الگ لکھوا کر مسلمانوں کو عطا فرمادیے تھے قرآن مجید میں بھی بیان ہوئی ہے۔ رسول من الله یتلو صحفا مطهرة فیها کتب قیمة۔ یہ اللہ کے وہ رسول ہیں جو پاکیزہ صحیفے تلاوت

کر کے سناتے ہیں، ان پاکیزہ صحیفوں میں قیمتی تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔ گویا ایسے چھوٹے کتابچے اور تحریریں عام طور دستیاب تھیں جن میں کتاب الٰہی کی آیات اور سورتیں لکھی ہوئی موجود تھیں، جن کی طرف قرآن پاک کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ آیات قرآنی کے لیے صحف کی اصطلاح سورہ عبس میں بھی آئی ہے، جو بالاتفاق مکی سورت ہے۔ گویا قرآن مجید کی سورتوں کا کتابچوں میں لکھا جانا اور صحف کے طور پر معروف ہونا مکہ مکرمہ کے دور آغاز سے ہے۔

کفار مکہ نے جو قرآن مجید پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور آئے دن نت نئے اعتراضات کرتے رہتے تھے، انہوں نے بھی کتابچوں کی تیاری کے اس عمل کو دیکھا اور حسب عادت اس کو بھی اپنے اعتراض کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے اس عمل پر یہ اعتراض کیا تھا، وقالوا اساطیر الاولین اکتبها فھی تملی علیه بکرة و اصیلا۔ ان نے یہ الزام لگایا کہ یہ پچھلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں جو یہ دوسروں سے لکھوا لیتے ہیں۔ اور یہ صبح شام ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ یہ جو صبح شام پڑھ کر سنائے جانے کا الزام ہے' یہ دراصل وہی عرضہ ہے۔ جس کا کل کی گفتگو میں ذکر کیا گیا تھا کہ صحابہ کرامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تحریری مجموعے پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سماعت فرمایا کرتے تھے اور یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکمل ہو جانے والی سورتوں کی اپنی نگرانی میں تحریر و تدوین کے عمل کی تکمیل فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ یہ بات کہ قرآن مجید مکمل طور پر تحریری شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر نگرانی تیار ہو چکا تھا' اتنی احادیث اور اتنی روایات سے ثابت ہے کہ اس بات کو تواتر اور قطعیت کا درجہ حاصل ہے۔ اور اس حقیقت میں شک وشبہ کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کی کتابت کروایا کرتے تھے تو پھر اسے پڑھوا کر سنا بھی کرتے تھے۔ فان کان فیه سقطا اقامه، اگر اس میں کوئی کمی بیشی ہوتی یا کوئی لفظ گر جاتا تو اس کو ٹھیک کر دیا کرتے تھے۔ ثم اخرج به الی الناس، پھر وہ لوگوں تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے جو میں نے کل سیدنا عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کے سلسلہ میں عرض کی تھی کہ لوگوں تک قرآن مجید کے نسخے پہنچانے کا بھی ایک باقاعدہ بندوبست تھا۔

قبیلہ قریش کے صرف ۱۷ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ لیکن مکہ مکرمہ میں کوئی معیاری

رسم الخط ایسا رائج نہیں تھا کہ سب لوگ اس کی پیروی کرتے ہوں۔ جیسے آج اردو کا ایک معیاری رسم الخط ہے یا عربی، انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کا ایک معیاری رسم الخط موجود ہے، جس کی سب لوگ پیروی کرتے ہیں۔ ایک ایک لفظ کے جو ہجے متعین ہیں انہی کے مطابق اس کو لکھا جاتا ہے۔ عرب میں اس وقت تک یہ چیزیں حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ مختلف علاقوں میں مختلف خط رائج تھے۔ مکہ مکرمہ میں جو خط رائج تھا وہ نبطی خط تھا۔ نبطی شمالی عرب کی ایک قوم تھی۔ جس نے تحریر میں مہارت حاصل کی تھی اور ایک خط ایجاد کیا تھا جس میں عربی کی ابتدائی تحریریں لکھی جاتی تھیں۔ آپ اسے موجودہ عربی رسم الخط کا پیش رو کہہ سکتی ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت تک مدینہ منورہ (یثرب) کو ایک مشہور اور باقاعدہ بستی کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی، وہاں کے باشندوں کی تعداد مکہ مکرمہ کے لوگوں سے زیادہ تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں یہودیوں کا خاصا بڑا طبقہ آباد تھا۔ یہودی تو تعداد میں خاصے زیادہ تھے۔ لیکن اکا دکا عیسائی بھی آباد تھے۔ ان لوگوں میں پڑھنے پڑھانے کا بہت رواج تھا۔ یہودیوں کے مدارس موجود تھے (ان کے ہاں تعلیمی اداروں کو مدارس کہا جاتا تھا)، وہاں یہودی طلبہ پڑھا کرتے تھے۔ عربوں کے بچے بھی وہاں پڑھنے کے لیے چلے جایا کرتے تھے۔ بعد میں مسلمان بچوں کے جاکر پڑھنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت زید ابن ثابتؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے وہاں جاکر چند ہفتوں میں عبرانی زبان سیکھ لی تھی۔

مدینہ منورہ میں خط حمیری کا رواج تھا۔ یہ خط نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اور مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جن صحابہ کرامؓ کی ہمراہی حاصل ہوئی یعنی حضرت ابی ابن کعب، حضرت ابو درداء، حضرت عبادہ ابن صامتؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور حضرت زید ابن ثابتؓ وغیرہ۔ یہ سب کے سب اس خط حمیری سے زیادہ مانوس تھے، اس لیے مدینہ منورہ آنے کے بعد قرآن مجید کے اجزاء زیادہ تر خط حمیری میں لکھے جانے لگے۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور جیسا کہ ہر انسانی کاوش وقت اور مشق کے ساتھ بہتر ہوتی جاتی ہے۔ اس خط میں بہتری پیدا ہوتی گئی اور نکھار آتا گیا یہاں تک کہ جب عراق میں کوفہ اور بصرہ کی نئی اسلامی بستیاں بسائی گئی تو عربی رسم الخط کو بڑی تیزی سے ترقی ملنا شروع ہوئی۔ یہ دونوں بستیاں عسکری اور انتظامی ضروریات سے عراق

عرب کے علاقے میں حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں بسائی گئیں تھیں۔ بہت جلد دونوں بستیوں نے مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کے بڑے مراکز کی حیثیت اختیار کرلی۔ جزیرہ عرب کی شمالی سرحدوں پر جب یہ دو بڑے تہذیبی مراکز قائم ہوئے تو وہاں جلد ہی ایک نیا خط پیدا ہوا جسے خط کوفی کہتے ہیں۔ یہ خط کئی سو سال جاری رہا۔ آج قرآن مجید کے بے شمار نسخے خط کوفی میں موجود ہیں۔ یہ خط جسے خط کوفی کا نام دیا گیا، دوسری صدی ہجری کے آغاز یا اس کے لگ بھگ شروع ہوا، اور پھر قرآن مجید اور عربی زبان کی بیشتر تحریریں اسی خط میں لکھی جانے لگیں۔ خط کوفی کم وبیش دو سال جاری رہا، یہاں تک کہ اس میں مزید خوبصورتی اور نکھار پیدا ہوا۔ تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ خطاطی میں ترقی ہوتی گئی۔ عہد عباسی میں جہاں اور بہت سے تہذیبی کارنامے انجام پائے۔ وہاں خط نسخ بھی رائج ہوا جو عربی زبان کا سب سے مقبول خط ہے۔ گذشتہ ایک ہزار سال کے دوران میں عربی زبان میں اکثر و بیشتر تحریریں اسی خط میں لکھی گئی ہیں۔ قرآن مجید بھی اسی خط میں لکھا جانے لگا اور دنیا کے بہت بڑے حصہ میں ابھی تک خط نسخ ہی میں لکھا جاتا ہے۔

ان خطوط میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے کہ یہ سب عربی زبان ہی کے خطوط تھے اور ان سب میں عربی زبان ہی لکھی جاتی رہی ہے۔ ان میں فرق صرف اس نوعیت کا ہے جیسے انگریزی کے مختلف خطوط میں ہوتا ہے، وہاں مطبوعہ خط اور ہوتا ہے، اور تحریری خط اور۔ گوتھک خط میں بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں جو عام خط میں نہیں ہوتے۔ آج کل کمپیوٹر میں عربی رسم الخط کے پچاسوں نمونے ملتے ہیں۔ یہ فرق بھی اسی طرح کی چیز تھی۔ یہ ایک ہی خط کی مختلف ترقیاتی شکلیں تھیں۔ ابتدائی شکل نبطی، پھر حمیری، پھر کوفی، اور آگے چل کر نسخ اور اب تقریباً ۱۰۵ یا ۱۰۴ خطوط عربی زبان میں، قرآن مجید کے موجود ہیں۔ فیصل مسجد میں ایک نسخہ رکھا ہوا ہے۔ جس میں قرآن مجید لکھنے کے لیے تقریباً چار سو خطوط استعمال ہوئے ہیں۔ آپ میں سے کوئی بہن دیکھنا چاہیں تو جا کر دیکھ سکتی ہیں۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مجید اکثر و بیشتر جھلیوں سے بنے ہوئے کاغذ پر، کبھی کبھی باہر سے آئے ہوئے عمدہ اور نفیس کاغذ پر، اور کاغذ کے علاوہ اور چیزوں پر بھی لکھا جاتا تھا۔ کاغذ اگرچہ کمیاب تھا لیکن نایاب نہیں تھا۔ جو صحابہ کرامؓ وسائل رکھتے تھے وہ کاغذ بھی استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اور جن کے وسائل کم تھے وہ رق

parchment وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ احادیث میں عُسُب کا ذکر بھی آیا ہے۔ جو عسیب کی جمع ہے۔ یہ بھی لکھنے کے لیے کاغذ نما ایک چیز ہوتی تھی اور کھجور کی چھال خشک کر کے کاغذ کی طرح بنالی جاتی تھی۔ لخاف کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جو لخف کی جمع ہے۔ یہ ایک چوڑی اور کشادہ سل نما چیز ہوتی تھی۔ یہ پتھر سے بنائی جاتی تھی۔ اس کی شکل غالباً وہ تھی جیسے آجکل بچوں کی سلیٹ ہوتی ہے۔ رقاع رقعہ کی جمع ہے، جس کے لفظی معنی رقعہ کے ہیں۔ جسے اردو میں ہم چٹھی بولتے ہیں، یہ کاغذ یا چمڑے کے ٹکڑے کا ہوتا تھا۔ اکتاف جو کتف کی جمع ہے، یہ اونٹ یا بڑے جانوروں کے مونڈھے کی ہڈی ہوتی تھی جس کو تختی کی طرح ہموار کر لیا جاتا تھا، پھر یہ لکھنے کے کام آتی تھی۔ ان چیزوں کے علاوہ لکڑی کی بڑی اور کشادہ شاخوں سے بنائی ہوئی تختیاں یا الواح بھی لکھنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کا احادیث میں ذکر آیا ہے۔ ان سب پر قرآن مجید لکھا جاتا تھا۔ قراطیس (قرطاس کی جمع) کا ذکر بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔

لیکن یہ سب چیزیں ایک مسلسل نظر ثانی کے عمل سے اور کتابت اور دوبارہ کتابت کے عمل سے گزرتی رہتی تھیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت صحیح بخاری میں موجود ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چھوٹے چھوٹے پرزوں (رقعوں یا چٹھیوں) سے قرآن مجید کی تالیف (تدوین) کیا کرتے تھے۔ کنا نئولف القران من الرقاع فی زمن النبی ؐ۔ اس کے معنی وہی ہیں کہ جب ایک سورت مکمل ہوجاتی تھی تو صحابہ کرامؓ سے کہا جاتا تھا کہ اپنے اپنے پاس موجود وہ اشیائے کتابت لے آئیں جن پر اس سورت کے مختلف اجزاء لکھے ہوئے ہیں۔ اور ان اجزاء کو اب اس نئی ترتیب سے مرتب کرلیں، جس ترتیب میں اب یہ سورت مکمل ہوئی ہے۔

اس عمل کی ایک چھوٹی سی مثال بلاتشبیہ یہ ہے کہ اگر آپ شاعر ہوں، مصنف یا مضمون نگار ہوں، اور کسی کو اپنے شعر یا مضمون کے مختلف اجزاء جیسے جیسے تیار ہوں بلاترتیب دیتی جائیں اور اس سے کہیں کہ ان سب کو محفوظ کرتا جائے۔ جب پورا مضمون، کتاب یا قصیدہ مکمل کر چکیں تو اب اس کو از سر نو اصل ترتیب سے مرتب کریں، اور بتاتی جائیں کہ پہلے یہ حصہ رکھنا ہے اور بعد میں وہ حصہ رکھنا ہے۔ اور جب یہ کام مکمل ہوجائے تو کہیں کہ اب ان سب کو فلاں ترتیب سے لکھ دیں۔ اس پورے عمل میں گویا پہلے ان سب اجزاء کو چھوٹے چھوٹے پرزوں اور یادداشتوں پر لکھا جائے گا، اور پھر آخر میں ان چھوٹے چھوٹے پرزوں سے پوری کتاب کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا۔

یہ عمل صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ ہوتا رہتا تھا۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ قرآن مجید کی سورتوں اور آیات کو مرتب کیا جارہا تھا اور حضورؐ کی خود بہ نفس نفیس اس کام کی نگرانی فرمارہے تھے۔ یہی معنی ہیں تالیف کے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کے الفاظ ہیں۔ کنا نولف۔ یعنی ہم تالیف وتدوین کیا کرتے تھے۔

یہ بات میں نے ذرا وضاحت سے اس لیے عرض کردی ہے کہ بعض غیر مسلم مصنفین نے اس روایت کو بڑے غلط معنی پہنائے ہیں اور تالیف کو تصنیف کے معنی میں سمجھا ہے۔ مولف کے معنی ہیں وہ شخص جو بہت سی چیزوں کو ایک جگہ جمع کردے۔ کئی ٹکڑوں کو یکجا کرکے ایک مرتب چیز لکھ دے، خود اس عمل کو تالیف اور اس عمل کے کرنے والے کو مولف کہتے ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اب آپ ذرا تصور فرمائیں کہ قرآن مجید کی تدوین کی کیفیت کیا رہی ہوگی۔ ہر شخص چشم تصور سے دیکھ سکتا ہے کہ تقریباً ایک لاکھ صحابہ کرامؓ کے پاس قرآن مجید کے اجزاء لکھے ہوئے موجود تھے۔ الگ الگ سورتیں بھی یاد تھیں۔ جس صحابی کو جتنا قرآن مجید حفظ تھا اتنے ہی کی ترتیب کے بھی وہ حافظ تھے۔ جس کو جتنا یاد نہیں تھا اتنی ترتیب بھی ان کو زبانی یاد نہیں تھی۔ لیکن ان میں ہزاروں ایسے تھے جو پورے قرآن مجید کے جید عالم اور پختہ حافظ اور قاری تھے اور پورا قرآن مجید صحیح ترتیب سے ان کو یاد تھا۔ لیکن جن حضرات کو پورا قرآن مجید یاد تھا ضروری نہیں کہ ان کے سب پاس اسی ترتیب سے لکھا ہوا بھی موجود ہو۔ لکھا ہوا جو موجود تھا وہ الگ الگ سورتوں کی شکل میں، الگ الگ کاغذوں اور تختیوں پر لکھا ہوا تھا۔ اور یہ سارا ذخیرہ کسی تھیلے میں، صندوق میں یا الماری میں رکھا ہوتا تھا۔ مثلاً ایک پرزے پر ایک آیت، اور دوسرے پرزے پر دوسری آیت۔ ایک تختی پر ایک سورت اور دوسری تختی پر دوسری سورت۔ کچھ لوگوں نے ان اجزاء کو بڑے مٹکے میں جمع کیا ہوا تھا۔ اس طرح سے قرآن مجید موجود تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

وہ صحابہ کرامؓ جو سرکاری طور پر قرآن مجید لکھتے تھے جن کا لقب عرف عام میں کاتبان وحی ہے، ان کے نام مختلف جگہ آئے ہیں۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تقریباً ۵۰ تا ۷۰ حضرات تھے۔ ان میں زیادہ نمایاں نام خلفاء اربعہ کے علاوہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت سالم مولی ابی حذیفہؓ، حضرت ابی ابن کعبؓ، حضرت زید ابن ثابتؓ وغیرہ کے تھے۔ ان کے علاوہ

بھی بہت سے لوگ تھے۔ ان میں بعض صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کا اتنا علم حاصل کر لیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے صحابہ کرامؓ کو ہدایت کی کہ ان سے قرآن مجید سیکھیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں جہاں مناقب انصار کا ذکر ہے وہاں بتایا گیا ہے کہ چار صحابی ایسے ہیں کہ ان سے قرآن مجید سیکھو، یعنی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، حضرت سالم مولی ابی حذیفہؓ، حضرت معاذ ابن جبلؓ اور حضرت ابی ابن کعبؓ۔ ان کو قرآن مجید کا اتنا گہرا اور پختہ علم حاصل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یادداشت اور علم قرآن کی تصدیق فرمائی۔

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے تو یہی صورتحال جاری رہی۔ جن صحابہ کرامؓ کے پاس جس قدر قرآن جس طرح محفوظ تھا، وہ اسی طرح محفوظ رہا۔ جن کو یاد تھا وہ اس کی تعلیم دے رہے تھے اور تعلیم پانے والے اس کی تعلیم پا رہے تھے۔ مدینہ منورہ میں ان ۹ مساجد کے علاوہ جن کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے مزید مساجد تعمیر ہوتی گئیں، بلکہ روزانہ ہی نئی نئی مساجد تعمیر ہو رہی تھیں اس لیے کہ مدینہ منورہ ایک پھیلا ہوا شہر تھا۔ اس کی نوعیت وہ نہیں تھی جو آج کسی گاؤں کی ہوتی ہے۔ بلکہ جیسے چھوٹے چھوٹے محلے اور گڑھیاں ہوتی ہیں، کہ چاروں طرف مضبوط دیوار ہے، درمیان میں گڑھی ہے، اس کے باہر زرعی زمین ہے، جو اس علاقے کے لوگوں کی ملکیت ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک اور گڑھی ہے۔ پھر زمین ہے، جو اس علاقہ کے لوگوں کی ملکیت ہے۔ اس طرح تقریباً ۱۵ یا ۲۰ آبادیوں کے مجموعے کا نام یثرب یا مدینہ منورہ تھا۔ ان میں سے ایک آبادی وہ تھی جو بنو نجار کی آبادی کہلاتی تھی۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر قیام فرمایا تھا اور مسلمانوں کی اکثریت سب سے پہلے اس علاقے میں ہوئی۔ پھر اس کے بعد بقیہ علاقوں میں ایک ایک کر کے مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی۔ بعض بستیاں ایسی تھیں جہاں حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ تک بھی مسلمانوں کی اکثریت نہیں تھی، یہودی وغیرہ زیادہ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ہر طرف سے کفار عرب نے حملہ کر دیا اور مدعیان نبوت کھڑے ہوگئے۔ مانعین زکوٰۃ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ایسی ایمرجنسی جزیرہ عرب میں پیدا ہوگئی جس کی نقشہ کشی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بڑے جامع اور دردناک انداز میں کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد مسلمانوں کی حیثیت وہ ہوگئی تھی، جو ایک انتہائی سرد برسات کی

رات میں جب بارش ہو رہی ہو اور رات تاریک ہو ایک ایسی بکری کی ہوتی ہے جو اپنے گلے سے بچھڑ گئی ہو اور گلیوں میں کھڑی ہو، اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ یہ کیفیت مسلمانوں کی تھی، اور اگر اللہ تعالیٰ میرے والد کے ذریعے سے مسلمانوں کی راہنمائی نہ کرتے تو کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کیا پیش آتا۔

اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ۱۲ لشکر مختلف علاقوں میں بھیجے اور اس قدر غیر معمولی جرات اور ہمت کا مظاہرہ کیا جس کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس پورے عمل کے دوران میں صحابہ کرامؓ نے بڑی قربانیاں دیں۔ اور بڑی تعداد میں جام شہادت نوش کیا۔ ان میں ایک جنگ جو جنگ یمامہ کہلاتی ہے اور مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی گئی تھی اس میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی دی۔ لیکن تقریباً سات سو ایسے صحابہ کرامؓ اس موقع پر شہید ہو گئے جو قرآن مجید کے حافظ تھے۔ جب ان سات سو صحابہ کرامؓ کی شہادت کی اطلاع ملی تو سیدنا عمر فاروقؓ گھبرا گئے۔ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ ڈالا کہ اس موقع پر قرآن مجید کی حفاظت کا بندوبست کرنا چاہیے۔ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے کہا کہ آپ قرآن مجید کی حفاظت کے لیے کچھ کریں' اس سے پہلے کہ مسلمان قرآن میں اس طرح کا اختلاف شروع کردیں، جیسا اختلاف یہود اور نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں شروع کردیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جواب میں کہا کہ میں وہ کام کیسے کروں جو حضورؐ نے اپنی زندگی میں نہیں کیا۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ ان پر برابر زور ڈالتے رہے۔ بالآخر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کے لیے میرا سینہ بھی کھول دیا تھا جس کے لیے عمرؓ کا سینہ کھولا تھا۔

وہ کیا چیز تھی جس کے لیے حضرت عمرؓ کا سینہ کھولا گیا تھا اور اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کا سینہ کھولا گیا۔ وہ یہ خطرہ نہیں تھا کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے گا۔ یہ خطرہ بھی نہیں تھا کہ قرآن مجید میں کوئی ایسی چیز ملادی جائے گی جو اس کا حصہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح قرآن مجید کو محفوظ فرما گئے تھے اس کے بعد یہ امکان ہی نہیں تھا کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے، یا کوئی چیز باہر سے آکر اس میں شامل ہو جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ کو جو اصل خطرہ تھا وہ یہ تھا کہ کہیں قرآن مجید کی ترتیب میں اختلاف

نہ پیدا ہو جائے۔ اس لیے کہ وہ حفاظ جن کو یہ معلوم ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب کیا ہے اگر وہ پورے قرآن پاک کو کتابی صورت میں مدون اور عام کرنے سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو اس کا امکان موجود ہے کہ بعد میں آنے والے لوگوں میں آیات اور سورتوں کی ترتیب کے بارہ میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے۔ اس لیے کہ اگر صحابہ کرامؓ اپنے اپنے تحریری ذخائر کو یونہی چھوڑ کر دنیا سے جاتے رہے تو آئندہ لوگوں کے پاس جب یہ لکھے ہوئے ذخیرے پہنچیں گے اور بوریاں اور صندوقوں میں قرآن مجید کے اجزاء بھرے ہوں گے تو کون بتائے گا کہ شروع میں سورۃ فاتحہ تھی یا سورۃ بقرہ، یہ کون بتائے گا کہ اقراء سے لے کر مالم یعلم تک جو حصے ایک کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں اس کا بقیہ کون سا ہے۔ یہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ دونوں ایک ہی سورت کے دو حصے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بعد میں آنے والا کوئی شخص اقراء کی ابتدائی آیات کو فاتحہ کے ساتھ ملا دے، اس طرح اس بات کا امکان عقلاً موجود تھا کہ قرآن مجید کے کچھ نسخے ایسے بھی تیار ہو جائیں جن میں ترتیب کا فرق ہوں۔ یہ تھا وہ خطرہ جو عمر فاروقؓ کو لاحق ہوا، جس کی وجہ سے انہوں نے کہا کہ ترتیب کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔

چنانچہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس کام پر شرح صدر حاصل ہو گیا تو انہوں نے حضرت زید ابن ثابتؓ کو بلوایا۔ وہ پہلے دن سے مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص اور معتمد صحابہ میں سے تھے۔ کاتبین وحی میں ان کا خاص مقام تھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیکرٹری کے طور پر بھی کام کیا تھا۔ آپؐ کے کہنے سے انہوں نے یہودیوں سے عبرانی زبان سیکھی تھی اور بعد میں سریانی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ اور ان زبانوں میں خط و کتابت انہی کے دست مبارک سے ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر سفر میں بھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے۔ کتابت وحی کے لیے بھی انہیں بلایا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سب سے پہلے انہیں بلا کر ان کے سامنے اس معاملہ کو رکھا۔ انہوں نے بھی وہی بات کہی جو ابتداء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمائی تھی، کہ آپ وہ کام کیوں کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں وہ تمام دلائل دیئے، جو عمر فاروقؓ نے انہیں دیے تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کا سینہ بھی کھول دیا۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرے وہم اور گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ مجھی سے اس کام کے کرنے کو کہا جائے گا۔ شاید اس تامل اور تردد کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ

اس وقت خاصے نوعمر تھے۔ کوئی ۲۲، ۲۳ برس کے ہوں گے۔ بڑے معمر صحابہ جو سابقون الاولون میں سے تھے، وہ بھی اس زمانہ میں موجود تھے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں نے حضرت زید ابن ثابتؓ سے کہا کہ یہ کام آپ ہی کو کرنا ہے۔ اور خاصے اصرار کے بعد ان کو تیار کرلیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک ایسا کام کرنے کو کہا گیا تھا جس کے مقابلے میں اگر مجھ سے یہ کہا جاتا کہ احد پہاڑ کو ایک طرف سے کھودنا شروع کرو۔ اور اسے کھود کر دوسری سمت میں منتقل کردو تو شاید یہ کام میرے لیے زیادہ آسان ہوتا۔ احد پہاڑ کی منتقلی سے بھی زیادہ مشکل کام میرے سپرد کیا گیا۔

جب یہ بات طے ہوگئی تو پھر ایک مجلس مشاورت بلائی گئی جس میں تقریباً پچیس تیس حضرات نے شرکت فرمائی۔ ان میں سے اکثر کے نام کتب حدیث اور کتب سیرت میں موجود ہیں۔ ان یقیناً خلفاء اربعہ بھی شامل تھے، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ بھی شامل تھے۔ جن کی قرات کی حضورؐ نے تصدیق فرمائی تھی۔ حضرت ابی ابن کعب بھی شامل تھے، جن کو حضورؐ نے اپنی امت کا سب سے بڑا قاری کہا تھا۔ ان میں وہ خوش نصیب بزرگ بھی شامل تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ عیہ وسلم نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی، جو عشرہ مبشرہ کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ ان میں حضرت سالم مولی ابی حذیفہ بھی شامل تھے، جن کے بارہ میں حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے انتقال کے وقت فرمایا تھا کہ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو میں بلا تامل ان کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کر دیتا۔ ان سب حضرات نے یک زبان ہو کر حضرت عمر فاروقؓ کی رائے سے اتفاق فرمایا۔ اور یہ طے پایا کہ ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو قرآن مجید کا ایک مرتب نسخہ سرکاری طور پر تیار کرے۔ بظاہر اگر ہم غور کریں تو یہ کام کوئی زیادہ مشکل نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ صورت حال یہ ہے کہ لاکھوں صحابہ کرامؓ حافظ ہیں، گھر گھر قرآن پاک کے لکھے ہوئے اجزاء موجود ہیں۔ حضرت زید ابن ثابتؓ خود حافظ اور کاتب وحی ہیں۔ وہ ایک جگہ بیٹھتے اور تمام تحریری اجزاء کو جمع کر کے لکھنا شروع کرتے۔ اور پندرہ بیس دن یا مہینہ دو مہینہ میں اس کام کو کر کے لے آتے۔

لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ ڈالا کہ انہوں نے اس سلسلہ میں بعض بڑی عجیب وغریب ہدایات دیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ یہ سات حضرات کی جو کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ سب سے پہلے یہ ساتوں حضرات آپس میں اپنے اپنے حافظہ اور اپنی اپنی یادداشتوں کا تبادلہ کریں گے۔ جب کوئی آیت لکھیں تو سب سے پہلے آپس میں سب ایک دوسرے کو پڑھ کر

سنائیں گے۔ جس آیت پر سب کا حافظہ متفق ہو جائے تو پھر اپنے پاس ان آیات کے جتنے تحریری ذخائر موجود ہوں جو حضورؐ کے سامنے عرضہ میں پیش ہو چکے ہوں اور حضورؐ نے ان کو اسی طرح سے منظور اور مستند کر دیا ہو۔ ان تحریری ذخائر میں سے اس آیت کی سب اپنے اپنے طور پر تصدیق کریں اور وہ نوشتہ لے کر آئیں۔ اس طرح گویا ایک آیت کی چودہ چودہ گواہیاں ہوں: یعنی ان ساتوں ارکان کی اپنی اپنی یادداشت اور قوت حافظہ کی بنیاد پر زبانی گواہیاں، پھر ان ساتوں حضرات کے تحریری ذخائر میں سے دستاویزی گواہیاں۔ ان سب گواہیوں کے بعد بھی ہر آیت پر مزید دو گواہیاں کمیٹی کے باہر سے لی جائیں۔ ہر آیت پر کوئی دو صحابی آ کر یہ گواہی دیں کہ اس آیت کو ہم نے اسی طرح سنا ہے اور یہ ہمیں اسی طرح یاد ہے۔ پھر ہر آیت کی تائید میں دو دو تحریری نوشتے لائے جائیں اور ہر نوشتے کی دو دو آدمی آ کر گواہی دیں۔ جب یہ سارا عمل مکمل ہو جائے تو اس کے بعد قرآن کی اس آیت کو لکھا جائے۔

اب اس سے زیادہ اہتمام و انتظام انسانی سطح پر ممکن نہیں ہے۔ انسان کے تصور میں نہیں آ سکتا کہ اس سے زیادہ کوئی اور کوشش اور مزید اہتمام کیا جا سکے۔ ان حضرات سے کہا گیا کہ مسجد نبویؐ میں بیٹھیں اور وہاں بیٹھ کر اس کام کو کریں تا کہ سب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ کام کس طرح ہو رہا ہے۔ گویا ایک کھلے ٹریبونل یا کھلی عدالتی کارروائی کے انداز میں یہ سارا کام کیا جائے۔ اکثر و بیشتر حضرت عمر فاروقؓ بذات خود بھی خلیفہ اول کے حکم سے ان حضرات کے ساتھ تشریف فرما ہوتے تھے۔ خاص طور پر جب گواہیاں لی جاتیں تو وہ بھی موجود ہوتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی رعب اور دبدبہ عطا فرمایا تھا۔ صحابہ کی مجلس میں بھی ہر شخص ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھا کرتا تھا۔ اور ہر کسی کی ان کے سامنے بولنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ ان کی موجودگی میں صحابہ کرامؓ بھی بے تکلفی سے گفتگو نہیں کرتے تھے۔ وہ بذات خود اس کام میں شریک ہوئے۔ اور یوں یہ سارا کام چند ماہ میں مکمل ہو گیا۔ اس کمیٹی میں حضرت ابی ابن کعب اور حضرت عبداللہ ابن عباس بھی شامل تھے۔ حضرت زید ابن ثابتؓ جو اس پورے کام کے ذمہ دار تھے انہی کی سربراہی میں کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ کُل سات حضرات تھے۔ ان سب نے مل کر قرآن مجید کا پورا نسخہ مکمل کر لیا۔ حضرت زید ابن ثابتؓ لکھنے والے تھے اور بقیہ اصحاب ان کی مدد کرنے والے تھے۔ قرآن مجید لکھنے کا جو اسلوب انہوں نے اختیار کیا اس کو رسم عثمانی کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی ایک ایک آیت پر گواہیوں کا سلسلہ بھی مکمل ہوگیا۔ ہر آیت پر دو دو گواہیاں زبانی اور تحریری بھی آ گئیں۔لیکن سورۃ توبہ کے آخر کی دو آیات ایسی تھیں کہ ان دونوں آیات پر آ کر کام رک گیا۔ یہ سورۃ توبہ کی آخری دو آیات تھیں۔ لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ماعنتم۔ سے لے کر سورت کے ختم تک کی دو آیتیں۔ان دونوں آیات کے بارے میں یہ ساتوں ارکان مطمئن تھے کہ یہ قرآن مجید کی سورۃ توبہ کی آخری دو آیات ہیں۔اور سورۃ توبہ کے سب سے آخر میں ہیں۔ان کو زبانی بھی یاد تھیں اور ان کے پاس تحریری ثبوت بھی موجود تھے، جو حضورؐ کے سامنے پیش کیے جا چکے تھے۔کمیٹی سے باہر کے دو صحابہ کرامؓ نے بھی آ کر گواہی دے دی کہ یہ دونوں آیات سورۃ توبہ کے آخر کی آیات ہیں، اور حضورؐ نے انہیں سورۃ توبہ کے آخر میں ہی لکھوایا تھا۔ دو تحریری وثیقے بھی آ گئے، ان میں سے ایک تحریری وثیقہ کی گواہی دینے کے لیے دو گواہ بھی آ گئے۔لیکن ان میں سے ایک وثیقہ ایسا تھا جس کا صرف ایک گواہ تھا۔حضرت عمرؓ فاروق نے کہا کہ دوسرا گواہ بھی لے کر آؤ۔انہوں نے کہا دوسرا گواہ تو نہیں ہے۔

چنانچہ مدینہ منورہ میں اعلان کروایا گیا کہ جس کے پاس سورۃ توبہ کی آخری دو آیات تحریری طور پر موجود ہوں اور حضورؐ کے سامنے عرضہ میں بھی پیش ہو چکی ہوں، وہ اس دستاویز کو لے کر آ جائے، اور جو حضرات اس عرضہ میں موجود تھے ان میں سے دو گواہ بھی ساتھ لائے۔لیکن اس اعلان کے جواب میں بھی کوئی صاحب نہیں آئے۔کئی دن گذر گئے، کمیشن کے ارکان انتظار کرتے رہے اور تلاش بھی جاری رہی۔صحابہ کرامؓ میں دلچسپی پیدا ہوگئی کہ کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ممکن ہے جو صحابی اس عرضہ کے وقت موجود ہوں وہ اس وقت کہیں سفر پر گئے ہوں، یا ممکن ہے کہ ان حضرات کا جو عرضہ میں موجود تھے انتقال ہو چکا ہو۔یعنی اس وقت ان کی عدم موجودگی کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ جب یہ مسئلہ زیادہ بڑھا تو اس کو جمعہ کے اجتماع میں پیش کیا گیا۔کسی نے مشورہ دیا کہ کوئی بات نہیں آپ ان آیات کو ایک ہی گواہ کی گواہی پر قبول کر لیجیے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جواباً انکار فرمایا۔وجہ ظاہر تھی کہ جب ہم نے ایک اصول طے کر دیا ہے تو اب ہم اس کے مطابق ہی چلیں گے۔آپ کسی نہ کسی طرح دوسرا گواہ لائیے۔آس پاس کی بستیوں میں بھی اعلان کرادیا گیا۔لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔پھر دوبارہ جب ایک زیادہ بڑے اجتماع میں اس مسئلہ کو رکھا گیا تو وہاں کسی نے سوال کیا کہ اس دستاویز کی گواہی میں جو ایک گواہ میسر ہیں وہ کون

سے صحابی ہیں۔ اور جیسے ہی ان صحابی کا نام آیا سب نے کہا مسئلہ حل ہو گیا۔ اور پھر فوراً ان دونوں آیات کو لکھ لیا گیا۔ دوسرے گواہ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ کبھی کبھی پیدل شہر سے باہر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ شاید چہل قدمی کرنے کے لیے تشریف لے جاتے ہوں۔ یا شاید لوگوں کے معاملات کو دیکھنے کے لیے جاتے ہوں، کسی اور وجہ سے جاتے ہوں، بہر حال کبھی کبھی تنہا شہر سے باہر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اسی طرح مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ تھوڑے فاصلے پر بدوؤں کا ایک قافلہ گزر رہا تھا اور کچھ دیر کے لیے وہاں ٹھہر گیا تھا۔ قافلے میں ایک شخص تھا جس کے پاس فروخت کرنے کے لیے ایک اونٹ تھا۔ حضورؐ نے اس سے دریافت فرمایا کہ یہ اونٹ کتنے کا بیچو گے۔ اس نے قیمت بتادی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمائی اور اس سے فرمایا کہ آؤ میرے ساتھ! میں تمہیں اس کی قیمت ادا کر دیتا ہوں۔ اونٹ والا اونٹ کی نکیل پکڑے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگے تشریف لے جانے لگے۔ جب مدینہ منورہ میں داخل ہو کر وہاں کے بازار سے گزرے تو لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ آپؐ کے پیچھے پیچھے آنے والا یہ کون شخص ہے، اور یہ کہ اس کے اونٹ کا سودا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طے ہو چکا ہے۔ ایک شخص نے راستہ میں اس سے پوچھا کہ اونٹ بیچتے ہو؟ اس نے کہا کہ ہاں بیچتا ہوں۔ پوچھا کتنے کا بیچو گے؟ اس نے جواب دیا: تم بتاؤ کتنے کا لو گے؟ اس شخص نے زیادہ قیمت لگائی، یہ اُس قیمت سے زیادہ تھی۔ جو وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طے کر کے آیا تھا۔ اونٹ کے مالک نے کہا: لاؤ رقم دے دو۔ جب اس نے رقم مانگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور فرمایا: یہ اونٹ تم نے مجھے نہیں بیچ دیا؟ اس نے کہا نہیں! میں تو نہیں جانتا کہ آپؐ کون ہیں! گویا اس نے جھٹلایا اور تکذیب کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرا تم سے سودا طے نہیں ہو گیا تھا؟ تم نے قیمت بتائی تھی اور میں نے منظور کر لی تھی اور اب تم رقم لینے کے لیے میرے ساتھ ساتھ نہیں آرہے تھے؟ اونٹ کے مالک نے ہر چیز سے صاف انکار کر دیا اور بولا: نہیں! میرا آپ کے ساتھ کوئی سودا نہیں ہوا! اور اگر آپ ایسی بات کہتے ہیں تو پھر اس پر کوئی گواہ لے کر آئیں۔ کوئی آپ کی گواہی دے گا تو میں اونٹ بیچوں گا۔ ایک انصاری صحابی حضرت

خزیمہ ابن ثابت وہاں کھڑے ساری بات سن رہے تھے۔فوراً بول اُٹھے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کی اس شخص سے بات ہوئی تھی۔اس نے یہ قیمت بتائی تھی اور آپؐ نے منظور فرمائی تھی۔اور اب یہ شخص طے شدہ قیمت لینے آپ کے ساتھ جارہا تھا۔اس پر وہ شخص خاموش ہوگیا اور جن صاحب نے زیادہ قیمت' بتائی تھی وہ بھی پیچھے ہٹ گئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی زیادہ قیمت' جو بازاروالے صاحب نے بتائی تھی' ادا کر کے اس اونٹ کو خرید لیا۔اور خرید کر اپنے دولت خانہ پر تشریف لے آئے۔حضرت خزیمہ ابن ثابت بھی ساتھ ہی تھے۔اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے حیرت سے فرمایا کہ جب میں نے اس شخص سے سودا کیا تو اس وقت تم وہاں موجود تھے؟ انہوں نے عرض کیا: نہیں، میں تو وہاں موجود نہیں تھا۔آپؐ نے فرمایا: پھر تم نے کس بنیاد پر اس بات کی گواہی دے دی؟ انہوں نے عرض کیا: جس بنیاد پر میں نے یہ گواہی دی کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔جس بنیاد پر یہ گواہی دی کہ آپؐ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے۔جس بنیاد پر مجھے یہ معلوم ہوا کہ جنت اور دوزخ موجود ہیں اور جس بنیاد پر سب کچھ مان رہا ہوں' اسی بنیاد پر یہ بھی مان لیا کہ آپ نے اس شخص سے جو سودا کیا وہ وہی تھا جو آپؐ بیان فرمار ہے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ساری بات سن کر بے حد خوش ہوئے اور وہاں موجود صحابہ سے فرمایا کہ آج سے خزیمہ کی گواہی دو اشخاص کے برابر مانی جائے۔اس واقعہ کے بعد ان کی زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ ان کی گواہی ایک تھی اور اس کو دو ماننے کی ضرورت پیش آئی۔یہ واقعہ صحابہ کرامؓ کے علم میں تھا،لہٰذا جیسے ہی ان کا نام لیا گیا ان کی ایک گواہی کو دو مان لیا گیا اور یہ آیات قرآن مجید کے متعلقہ مقام پر لکھ لی گئیں۔

اس طرح تاریخ میں قرآن مجید کا پہلا،مکمل،مستند اور سرکاری طور پر تیار شدہ نسخہ تیار ہوا۔جو خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس رہا۔گویا پہلی مرتبہ قرآن مجید کی تمام آیات اور سورتوں کو ترتیب تلاوت کے مطابق جھلی سے بنے ہوئے کاغذ پر لکھ کر کتابی شکل دی گئی۔کہا جاتا ہے کہ وہ نسخہ ڈیڑھ ہاتھ لمبا اور غالباً ایک ہاتھ چوڑا تھا۔چونکہ اس پر موٹے حروف لکھے گئے تھے اس لیے بڑا سائز اختیار کیا گیا اور اس کو تیار کر کے دھاگے سے اس طرح سی دیا گیا تھا جیسے کتاب کی جلد بنائی جاتی ہے۔یہ نسخہ خلیفہ اول کے پاس رہا۔ان کے انتقال کے بعد یہ نسخہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے پاس رہا اور ان کے انتقال کے بعد ان کی صاحبزادی ام المومنین حضرت

حفصہؓ کی تحویل میں چلا گیا۔ وہ اس سے تلاوت فرمایا کرتی تھیں۔ اور اگر کوئی دیکھنا چاہتا تو اس کو دکھایا بھی کرتی تھیں۔ صحابہ یا تابعین میں سے لوگ آ آ کر اس کا کوئی لفظ یا اس کے ہجے اور تلفظ چیک کرنا چاہتے تو وہ بھی کر لیا کرتے تھے۔

خلیفہ دوم کے بعد جب خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا تو تدوین قرآن کی تاریخ کا ایک اور اہم بلکہ آخری اہم قدم اٹھایا گیا۔ یہ ان کے زمانہ خلافت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے۔ سیدنا عمر فاروق کا انتقال ۲۳ھ میں ہوا تھا اور یہ ۲۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت مسلمان آرمینیا اور آذربائیجان کے علاقہ میں جہاد کر رہے تھے۔ یہ وہ علاقے ہیں جو کم وبیش دو سو سال روسی استعمار اور غلامی میں گزارنے کے علاوہ ستر سال سوویت یونین کا حصہ رہے اور اب آزاد مملکتیں ہیں۔ آرمینیا میں آج کل غیر مسلموں کی اکثریت ہے جبکہ آذربائیجان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

اب صحابہ کرام کی تعداد تھوڑی رہ گئی تھی۔ اب زیادہ تعداد تابعین کی تھی۔ صحابہ کرامؓ بڑی تعداد میں تیزی سے دنیا سے تشریف لے جا رہے تھے۔ اس لیے عموماً یہ ہوتا تھا کہ جب کوئی فوج جہاد کے لیے کسی علاقہ میں بھیجی جاتی تھی تو فوج کے تابعین سپاہیوں کا اصرار ہوتا تھا کہ ہمارے ساتھ کسی جلیل القدر صحابی کو ضرور بھیجا جائے، تاکہ ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائیں۔ ہر فوجی دستے کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کے دستے میں کسی نہ کسی صحابی کی شمولیت ضرور رہو۔

حضرت حذیفہ ابن الیمانؓ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار کہلاتے ہیں اور بعض اہم معاملات میں حضورؐ نے ان کو اعتماد میں لے کر وہ باتیں ارشاد فرمائیں جو کسی اور سے نہیں کہیں۔ یہ صحابی بھی اس جہاد میں شریک تھے۔ حضرت حذیفہؓ صحابہ میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے اور بڑی جلیل القدر شان کے مالک تھے۔ فوج کے دستے ان کو وقتاً فوقتاً اپنے ہاں بلاتے تھے۔ وہ روزانہ کسی نئے دستے کے ساتھ مصروف جہاد ہوتے تھے۔ ایک روز وہ ایک دستے میں شامل تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ یہ غالباً مغرب یا عشاء کی نماز تھی۔ نماز کھڑی ہو گئی، امام نے ایک خاص لہجے میں قرآن کی تلاوت کی۔ نماز کے بعد کچھ لوگوں نے امام صاحب سے کہا کہ آپ کی تلاوت درست نہیں ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے بالکل صحیح پڑھا ہے اور میں نے فلاں صحابی سے قرآن پاک سیکھا ہے۔ اعتراض کرنے والے صاحب نے کہا کہ میں نے بھی

فلاں صحابی سے قرآن پاک سیکھا ہے، اس لیے میرا کہنا درست ہے۔

یہ دراصل لہجوں کا اختلاف تھا۔ جس کی طرف میں بعد میں تفصیل کے ساتھ آؤں گا۔ مثلاً اگر ایک تابعی قبیلہ ہذیل کے تھے تو انہوں نے ہذلی اسلوب اور لہجہ میں قرآن پاک پڑھا ہوگا، اور اگر دوسرے تابعی قبیلہ قریش کے تھے تو انہوں نے قریشی لہجے میں پڑھا ہوگا۔ اس وجہ سے ان دونوں میں آپس میں اختلاف پیدا ہوا ہوگا۔

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے جب یہ منظر دیکھا تو فوراً سالار لشکر سے واپسی کی اجازت طلب کی اور کہا کہ وہ فوری طور پر مدینہ منورہ جانا چاہتے ہیں۔ وہ اسی وقت اونٹ کی پشت پر سوار ہوئے اور سیدھا مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ کہتے ہیں کہ کئی ماہ کا سفر کر کے جب وہ مدینہ منورہ پہنچے تو گرمی کا زمانہ تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ لوگوں کو پتا چلا کہ صحابی رسولؐ حضرت حذیفہ بن ایمان میدان جہاد سے تشریف لائے ہیں تو مدینہ منورہ کے لوگ فوراً حاضر ہونے لگے۔ ہر ایک کا اصرار تھا کہ ہمارے گھر تشریف لے چلیے اور آرام فرمائیے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اسی وقت بلا تاخیر خلیفہ سے ملنا ہے، یعنی حضرت عثمان غنیؓ سے۔ لوگوں نے عرض کیا: دوپہر کا وقت ہے، ممکن ہے کہ وہ بھی آرام کر رہے ہوں، آپ بھی آرام فرمائیے، بعد میں مل لیجیے گا۔ لیکن انہوں نے فرمایا کہ میں ابھی اور اسی وقت خلیفہ وقت سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ سو رہے ہوں تو انہیں جگا دو اور بتاؤ کہ میں میدان جنگ سے سیدھا آ رہا ہوں۔

چنانچہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اسی وقت خلیفہ وقت کے پاس پہنچے اور جا کر کہا، ادرك امة محمدؐ قبل ان يختلفوا في القران اختلاف اليهود والنصارىٰ، محمدؐ کی امت کو تھامیے اس سے پہلے وہ اس اختلاف کا شکار ہو جائے جس کا شکار یہودی اور نصرانی ہو گئے تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے پوچھا: کیا بات ہو گئی؟ انہوں نے سارا واقعہ گوش گزار کیا۔ دونوں بزرگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے، اور یہ طے کیا کہ مختلف لہجوں میں قرآن مجید پڑھنے کی جو اجازت ابتداء میں دی گئی تھی اب اس کی ممانعت کر دی جائے۔ اور لوگوں سے کہا جائے کہ اب وہ صرف قریش کے لہجہ اور تلفظ میں قرآن پڑھا کریں، اس لیے کہ معیاری لہجہ قریش ہی کا ہے۔ مزید یہ کہ اب کسی کو کوئی ایسا ذاتی نسخہ قرآن مجید کا لکھا ہوا رکھنے کی اجازت نہ دی جائے جو حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانہ کے تیار کردہ معیاری اور مستند نسخہ سے نقل نہ کیا گیا ہو۔ یعنی لوگوں کا اپنا ذاتی طور

پر لکھا ہوا ہر نسخہ آج کے بعد سے ممنوع ہونا چاہیے۔ ایسا اس لیے کہا گیا کہ اس کا امکان موجود تھ کہ کسی لکھنے والے نے اس کو کسی قبیلہ کے لہجے پر لکھا ہوگا۔ اور کسی اور صاحب نے کسی اور قبیلہ کے لہجہ پر۔ جب کوئی ایک مشترک اور طے شدہ معیاری رسم الخط موجود نہ ہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کوئی ایسا معیاری خط پورے عرب میں موجود نہیں تھا جس کی پورے عرب میں یکساں طور پر پیروی کی جاتی ہو۔ مکہ میں اور خط تھا اور مدینہ میں اور خط تھا۔ دوسرے علاقوں میں دوسرے خطوط رائج تھے۔ قبائل کے لہجے بھی الگ الگ تھے اور اس بات کا امکان بہرحال موجود تھا کہ مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے حضرات نے اپنے اپنے لہجہ کے مطابق الگ الگ ہجے اختیار کر لیے ہوں۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ خدانخواستہ اگر کبھی یہ طے ہو جائے کہ اردو زبان کو رومن رسم الخط میں لکھا جائے گا (اگرچہ میں ذاتی طور پر اس کو ملک وملت کے لیے بہت بُرا اور تباہ کن سمجھتا ہوں لیکن صرف مثال کے لیے عرض کرتا ہوں) تو جب تک کوئی خاص معیاری ہجے مقرر نہ ہوں، کوئی کسی طرح لکھے گا۔ اور کوئی کسی طرح۔ مثلاً ظہیر کے لفظ لیجیے۔ کوئی اس کو Zaheer یعنی ڈبل e سے اور کوئی Zahir یعنی آئی سے لکھے گا۔ پھر اس طرح لکھنے میں اس کا شدید امکان موجود رہے گا کہ زاہر، ظاہر، ظہیر وغیرہ میں التباس ہو جائے۔ ہجا اور رسم الخط کے تنوع میں اس طرح کے التباس کا امکان رہتا ہے۔

خلیفہ سوم نے اس تمام مسئلہ پر بہت غور وخوض کیا، کبار صحابہ کو بلا کر ان سے مشورہ کیا اور دوبارہ آٹھ صحابہ کرامؓ پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کا کام یہ تھا کہ قرآن مجید کے پانچ یا سات یا چودہ، نسخے تیار کرے اور جہاں جہاں قرأت اور ہجاء کا اختلاف ہو اس کو مکہ کی قرأت کے مطابق اور مکہ کے ہجوں میں لکھا جائے، کیونکہ قرآن مجید قریش مکہ کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اگرچہ حضرت زید ابن ثابتؓ اور حضرت ابی ابن کعبؓ جو اس کمیٹی میں شامل تھے دونوں انصاری تھے اور مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے، لیکن ان سے کہا گیا کہ قرآن مجید کو قریش مکہ کے اسلوب ہجا اور لہجہ میں لکھا جائے۔

چنانچہ ان سب حضرات نے چندہ ماہ کے عرصہ میں قرآن مجید کے کئی نسخے تیار کر دیے جو بہ اختلاف روایات پانچ، یا سات، یا چودہ نسخے تھے۔ یہ ۲۵ء کا واقعہ ہے۔ ان حضرات کے مابین

جہاں اختلاف پیدا ہوا انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کرلیا کہ کس لفظ کو کس طرح لکھنا ہے۔ ایک لفظ کے بارہ میں اختلاف پیدا ہوا کہ اس کو کس طرح لکھا جائے۔ یہ اختلاف جب آپس کے مشورہ سے طے نہ ہوا تو خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ سے عرض کیا گیا کہ وہ اس بارہ میں اپنا فیصلہ دیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ قرآن پاک میں تابوت کا جو لفظ ہے یہ لمبی ت سے لکھا جائے یا گول ۃ سے۔ یعنی اگر وقف ہو تو اس کو ت پڑھ کر کے وقف کریں۔ یا اگر گول ۃ ہے تو تابوت کی ۃ کو ھا میں تبدیل کریں گے۔ جیسا کہ عربی زبان میں تا مربوطہ کا قاعدہ ہے۔ مدینہ منورہ کی زبان میں تابوت تا مربوطہ یعنی گول ۃ سے (تابوۃ) لکھا جاتا تھا، یعنی اگر وقف نہ کرنا ہو تو اس کا تلفظ کر کے اس کو پڑھا جائے گا ورنہ نہیں۔ جبکہ مکہ کی زبان میں اسے لمبی ت سے تابوت لکھا جاتا تھا۔ اور وقف اور عدم وقف دونوں صورتوں میں ت ہی پڑھا جاتا تھا۔ یہ بات خلیفہ سوم کے سامنے پیش کی گئی۔ انہوں نے حکم دیا کہ اس کو مکہ مکرمہ کی زبان میں لکھا جائے، یعنی لمبی ت سے لکھا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں تابوت لمبی ت سے لکھا گیا۔

ان سات یا چودہ نسخوں کی تیاری میں بعض جگہ قرآن مجید کے الفاظ کو لکھنے کا ایک نیا اسلوب ان حضرات نے اختیار فرمایا، جو عربی زبان کے عام اسلوب سے کہیں کہیں مختلف ہے۔ انہوں نے یہ خاص اسلوب کیوں اختیار فرمایا؟ ہم نہیں جانتے۔ ایسا اتفاقاً ہوا؟ یا اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مصلحت سے ان کے دل میں یہ بات ڈالی؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے کی ہدایت کی تھی؟ یا خلیفہ سوئم نے فرمایا تھا؟ اس کے بارہ میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس اسلوب کے مطابق قرآن مجید میں متعدد الفاظ کا ہجاء عربی زبان کے عام اسلوب ہجاء سے ہٹ کر اختیار کیا گیا۔

مثلاً جب آپ قرآن مجید کو کھول کر دیکھیں گے تو آپ کو بہت سی جگہ کتاب کا لفظ ملے گا۔ جو صرف ک۔ ت۔ ب سے مرکب ہوگا، یعنی کِتٰبْ، اور ت کے اوپر کھڑا زبر ہوگا۔ حالانکہ عام طور پر جب عربی زبان میں کتاب لکھتے ہیں تو ک، ت الف اور ب سے کتاب لکھتے ہیں۔ دنیا میں ہر عربی لکھنے والا جب کتاب لکھے گا تو الف کے ساتھ ہی لکھے گا، لیکن قرآن مجید میں بہت سی جگہ اگرچہ الف کے ساتھ بھی ہے، لیکن عموماً الف لکھنے کے بجائے ت کے اوپر کھڑی زبر ڈالی گئی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی کوئی حکمت معلوم نہیں ہو سکی۔ لیکن قرآن پاک کو لکھنے والے صحابہ کرامؓ

نے ان الفاظ کو اسی طرح لکھا۔ مثال کے طور پر ایک اور لفظ اسماعیل ہے۔ عام طور پر جب اردو میں یا عربی میں اس لفظ کو لکھتے ہیں۔ تو میم کے ساتھ الف لکھتے ہیں۔ اس کے بعد ع، ی اور ل لکھتے ہیں۔ اسماعیل۔ لیکن کاتبان قرآن نے اسمٰعیل میں کہیں بھی الف نہیں لگایا اور اسماعیل کو بغیر الف کے اسمٰعیل ہی لکھا۔ م کے بعد ع بنایا اور م کے اوپر کھڑا زبر لگایا۔ عیل میں بھی کسی جگہ ی لکھی ہے اور کسی جگہ نہیں لکھی۔ جہاں لکھی ہے وہاں کیوں لکھی ہے اور جہاں نہیں لکھی کیوں نہیں لکھی۔ اس کی حکمت ہمیں معلوم نہیں۔ بعض جگہ ایسا بھی ہے کہ کوئی ایک حرف دو مرتبہ لکھا گیا۔ مثلاً ستائیسویں پارہ میں، ایک آیت ہے۔ والسماء بنینھا باییدٍ وانا لموسعون۔ اس میں ایک لفظ ہے ایید، اس میں یوں تو ایک ی ہے۔ مگر جب ان حضرات نے اس لفظ کو لکھا تو دو ی لکھیں۔ ایک ی کے نیچے نقطے ہیں۔ اور دوسری، ی، کے نیچے نقطے نہیں ہیں۔ انہوں نے باییدٍ لکھا۔ یہ انہوں نے کیوں لکھا۔ ہم نہیں جانتے۔

اس کو رسم عثمانی کہا جاتا ہے۔ یعنی قرآن مجید کو لکھنے کا وہ اسلوب یا وہ ہجے یا وہ رسم الخط جس میں حضرت زید بن ثابتؓ نے سیدنا عثمان غنیؓ کے زمانہ میں قرآن مجید کو تحریر فرمایا۔ اس رسم عثمانی کی پابندی واجب اور لازمی قرار دی جاتی ہے اور آج تک مشرق و مغرب میں جہاں جہاں قرآن مجید کے نسخے لکھے جا رہے ہیں، وہ اسی رسم الخط کے مطابق لکھے جا رہے ہیں۔ چنانچہ باییدٍ میں دو ی ہی لکھی جائیں گی۔ ویسے جب ہم عام عربی زبان میں یہ لفظ لکھیں گے تو ایک ی سے لکھیں گے۔ لیکن جب آیت قرآنی کے ایک ٹکڑے کے طور پر یہ لفظ لکھا جائے تو دو یا ہی سے لکھا جائے گا۔ کتاب جہاں جہاں انہوں نے بغیر الف کے لکھا ہے وہاں کتاب بغیر الف ہی کے لکھا جائے گا، اور اسماعیل جہاں انہوں نے بغیر الف کے لکھا ہے وہ اسی طرح بغیر الف کے لکھا جائے گا۔ یہی رسم عثمانی ہے۔ اور اس کی پابندی علماء امت نے واجب قرار دی ہے۔

جب یہ نسخے تیار ہو گئے تو حضرت عثمان غنیؓ نے اعلان کروایا کہ جس جس کے پاس جو جو نسخے' قرآن مجید کے' جہاں جہاں موجود ہیں' وہ سب سرکاری خزانے میں جمع کروا دیئے جائیں۔ انہوں نے یہ تمام نسخے جمع کر کے ان کو نذر آتش کرا دیا۔ اس موقعہ پر بعض صحابہ کرام نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا اور اصرار کیا کہ یہ فیصلہ درست نہیں ہے۔ لیکن حضرت عثمان غنیؓ کا موقف یہ تھا کہ قرآن مجید کے بارے میں ایک فی ہزار، ایک فی لاکھ بلکہ ایک فی کروڑ بھی ایسا امکان باقی

نہیں رہنا چاہیے، جس کے نتیجہ میں آگے چل کر کوئی اختلاف پیدا ہو سکے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عرصہ میں جو جو تحریری نوشتے حضور علیہ السلام کے روبرو پیش کیے جاتے تھے وہ حضورؐ صرف پڑھوا کر سنتے تھے۔ آپؐ ان میں سے ہر ایک کے ہجے انفرادی طور پر چیک نہیں کرتے تھے کہ مثلاً کس نے اسماعیل کو الف سے لکھا ہے اور کس نے بغیر الف کے لکھا ہے۔ اگر حضرت عثمان غنیؓ قرآنی ہجا اور رسم الخط کی یکسانیت اور معیار سازی کا یہ فیصلہ نہ فرماتے تو ہو سکتا تھا کہ قرآن پاک کے مختلف ہجے رائج ہو جاتے۔ ہو سکتا ہے بعد کے دور میں کوئی شخص یہ سمجھ بیٹھتا کہ اسماعیل اور شخص ہیں اور اسمٰعیل اور۔

علاوہ ازیں جب صحابہ کرام نے اپنے اپنے نسخے الگ الگ تیار کیے تو ہو سکتا ہے کہ کسی کاتب سے ترتیب یا ہجا میں کوئی غلطی بھی ہو گئی ہو۔ بھول چوک ہر انسان سے ہو سکتی ہے اور اس کا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ آرمینیا سے لے کر سوڈان تک اور ملتان سے لے کر اسپین تک سارے نسخے ایک ایک کر کے چیک کیے جائیں اور یوں کروڑوں نسخوں کے ہجے درست کیے جائیں۔ ایسا کرنا تو آج سارے وسائل کے باوجود ممکن نہیں اس وقت کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ اس لیے جو کام آسان اور قابل عمل تھا وہ یہی کہ ان سب کو اکٹھا کر کے ضائع کر دیا جائے اور ایک معیاری نسخہ تیار کیا جائے۔

بعض صحابہ کرامؓ جنہوں نے اس فیصلہ سے شدت سے اختلاف کیا ان میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے عظیم انسان بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنا ذاتی نسخہ جمع کرانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ حضورؐ کے زمانہ سے میرے پاس چلا آ رہا ہے۔ میں اس میں مستقل تلاوت کرتا ہوں۔ یہ نسخہ میں نے حضورؐ کی زندگی میں آپؐ کے سامنے لکھا تھا، اب یہ کل کے بچے (انہوں نے یہی الفاظ استعمال کیے، اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مکہ مکرمہ کے ابتدائی دور کے صحابہ میں سے تھے اور سابقون الاولون میں آپ کا شمار تھا، معمر صحابی تھے، جبکہ حضرت زید بن ثابتؓ کم سن نوجوان تھے اور مدینہ منورہ کے دور میں مسلمان ہوئے تھے) آ کر مجھے بتائیں گے کہ قرآن مجید کو کیسے لکھا جائے، لہٰذا میں نہیں دوں گا۔ لیکن خلیفہ سوم نے سختی فرمائی اور ان کا ذاتی نسخہ زبردستی ان سے ضبط کر لیا۔ بعد میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرمایا کرتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ انہوں نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا، اور جو بات

ان کے ذہن میں تھی وہ میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ حضرت علیؓ نے بھی کئی بار حضرت عثمانؓ کے اس فیصلہ کے بارے میں فرمایا کہ عثمانؓ نے جو کیا ٹھیک کیا، ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہی کرتا جو انہوں نے کیا۔ اس کے بعد سے حضرت عثمان غنیؓ کا لقب ہوگیا ''جامع الناس علی القران'' یعنی قرآن پر لوگوں کو جمع کرنے والے۔ اسی کو بعد میں مختصر کر کے جامع القران کہا جانے لگا۔

صحابہ کرامؓ کے جو اپنے اپنے ذاتی نسخے تھے، جیسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اپنا نسخہ، حضرت ابی بن کعبؓ کا اپنا نسخہ اور حضرت عائشہؓ کا اپنا نسخہ، آج ان میں سے کوئی نسخہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ سب نسخے حضرت عثمان غنیؓ نے ضبط کر کے نذر آتش کرادیے تھے۔ لیکن ان نسخوں کے بارے میں تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں کہ وہ نسخے کس طرح کے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نسخے میں آخر میں جہاں سورۃ اخلاص لکھی ہوئی تھی وہاں انہوں نے اپنی یاداشت کے لیے دعائے قنوت بھی لکھ لی تھی۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا کہ کل کلاں اگر کوئی دعائے قنوت کو بھی قرآن کا حصہ سمجھ لے اور یہ دعوی کرے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے جید صحابی کے نسخہ قرآن میں لکھی ہوئی ہے، لہٰذا یہ بھی قرآن مجید کی ایک سورت ہے، یا یہ کہے کہ یہ قرآن مجید ہی کی ایک آیت تھی، جو دوسرے نسخوں سے نکال لی گئی ہے تو اس کا کیا جواب ہوگا۔ اگر یہ غلط فہمی بعد میں کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ پیدا کرتا تو کیا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ یہ بتانے کے لیے موجود ہوتے کہ یہ تو دعائے قنوت ہے، یہ تو میں نے محض اپنی سہولت کی خاطر لکھ لی تھی اور یہ قرآن کا حصہ نہیں ہے؟

ایک مثال اور لیجیے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عادت مبارکہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کے جس لفظ کا مطلب سیکھتیں اسے اپنے نسخے کے حاشیہ پر لکھ لیا کرتی تھیں۔ مثلاً قرآن مجید کی آیت، حافظوا علی الصلوات و الصلوۃ الوسطیٰ، میں صلاۃ وسطی سے صلوۃ العصر مراد ہے، اس کے بعد اگلی آیت وقوموا للہ قانیتن۔ لکھی تھی۔ ان دونوں کے درمیان انہوں نے صلاۃ العصر کے الفاظ لکھ رکھے تھے۔ یقیناً انہوں نے اپنے یاد رکھنے کی خاطر ایسا کیا تھا۔ لیکن اس امر کا امکان تو موجود تھا کہ آگے چل کر حواشی اصل متن کے ساتھ ملتبس ہو جائیں۔ اس لیے ایسا سخت اقدام کرنا خلیفہ وقت کے لیے ناگزیر تھا اور انہوں نے یہ اقدام کیا۔ اور یوں وہ قرآن پاک کی حفاظت کا ایک اہم بندوبست کر گئے۔

یہ تیار شدہ نسخے مختلف علاقوں میں بھیج دیے گئے، اور وہاں کے حکام کو لکھ دیا گیا کہ پرانے نسخے ضبط کر کے نذر آتش کر دیے جائیں اور نئے نسخے ان سرکاری نسخوں سے نقل کر کے تیار کیے جائیں۔ یہ سات یا چودہ نسخے کئی سو سال تک باقی رہے۔ اور تاریخ میں ان سب کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں سے اس وقت صرف چار نسخے دنیا میں موجود ہیں۔ ان میں سے تین کی زیارت کا شرف مجھے بھی حاصل ہوا ہے۔ ایک دمشق میں ہے، دوسرا استنبول میں ہے اور اور تیسرا تاشقند میں ہے۔ جو نسخہ تاشقند میں ہے وہ ایک ہاتھ یعنی ڈیڑھ فٹ کے قریب لمبا ہے جس کو ایک ذراع کہتے ہیں، چوڑائی میں بھی کوئی ایک فٹ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ میں نے ناپ کے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن میرا اندازہ یہی ہے۔ کوفی رسم الخط سے ملتے جلتے خط میں خاصے موٹے حروف میں لکھا ہوا ہے۔ اس کو اس وقت حمیری خط کہتے تھے۔ یہ خط کوفی کی ایک ابتدائی شکل تھی۔ دیکھنے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس نسخے کو واسطی قلم یعنی سرکنڈے کے قلم سے لکھا گیا ہے۔ جیسا تختی پر لکھنے کا قلم ہوتا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ جب دشمنان اسلام نے سیدنا عثمان غنیؓ کو شہید کیا تو وہ اسی نسخہ میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے اور جو صفحہ کھولا ہوا تھا وہ یہاں سے شروع ہوتا تھا، فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم۔ اس صفحہ پر ان کے خون کے نشانات بھی موجود ہیں جو آج بھی نظر آتے ہیں۔

جب یہ کام مکمل ہو گیا تو گویا قرآن مجید کی حفاظت کا جو آخری مرحلہ تھ وہ بھی مکمل ہو گیا۔ لیکن ابھی ایک کام کرنا باقی تھا۔ وہ یہ کہ چونکہ شروع شروع میں سب لوگ عرب تھے اور عربی ان کی اپنی زبان تھی، اس لیے قرآن مجید کے معاملہ میں وہ بہت سی ایسی چیزوں کے محتاج نہیں تھے جن کے بعد والے آگے چل کر محتاج ہوئے۔ مثلاً اس وقت عام طور پر تحریروں میں نقطے اور اعراب لگانے کا رواج نہیں تھا۔ لوگ بغیر نقطوں کے لکھا کرتے تھے۔ بغیر نقطوں کے لکھنے کا رواج ایک عرصہ تک رہا۔ شاید آپ میں سے بھی کسی نے دیکھا ہو، میں نے اپنے بچپن میں بعض معمر بزرگوں کو دیکھا کہ اردو میں لکھتے وقت نقطے نہیں لگاتے تھے۔ پرانی تحریروں میں ایسے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت قرآن مجید میں بھی نہ تو نقطے لگائے جاتے تھے اور نہ اعراب۔

جیسے ہم اردو میں اعراب نہیں لگاتے۔ لیکن اگر ہم کسی غیر ملکی مثلاً کسی چینی کو اردو زبان

سکھانا شروع کردیں تو اس کے لیے ہمیں اعراب لگانا پڑیں گے۔ وہ اعراب کی ضرورت محسوس کرے گا، لیکن ہم اور آپ اس کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔ دراصل اپنی زبان میں زیر زبر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ ضرورت دوسری زبان میں پیش آیا کرتی ہے۔ اعراب دراصل وہ اوزار ہیں جن کی مدد سے لفظ کو صحیح بولنے میں مدد ملتی ہے۔ اس مدد کی یعنی اعراب کے ان اوزاروں کی ضرورت غیر زبان والوں کو پڑتی ہے' اہل زبان کو نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین وغیرہ کو ابتدائی دور میں اعراب کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن بہت جلد ایسا ہوا کہ بہت بڑی تعداد میں غیر عرب اقوام اسلام میں داخل ہونے لگیں۔ ابھی ہم نے دیکھا کہ حضرت عثمان غنیؓ کی حکومت کے آغاز میں ہی آرمینیا اور سائبیریا کی حدود تک اسلام کا پیغام جا پہنچا تھا۔ اسپین میں حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں اسلام کے قدم داخل ہو گئے۔ ہمارے برصغیر میں حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ہی اسلام آچکا تھا۔

جب نئے لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے، جن میں غالب اکثریت غیر عربوں کی تھی تو ضرورت پیش آئی کہ قرآن مجید پڑھانے سے پہلے ان کو یہ بھی سکھایا جائے کہ وہ عربی زبان کا تلفظ کس طرح کریں۔ ایک روایت کے مطابق حضرت علیؓ کے حکم سے ان کے شاگرد ابوالاسود دئلی نے قرآن مجید پر پہلی بار نقطے لگائے۔ مگر ان نقطوں کو سرکاری طور پر بطور پالیسی کے اختیار نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایک مدد تھی جو لوگوں کو دی گئی کہ وہ اگر چاہیں تو اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ کچھ لوگ نقطے لگاتے تھے اور کچھ نہیں لگاتے تھے۔ لیکن ابوالاسود نے پہلی مرتبہ حضرت علیؓ کے ارشاد کے مطابق نقطے لگانے کا اہتمام کیا اور اس کا ایک فارمولا مقرر کیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن قرآن مجید میں نقطے لگانے کو سرکاری طور پر لازمی قرار دینے کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے آدمی کو دی جو اسلام کی تاریخ میں زیادہ نیک نام نہیں ہے۔ یعنی حجاج بن یوسف۔ اس نے بطور پالیسی کے یہ حکم دیا کہ آئندہ قرآن مجید کا کوئی نسخہ بغیر نقطوں کے نہ تو قبول کیا جائے گا اور نہ اس کی اجازت دی جائے گی۔ چنانچہ اس کے زمانہ سے قرآن مجید پر نقطے لگانے کا باقاعدہ رواج شروع ہوا۔

اعراب کا ابھی تک بھی رواج نہیں تھا۔ اس لیے کہ عربی جاننے والا زبر زیر کا محتاج نہیں ہوتا تھا۔ جو نیا شخص اسلام میں داخل ہوتا تھا وہ جلد ہی عربی سیکھ لیا کرتا تھا۔ آج بھی عام طور پر عربی کتابوں میں زبر زیر نہیں ہوتے۔ یہ کام دوسری صدی کے اواخر یا تیسری صدی ہجری کے اوائل

میں ہوا۔ بنوعباس کے زمانہ میں، اسلامی تاریخ کی ایک بہت اہم اور غیر معمولی شخصیت گزری ہے، جس کے بارے میں میں سمجھتا ہوں کہ انسانی تاریخ میں جتنے اعلیٰ ترین دماغ گزرے ہیں۔ ان میں سے وہ ایک تھا، یعنی خلیل بن احمد الفراہیدی۔ وہ کئی علوم وفنون کا موجد ہے۔ اعراب بھی اس نے ایجاد کیے۔ اعراب کا تصور نہ صرف سب سے پہلے اسی نے دیا۔ بلکہ اس نے قرآن مجید پر بھی اعراب لگائے۔ اس لیے وہ تمام دنیا کے مسلمانوں اور بالخصوص غیر عرب دنیا کے مسمانوں کے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے اس کام کو اتنا آسان کر دیا کہ غیر عرب قرآن مجید کو آسانی کے ساتھ پڑھ سکیں۔ اس کے بعد جتنے نسخے بھی قرآن مجید کے آئے وہ اعراب کے ساتھ آئے، اور خط کوفی میں لکھے گئے۔

۱۶۰ھ کے لگ بھگ سے لے کر تقریباً چوتھی صدی ہجری کے اواخر تک قرآن مجید خطِ ہی میں کوفی میں ہی لکھا جاتا رہا البتہ اس میں مزید بہتری البتہ پیدا ہوتی گئی۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر سے خط نسخ میں قرآن مجید لکھا جانے لگا جو خط کوفی ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک قرآن مجید اسی خط میں لکھا جارہا ہے اور اس میں مزید بہتری بھی پیدا ہو رہی ہے۔ مسلم ممالک کے بیشتر حصوں میں قرآن مجید خط نسخ میں ہی لکھا جاتا ہے۔ انڈونیشیا سے لے کر الجزائر کی مشرقی سرحدوں تک خط نسخ کی حکمرانی ہے۔ پھر آگے چل کر الجزائر اور مراکش میں ایک خاص خط رائج ہے جو خط مغربی کہلاتا ہے، جس کا رواج دنیائے اسلام کے مغربی حصہ میں ہوا۔ وہاں قرآن مجید اسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ میرے پاس خط مغربی میں چھپے ہوئے قرآن مجید کے نسخے موجود ہیں۔ خط مغربی خط نسخ سے خاصا مختلف ہے۔ (اگر آپ نے نہ دیکھا ہو تو میرے پاس موجود ہے۔ کل میں اس کا نسخہ آپ کو دکھانے کے لیے لیتا آؤں گا)۔

خط مغربی میں قرآن مجید کب سے لکھا جارہا ہے۔ یقین سے تو نہیں جاسکتا، لیکن اندازہ یہ ہے کہ کم از کم گذشتہ چار، پانچ سو سال سے اس علاقے میں خط مغربی میں قرآن مجید لکھا جارہا ہے۔

جب حفظ قرآن کے مدارس غیر عرب علاقوں میں جگہ جگہ قائم ہونے لگے اور غیر عرب کمسن بچوں کو قرآن مجید حفظ کروایا جانے لگا تو ضرورت پیش آئی کہ قرآن مجید کے ایسے چھوٹے چھوٹے اجزاء کو الگ الگ کر کے ان کی ایک پہچان مقرر کردی جائے، تاکہ بچوں کے لیے یاد کرنا

آسان ہو جائے۔ اور نمازوں میں پڑھنا بھی آسان ہو جائے۔ خاص طور پر تراویح میں سہولت رہے۔ مسلمانوں میں حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ سے یہ رواج چلا آ رہا ہے کہ تراویح کی نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے اور اکثر و بیشتر بیس رکعتیں ہی پڑھی جاتی رہی ہیں۔ اگرچہ بعض کم پڑھنے والے بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ بعض حضرات کے یہ سمجھنے کے باوجود کہ آٹھ ہی رکعت تراویح کی مسنون ہیں۔ حرم میں آج تک بیس رکعتیں ہی پڑھی جا رہی ہیں۔ بہر حال اگر بیس رکعات میں قرآن مجید کی تلاوت مکمل کی جائے تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ حفاظ جہاں جہاں رکوع کریں وہ مقامات متعین کر لیے جائیں۔

حفاظ کو ایک بڑا مسئلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ ان کے لیے عام طور پر سورت یا پارہ کے درمیان سے پڑھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسا ہر چیز کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کوئی نظم یا غزل وغیرہ، جو آپ کو زبانی یاد ہو، درمیان سے پڑھنے کے لیے کہا جائے تو شاید آپ کے لیے مشکل ہو جائے، لیکن اگر آپ اول سے شروع کر کے آخر تک پڑھیں تو آپ اس کو آسانی سے پڑھ لیں گے۔ تجربے کے طور پر اگر آپ کسی بچے سے اچانک پوچھیں کہ ایف کے بعد کون سا حرف آتا ہے تو وہ ایک دم نہیں بتا سکے گا، بلکہ اے بی سی ڈی سے پڑھنا شروع کرے گا اور اس کے بعد ایف پر پہنچ کر بتائے گا ایف کے بعد جی آتا ہے۔ یعنی یہ انسانی حافظہ کی کمزوری ہے یا اس کی عادت ہے کہ اس کے لیے شروع سے پڑھنا تو آسان ہوتا ہے لیکن درمیان سے کسی جگہ سے پڑھنا اور پچھلی عبارت سے اس کو جوڑنا زبانی پڑھنے والے کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے حفاظ کو یہ مسئلہ درپیش ہوتا تھا کہ اگلی رکعت میں قرآن مجید کو درمیان سے کیسے شروع کریں۔ ان کی آسانی کے لیے قرآن مجید کو ۵۴۰ حصوں میں تقسیم کر لیا گیا تا کہ اگر بیس رکعتیں روزانہ پڑھی جائیں تو ستائیسویں رات کو قرآن مجید ختم ہو جائے۔

یوں رکوعوں کی تقسیم شروع ہوئی۔ رکوعوں کی یہ تقسیم اکثر و بیشتر مضمون کی مناسبت سے کی گئی، یعنی ملتے جلتے مضمون کو ایک رکوع میں کر دیا گیا۔ مقصد یہ تھا جب بچہ شروع سے یاد کرے تو رکوعات کے حساب سے یاد کرنا شروع کرے اور نمازوں میں پڑھے تو رکوع ہی کے حساب سے پڑھے۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا؟ معلوم نہیں! البتہ یہ معلوم ہے کہ پانچویں صدی ہجری تک یہ تقسیم عمل میں آ چکی تھی۔ اس لیے کہ پانچویں صدی ہجری کے بعض ایسے نسخے موجود ہیں۔ جن میں

رکوع کے یہ اشارات پائے جاتے ہیں۔لیکن یہ تقسیم کس نے اور کب کی؟ یہ معلوم نہیں۔ بہر حال جس نے بھی یہ کام کیا بہت اچھا کیا۔ایک اندازہ یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ کام عرب دنیا میں نہیں ہوا، بلکہ غیر عرب دنیا میں ہوا۔اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عرب دنیا میں قرآن مجید کے جو نسخے چھپے ہوئے ملتے ہیں ان میں رکوع کی نشاندہی نہیں ہے، بلکہ برصغیر، بنگلادیش، وسطی ایشاوغیرہ میں جو قرآن مجید چھپتے ہیں ان میں رکوع کی نشاندہی ہوتی ہے۔عرب دنیا میں اس طرح کی ذیلی اور دری تقسیم اور ہے۔ وہ ایک پارے کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، جسے وہ حزب کہتے ہیں۔ پھر ایک حزب کو دو حصوں میں تقسیم کر کے نصف الحزب کا نام دیتے ہیں۔ ہر نصف الحزب کو دو حصوں میں یعنی ربع الحزب میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ ہمارے نسخوں میں یہ تقسیم نہیں ہے۔

جب ذیلی تقسیموں یہ سلسلہ مقبول ہوا تو ایک اہم تقسیم اور بھی وجود میں آئی۔شروع میں تو لوگ سات دنوں میں قرآن مجید مکمل کیا کرتے تھے اس لیے قرآن پاک کی سورتوں کی تقسیم منزلوں میں ہوگئی۔جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ''فمی بشوق'' کے فارمولے سے یہ سات منزلیں یاد رہ سکتی ہیں۔لیکن بعد میں جب ہمتیں کمزور ہوگئیں اور دنیاوی مشاغل میں انہماک بڑھا تو سات دن میں قرآن مجید ختم کرنے والے لوگ تھوڑے رہ گئے۔اب زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو ایک ماہ میں قرآن مجید کی تلاوت مکمل کرلیا کرتے تھے۔اب مہینہ کی مناسبت سے ایک ایسی تقسیم کی ضرورت پیش آئی جس کے مطابق ایک ماہ میں قرآن مجید کی تلاوت مکمل کی جاسکے اور روزانہ تلاوت کے لیے کوئی پہچان رکھی جاسکے۔اس سہولت کے لیے بعض لوگوں نے قرآن مجید کو ۳۰ برابر حصوں میں تقسیم کرلیا، جو سپارے یا اجزاء کہلاتے ہیں۔ یہ کس نے کیا؟ یہ بھی نہیں معلوم، لیکن یہ بھی غالباً چوتھی یا پانچویں صدی ہجری میں ہو۔اس لیے کہ اس سے پہلے کے نسخوں میں ایسی کوئی نشاندہی موجود نہیں ہے۔ پاروں یا اجزاء کی اس ترتیب کا قرآن مجید کی اصل تقسیم سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کا مضامین سے کوئی تعلق ہے۔ یہ محض سہولت کی خاطر کیا گیا۔کوشش کی گئی کہ ہر پارہ آیت پر ختم ہو۔رہا مضمون، تو وہ کسی جگہ ختم ہو جاتا ہے، کسی جگہ نہیں ہوتا۔لیکن پاروں کی اس تقسیم کا کوئی تعلق قرآن مجید کے معانی و مطالب کے سیکھنے یا سکھانے سے نہیں ہے۔

اب تک ساری گفتگو قرآن مجید کے متن کی کتابت اور تدوین کے بارہ میں تھی۔ اس گفتگو سے قرآن مجید کی حفاظت اور تدوین کا سارا نقشہ آپ کے سامنے آ گیا۔لیکن متن میں بھی

بعض اوقات ایک ہی لفظ ایک ہی علاقے میں دو طرح بولا جاتا ہے۔آپ کسی بھی زبان کو لے لیں اور کسی بھی علاقے کو معیار قرار دے لیں، لیکن اس معیاری علاقہ میں بھی بعض اوقات ایک ہی لفظ کا تلفظ دو یا تین طریقے سے ہوتا ہے۔ یہ ایک عام رواج کی بات ہے۔قریش میں بھی مکہ مکرمہ میں جہاں کی یہ زبان تھی۔بعض الفاظ ایک سے زائد انداز سے بولے جاتے تھے۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح بولتے سنا اور تواتر سے ہم تک پہنچا دیا۔ یہ بھی قرآن مجید ہی کے متن کا حصہ ہے۔

اسی طرح آپ نے سات قراءتوں کا نام سنا ہوگا۔وہ سات قرائتیں یا سبعہ قراءات بھی صحابہ اور تابعین کے دور سے چلی آرہی ہیں۔ یہ سات قراءتیں ہیں جو صحابہ کرام سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں اور رسم عثانی کی حدود کے اندر ہیں۔ان کو صحابہ کرام کے زمانہ سے لوگ اسی طرح پڑھتے آرہے ہیں۔ یہ ساتوں متواتر قراءتیں بھی اسی طرح قرآن مجید کا حصہ ہیں جیسے امام حفص کی رائج العام کوئی بھی روایت، یوں تو مشہور روایات دس ہیں۔لیکن ان میں سے سات زیادہ مشہور ہیں۔وہ سات مشہور قراء جن کی روایت سے یہ سات قراءتیں ہم تک پہنچی ہیں یہ ہیں:۔

۱۔ امام عاصم ابن ابی النجود (متوفی ۱۲۸ھ) یہ تابعین میں سے ہیں۔ان کے سب سے نامور شاگرد امام حفص بن سلیمان کوفی (متوفی ۱۸۰ھ) ہیں۔اس وقت دنیائے اسلام کے بیشتر حصوں، بشمول برصغیر، افغانستان، عرب دنیا، ترکی، وسطی ایشیاء وغیرہ میں انہی کی روایت مروج ہے۔

۲۔ امام نافع مدنی (متوفی ۱۶۹ھ)۔انہوں نے حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوہریرہ جیسے کبار صحابہ کے ستر تلامذہ سے علم قراءات سیکھا۔ان کے سب سے نامور شاگرد امام عثمان بن سعید ورش مصری (متوفی ۱۹۷ھ) ہیں۔ان کی روایت شمالی افریقہ میں زیادہ رائج ہے۔

۳۔ امام عبداللہ بن کثیر الداری (متوفی ۱۲۰ھ)۔ یہ تابعین میں سے ہیں۔انہوں نے متعدد صحابہ کرام سے جن میں حضرت ابوایوب انصاری بھی شامل ہیں کسب فیض کیا۔

۴۔ امام عبداللہ بن عامر شامی (متوفی ۱۱۸ھ) یہ بھی تابعین میں سے ہیں اور قراءات کے علم میں ایک واسطہ سے خلیفہ سوم جامع القران حضرت عثمان غنیؓ کے شاگرد ہیں۔

۵۔ امام ابوعمرو بن العلاء بصری (متوفی ۱۵۴ھ) یہ ایک ایک واسطہ سے حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں۔

۶۔ امام حمزہ کوفی (متوفی ۱۵۶ھ)

۷۔ امام علی بن حمزہ الکسائی کوفی (متوفی ۱۸۹ھ)۔ اپنے زمانے کے مشہور امام نحو وعربیت اور امام قراءت۔

ان میں سے ہر ایک کے مشہور تلامذہ ہیں جنہوں نے ان سے قراءات کی روایت کی ہے۔ یہاں ان قراءات کی حقیقی نوعیت پر تفصیلی گفتگو تو دشوار ہے۔ لیکن سمجھنے کے لیے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ سورۃ فاتحہ کی آیت مالک یوم الدین میں مالک کا لفظ ہے جو رسم عثمانی کی رو سے ملک لکھا جاتا ہے۔ اس کو مالک بھی پڑھا جاسکتا ہے اور ملک بھی۔ مالک اور ملک یہ دونوں لفظ ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوتے تھے۔ کچھ لوگ مالک کہتے تھے اور کچھ ملک کہتے تھے۔ کھڑا زبر ہو تو مالک پڑھا جائے گا، اور پڑا زبر ہو تو ملک پڑھا جائے گا۔ یاد رہے کہ اس وقت نہ کھڑا زیر تھا اور نہ بیٹھا زبر۔ چونکہ اعراب نہیں تھے اس لیے مالک اور ملک دونوں کے پڑھنے کی گنجائش تھی۔ اور حجاز میں اس کو دونوں طرح پڑھا جاتا تھا۔ مفہوم کے لحاظ سے بھی دونوں درست ہیں یعنی روز جزا کا بادشاہ اور روز جزا کا مالک۔ بادشاہ بھی اپنے علاقے کا مالک ہی ہوتا تھا۔ اس لیے یہ جو اختلاف قراءات، بلکہ تنوع قراءات ہے، جس کی تعداد سات یا دس ہے وہ قرآن مجید کے رسم عثمانی میں موجود ہے۔

اس وقت تک جو قرآن مجید لکھا جاتا تھا اس میں تمام قراءتیں شامل ہوتی تھیں۔ لیکن زبر زیر لگانے میں قراءت کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ جب آپ زیر زبر لگائیں گی تو آپ کو مالک یا ملک میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑے گا۔ اتفاق رائے سے یہ طے کیا گیا، کب طے ہوا، یہ تو میں نہیں جانتا، لیکن شروع سے' تقریباً ایک ہزار سال سے' زائد سے' یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ قرآن مجید جب لکھا جائے گا تو امام حفص کی روایت جو امام عاصم سے ہے اس کے مطابق لکھا جائے گا۔ امام عاصم ابن ابی النجود قراءت کے بہت بڑے امام تھے جن کا سلسلہ تلمذ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعب تک پہنچتا ہے۔ ان دو اصحاب سے انہوں نے بالواسطہ قرآن مجید کی تعلیم پائی تھی، صرف ایک واسطہ سے۔ یہ خود تابعی تھے۔ امام عاصم سے ان کے شاگرد حضرت حفص روایت

کرتے ہیں، اس لیے یہ روایت 'روایت حفص کہلاتی ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں قرآن مجید کے جو نسخے لکھے جا رہے ہیں انہی کی روایت کے مطابق لکھے جا رہے ہیں۔

ایک روایت ورش کی بھی ہے۔ جو امام نافع کے شاگرد تھے۔ اس میں کہیں کہیں تھوڑا تھوڑا لفظی اختلاف ہے۔ مغربی دنیا میں یعنی دنیائے اسلام کے مغرب میں یعنی مراکش، الجزائر، تیونس اور لیبیا میں قرآن پاک کے نسخے روایت ورش کے مطابق لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً وہاں مالک پر کھڑا زبر نہیں بلکہ پڑا زبر ہوگا۔ اور اس کو وہ لوگ ملک پڑھیں گے۔ اسی طرح سے جہاں الف مقصورہ جس کو ہم امام حفص کی روایت کے بموجب الف کی طرح تلفظ کرتے ہیں۔ والنجم اذا ھویٰ۔ ماضل صاحبکم وما غویٰ۔ وما ینطق عن الھویٰ۔ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ یہ سب کے سب ایک کھڑے مد کے برابر ہیں، انکو کھڑا پڑھا جائے گا۔ زبر کے ساتھ۔ لیکن امام ورش کی روایت میں اس کو تھوڑا سا امالہ کے ساتھ اس طرح پڑھا جائے گا، جس طرح ہم بسم اللہ مجرھا پڑھتے ہیں۔ جس طرح سے ہم یہاں امالہ کرتے ہیں، اسی طرح امام ورش ہر اس جگہ امالہ کرتے ہیں جہاں الف مقصورہ آیا ہو، یعنی الف کو اس طرح بولا جائے، جس طرح جھکا کر بولا جا رہا ہو۔ یہ صرف تلفظ کا فرق ہے۔ یہ ہیں وہ روایات سبعہ یا قراءات سبعہ جو آج کل مروج ہیں۔

یہاں میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ لیکن ختم کرنے سے پہلے ڈاکٹر حمید اللہ کے حوالہ سے ایک واقعہ کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے ۷۰۔۷۵ سال قبل بعض اہل مغرب کو یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن مجید تو جوں کا توں محفوظ ہے اور مسلمانوں کا یہ دعویٰ کسی طرح بھی قابل تردید نظر نہیں آتا کہ قرآن مجید بعینہٖ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ذریعہ سے دنیا کو دے کر گئے تھے جبکہ ہماری آسمانی کتب خاص طور پر بائبل اس طرح محفوظ نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں کوشش کر کے قرآن مجید میں کوئی ایسی بات نکالنی چاہیے جس سے قرآن میں کسی تبدیلی کا دعویٰ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے جرمنی میں ایک ادارہ بنایا گیا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے اس میں قرآن مجید کے بہت سے قلمی نسخے جمع کیے گئے۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک جتنے قلمی نسخے دستیاب ہوئے وہ جمع کیے گئے، ماہرین کی ایک بہت بڑی ٹیم کو بٹھایا گیا۔ اسی طرح بائبل کے بھی بہت سے نسخے جمع کیے گئے اور ایک دوسری ٹیم کو ان نسخوں پر بٹھایا گیا۔ یہ

ادارہ ابھی اپنا کام کر ہی رہا تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں اس پر بم گرا اور یہ تباہ ہو گیا۔ اس کا سارا ریکارڈ بھی تباہ ہو گیا۔

لیکن اس ادارے کی ایک ابتدائی رپورٹ ایک رسالے میں شائع ہوئی تھی جس کا خلاصہ ایک مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہؒ نے مجھے پڑھنے کے لیے دیا تھا۔ اصل رپورٹ جرمن زبان میں تھی۔ اس رپورٹ میں لکھا تھا کہ قرآن مجید کے جتنے نسخے بھی ہم نے دیکھے ہیں ان میں کتابت کی غلطیاں تو کئی جگہ نظر آتی ہیں کہ لکھنے والے سے لکھنے میں غلطی ہو گئی، مثلاً الف چھوٹ گیا یا ب چھوٹ گئی۔ لیکن نسخوں کا اختلاف ایک بھی نہیں ملا۔ نسخوں کے اختلاف اور کتابت کی غلطی میں فرق یہ ہے کہ کتابت کی غلطی تو ایک ہی نسخے میں ہو گی۔ مثلاً آپ نے اپنا نسخہ تیار کیا اور کسی جگہ آپ سے غلطی ہو گئی، یا بھول چوک ہو گئی۔ مثلاً ایک لفظ لکھنے سے رہ گیا، یا ایک لفظ دو بار لکھا گیا۔ لیکن باقی سارے نسخوں میں وہ غلطی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غلطی صرف آپ کی ہے۔ اختلاف قراءت یہ ہے کہ اگر دس ہزار نسخے ہیں اور ایک ہزار میں وہ لفظ نہیں ہے۔ نو ہزار میں ہے تو پھر یہ محض ایک آدمی کی غلطی نہیں ہو گی، بلکہ یہ اختلاف نسخ ہو گا۔ انہوں نے لکھا کہ اختلاف نسخ کی تو کوئی ایک مثال بھی موجود نہیں ہے۔ البتہ ذاتی یا انفرادی غلطی کی اکا دکا مثالیں ملتی ہیں اور وہ اکثر ایسی ہیں کہ لوگوں نے ان کو قلم سے ٹھیک کر دیا ہے۔ جہاں غلطی ملی اس کو یا تو خود متن ہی میں یا حاشیے میں یا بین السطور میں ٹھیک کر دیا گیا ہے۔ اصلاح بھی نظر آتی ہے کہ پڑھنے والے نے پڑھا اور کتابت کی غلطی سمجھ کر اصلاح کر دی اور اسے اختلاف نسخہ نہیں سمجھا۔ جہاں تک بائیبل کی غلطیوں کا تعلق ہے تو ہم نے اس میں کتابت کی انفرادی غلطیاں تو نظر انداز کر دیں، اور صرف اختلاف نسخ پر توجہ دی۔ اختلاف نسخ کا جائزہ لیا گیا تو کوئی پونے دو لاکھ کے قریب اختلافات نکلے۔ ان پونے دو لاکھ میں ایک بٹا سات (۱/۷) یعنی تقریباً ۲۵۰۰۰ وہ اختلافات ہیں جو انتہائی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ جن سے بائیبل کے مطالب اور پیغام پر فرق پڑتا ہے۔

یہ ایک عارضی رپورٹ تھی جو اس ادارہ نے ۱۹۳۹ سے قبل شائع کی تھی۔ بعد میں جنگ عظیم شروع ہو گئی اور اس دوران میں بم گرنے سے یہ ادارہ تباہ ہو گیا۔

یہ پوری تفصیل جو میں نے کل اور آج عرض کی ہے اس سے اس امر کی پوری پوری تصدیق ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا تھا، اسی لیے یہ کتاب آج تک

ہر اعتبار سے محفوظ چلی آ رہی ہے۔ غیر مسلموں کی اس رپورٹ سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید کو صحابہ کرام نے اس طرح دل و جان سے محفوظ کیا کہ اس سے بڑھ کر انسانی ذہن اور دماغ میں کسی چیز کی حفاظت کا طریقہ آ نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے جانشینوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجات نصیب فرمائیں۔ آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆☆☆☆☆

خطبہ پنجم

علم تفسیر

ایک تعارف

۱۱اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن مجید جس کا سرسری تعارف گذشتہ تین چار نشستوں میں کرایا گیا ہے' اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے قیامت تک ضابطہ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ میں تمام اصولوں اور معاشرتی قوانین کا ماخذ و مصدر اولین یہ کتاب ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں یہ کتاب ایک برتر قانون اور دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید ایک ایسا ترازو اور پیمانہ عمل ہے جس کی بنیاد پر حق و باطل میں تمیز کی جاسکتی ہے۔ یہ وہ فرقان ہے جو ہر صحیح کو ہر سقیم سے الگ کرسکتی ہے۔ یہ کتاب مسلمانوں کے لیے بالفعل براہ راست، اور پوری انسانیت کے لیے بالقوۃ، ایک نظام ہدایت ہے۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر پرکھ کر کھرے اور کھوٹے کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ نظام ہدایت ہے جو رہتی دنیا تک کے لیے ہے، جس کی پیروی ہر زماں اور ہر مکاں کے انسانوں کے لیے واجب ہے۔ یہ نظام ہدایت ہر صورت حال میں انسانوں کو پیش آنے والے ہر معاملہ میں روحانی ہدایت اور اخلاقی و تشریعی راہنمائی فراہم کرسکتا ہے۔ اس کتاب کی مدد سے مکارم اخلاق کے معیارات رہتی دنیا تک کے لیے مقرر کیے جاتے رہیں گے۔

لیکن اس کتاب سے راہنمائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو سمجھنے اور منطبق کرنے میں ان اصولوں اور ان قواعد کی پابندی کی جائے جو حضورؐ کے زمانہ سے تفسیر و تشریح قرآن کے لیے برتے جارہے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے اجتماعی طرز عمل اور امت اسلامیہ کے اجماعی رویہ، تعامل اور فہم قرآن کی رو سے تفسیر قرآن کے لیے ایسے مفصل اصول اور قواعد طے پاگئے ہیں جن کی پیروی روز اول سے آج تک کی جارہی ہے۔ ان اصولوں کا واحد مقصد یہ ہے کہ جس طرح کتاب الٰہی کا متن محفوظ رہا، اس کی زبان محفوظ رہی، اسی طرح اس کے معانی اور مطالب بھی ہر قسم

کی تحریف اور اشتباہ سے محفوظ رہیں، اور اس بات کا اطمینان رہے کہ کوئی شخص نیک نیتی یا بد نیتی سے اس کتاب کی تعبیر وتشریح' طے شدہ اصولوں سے ہٹ کر من مانے انداز سے نہ کرنے لگے۔

کسی بھی قانون، کسی بھی نظام اور کسی بھی کتاب دستور کی تشریح وتفسیر اگر من مانے اصولوں کی بنیاد پر کی جانے لگے تو دنیا میں کوئی نظام بھی نہیں چل سکتا۔ جس طرح دنیا کی ہر ترقی یافتہ تہذیب میں قانون و دستور کی تعبیر وتشریح کے اصول مقرر ہیں' جن کی ہر ذمہ دار شارح پیروی کرتا ہے اسی طرح قرآن مجید کی تفسیر وتعبیر کے بھی اصول مقرر کیے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی پیروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے صحابہ کرامؓ نے کی۔ تابعین اور تبع تابعین نے کی، تا آنکہ ان تمام اصولوں کو اکابر ائمہ تفسیر اور اہل علم نے دوسری اور تیسری صدی میں اس طرح مرتب کردیا کہ بعد میں آنے والوں کے لیے ان کی پیروی بھی آسان ہوگئی اور قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کے لامتناہی راستے بھی کھلتے چلے گئے۔

قرآن مجید کو من مانی تاویلات کا نشانہ بنایا جائے تو پھر یہ کتاب' ہدایت کے بجائے گمراہی کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ بہت سے لوگ اس سے گمراہ بھی ہوتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ اس سے ہدایت بھی پاتے ہیں۔ یضل به کثیرا ویهدی به کثیرا۔ اس کتاب سے گمراہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو پہلے سے اپنے ذہن میں کچھ طے شدہ عقائد، نظریات اور خیالات لے کر آئیں اور ان کو کتاب الٰہی میں اس طرح سمونے کی کوشش کریں اور اس کے الفاظ کی تعبیر اور تشریح اس انداز سے کریں کہ اس سے ان کے اپنے عقائد ونظریات اور خیالات وافکار کی تائید ہو۔ گویا خود کتاب الٰہی کے تابع بننے کے بجائے کتاب الٰہی کو اپنا تابع بنائیں۔ یہ ایک ایسی وباء ہے جس کا شکار ماضی کی قریب قریب تمام اقوام ہوئیں۔ انہوں نے اپنی اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کی۔ آسمانی کتابوں کے معانی اور مفاہیم میں ردوبدل کی، اور ان کے احکام کی تعبیر وتشریح اس طرح سے من مانے انداز سے کی کہ وہ ان کے اپنے تصورات ونظریات، عقائد وآداب، غلط رسم ورواج، فاسد نظریات اور باطل تقاضوں کے تابع ہوجائیں، اور ان چیزوں کو کتاب الٰہی کی ظاہری تائید ملتی رہے۔

یہ وہ چیز ہے جس کی طرف قرآن مجید میں بار بار تنبیہ کی گئی ہے اور مسلمانوں کو اس سے روکا گیا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا یہ بات ارشاد فرمائی اور آپ کا یہ ارشاد گرامی

احادیث متواترہ میں شامل ہے کہ جس نے قرآن مجید کے بارہ میں محض اپنی ذاتی رائے اور اپنی عقل کی بنیاد پر کوئی بات کی (یعنی تفسیر قرآن کے قواعد، اصول تشریح، طے شدہ معانی و مطالب سے ہٹ کر کوئی بات اس کتاب سے منسوب کی) وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنا لے۔ اس انجام سے بچنے کے لیے اہل علم نے دور صحابہ کرام سے لے کر آج تک اس کا اہتمام کیا ہے کہ قرآن مجید کے متن کی طرح اس کے معانی کی بھی حفاظت کی جائے اور ان گمراہیوں کا راستہ بند کیا جائے جن کا یہود اور نصاریٰ شکار ہوئے۔ چنانچہ قرآن مجید کے معانی و مفاہیم، پیغام اور مطالب کی اصالت اور تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے علم تفسیر کی ضرورت پیش آئی۔

جس طرح قرآن مجید کا متن پوری طرح محفوظ ہے، جس طرح قرآن مجید کی زبان محفوظ ہے اور جس طرح حامل قرآن کا اسوہ حسنہ محفوظ ہے، اسی طرح قرآن مجید کے معانی اور مطالب بھی محفوظ ہیں۔ قرآن کے یہ معانی اور مطالب دو طرح سے محفوظ کیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کے پیغام اور معانی و مطالب کا ایک بڑا اور اہم حصہ تو وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بہ نفس نفیس بیان فرمایا، جس کی آپؐ نے نہ صرف زبان مبارک سے بلکہ اپنے طرز عمل سے وضاحت اور تشریح فرمادی اور اس کے مطابق ایک پوری نسل کی تربیت کر کے ایک پوری امت اس کی بنیاد پر کھڑی کردی۔ قرآن پاک کے معانی و مطالب اور پیغام کا یہ حصہ اب امت مسلمہ کے رگ و پے میں شامل ہو چکا ہے۔ اب یہ حصہ امت مسلمہ کے رگ و ریشے کا حصہ بن چکا ہے، اب یہ ملت اسلامیہ کے جسد اجتماعی کا جزو بن چکا ہے۔ اب ان معانی و مطالب کو امت مسلمہ کے جسد ملی سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ جب تک امت مسلمہ اسلام کی اساس پر قائم اور زندہ و تابندہ ہے تفسیر قرآن کا یہ حصہ بھی زندہ و پائندہ ہے۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے۔ اقیمو الصلوٰۃ۔ اب مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ارشاد خداوندی کا مطلب سیکھا اور سمجھ لیا کہ اقامت صلوٰۃ سے کیا مراد ہے، پھر یہ چیز اس طرح مسلم معاشرہ کا حصہ بن گئی اور اس کے رگ و پے میں سما گئی کہ آج اگر کسی غیر مسلم سے بھی پوچھیں کہ مسلمانوں کی سب سے نمایاں عبادت کون سی ہے۔ تو ہر وہ غیر مسلم جس کو مسلمانوں سے تھوڑی سی بھی واقفیت ہے وہ اس بات کی گواہی دے گا کہ مسمانوں کی نمایاں ترین عبادت نماز ہے جو دن میں پانچ مرتبہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ بات یہودی، عیسائی، ہندو،

کیمونسٹ سب جانتے ہیں۔ بے عمل سے بے عمل مسلمان بھی جانتا ہے کہ نماز کیا ہے اور کیسے پڑھی جاتی ہے۔ لہٰذا آج اقیموا الصلاۃ کی تفسیر جاننے کے لیے اور آج نماز کا مفہوم سمجھنے کے لیے امت مسلمہ کا یہ اجتماعی تعامل کافی ہے۔ اب اس کے لیے کسی تفسیری کتاب کی ضرورت نہیں، کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ آج اقیموا الصلاۃ کی تفسیر جاننے اور سمجھنے کے لیے کسی بھی ملک میں مسلم ماحول میں چند روز بلکہ چند گھنٹے گزار لینا کافی ہے۔

اس طرح کی سینکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں، جن سے یہ اندازہ اچھی طرح ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر وتعبیر کا ایک بہت بڑا حصہ وہ ہے جو مسلمانوں کے تعامل، اور روزمرہ کے اجتماعی عمل میں شامل ہوگیا ہے۔ یہ حصہ اب مسلمانوں کی زندگی کا حصہ بن چکا ہے اور مسمانوں کی ثقافت اور تہذیب وتمدن میں ایک اہم عنصر کے طور پر شامل ہے۔ اس کے بارے میں اب کسی شک وشبہ کی یا کسی اور خیال یا رائے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ تفسیر قرآن کے اس حصہ میں اب اگر کوئی شخص کسی اور تاویل اظہار کرتا ہے تو وہ تاویل' تاویل باطل ہے۔ اور نا قابل قبول ہے۔

قرآن مجید کی تشریح وتعبیر کا یہ وہ حصہ ہے جس کے لیے ایک عام مسلمان کو کسی تفسیری ادب یا تفسیری قواعد وضوابط کی عملاً زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو آفتاب آمد دلیل آفتاب ہے۔ مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں اس پر عمل کرتے چلے جارہے ہیں، اس کے لیے نہ وہ کسی کتاب کے محتاج ہیں اور نہ کسی مدرس کے۔ جس طرح ایک پیدا ہونے والا بچہ خود بخود سانس لینا سیکھ لیتا ہے اور آپ سے آپ دودھ پینا سیکھ لیتا ہے، اسی طرح مسلم معاشرہ میں شامل ہونے والا ہر فرد خود بخود یہ جان لیتا ہے کہ نماز کیا ہے، نمازیں تعداد میں کتنی ہیں، کیسے پڑھی جائیں گی، کب پڑھی جائیں گی۔ روزہ کیسے رکھا جائے گا۔ زکوۃ کیسے ادا کی جائے گی۔ حج کیسے کیا جائے گا۔ شادی بیاہ کے بارہ میں اسلام کی عمومی ہدایات کیا ہیں، کن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے، کون محرم ہے، کون نامحرم ہے۔ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے۔ ان سب امور کا بڑا حصہ جس سے ملت مسلمہ کا تشخص قائم ہوتا ہے اور اسلام اور کفر میں حد قائم ہوتی ہے واضح اور معلوم ومعروف ہے۔ اب یہ احکام مسلم معاشرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔

لیکن قرآن مجید کا ایک بہت بڑا حصہ وہ بھی ہے جس کو سمجھنے کے لیے تعبیر اور تشریح کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس تعبیر وتشریح کے لیے کچھ مقررہ اور طے شدہ اصول ہیں جن کی پابندی ہر

اس شخص کو کرنی پڑے گی جو قرآن مجید کی تفسیر وتشریح کرنا چاہتا ہے۔ ان اصولوں کے مجموعے اور ان کو برتنے اور استعمال کرنے کے مجموعی علم کو علم تفسیر کہا جاتا ہے۔ تفسیر کے بنیادی اصول اور قواعد میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جو خود قرآن مجید ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ بہت سے دوسرے قواعد اور ضوابط ایسے ہیں جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادیے ہیں۔ بہت سے قواعد اور ضوابط صحابہ کرامؓ نے اپنی غیر معمولی گہری بصیرت، فہم قرآن، دینی تربیت، فطری ذوق سلیم، نزول قرآن کے ماحول اور پس منظر سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اپنے اجتماعی ضمیر اور اسلامی خمیر کی بنیاد پر مرتب کیے۔ امت آج تک ان اصولوں کی پیروی کرتی چلی آرہی ہے۔ ہر آنے والا مفسر اور شارح قرآن ان اصولوں کی پیروی کرتا ہے اور کتاب الٰہی کے معانی ومطالب کے تعین میں ان اصولوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ یہی اصول ہیں جنہوں نے قرآن مجید کو اس طرح کی تحریفات اور تاویلات باطلہ سے محفوظ رکھا جن کا دوسری مذہبی کتابیں نشانہ بنیں۔ اگر اقوام سابقہ کے علمائے مذہب بھی اپنی اپنی کتابوں کی تفسیر وتعبیر کے عمل کو قواعد وضوابط کا پابند بنالیتے تو شاید وہ کتابیں اس انجام کا شکار نہ ہوتیں جو بعد میں ان کا مقدر بنا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ جب ان اصولوں کی بنیاد پر بہت سی تفسیریں لکھ دی گئیں تو پھر اب ان اصولوں کی عملی افادیت کیا ہے اور اب مزید نئی تفسیروں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سوال عموماً وہ لوگ کرتے ہیں یا کرسکتے ہیں جو یا تو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک کے پہلے مفسرین نے اتنا کام کردیا ہے کہ اب رہتی دنیا تک کے لیے ان کا تفسیری کام کافی ہے۔ اب نہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہوگا، نہ نئے سوالات پیدا ہوں گے، نہ نئے اعتراضات کیے جائیں گے، نہ نئے افکار جنم لیں گے، گویا عقل انسانی کام کرنا بند کردے گی، فکر انسانی کے چشمے خشک ہوجائیں گے، انسان کا تہذیبی ارتقا رک جائے گا اور دنیا وہیں کی وہیں کھڑی رہے گی جہاں ساتویں، آٹھویں یا بیسویں صدی کے مفسرین اسے چھوڑ گئے تھے۔

لیکن یہ سوال کرنے والے حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ خود بیسویں صدی کے مفسرین کو اپنے سے پہلے مفسرین کے کام کی موجودگی اور اس کی غیر معمولی علمی اہمیت کے باوجود نئی تفسیری کاوشوں کی بجا طور پر ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اسی طرح ہر صدی میں اور ہر دور میں قرآن پاک کے مفسرین کو نئی نئی تفسیریں لکھنے کی ضرورت کا احساس ہوا اور انہوں نے مختلف ضروریات اور

تقاضوں کے پیش نظر یہ خدمت انجام دی۔

کچھ اور لوگ جو یہ سوال کرتے ہیں وہ شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کتاب علوم و معارف کا ایک لامتناہی گنجینہ ہے۔ یہ رہتی دنیا تک کے لیے کتاب ہدایت اور دستور العمل ہے۔ اگر اس میں ہر دور کے لیے رہنمائی کا سامان موجود ہے تو ہر دور کے اہل علم کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے دور کے انسانوں کے لیے اس کتاب کی تعبیر و تفسیر کا فرض انجام دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید معانی و مطالب اور حقائق و معارف کا ایک ایسا لامتناہی سمندر ہے جس کے نہ معانی اور مطالب کی کوئی حد ہے اور نہ اس کے حقائق و معارف کی کوئی انتہاء۔ ایک طویل حدیث میں، جس کو محدث طبرانی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، حضورؐ نے فرمایا" اس کتاب کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے اور یہ بار بار پڑھنے کے باوجود پرانی نہیں ہوگی"۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ جو کتاب پرانی ہو جاتی ہے اس کے معانی اور مطالب بھی پرانے ہو جاتے ہیں۔ جس کتاب کے معانی و مطالب زندہ اور تر و تازہ ہوں وہی کتاب زندہ رہتی ہے اور تر و تازہ رہتی ہے۔ جو گلستان زندہ و پائندہ ہو، جس کے گلہائے رنگا رنگ زندہ اور تر و تازہ ہوں اسی گلستان سے روزانہ نئے گلدستے سج کر نکلتے ہیں۔ یہ تو وہ کتاب ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لا یزال است و قدیم

اس کتاب کی حکمت تو ازل سے ابد تک جاری ہے۔ اس لیے ہر نئی آنے والی صورتحال میں قرآن مجید کے احکام کو اس پر منطبق کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہر نئے سوال کا جواب دینے کے لیے قرآن مجید کی آیات کی تعبیر و تفسیر کی ضرورت پڑتی ہے اور اس غرض کے لیے تفسیر کے اصول اور تعبیر کے قواعد درکار ہوتے ہیں۔ جن سے کام لے کر قرآن مجید سے اس سوال کا جواب نکالا جا سکے۔ اس پورے عمل کے لیے علم تفسیر کی ضرورت ہے۔

تفسیر کے لغوی معنی ہیں وضاحت اور تشریح، یعنی کسی چیز کو کھول کر سامنے رکھ دیا جائے۔ فسر یعنی ف، س، ر، اس لفظ کا مادہ ہے۔ عربی زبان میں اس کے اصل معنی ہیں کسی چیز کو پردوں سے نکال کر یا کھول کر سامنے رکھ دینا، عربی زبان میں فسر کے یہ معنی بھی آتے ہیں کہ کسی

سجے سجائے گھوڑے کو اس کے سارے لوازمات، زین وغیرہ، لگام اور دوسری چیزوں سے نکال کر پیش کر دینا، گویا خریدار کے سامنے اصل گھوڑے کو اس طرح رکھ دینا کہ اس کی اصلی صورت، شکل اور رنگ و روپ سب نظر آ جائے۔ گویا قرآن مجید کے معانی اور مطالب کو اس طرح کھول کر سامنے رکھ دیا جائے کہ ہر سننے والے کی سمجھ میں آ جائے۔ اور ہر پڑھنے والا اس کا مفہوم اور مقصد سمجھ لے۔ اس عمل کو تفسیر کہتے ہیں۔

لہٰذا اسلامی علوم کی اصطلاح میں تفسیر سے مراد وہ علم ہے جس سے کتاب اللہ کے معانی و مطالب سمجھے جائیں، اس کے الفاظ اور آیات کے وہ معانی دریافت کیے جاسکیں جو ایک عام قاری کی نظر میں فوری طور پر نہیں آ سکتے۔ اس سے نئے نئے احکام نکالے جاسکیں۔ اور نئی پیش آنے والی صورتحال پر قرآن مجید کے الفاظ و آیات کو منطبق کیا جاسکے۔ جس علم میں یہ طریقے، مباحث اور قواعد بیان کیے جائیں اس کو علم تفسیر کہتے ہیں۔

اس علم کی باقاعدہ تدوین پہلی صدی ہجری ہی میں شروع ہو گئی تھی، صحابہ کرام کے تلامذہ نے صحابہ کرام کے تفسیری سرمایہ کی بنیاد پر علم تفسیر کی تدوین کا کام شروع کر دیا تھا۔ دوسری صدی ہجری کے اواخر تک اس علم کی بنیادیں پڑ چکی تھیں اور حدود متعین ہو گئی تھیں۔ پھر جیسے جیسے علم تفسیر کا ارتقا ہوتا گیا نئے نئے علوم و فنون بھی پیدا ہوتے گئے، جن کا تفصیلی تعارف انشاء اللہ آئندہ کسی گفتگو میں ہوگا۔ یہ سب علوم و معارف مجموعی طور پر علوم القرآن کہلاتے ہیں۔

علوم القرآن اور علم تفسیر بعض اعتبار سے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اور بعض اعتبار سے یہ دونوں الگ الگ علوم ہیں۔ یہ دونوں اس اعتبار سے ایک ہی چیز ہیں کہ جن علوم و معارف کو علوم القرآن کہا جاتا ہے ان سب سے علم تفسیر ہی میں کام لیا جاتا ہے۔ وہ گویا علم تفسیر کے اوزار اور آلات ہیں۔ یہ وہ وسائل ہیں جن سے کام لے کر قرآن مجید کی تفسیر اور تعبیر کی جاتی ہے۔ لیکن اس اعتبار سے وہ تفسیر سے الگ ہیں کہ یہ تفسیر میں کام آنے والے آلات و ذرائع ہیں، خود تفسیر نہیں ہیں۔ تفسیر اس عمل کا نام ہے جس کی رو سے قواعد اور اصول تفسیر کا انطباق کر کے قرآن مجید کے معانی دریافت کیے جائیں۔

یہ جو مختلف علوم و فنون یا آلات و وسائل ہیں ان میں بہت سی وہ چیزیں شامل ہیں جن کو جانے بغیر یا جن سے کام لیے بغیر تفسیر قرآن کے عمل میں پیش رفت نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر

خود نزول کی تفصیلات کہ کون سی آیت کیسے نازل ہوئی، قرآن مجید میں جو قصص بیان ہوئے ہیں ان کا پس منظر کیا ہے، وہ کیوں بیان ہوئے، کوئی خاص حکم کب، کیوں اور کن حالات میں نازل ہوا، یہ سب امور جو اسباب نزول کہلاتے ہیں، ان کا گہرا علم بہت سے معاملات کو صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح یہ تعین کہ کون سی آیت مکی ہے اور کونسی مدنی، یہ اور اس طرح کے بہت سے علوم و مسائل ہیں جن کو مجموعی طور پر علوم القران کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں تفصیلی گفتگو بعد میں کی جائے گی۔

یہ تھی علم تفسیر کی لغوی تعریف۔ قرآن مجید میں ایک اور لفظ اس سیاق اور سباق میں استعمال ہوتا ہے: تاویل۔ تاویل اور تفسیر میں کیا فرق ہے؟ کیا یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں؟ یا الگ الگ ہیں؟ اس پر بھی قریب قریب تمام مفسرین کے ہاں مباحث ملتے ہیں۔ تاویل کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو لوٹانا یا رجوع کرنا۔ عربی زبان میں آل یئول، اولا کے معنی آتے ہیں رجوع کرنا یا واپس لوٹنا۔ کسی لفظ کی تفسیر اور تعبیر کو اس کے فوری ظاہری معنی سے ہٹا کر کسی اور معنی کی طرف لوٹانا، بالفاظ دیگر متبادر معنی سے لفظ کے حقیقی معنی اور مراد کی طرف لوٹانا، تاویل کہلاتا ہے۔ اس میں چونکہ لوٹانے کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے اس کے لیے تاویل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں تاویل کا لفظ کسی چیز یا فعل کی عاقبت یا انجام کار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ سورہ اعراف (آیت ۵۳) میں آیا ہے: هل ينظرون الاتاويله۔ یعنی وہ بالآخر اپنی عاقبت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک اعتبار سے تاویل میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے، گویا آیت کا پہلے جو مفہوم بظاہر نظر آتا تھا، تحقیق اور غور و فکر کے نتیجہ میں انجام کار وہ مفہوم مرجوح قرار پایا اور بالآخر ایک دوسرا صحیح تر مفہوم راجح قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ جب تاویل کے نتیجے میں ایک مفہوم متعین ہو جاتا ہے تو اس میں لوٹانے اور عاقبتِ کار' دونوں معانی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے دونوں مفہوموں کی رو سے تاویل کی اصطلاح برمحل ہے۔

بعض اوقات کسی مبہم اور غیر واضح چیز کا مطلب بیان کرنے کو بھی عربی زبان میں تاویل کہتے ہیں۔ چنانچہ خواب کی تعبیر کے لیے بھی تاویل کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ سورہ یوسف میں آیا ہے یا ابت هذا تاويل رویای من قبل۔ ابا جان! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے دیکھا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے یہ جملہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ گویا یہ

وضاحت ہے اس مبہم اور غیر واضح خواب کی جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا اور جس کی وجہ سے میرے بھائی میرے دشمن ہو گئے تھے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ اور، حضرت خضر علیہما السلام کے قصے میں بھی ایک جگہ آیا ہے: ذلك تاويل مالم تسطع عليه صبرا۔ یہ مفہوم ہے ان باتوں کا جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں اور جن پر آپ صبر نہیں کر سکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دیکھا تھا وہ احکام شریعت سے متعارض نظر آتا تھا، لیکن وہ بظاہر غیر شرعی اعمال اللہ کے ایک مقرب بندہ کے ہاتھوں ہو رہے تھے۔ بظاہر یہ باتیں غیر واضح اور نا قابل فہم تھیں۔ بظاہر ان کا اصل مدعا اور مفہوم سامنے نہیں تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام بطور ایک نبی کے ان پر صبر نہیں کر پائے اور انہوں نے بار بار اعتراضات کیے، ان کے جواب میں کہا گیا کہ یہ تاویل یا مفہوم ہے ان باتوں کا جو آپ کے لیے واضح نہیں تھیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاویل اور تفسیر دونوں ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں؟ یا ان دونوں کے مفاہیم الگ الگ ہیں؟ متقدمین کے ہاں تاویل وتفسیر' دونوں اصطلاحیں ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوتی تھیں۔ چنانچہ اگر آپ امام طبری کی تفسیر اٹھا کر دیکھیں تو ان کی تفسیر میں قریب قریب ہر صفحے پر جابجا تاویل کا لفظ ملتا ہے جو ان کے ہاں تفسیر ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وہ پہلے ایک آیت قرآنی تحریر کرتے ہیں، اس کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں، القول فی تاويل هذا الاية۔ یعنی اس آیت کی تاویل (تفسیر) میں جو قول ہے وہ یہ ہے۔ گویا تاویل اور تفسیر کو انہوں نے ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔

بعض متاخرین نے بھی تاویل کو تفسیر ہی کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر ہمارے برصغیر کے مولانا حمید الدین فراہیؒ اور ان کے شاگرد رشید اور ممتاز مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے تاویل اور تفسیر کو قریب قریب مترادف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مولانا اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن میں بھی تاویل کا لفظ تفسیر ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن ان چند حضرات کے استثناء کے ساتھ۔ یعنی چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے بعد کے حضرات کے ہاں۔ تفسیر اور تاویل کی اصطلاحات الگ الگ معنی میں ہی استعمال ہوتی رہی ہیں۔

حضرات مفسرین کی عمومی اصطلاح میں تفسیر یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کے عام اصولوں کو منطبق کر کے جو ظاہری مطلب سمجھ میں آئے وہ بیان کر دیا جائے، یعنی جو مفہوم تفسیر کے

عام اصولوں کے مطابق ہو اسے تفسیر کہتے ہیں۔ لیکن اگر بظاہر کوئی ایسا مشکل لفظ ہو کہ یا تو اس کے ظاہری معنی مراد نہ لیے جا سکیں، یا اگر اس کے ظاہری معنی مراد لیے جائیں تو اس سے کوئی اعتراض یا قباحت پیدا ہوتی ہے اور وہاں ظاہری معنی سے ہٹ کر کوئی دقیق تر مفہوم مراد لینا ناگزیر ہو، تو پھر ظاہری معنی سے سے ہٹ کر جو معنی مراد لیے جائیں گے ان کو تاویل کہا جائے گا۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں آیا ہے، کل شئی ھالك الا وجهه، ہر چیز فنا ہونے والی ہے، سوائے اس کے چہرے کے۔ عام طور پر مفسرین نے یہاں چہرہ کے لفظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات مراد لی ہے اور آیت کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہنے والی ہے، اور باقی ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ ان حضرات کی رائے میں یہاں چہرے کو ذات باری تعالیٰ کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تاویل ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے۔ يدالله فوق ايديهم، یعنی جب وہ بیعت کر رہے تھے تو ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اس سے کیا مراد ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا دست مبارک واقعی ان کے ہاتھ میں تھا؟ یا اللہ تعالیٰ کی برکت ان کے ہاتھ پر تھی۔ یا اللہ تعالیٰ کا دست شفقت اور دست رحمت ان کے اوپر تھا۔ جیسے کوئی بزرگ ہستی سر پر ہاتھ رکھے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی شفقت اور برکت ساتھ ہے۔ یہاں ید اور ہاتھ کا جو مفہوم بھی قرار دیا جائے گا وہ تاویل کے زمرے میں آئے گا۔ اس لیے کہ ظاہری طور پر یہ مراد معلوم نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کا دست مبارک ان کے دست بیعت میں تھا۔ اس لیے متاخرین کی اصطلاح میں تاویل سے مراد ہے ظاہری معنی سے ہٹ کر کوئی اور معنی مراد لینا، بشرطیکہ ظاہری معنی کو مراد لینے میں کوئی الجھن یا مشکل پیدا ہو رہی ہو۔

متاخرین کے اصول اور اصطلاح کے مطابق تاویل کی ضرورت وہاں عام طور پر پیش آتی ہے جہاں متشابہات کا ذکر ہو۔ اس لیے کہ متشابہات وہ چیزیں ہیں جہاں اخروی اور مافوق الفطرت حقائق کو انسانوں کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اور احادیث مبارکہ میں عالم آخرت کے حقائق اور ذات باری تعالیٰ کی قدرت اور صفات کو انسانوں کے فہم سے قریب تر کرنے کے لیے انسانوں کی زبان، انسانوں کے اسلوب اور انسانوں کے محاورے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ انسان اپنے محدود فہم اور بصیرت کے لحاظ سے ایک چیز کو اسی حد تک سمجھ سکتا ہے جس حد تک وہ اس کا علم رکھتا ہو۔ اس کے علم، تجربہ اور مشاہدہ کی حدود سے باہر اس کو کوئی

چیز سمجھانے کے لیے متکلم کو مخاطب کی سطح پر اتر کر وہ اسلوب اختیار کرنا پڑے گا جو اس کی محدود فہم میں آ سکے۔

جس دیہاتی شخص نے کبھی بیل گاڑی بھی نہ چلائی ہو اس کو F-16 چلانے کا طریقہ کیسے بتایا جائے گا۔ ایک ماہر سے ماہر پائلٹ بھی اس سادہ لوح دیہاتی کو اس کی سادہ سی زبان میں محض ابتدائی باتیں ہی سمجھا سکتا ہے کہ یہ ایک سواری ہوتی ہے جو بڑی تیز ہوتی ہے، ایک بٹن دبانے سے بہت تیز چلتی ہے اور آسمانوں میں اڑتی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ اس لیے کہ سادہ لوح مخاطب اس فن سے واقف نہیں ہے۔ مزید تفصیلات اس کے لیے سرے سے ناقابل فہم ہوں گی، لہٰذا ان کو بیان کرنا بیکار اور لا حاصل ہے۔ اگر کسی آدمی نے زندگی میں کبھی پٹاخہ بھی نہ بنایا ہو اس کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان کیا سمجھا سکتے ہیں کہ ایٹم بم کیا ہوتا ہے اور کیسے بنتا ہے۔ اور اگر بتانا چاہیں گے بھی تو وہ سمجھے گا نہیں۔ اس لیے تاویل کی ضرورت پیش آئے گی۔ اور اس کی فہم کے قریب ترین الفاظ اور محاورہ میں اس کو بتانا پڑے گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ تاویل کی ضرورت متشابہات میں پیش آتی ہے۔ گویا تفسیر ایک عام اصطلاح ہے، جس کے بہت سے حصے اور شعبے ہیں جن میں سے ایک حصہ تاویل بھی ہے۔ ایک فرق تو سمجھنے کی خاطر تاویل وتفسیر میں یہ ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ تفسیر اکثر وبیشتر قرآن مجید کے الفاظ کی جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی لفظ مشکل یا نامانوس ہے، تفسیر کر کے اس کی مشکل دور کر دی جاتی ہے، اس کے معنی کو مانوس بنا دیا جاتا ہے۔ یا مثلاً یہ سوال کہ کسی لفظ کے عموم میں کیا کیا شامل ہے؛ اس کو تفسیر سے واضح کر دیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام میں مشکل اور نامانوس الفاظ کی تفسیر کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ پوچھا، وفاکهة وابا میں۔ ابا سے کیا مراد ہے؟ تو ایک صحابی نے بتایا کہ فلاں قبیلے کی زبان میں جانوروں کے چارہ کو ابٌ کہتے ہیں۔

گویا جہاں الفاظ وکلمات کے معنی کی تشریح ووضاحت کی جائے گی وہ تفسیر، اور جہاں معانی ومطالب متعین کیے جائیں گے وہ تاویل کہلائے گی۔ کچھ لوگوں نے یہ امتیاز بھی بیان کیا ہے کہ تفسیر کے ذریعہ سے جب قرآن پاک کے کسی لفظ یا آیت کا مفہوم متعین کر دیا جائے تو وہ یقینی ہوتا ہے، اس کے برعکس تاویل کے نتیجہ میں جو مفہوم متعین کیا جائے وہ ظنی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مثلاً يد الله فوق ايديهم کا مفہوم اگر ہم یہ قرار دیں کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی برکت یا رحمت

ہے تو یہ ہمارا خیال اور رائے ہوگی۔ اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ ہم نے اس آیت کا یہ مفہوم سمجھا ہے اور ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ مفہوم درست ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک ظنی چیز ہے۔ ہماری فہم کو نہ قطعیت کا درجہ حاصل ہے اور نہ یقینی طور صحت کا۔ اس امر کا امکان بہر حال موجود ہے کہ ہمارا یہ خیال درست نہ ہو اور ید اللہ کا کچھ اور مفہوم ہو۔

تاہم تاویل کے ظنی ہونے یا ہماری فہم کے ظنی ہونے سے قرآن مجید کے پیغام یا عمومی مفہوم کو سمجھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی۔ اس آیت مبارکہ (یدالله فوق ایدیهم) کے پیغام کو سمجھنے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ان صحابہ کرام کے شامل حال تھی جو بیعت رضوان کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کر رہے تھے۔

تفسیر اور تاویل کے مابین اس فرق کی وضاحت کے بعد مناسب ہوگا کہ علم تفسیر کی اصطلاحی تعریف بھی بیان کی جائے۔ یوں تو علمائے تفسیر نے حسب دستور علم تفسیر کی بہت سی تعریفیں بیان کی ہیں۔ جن میں لفظی اختلاف بھی موجود ہے، اگر چہ اپنے مفہوم اور مدعا کے اعتبار سے ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ تاہم علم تفسیر کی ایک جامع تعریف جو علامہ بدرالدین زرکشی نے کی ہے یہ ہے: هو علم یفهم به کتاب الله المنزل علی نبیه محمد ﷺ وبیان معانیه، واستحراج احکامه و حکمه۔ یعنی علم تفسیر وہ علم ہے جس کی مدد سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب کو سمجھا جائے، اس کے معانی و مطالب کی وضاحت کی جائے اور اس کے احکام اور حکمتوں کا پتا چلایا جائے۔

علامہ بدرالدین زرکشی کے نزدیک علم تفسیر میں حسب ذیل چیزوں کا علم بھی شامل ہے:

۱۔ قرآن مجید کی آیات کے الگ الگ نزول کا تفصیلی علم، کہ کون سی آیت کب، کیسے اور کہاں نازل ہوئی۔

۲۔ قرآن مجید کی کون سی آیت یا سورت کن حالات اور کس پس منظر میں نازل ہوئی۔

۳۔ کون سی آیت محکم ہے اور کون سی متشابہ۔

۴۔ کون سی آیت خاص ہے اور کون سی عام۔

۵۔ ایک ہی حکم یا ملتے جلتے احکام پر مشتمل وہ آیات جو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھی جانی چاہئیں۔ ان آیات کو قدیم مفسرین اپنی اصطلاح میں ناسخ اور منسوخ

کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ متقدمین کی اصطلاح میں ناسخ اور منسوخ کے وہ معنی نہیں ہیں جو ان الفاظ سے فوری طور پر سمجھ میں آتے ہیں۔ قدیم مفسرین کی اصطلاح میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ آیت فلاں آیت سے منسوخ ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ اس آیت کو فلاں آیت کی روشنی میں سمجھا جائے۔

۶۔ قرآن مجید کے رسم الخط اور متواتر وغیر متواتر قراءات کا علم

۷۔ قصص القران کا علم

۸۔ مکی اور مدنی کا علم، یعنی ترتیب نزولی سے عمومی اور سرسری واقفیت، وغیرہ وغیرہ۔

خلاصہ یہ ہے کہ متقدمین کے نزدیک تاویل اور تفسیر دونوں ایک اصطلاح ہیں اور دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ جبکہ متاخرین کے نزدیک یہ دونوں الگ الگ اصطلاحیں ہیں، اور یہ تین فرق جو میں نے آپ کو بتائے ہیں وہ ان دونوں اصطلاحوں کے مابین متاخرین کے نزدیک پائے جاتے ہیں۔

علم تفسیر کے بعض اصول تو وہ ہیں جو خود قرآن پاک سے مستنبط ہوئے ہیں، کچھ اصول وہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے۔ اور کچھ اصول وہ ہیں جو صحابہ کرامؓ نے رسول اللہؐ کے ارشادات کو سامنے رکھ کر وضع کیے۔ اور کچھ اصول وہ ہیں جو صحابہ کرامؓ نے اپنے اجتہاد کی بنیاد پر اور اپنی بصیرت سے کام لے کر مرتب کیے۔ بعد میں آنے والوں نے ان کو قبول کیا، اور یوں ان پر اجماع امت ہو گیا۔

جن صحابہ کرامؓ نے علوم تفسیر کی تدوین یا اصول تفسیر کی تحدید و تعیین میں نمایاں کام کیا، جن کے خیالات اور جن کے کام کا اصول تفسیر کی تدوین پر نہایت گہرا اثر ہے ان میں سب سے نمایاں نام تو خلفاء اربعہ کا ہے۔ خلفاء اربعہ میں بھی خاص طور پر سیدنا عمر فاروقؓ اور سیدنا علیؓ کا نام بہت نمایاں ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے بارہ میں تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی کثرت کی گواہی دی تھی۔ اور سیدنا علیؓ کو بچپن سے حضورؐ کی سرپرستی اور راہنمائی میں تربیت پانے کا موقع ملا۔ کل یا پرسوں میں نے ان کا یہ جملہ نقل کیا تھا جو وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں یا آخری مہینوں میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہو پوچھ لو، ''سلونی عما شئتم''۔ جب میں نہیں

رہوں گا تو کوئی شخص تمہیں ایسا نہیں ملے گا۔ جو تمہیں یہ بتا سکے کہ قرآن مجید کی کون سی آیت کب اور کہاں اور کس صورتحال میں نازل ہوئی تھی۔

خلفاء اربعہ کے بعد جو نام سب سے نمایاں ہیں وہ انہی حضرات کے ہیں جن کا تذکرہ گذشتہ تین چار دن کی گفتگو میں کئی بار آ چکا ہے۔ یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر مردوں میں، اور خواتین میں خاص طور پر حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ ان تمام ناموں میں بھی سب سے زیادہ تفسیری اقوال حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ہیں۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کہ ان حضرات کی عمریں نسبتاً زیادہ طویل ہوئیں۔ اور ان کو کم سنی میں براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں رہنے اور شب و روز دین سیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے برعکس بعض کبار صحابہ کو حضور علیہ السلام کے بعد زیادہ رہنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے ان کے علم سے زیادہ استفادہ نہیں کیا جا سکا۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف دو سال زندہ رہے، اس لیے ان سے فائدہ اٹھانے والے بھی تھوڑے ہی رہے۔ مزید برآں وہ دور خود صحابہؓ کا دور تھا اور دیگر صحابہ کے پاس بھی علوم و معارف کے وہ سب خزانے موجود تھے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس تھے۔ انہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کسب فیض کی اتنی ضرورت پیش نہیں آئی جتنی ضرورت اس وقت محسوس کی گئی جب صحابہ ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھنے شروع ہوئے۔ چنانچہ جب تابعین کا دور آیا اور صحابہ کی تعداد میں کمی آئی تو اس بات کی زیادہ ضرورت پیش آئی کہ صحابہ کرامؓ کا علم تابعین تک منتقل ہو۔ اس لیے جن صحابہ کرامؓ کی عمریں زیادہ ہوئیں ان کی تفسیری روایات زیادہ ہیں اس لیے کہ ان سے استفادہ کا تابعین کو زیادہ موقع ملا۔

صحابہ کرامؓ نے جب قرآن پاک کی تفسیر کے اصول مرتب کیے اور خود تفسیری مواد جمع کیا تو ان کے سامنے چار بنیادی مصادر و مآخذ تھے۔ سب سے پہلا اور اہم ترین اور مستند ترین ماخذ تو خود قرآن مجید تھا۔ دوسرا ماخذ احادیث رسول تھیں جن کے براہ راست مخاطبین خود صحابہ کرام تھے اور جن کے ذریعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے معانی و مطالب اور وحی الٰہی کے اسرار و رموز ان پر واضح کیے تھے۔ صحابہ کرام کے لیے یہ احادیث قرآن پاک کے بعد

سب سے مستند اور معتبر ماخذ تفسیر تھیں۔ تیسرا ماخذ کلام عرب تھا جس کے نثری اور شعری مصادر صحابہ کرام کی دسترس میں تھے، جس کے شواہد اور نظائر سے کام لے کر وہ نہ صرف قرآن مجید کے مشکل الفاظ وعبارات کی تفسیر کرتے تھے، بلکہ جس کی مدد سے وہ قرآن مجید کی فصاحت کی بلندیوں کا پتا لگاتے تھے۔ اور چوتھا ماخذ صحابہ کرامؓ کے اپنے اجتہادات اور فہم وبصیرت پر مبنی تفسیری اقوال تھے۔

صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے تفسیر قرآن کا یہ ایک تسلیم شدہ اور طے شدہ اصول چلا آرہا ہے کہ قرآن مجید کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصہ کی تشریح اور تعبیر کرتا ہے، القران یفسر بعضه بعضا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ ایک چیز اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ وہی چیز آگے چل کر کسی اور جگہ تفصیل کے ساتھ بیان کردی گئی ہے۔ بعض جگہ ایک چیز عمومی انداز میں بیان ہوئی ہے۔ آگے چل کر اس کی تخصیص کردی گئی ہے اور کہیں کہیں اسباب تخصیص اور موجبات تخصیص کو بھی ساتھ ساتھ بیان کردیا گیا ہے، اور بتادیا گیا ہے کہ متعین طور پر اس خاص حکم کا اطلاق کہاں کہاں ہوتا ہے۔

تفسیر قرآن بالقران کی چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔ سورہ فاتحہ میں ہم سب یہ آیت تلاوت کرتے ہیں جس میں یہ دعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ! ان لوگوں کا راستہ ہم لوگوں کو دکھا جن پر تو نے اپنا انعام فرمایا ہے۔ یہاں اس آیت میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ وہ کون لوگ تھے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔ اس اعتبار سے اس جگہ اس آیت میں اجمال پایا جاتا ہے۔ لیکن آگے چل کر ایک دوسری جگہ (سورہ نساء آیت ٦٩) میں اس کی وضاحت کردی گئی کہ وہ چار طرح کے لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام فرمایا، انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ گویا اس تفصیلی آیت میں جو سورۃ نساء میں آئی ہے' اس کے ذریعہ سے سورۃ فاتحہ میں آنے والے اس ایک لفظ کی' جو مجمل تھا وضاحت کردی گئی۔ اس مثال سے واضح ہوگیا کہ قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی وضاحت کس طرح کرتا ہے۔

صحابہ کرامؓ اور تابعین نے اس پہلو پر غور کیا اور غور وخوض کرنے کے بعد انہوں نے ان تمام آیات کی نشان دہی کردی جن کی تفسیر وتشریح کے لیے قرآن مجید ہی کی دوسری آیات سے راہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قرآن مجید کا انداز یہ ہے کہ اگر اس میں ایک جگہ ایجاز ہے تو دوسری جگہ اطناب ہے۔ بعض جگہ اجمال ہے تو دوسری آیت میں اس اجمال کی تفصیل موجود ہے۔

کسی جگہ اطلاق ہے تو کسی اور جگہ اس کی تقیید ہے۔ کہیں عام حکم ہے تو دوسری جگہ اس کی تخصیص کردی گئی ہے۔

مثال کے طور پر سورۂ بقرہ میں ایک جگہ آیا ہے۔ فتلقی آدم من ربہ کلمٰت فتاب علیہ، کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے بعض کلمات سیکھ لیے اور ان کلمات کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ نے ان کی دعا قبول کرلی۔ سورۂ بقرہ کے اس مقام پر صرف اتنا ہی ذکر ہے۔ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کیا کلمات تھے جن کے ذریعے سے حضرت آدمؑ نے توبہ کی اور وہ قبول ہوئی۔ لیکن ایک دوسری جگہ ان کلمات کی وضاحت کردی گئی ہے۔ سورہ المص کی آیت ہے کہ وہ کلمات یہ تھے، ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین، گویا یہاں سے سورہ بقرہ کی اس آیت کا مطلب حتمی طور پر متعین ہو جائے گا۔

بعض جگہ مطلق لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس میں آگے چل کر کچھ قیود متعین کردی گئیں جن کی روشنی میں اور جن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اس مطلق حکم پر عمل کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے کہ اگر فلاں غلطی ہو جائے تو اس کے کفارہ کے طور پر ایک غلام آزاد کرو، تقریباً تین چار جگہ ایسا حکم آیا ہے۔ ان تین چار مقامات میں سے ایک جگہ یہ حکم ایک قید کے ساتھ آیا ہے، فتحر یررقبۃ مومنہ، کہ ایک صاحب ایمان غلام کو آزاد کرو۔ گویا صاحب ایمان کی قید ہے تو ایک جگہ، لیکن وہ سب پر منطبق ہوگی۔ جہاں جہاں بطور کفارہ غلام آزاد کرنے کا ذکر ہے وہاں سب جگہ یہی سمجھا جائے گا کہ صاحب ایمان غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ گویا قرآن مجید کے اطلاق کی تقیید ہے۔

بعض جگہ عام لفظ آتا ہے جس میں بہت سے اجزاء یا افراد شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن دوسری آیات میں یہ تخصیص کردی گئی کہ فلاں فلاں قسمیں، اجزاء یا افراد اس عام حکم میں شامل نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ آیا ہے احلت لکم بھیمۃ الانعام الا مایتلی علیکم، یعنی جتنے چوپائے جانور ہیں وہ تمہارے لیے حلال قرار دیئے گے سوائے ان کے جن کے بارے میں آگے تلاوت کی جائے گی۔ اب دیکھنا پڑے گا کہ آگے کیا تلاوت کیا گیا ہے۔ آگے جو تلاوت کیا گیا' وہ یہ ہے: حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیۃ والنطیحۃ وما أكل السبع الا ما ذکیتم و ماذبح علی النصب

وان تستقسموا بالازلام۔ ذلکم فسق۔یعنی پانچ قسم کے چوپائے جائز نہیں ہیں:وہ جو دم گھٹ کر مرجائیں،وہ جواوپر سے گر کر مرجائیں، وہ جو کسی اور جانور کے سینگ مار دینے سے مرجائیں، وہ جو ضرب لگنے سے مرجائیں،وہ جن کو کسی غیراللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور جو آستانے پر چڑھایا گیا ہو۔ یہ پانچ اقسام جائز نہیں ہیں' باقی جائز ہیں۔ گویا ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھا جائے گا اور پھر دونوں آیات کو سامنے رکھ کر حکم معلوم کیا جائے گا۔لہٰذا کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ سورۃ الانعام میں عمومی حکم ہے،اس لیے سب چوپائے جائز ہیں۔ایک آیت کو دوسری آیت یا آیات کی مدد سے سمجھنے کا یہ طریقہ اور انداز ہے' تفسیر القران بالقران کا۔

صحابہ کرامؓ نے اس سے ایک اور اصول نکالا۔ اور وہ یہ تھا کہ بعد میں آنے والا ہر حکم پہلے دیئے جانے والے احکام کو qaulify کرتا ہے،یعنی ہر حکم کو بعد میں آنے والے حکم کی روشنی میں پڑھا جائے گا۔ اب یہ دنیا کے ہر قانون کا طے شدہ اصول بن چکا ہے۔اس وقت دنیا میں کوئی نظام قانون ایسا نہیں ہے جس کی تعبیر اور اور تشریح کے اصولوں میں یہ بات شامل نہ ہوگئی ہو کہ ہر سابقہ قانون کو بعد کے قانون کی روشنی میں سمجھا جائے گا۔ یہ اصول صحابہ کرامؓ کی دین ہے،اب یہ دنیا کے تمام قوانین میں ایک بنیادی اور طے شدہ اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔صحابہ کرامؓ میں بھی جس شخصیت نے سب سے زیادہ اس اصول کو وضاحت سے بیان فرمایا وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہیں۔ان سے کسی نے عدت کے بارہ میں سوال کیا۔اب قرآن مجید میں عدت کے بارے میں تین آیات آئی ہیں جن میں الگ الگ احکام بتائے گئے ہیں۔ جس شخص نے مسئلہ پوچھا تھا اس کو یہ التباس تھا کہ تین جگہ تین آیات آئی ہیں اور تینوں میں تین مختلف احکامات بیان ہوئے ہیں۔تو میں جس صورتحال کا حل معلوم کرنا چاہتا ہوں اس میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔آپ نے یہ سوال سننے کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ سورۃ طلاق سورۃ بقرہ کے بعد نازل ہوئی تھی۔آپ نے اس سائل کے سوال کے جواب میں صرف یہ مختصر سا جواب دیا۔اس جواب سے پوچھنے والے صاحب سمجھ گئے کہ سورۃ طلاق میں جو حکم بیان ہوا ہے اس کو سورۃ بقرہ کے حکم کی روشنی میں سمجھا جائے گا اور سورۃ بقرہ کے حکم کو عملی حالات پر منطبق کرتے وقت سورۃ طلاق کے حکم کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ جب دونوں کو ملا کر پڑھا جائے گا تو صورتحال واضح ہوگی۔ گویا قانون کی تمام متعلقہ دفعات کو ملا کر پڑھا جائے پھر حکم نکالا جائے۔ اس لیے کہ قانون ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے،

اس کو الگ الگ متعارض ٹکڑوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ اس لیے قانون کی کسی ایک دفعہ کو نہ دوسری دفعات سے الگ کر کے نافذ کیا جا سکتا ہے اور نہ دونوں دفعات کی الگ الگ تعبیر کی جا سکتی ہے۔ گویا قانون کی روح اور اس کی دیگر دفعات کو نظر انداز کر کے اس کی کسی ایک دفعہ کی الگ تھلگ تعبیر نہ کی جائے۔

یہ اصول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان فرمایا اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق فرمایا۔ آج یہ دنیا کے ہر نظام قانون کا بنیادی اصول ہے۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان اس بارہ میں کبھی بھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔ اور جب کسی آیت سے راہنمائی لینی ہو۔ تو اس کی ہم مضمون تمام آیات کو سامنے رکھا جائے اور ان سب پر غور کرنے کے بعد ہی اس آیت کا مفہوم متعین کیا جائے۔

قرآن مجید کے بعد تفسیر کا دوسرا ماخذ سنت رسولؐ ہے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض کے بارہ میں بتایا گیا ہے لتبین للناس مانزل الیھم۔ یعنی آپ کا کام یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اس کلام کی وضاحت کر دیں اور اس ہدایت کو کھول کھول کر بیان کر دیں جو ان کی طرف اتاری گئی۔ گویا قرآن مجید کے معانی کی وضاحت اور تشریح پیغمبرانہ فرائض میں شامل تھی۔ احادیث میں ایسی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے کسی آیت کی تفسیر پوچھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرما دی۔ اگر قرآن مجید میں کوئی چیز مجمل تھی تو آپؐ نے اس کی تفصیل بیان کر دی۔ اگر قرآن مجید میں کوئی چیز عام تھی تو آپؐ نے اس کی تخصیص فرما دی۔ اور اس کے بعد وہ چیز قرآن مجید کی تفسیر کا حصہ بن گئی۔

سورۃ فاتحہ میں ہم دن میں کم از کم سترہ مرتبہ اللہ تعالیٰ سے جو دعا کرتے ہیں اس میں یہ الفاظ بھی شامل ہوتے ہیں: غیر المغضوب علیھم ولاالضالین۔ کہ اے اللہ تعالیٰ! ہم لوگوں کو ان کے راستے پر نہ چلانا جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی ان لوگوں کے راستے پر چلانا جو گمراہ ہوئے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گمراہ کون لوگ ہیں، مغضوب علیھم کون ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے۔ گمراہ تو لوگ ہر دور میں ہوتے رہے ہیں۔ مشرق میں بھی ہوتے ہیں، اور مغرب میں بھی، بلکہ مسلمانوں میں بھی کچھ لوگ گمراہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن حضورؐ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ اس

آیت میں مغضوب علیھم سے مراد یہودی ہیں، اور ضالین سے مراد یہاں عیسائی ہیں۔یعنی یہودیوں اور عیسائیوں دونوں سے اپنے اپنے زمانہ میں جو گمراہیاں اور غلطیاں سرزد ہوئیں ان سے اللہ تعالیٰ ہمیں بچائے اور دونوں کے راستے پر چلنے سے اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔ان دونوں کا راستہ کیا تھا۔اور اس میں کیا کیا خرابیاں پنہاں تھیں۔اس کا اندازہ کرنے کے لیے ان دونوں اقوام کی تاریخ اور مذہبی رویے کا جائزہ لینا پڑے گا۔یہ دونوں گروہ گمراہی کے دو راستوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جب کسی قوم میں وحی الٰہی سے انحراف پیدا ہوتا ہے تو عموماً اس کے دو بڑے بڑے اسباب ہوتے ہیں۔آغاز میں زیادہ تر انحراف نیک نیتی ہی کے راستے سے ہوتا ہے۔بد نیتی سے شروع شروع میں بہت کم لوگ انحراف کرتے ہیں۔ہوتا یہ ہے کہ نیک نیتی سے کوئی غلط راستہ اختیار کر لیا، یہ احساس کیے بغیر کہ یہ راستہ غلط ہے اور اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔پھر بعد میں آنے والے اس پر آگے بڑھتے چلے گئے، بڑھتے چلے گئے اور دلیل یہ دیتے رہے کہ شروع شروع میں جن لوگوں نے یہ راستہ اختیار کیا تھا وہ تو بڑے نیک لوگ تھے۔حالانکہ نیک آدمی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔غلطی سے صرف پیغمبر مبرا ہیں۔ان کے علاوہ ہر انسان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ہو سکتا ہے کہ شروع میں یہودیوں اور عیسائیوں کے نیک نیت لوگوں نے کسی غلطی کا ارتکاب کیا ہو۔لیکن بعد میں آگے چل کر وہ اتنی بڑی اور بھیانک غلطی بن گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو مغضوب علیھم اور دوسرے کو ضالین قرار دیا۔

یہودیوں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے قانون الٰہی کے ظاہری پہلو پر زور دیا اور اس کی روح کو نظر انداز کر دیا۔اس سے ان میں ایک خاص نوعیت کی گمراہی پیدا ہو گئی، ان کا کانٹا ہی بدل گیا۔جیسے ریلوے لائین کا کانٹا بدل جائے تو گاڑی کہیں کی کہیں نکل جاتی ہے۔اور جب ہزاروں میل کا سفر ہو تو بہت دیر میں احساس ہوتا ہے کہ راستہ بدل گیا ہے اور مسافر بھٹک گئے ہیں۔یہودی بھی اپنی غلطیوں کے نتیجہ میں ہزاروں سال دوسرے راستوں پر منزل کی تلاش میں سرگرداں رہے، اور یوں وہ شریعت الٰہی سے بہت دور نکل گئے۔اس کے برعکس عیسائیوں نے جو غلطی کی وہ یہ کہ انہوں نے قانون و شریعت کی روح پر بہت زیادہ زور دیا اور احکام و ظواہر کو چھوڑ دیا۔ان کا بھی کانٹا بدلا۔وہ ایک دوسرے رخ پر چل پڑے۔راہ راست سے یہ بھی بھٹک گئے اور وہ بھی بھٹک گئے۔

راہ راست، صراط مستقیم اور راہ اعتدال ہے۔ جس میں شریعت کی روح اور مظاہر وظواہر دونوں کی پابندی توازن کے ساتھ کی جاتی ہے۔

تفسیر بالسنتہ کی ایک دوسری مثال لیجیے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے قرآن مجید میں پڑھا، الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئك لھم الامن وھم مھتدون۔ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ان کا ایمان کسی معمولی سے بھی ظلم سے ملوث نہیں ہوا، وہی لوگ ہیں جو امان میں ہوں گے اور وہی لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔ صحابی کو یہ آیت پڑھ کر بہت خوف محسوس ہوا۔ انہوں نے سوچا کہ ہم میں سے کون ہے جس سے ظلم کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ کبھی کسی قسم کا ظلم سرزد ہو جاتا ہے اور کبھی کسی قسم کا۔ کسی کے ایمان پر ظلم کی پرچھائیں بھی کبھی نہ پڑی ہو! یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سوچ کر وہ صحابی بڑی پریشانی کے عالم میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی پریشانی کی وجہ بیان کی۔ حضورؐ نے سن کر فرمایا کہ ظلم سے مراد یہاں شرک ہے۔ جیسا کہ قرآنی آیت میں بتایا گیا ہے، ان الشرك لظلم عظیم۔ کوئی عام قسم کی زیادتی یا کوئی ادنیٰ درجہ کا ظلم مراد نہیں ہے۔

تفسیر قرآن کا بہت بڑا حصہ وہ ہے جو امت کے اجتماعی طرز عمل کے ذریعہ سے ہم تک پہنچا ہے' یہ اجتماعی طرز عمل ہر دلیل سے بڑھ کر اور ہر شک وشبہ سے ماوراء ہے۔ اس کو اسی طرح قطعیت حاصل ہے جس طرح قرآن مجید کو حاصل ہے۔ نمازیں پانچ ہیں۔ فجر کی دو رکعتیں، ظہر کی چار، عصر کی چار، مغرب کی تین اور عشاء کی چار۔ ان چیزوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض بیان فرمانے پر اکتفا نہیں فرمایا۔ یا صرف لکھوا دینے پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ آپؐ نے کم وبیش ڈیڑھ لاکھ صحابہ کو عملی تربیت دے دی کہ وہ اس طرح سے نمازیں پڑھنی شروع کر دیں۔ پھر ان ایک ڈیڑھ لاکھ صحابہ نے مزید لاکھوں تابعین کو تربیت دی۔ تابعین نے آگے چل کر دسیوں لاکھ، بلکہ شاید کروڑوں، تبع تابعین کو تربیت دے دی۔ اس طرح یہ سب چیزیں اجتماعی نقل اور اجتماعی عمل کے ذریعہ سے آگے منتقل ہو رہی ہیں۔

آپ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین ہیں۔ آپ اپنی ہی مثال اور تجربہ سے دیکھ لیں۔ آپ میں سے کسی نے بھی کبھی کوئی حدیث کی کتاب پڑھ کر نماز پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ کسی نے کبھی صحیح بخاری میں جا کر نہیں دیکھا تھا کہ روزہ کس طرح رکھنا ہے، کسی نے زکوۃ کی فرضیت کو جاننے کے

لیے جامع ترمذی یا سنن ابوداؤد نہیں کھنگالی۔ بلکہ ان تمام معاملات میں جس طرح شروع سے مسلمان کرتے چلے آرہے ہیں، اسی طرح ہر آنے والا بچہ اپنے بزرگوں کو دیکھ کر نماز پڑھ لیتا ہے' روزہ رکھ لیتا ہے اور تمام عبادات انجام دینے لگتا ہے۔ اسی طرح ہر نومسلم جب دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے، تو وہ مسلمانوں کو دیکھ دیکھ کر اپنی اسلامی زندگی کا آغاز کر دیتا ہے۔ اور یوں یہ چیز اس کی زندگی کا ایک ایسا حصہ بن جاتی ہے جس کو اس کی زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں، وہ ایک ہی طرح ان عبادات کو انجام دیتا ہے۔ البتہ اس عمل میں کبھی کسی سے غلطی ہو جائے، یا کسی جزو کے بارہ میں شبہ ہو جائے کہ وہ عین سنت کے مطابق ہے کہ نہیں، تو پھر اہل علم کتب حدیث اور ذخائر سنت سے چیک کر کے بتا دیتے ہیں کہ غلطی ہوئی ہے یا نہیں۔

بعض اوقات صحابہ کرامؓ کو اپنی سادہ لوحی کی بنا پر بعض احکام کو سمجھنے میں دقت بھی پیدا ہوتی تھی۔ جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی کہ اس وقت تک سحری کھا سکتے ہیں جب تک سفید دھاگہ کالے دھاگہ سے ممتاز نہ ہو جائے۔ تو ایک صحابی نے دو دھاگے لیے اور اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیے اور تھوڑی تھوڑی دیر میں دیکھتے رہے کہ سفید دھاگہ کالے دھاگہ سے الگ ہوتا ہے یا نہیں۔ بہت دیر ہو گئی اور سورج نکل آیا۔ لیکن ان کا سفید دھاگہ کالے دھاگے سے نہ الگ ہونا تھا، نہ ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے تو پتہ ہی نہیں چل سکا کہ میرا سفید دھاگہ کالے دھاگہ سے الگ ہوا یا نہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ تم نے کالا اور سفید دھاگہ کہاں دیکھا تھا؟ عرض کیا کہ میں نے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا' وہیں دیکھتا رہا۔ آپؐ مسکرائے اور فرمایا کہ تمہارا تکیہ تو بڑا وسیع و عریض ہے۔ پورے افق پر پھیلا ہوا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اس سے مراد سورج کی وہ پو ہے جو پھٹتی ہے۔ دھاگہ سے مراد نور کی وہ ڈوری ہے جو افق پر پھیل جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ پہلے ایک سیاہی پھیلتی ہے۔ اور اس کے بعد ایک سفید دھاگہ سا پھیلتا ہے جو اس امر کا اشارہ ہوتا ہے کہ فجر طلوع ہو گئی۔ ان دھاگوں سے یہی مراد ہے۔ اب ان کی سمجھ میں آیا۔

ایک اور مثال: قرآن مجید میں آیا ہے، والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما۔ چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہاں ایدی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو جمع ہے۔ بعض صحابہ کو خیال ہوا کہ شاید دونوں ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ

اس سے دایاں ہاتھ مراد ہے اور صرف دایاں ہاتھ ہی کاٹنے کا حکم ہے۔

تفسیر کا تیسرا ماخذ جو صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں خاص طور پر پیش نظر رہا وہ کلام عرب تھا۔ کلام عرب سے مراد عرب جاہلیت کا وہ ادبی ذخیرہ ہے۔ جو اسلام سے قبل اور صدر اسلام میں عام دستیاب اور موجود تھا۔ قرآن مجید قریش کی معیاری اور ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اور فصاحت اور بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارے میں ارشاد فرمایا کہ میں افصح العرب ہوں۔ اور واقعی حضورؐ سے زیادہ فصاحت اور بلاغت کسی اور انسانی کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اس لیے قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس کی فصاحت اور بلاغت کے نکتوں کو سمجھنے کے لیے بالخصوص، اور بعض اوقات اس کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے کے لیے بالعموم کلام عرب کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس زمانہ کی عربی شاعری، خطبات، رسم و رواج اور طور طریقوں سے اگر واقفیت نہ ہو تو قرآن مجید کی بہت سی آیات کو سمجھنے میں مشکل پیش آ سکتی ہے۔ اس سے ہٹ کر اگر کوئی اور طریقہ قرآن مجید کے اسالیب کو سمجھنے کا اختیار کیا جائے گا تو اس میں غلط فہمی اور غلط راستے پر چل پڑنے کے بہت سے امکانات باقی رہیں گے۔

کلام عرب سے استفادہ کی بے شمار مثالیں صحابہ کرامؓ کے تفسیری ذخیرے میں ملتی ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے اپنے زمانہ کے عربی ادب اور شاعری سے قرآن فہمی میں پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ جن کا نام مفسرین قرآن میں بڑا نمایاں ہے خود جاہلی ادب کا بڑا گہرا ذوق رکھتے تھے۔ عربی زبان اور ادب پر ان کی گرفت غیر معمولی تھی۔ سیدنا علیؓ اپنے زمانہ کے بڑے خطیبوں میں سے ایک تھے۔ بلکہ ان کا شمار تاریخ خطابت کے بڑے بڑے خطباء میں کیا جانا چاہیے۔ زبان پر ان کی قدرت ضرب المثل تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ جو دور صحابہ ہی میں ترجمان القران کہلائے جانے لگے تھے۔ ان کو بھی کلام عرب سے اتنی ہی گہری واقفیت حاصل تھی۔ آج اس نوعیت کا خاصا بڑا تفسیری سرمایہ ان کی روایات سے ہم تک پہنچا ہے۔

بعض مفسرین اور مورخین نے ایک خارجی لیڈر سے حضرت عبداللہ بن عباس کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ خوارج کا ایک سردار نافع بن الازرق ایک مرتبہ حج کے لیے آیا تو دیکھا کہ مسجد الحرام کے صحن میں ایک مجمع ہے جہاں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ کچھ بولنے کی آواز آ رہی ہے۔ اس نے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ تشریف لائے ہوئے

ہیں۔اورلوگ ان سے مسائل پوچھ رہے ہیں۔نافع بن الازرق کے ہمراہ دوآدمی اور تھے۔انہوں نے کہا کہ چلو ہم بھی چل کر کچھ سوالات پوچھتے ہیں۔غالبًا انہوں نے سوچا ہوگا کہ اس طرح کے سوالات پوچھنے چاہئیں جن کے جواب حضرت عبداللہ بن عباس نہ دے سکیں۔نافع اور اس کے یہ دونوں ہمراہی بدوی تھے،عربی زبان کی نزاکتوں سے خوب واقف تھے،ساری عمر بادیہ پیمائی میں گذاری تھی۔زبان دانی ان کا فن تھا۔ان کا خیال تھا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ساری عمر شہری زندگی کاٹی ہے۔مکہ مکرمہ،مدینہ منورہ اور طائف جیسے شہروں میں رہے ہیں۔بدوی زبان کے تقاضوں اوراس کی نزاکتوں سے واقف نہیں ہوں گے۔چنانچہ انہوں نے قرآن مجید کے بعض ایسے الفاظ کے معنی حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھے جن کے بارہ میں ان کا خیال یہ تھا کہ شاید ان کے علم میں نہیں ہوں گے۔اوراگر علم میں ہوئے بھی تو ان کی جو سند ہے لغت اور ادب کی وہ ان کے سامنے مستحضر نہیں ہوگی۔

چنانچہ ان لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے عرض کیا:ہم آپ سے قرآن مجید میں سے بعض امور کے بارہ میں پوچھنا چاہتے ہیں۔آپ ان چیزوں کی تفسیر بیان فرمائیں اور کلام عرب سے اپنی تفسیر کی تائید بھی بیان فرمائیں،اس لیے کہ قرآن مجید عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا۔ضرور پوچھو۔اس پر نافع بولا:

قرآن مجید کی آیت:عن الیمین و عن الشمال عزین میں عزین سے کیا مراد ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس:عزین سے مراد چھوٹے چھوٹے حلقے ہیں۔

نافع:کیا یہ معنی عربوں کے ہاں معروف تھے؟۔

حضرت عبداللہ بن عباس۔بالکل!کیا تم نے عبید بن الابرص کا یہ شعر نہیں سنا۔

فجاء وا یھر عون الیه حتی

یکونوا حول منبرہ عزینا

نافع:قرآن مجید کی آیت۔وابتغوا الیه الوسیلة میں وسیلہ سے کیا مراد ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس۔یہاں وسیلہ سے حاجت مراد ہے۔

نافع۔کیا یہ معنی عربوں کے ہاں معروف تھے؟

حضرت عبداللہ بن عباس:بالکل!کیا تم نے عنترہ کا یہ شعر نہیں سنا؟

ان الرجال لهم اليك وسيلة

ان ياخذوك تكحلی و تخضبی

اس طرح نافع نے کم وبیش دوسو سے زائد سوالات کیے۔ ان میں سے ایک سونوے ۱۹۰ سوالات علامہ جلال الدین سیوطی نے مع جوابات وشواہد نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ پندرہ کے قریب سوالات جو بہت عام اور پیش پا افتادہ تھے وہ میں نے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ سوالات اور جوابات بہت سے ائمہ لغت نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیے ہیں مشہور امام لغت ابوبکر بن الانباری نے اپنی سند کے ساتھ ان میں سے بہت سے سوالات اور جوابات روایت کیے ہیں۔ دوسرے متعدد مفسرین ومحدثین نے بھی الگ الگ سندوں سے ان سوالات اور جوابات کو نقل کیا ہے۔ مفسرین میں سے علامہ ابن جریر طبری کے ہاں اور محدثین میں سے امام طبرانی کے ہاں ان سوالات کی خاصی تعداد ملتی ہے۔ دیگر بڑے محدثین نے بھی ان میں سے بہت سے سوالات اور جوابات نقل کیے ہیں۔

جو لوگ وہاں موجود تھے انہوں نے یہ گفتگو سنی اور قلمبند کرلی۔ اس طرح یہ تاریخ میں محفوظ ہوگئی۔ پھر بہت سے محدثین، مفسرین اور علمائے لغت نے ان معلومات کو اپنے اپنے انداز میں اپنی تصانیف میں سمودیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کس طرح قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے جاہلی ادب سے مدد لیا کرتے تھے۔

ان مشکل الفاظ وعبارات کے علاوہ بھی بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا صحیح مفہوم اور پس منظر محض لغت کی مدد سے معلوم نہیں کیا جاسکتا۔ ان امور کی صحیح فہم کے لیے عربی شاعری، عربی خطابت، بلکہ بہ حیثیت مجموعی جاہلی ادب کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ جاہلی ادب کو سمجھے بغیر قرآن مجید کی متعلقہ آیت کو سمجھنا بہت مشکل بلکہ بعض صورتوں میں ناممکن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مہینوں کے نام بارہ ہیں، ان عدة الشهور عندالله اثنا عشر شهراً۔ پھر آتا ہے کہ ان میں سے چار مہینے حرام ہیں۔ اسی سلسلہ بیان میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ انما النسی زیادة فی الکفر۔ یعنی نسی کفر میں زیادتی کی ایک قسم ہے۔ اب نسی کیا ہے؟۔ اسے کفر میں زیادتی کس بناء پر کہا گیا ہے۔ یہ معلوم کیے بغیر اس پوری آیت کا صحیح مفہوم سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

یہ جاننا کہ نسی کیا ہوتی تھی اور یہ کیوں ایک کفریہ عمل تھی ہمارے لیے یوں بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی ایسا عمل جو نسی سے ملتا جلتا ہو آج کل بھی ہو رہا ہو تو ہمیں لازماً اس سے بچنا چاہیے۔ لہٰذا یہ جاننا بھی ضروری ہوگا کہ کیا آج نسی سے ملتی جلتی ہوئی چیز پائی جاتی ہے۔ اگر نہیں پائی جاتی تو ہم مطمئن ہو جائیں۔ اور اگر پائی جاتی ہے تو ہم اس سے بچنے کی کوشش کریں۔ اب اس آیت کا مطلب سمجھنے کے لیے زمانہ جاہلیت کی توقیت اور ماہ وسال کی تقسیم کے پورے نظام کو سمجھنا پڑے گا۔ یوں جاہلی ادب کا وہ حصہ لازماً تفسیری ادب کا حصہ بن جائے گا۔ اور اس کی مدد سے قرآن مجید کی اس آیت کو سمجھا جائے گا۔

آپ کو معلوم ہے کہ عرب میں اسلام سے پہلے بڑی بدنظمی اور بدامنی پائی جاتی تھی۔ اور اسے بہت قابل فخر سرگرمی سمجھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے شعراء اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ ایک شاعر فخریہ بیان کرتا ہے کہ:۔

وایمت نسوانا وایتمت الدة

وعدت کما ابدات واللیل الیل

میں رات کی تاریکی میں نکلتا ہوں۔ کتنی ہی عورتوں کو بیوہ کر دیتا ہوں۔ کتنے ہی بچوں کو یتیم کر دیتا ہوں۔ اور رات کی تاریکی ختم نہیں ہونے پاتی کہ واپس گھر آ جاتا ہوں۔ ایک اور شاعر کہتا ہے کہ میں ڈاکے ڈالتا ہوں اور اگر کوئی اور نہ ملے تو اپنے ہی بھائی بکر کے قبیلے پر ہی حملہ کرتا ہوں۔

واحیانا علی بکر أخینا

اذا مالم نجد الا أخانا

اندازہ کریں کہ اس صورتحال میں لوگوں کے لیے حج اور عمرہ کے لیے آنا جانا کتنا دشوار ہوتا ہوگا۔ لیکن قبیلہ قریش بڑی حد تک اس بدنظمی اور بدامنی سے محفوظ و مامون اور مستثنیٰ تھا۔ اس کے بارے میں تمام قبائل میں آپس میں یہ اتفاق تھا کہ قبیلہ قریش کو نہیں چھیڑیں گے۔ اس لیے کہ وہ کعبہ کے متولی ہیں۔ قریش کے علاوہ کوئی قبیلہ محفوظ نہیں تھا۔ ہر قبیلہ کے لوگوں اور خاص طور پر تجارتی قافلوں کو اس کا انتظام کرنا پڑتا تھا کہ جب سفر پر جائیں تو اپنی حفاظت کا بندوبست کریں۔ خاص طور پر جو لوگ تجارت پیشہ بھی تھے اور خانہ بدوش بھی۔ ان کو اپنی حفاظت کا غیر معمولی اہتمام کرنے کی زیادہ ضرورت پڑتی تھی۔

حج اور عمرہ کی سہولت کے لیے انہوں نے آپس میں اتفاق رائے سے یہ طے کر رکھا تھا کہ چار ماہ ایسے ہوں گے کہ جن میں کوئی جنگ نہیں ہوگی اور کسی پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ دو ماہ حج کے سفر کے لیے اور دو ماہ عمرے کے لیے۔ گویا سال میں چھ چھ ماہ کے بعد ایک پر امن مہینہ عمرہ کے لیے آئے گا۔ یعنی رجب اور محرم۔ ایک مرتبہ لوگ سکون سے محرم میں جا کر عمرہ کر لیں اور ایک مرتبہ رجب میں کر لیں۔ ان دونوں مہینوں کے علاوہ ذوالقعد اور ذوالحجہ دو مہینے حج کے سفر کے لیے تھے۔ انہوں نے طے کیا ہوا تھا کہ اس مدت میں کسی کو نہیں چھیڑیں گے، نہ کسی قافلے کو تنگ کریں گے اور نہ حج و عمرہ کے لیے آنے والے مسافروں اور زائرین کو روکیں گے۔

اس سے یہ بھی سمجھ لیں کہ ان چار مہینوں میں امن پر اتفاق کرنے کے معنی عملاً یہ تھے کہ بقیہ آٹھ ماہ میں ایک دوسرے کے خلاف خوب لڑیں گے۔ قتل و غارت بھی خوب کریں گے اور جہاں کسی کو پائیں گے گردن مار دیا کریں گے۔ صرف مذکورہ چار مہینوں میں اس سے اجتناب کریں گے۔ گویا یہ سیاق اور سباق تھا اس آیت مبارکہ کا کہ چار مہینے محترم ہیں جن کا احترام زمانہ جاہلیت میں بھی کیا جاتا تھا۔ چونکہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ ہر وہ اچھی بات جس پر غیر اسلامی تہذیبوں میں عمل کیا جاتا ہو اس پر اسلام میں زیادہ قوت اور اہتمام سے عمل کیا جائے گا۔ اس لیے ان چار مہینوں کے احترام کا قرآن پاک میں خصوصی طور پر ذکر کیا گیا۔

اس کے بعد جب کہا گیا انما النسی زیادہ فی الکفر کہ نسی کفر میں زیادتی ہے تو اس کے مفہوم کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پورے عرب کا کنٹرول چند بااثر قبائل کے ہاتھ میں تھا۔ ان میں سب سے زیادہ بااثر قبائل طائف کے رہنے والے، ثقیف اور ہوازن کے قبیلے اور مکہ کا قبیلہ قریش تھا۔ جب یہ بااثر قبائل دیکھا کرتے کہ کوئی طاقت ور قبیلہ کسی خاص جگہ مقیم ہے، یا کوئی تجارتی قافلہ گذرنے والا ہے، رحلة الشتاء و الصیف میں اس طرف اشارہ ہے، ایک قافلہ شام سے اور ایک یمن سے آیا کرتا تھا، اگر یہ پتا چلتا کہ اس قافلے میں لاکھوں روپے کا سامان ہے، تو عرب کے پیشہ ور چوروں اور ڈاکوؤں کی نیت خراب ہو جاتی اور رال ٹپکنے لگتی۔ لیکن مشکل یہ پیش آتی تھی کہ اب قافلہ کو لوٹنے کا ارادہ ہے، لیکن جب تک وہ یہاں پہنچے گا اس وقت تک مثلاً رجب کا مہینہ شروع ہو جائے گا جو عمرہ کی وجہ سے محترم ہے، یا ذوالقعدہ کا مہینہ کا شروع ہو جائے گا جو حج کی وجہ سے محترم ہے۔ اب یہ فکر ہے کہ ان محترم مہینوں میں قافلہ کیسے

لوٹیں۔اس کو لوٹے بغیر جانے بھی نہیں دینا چاہتے۔لوٹنا بھی ضروری ہے، اور اشھر حرام کا احترام بھی کرنا چاہتے ہیں۔تو وہ ایسا کیا کرتے تھے کہ اعلان کر دیا کرتے تھے کہ ہم نے اس مہینہ مثلاً جمادی الثانی میں ۱۰ دن کا اضافہ کر دیا ہے۔اس مرتبہ جمادی الثانی ۴۰ دن کا ہوگا۔تا کہ اس اضافہ شدہ مدت میں رجب کے پہلے دس دن کو جمادی الثانی کے آخری اضافہ شدہ دس دن قرار دے کر ان دنوں میں ان کے لوگ قافلہ کو لوٹ سکیں۔اب جب جمادی الثانی ۴۰ دن کا ہوگا تو یا تو رجب بیس دن کا رہ جائے گا، یا وہ بھی ۴۰ دن کا ہو جائے گا۔پھر جب رجب ۴۰ دن کا ہوگا۔تو شعبان بھی ۴۰ دن کا ہو جائے گا۔تو گویا اشھر حرام کے باوجود قافلے پر حملہ کرنے کے لیے ہمیں ۱۰ دن مل جائیں گے۔لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا تھا کہ جب ایک مرتبہ مہینوں کا یہ نظام تلپٹ کر دیا جائے تو پھر آگے چل کر حج کا نظام بھی تلپٹ ہو جائے گا۔پھر ہو سکتا ہے کہ اس الٹ پلٹ کے نتیجہ میں حج آئندہ اس ماہ میں ہو ہی نہ سکے جس میں ہونا چاہیے تھا۔

جاہلیت کی حد تک تو یہ بات اسی طرح چلتی رہی۔مگر اسلام کے آنے کے بعد اس چیز کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ حج اور عمرہ بلکہ رمضان کے مہینوں کے بارہ میں اس تلاعب کو جاری رکھا جائے۔مسلمانوں کا حج اور مسلمانوں کے روزے ہر چیز کا تعلق چاند کے مہینے سے ہے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے اور اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب مشیت اور حکمت ہے کہ عین حجۃ الوداع کے موقعہ پر یہ پوری خرابی خود بخود طبعی اور قدرتی طور پر درست ہو گئی۔خطبہ حجۃ الوداع میں ایک جملہ ایسا آیا ہے جس کی معنویت کو سمجھنے میں عام طور پر لوگوں کو دشواری محسوس ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ آپؐ نے فرمایا کہ آج زمانہ اسی ہیئت اور بنیاد پر واپس آ گیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عجیب اتفاق بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ایک عجیب اور منفرد انعام تھا کہ نسی وغیرہ نکالنے کے بعد اس دن جو ۹ ذوالحجہ پڑی وہ اصلی ۹ ذوالحجہ بھی تھی۔یعنی اس میں کسی نسی یا کسی اور کمی بیشی کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔جو فرق ماضی میں پڑتا رہا تھا وہ آج خود بخود ختم ہو گیا تھا۔یہی مراد ہے حضور علیہ السلام کے اس ارشاد گرامی سے کہ آج زمانہ اسی نقشے پر آ گیا ہے جس نقشہ پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا تھا۔اس کے بعد نسی کی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ممانعت ہو گئی۔اس لیے کہ چاند کا جو حساب اللہ تعالیٰ نے رکھا ہوا ہے (وقدرنہ منازل) نسی کا تصور اس نظام میں مداخلت کرنے کے مترادف ہے۔اب اس آیت مبارکہ کا مفہوم

اور معنویت سمجھنے کے لیے کہ نسی کی رسم، جاہلیت میں مہینوں کا نظام اور نسی کے معاشی اور معاشرتی پس منظر کے بارے میں جاننے کے لیے جاہلی ادب سے گہری واقفیت ضروری ہے۔

سورۃ قریش میں سردی اور گرمی کے دو تجارتی سفروں کا ذکر آتا ہے۔ ان سفروں کی اہمیت اور ان کے آغاز کی ایک الگ تاریخ ہے جس کی اگر تفصیل بیان کروں گا تو وقت ناکافی ثابت ہوگا اور گفتگو طویل ہو جائے گی۔ البتہ ان سفروں کے بارے میں اتنا سمجھ لیں کہ قریش جو مکہ کے سردار تھے پورے عرب میں ان کی سرداری مانی جاتی تھی۔ قبیلہ قریش کی سرداری مختلف اوقات میں مختلف شخصیتوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اپنے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا جناب ہاشم بن عبد مناف مکہ کے سردار تھے۔ اور اس شان کے سردار تھے کہ جتنے نادار اور ضرورت مند حجاج حج کے لیے آتے ان سب کی ضیافت انہوں نے ذاتی طور پر اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ وہ اپنے ذاتی پیسے سے ان سب کی ضیافت کیا کرتے تھے۔ کسی نادار حاجی کو اس بات کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ وہ مکہ مکرمہ میں اپنے کھانے پینے کا خود بندوبست کرے۔ جناب ہاشم کی جیب سے اس کے کھانے پینے کا بندوبست ہوا کرتا تھا۔ اسی لیے ان کا نام بھی ہاشم پڑ گیا تھا۔ ہاشم کے معنی ہیں روٹی توڑ کر ثرید بنانے والا۔ ان کی طرف سے ثرید کے بڑے بڑے دسترخوان بچھ جاتے تھے۔ اسی لیے عرب کے بدویوں میں ان کا نام ہاشم پڑ گیا تھا۔

جناب ہاشم کا اصل اسم گرامی ہاشم نہیں عمرو تھا۔ انہوں نے اپنے اثر ورسوخ اور غیر معمولی شخصیت سے کام لے کر قیصر روم کے دربار میں واقفیت حاصل کرلی تھی۔ اور قیصر روم کے دربار سے اس بات کی اجازت لے لی تھی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ گرمیوں کے موسم میں وہاں جایا کرے گا۔ اور اس کو تمام تجارتی سہولتیں اور مراعات حاصل ہوں گی۔ اسی طرح کا ایک تجارتی قافلہ سردی کے موسم میں یمن جایا کرتا تھا۔ وہاں سردی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ یہ بات جناب ہاشم نے منوالی تھی کہ ان کی انتظامی نگرانی میں ایک قافلہ یمن آیا کرے گا۔ اور ایک شام جایا کرے گا۔ ان قافلوں کو وہ تمام سہولیات رومن امپائر اور حکومت حبشہ کی طرف سے حاصل تھیں جو کسی بین الاقوامی تجارتی قافلے کو حاصل ہوتی ہیں۔ اور چونکہ یہ اجازت نامہ جناب ہاشم کی وجہ سے صرف قریش کے تاجروں کو حاصل تھا اس لیے بقیہ بہت سے قبائل بھی اپنا پیسہ قریش کو دے دیا کرتے تھے کہ آپ ہماری طرف سے بھی تجارت کریں اور جب تجارت کر کے واپس آئیں تو ہمارا نفع اور

اصل زر ہمیں واپس کردیں اور نفع میں اپنا حصہ رکھ لیں۔ اس طرح سے مضاربہ کا عمل شروع ہوا۔ اسلام میں تجارت اور کاروبار کی سب سے مقبول صورت مضاربہ ہے۔ اس کے بانی بھی ایک اعتبار سے جناب ہاشم بن عبد مناف ہیں۔

اب یہ بات قرآن مجید میں تو تھوڑی سی آئی ہے رحلة الشتاء والصیف۔ لیکن اس سے مراد کیا ہے؟ یہ جاننے کے لیے جاہلیت کے ادب کو کھنگالنا پڑے گا جس سے اس حوالہ کی اہمیت اور معنویت کا اندازہ ہو سکے گا۔ آیت مبارکہ کے ان تین الفاظ میں جو مفہوم پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ جس ذات نے تمہیں یہ حیثیت دی ہے اور بین الاقوامی سطح پر تمہیں یہ مقام دیا ہے کہ مشرق اور مغرب میں، شمال اور جنوب میں تمہارے تجارتی قافلے بلا روک ٹوک آ جا رہے ہیں، سردیوں میں ایک طرف جاتے ہو اور گرمیوں میں دوسری طرف جاتے ہو، جس پروردگار کے نام پر تم نے یہ آزادیاں اور یہ مراعات حاصل کی ہیں اس پروردگار کا یہ بھی حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے فلیعبدوا رب ھذا البیت۔

صحابہ کرام کے تفسیری ادب میں جاہلی ادب سے استفادہ کے اتنے نمونے ملتے ہیں کہ اگر ان کا استقصاء کیا جائے تو بڑی بڑی ضخیم کتابیں اس سے تیار ہو سکتی ہیں۔ تین چار مثالیں آپ کے سامنے مزید پیش کر دیتا ہوں۔ لیکن سب سے پہلے اس کی اہمیت کے بارے میں امام مالکؒ جیسے محدث اور فقیہ کا قول نقل کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر میرے پاس کوئی ایسا آدمی لایا گیا جو عربی زبان کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتا اور اس کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر کرتا ہے تو میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ دنیا کے لیے نمونہ اور لوگوں کے لیے عبرت بن جائے۔ گویا امام مالکؒ کے نزدیک تفسیر اور قرآن فہمی میں عربی ادب اور جاہلیت کے حالات سے واقفیت کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ وہ اس کو نظر انداز کرنے کو نہ صرف بُرا سمجھتے ہیں بلکہ وہ ایسی حرکت کرنے والے کو گویا ایک فوجداری جرم کا مرتکب سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید حجاز کی مستند زبان میں ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے اپنی بات صحیح طرح پہنچانے کے لیے حجاز کے علاوہ بھی بعض قبائل کی لغتیں استعمال کی ہیں۔ جیسا کہ میں نے وفاکھة وابا میں لفظ ابًا کی مثال دی تھی۔ اسی طرح کی ایک اور مثال ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات طلبہ قرآن، خاص طور پر مترجمین قرآن کو مشکل پیش آتی

ہے۔۔سورۃ منافقون میں ایک جگہ آیا ہے۔ واذا رائیتھم تعجبك اجسامھم وان یقولوا تسمع لقولھم کانھم خشب مسندۃ، کہ جب آپ منافقین کو دیکھیں تو ان کے پلے پلائے جسم خوشنما معلوم ہوتے ہیں، لیکن جب وہ کوئی بات کہیں اور آپ سنیں تو وہ ایسے لگتے ہیں جیسے ٹیک لگائی ہوئی لکڑیاں۔ مسندہ کا ترجمہ بعض مترجمین نے ٹیک لگائی ہوئی کیا ہے۔ اب ٹیک لگائی ہوئی لکڑی سے مثال کی نوعیت سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن اگر کلام عرب کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بعض قبائل کی زبان میں سند کے معنی ہوتے تھے اصل لباس کے اوپر کوئی اچھا لباس اختیار کرلینا۔ جیسے شلوار قمیص کے اوپر شیروانی پہن لی، یا شرٹ اور پتلون کے اوپر جیکٹ پہن لی۔ یعنی اوپر کا ظاہری لباس جو خوبصورت ہو وہ اختیار کرلینا۔ اس کو سند کہتے تھے۔ اب اس کے معنی یہ ہیں کہ کہ گویا وہ لکڑی کے بنائے ہوئے ایسے خوشنما بت ہیں جن کو اچھے اچھے لباس پہنا کر بٹھا لیا گیا ہے۔ اگر لکڑی کے اچھے بت بنا کر اور انہیں اچھا لباس پہنا کر بٹھا دیا جائے تو دور سے دیکھنے میں بہت خوشنما محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن نہ وہ بات کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ عمل کر سکتے ہیں۔ اگر خشب مسندہ کا یہ مفہوم سامنے ہو تو بات کی پوری معنویت سمجھ میں آجاتی ہے۔

بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ قرآن مجید ہی میں ایک لفظ دو مختلف معانی میں استعمال ہوا ہوتا ہے، اور سیاق وسباق سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہاں کون سا مفہوم مراد ہے۔ لیکن یہ تعین بھی عربی زبان میں بصیرت اور زبان کے محاورہ سے گہری واقفیت کے بغیر مشکل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ آیا ہے خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم، کہ آپ ان کے مال میں سے صدقہ لیں تاکہ ان کو پاکیزہ بنائیں۔ ایک دوسری جگہ آیا ہے: انما الصدقات للفقراء والمساکین .....بعض جگہ صدقہ کا ذکر عام انداز میں ہے کہ تم جو صدقہ ادا کرتے ہو، وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں بڑھتا رہتا ہے۔ بعض جگہ صدقہ سے مراد صدقہ نافلہ ہے، اور بعض جگہ صدقہ سے مراد صدقہ واجبہ ہے۔ اب کہاں صدقہ واجبہ ہے جس سے مراد زکوۃ ہے اور کہاں صدقہ نافلہ مراد ہے۔ جس سے مراد زکوۃ کے علاوہ عام خیرات وصدقات ہے۔ یہ سیاق اور سباق ہی سے اندازہ ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ الشعر دیوان العرب۔ عربی شاعری عربوں کا انسائیکلوپیڈیا ہے، دیوان سے مراد وہ بڑا رجسٹر ہوتا ہے جس میں کسی چیز کے بارہ میں ساری معلومات لکھی ہوں۔ عربی شاعری گویا عربوں کی تاریخ کا دیوان ہے جس سے ہر چیز کا

اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس لفظ سے کیا مراد ہے۔

اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے کلام عرب سے کس طرح مدد لی۔ بعد کے تمام مفسرین قرآن صحابہ کرام کے اس تفسیری ذخیرہ کے علاوہ علمائے ادب کے فراہم کردہ مواد سے استفادہ کرتے چلے آئے ہیں۔ ہمارے ہاں اردو میں جتنی تفاسیر ملتی ہیں ان میں سب سے زیادہ مولانا امین احسن اصلاحی نے جاہلی ادب سے استفادہ کیا ہے۔

آخری چیز جو صحابہ کرامؓ تفسیر قرآن کے کام میں پیش نظر رکھتے تھے وہ ان کی اپنی فہم و بصیرت اور اجتہاد تھا جس سے کام لے کر وہ ایسے ایسے نکتے قرآن مجید کی آیات سے حاصل کر لیا کرتے تھے کہ جن کی طرف عام لوگوں کی نظر نہیں جاتی تھی۔ چنانچہ جب سورۃ النصر نازل ہوئی جس میں نصرت خداوندی کی تکمیل اور لوگوں کے جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے کا تذکرہ ہے تو صحابہ کرامؓ بہت خوش ہوئے، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ یہ سورت سن کر رو پڑے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ رو کیوں پڑے؟ یہ تو خوشی کا موقع ہے! آپ نے فرمایا کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی پیش گوئی معلوم ہوتی ہے۔ اب ظاہری الفاظ کے ذریعے سے تو سورہ نصر سے ایسا کوئی مفہوم نہیں نکلتا کہ جس سے سرکار رسالت مآبؐ کے انتقال کا اشارہ ملتا ہو۔ یہاں تو صرف یہ کہا جا رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی مدد آ گئی، فتح بھی مکمل ہو گئی اور آپؐ نے لوگوں کو دیکھ لیا کہ دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو اب حمد اور استغفار کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات توبہ قبول کرنے والی اور بندوں کی طرف رحمت و شفقت سے رجوع کرنے والی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے محسوس فرمایا کہ یہاں رجوع اور انابت کا تذکرہ ہے۔ جب تمام فتوحات مکمل ہو گئیں اور لوگ اسلام میں داخل ہو گئے تو آپ کا کام بھی پایہ تکمیل تک پہنچ گیا اور جب کام ختم ہو گیا تو اب صرف تشریف لے جانا باقی رہ گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نگاہ وہاں تک پہنچی جہاں تک عام صحابہ کی نظر نہیں پہنچی تھی۔ یہ آپ کے فہم و بصیرت کی دلیل ہے۔

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا، اس وقت سیدنا عمر فاروقؓ کی یہی کیفیت ہوئی۔ وہ رو پڑے اور کہا کہ یہ تو حضورؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس واقعہ کے ٹھیک ۸۱ دن بعد واقعی حضورؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ فہم وبصیرت کا وہ بلند مقام رکھتے تھے کہ ان کی توقع ،اندازہ اور پیش بندی کے مطابق قرآن مجید میں کم وبیش سترہ مقامات پر آیات نازل ہوئیں۔ گویا یہ سترہ آیات وہ ہیں کہ جہاں انہوں نے اندازہ کیا کہ اس معاملہ میں اسلام کی روح اور مزاج کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں اس طرح کا حکم ہونا چاہیے، وہاں اسی طرح کا حکم بالآخر نازل ہوگیا۔ گویا شریعت کی مزاج شناسی اور قرآن کی روح میں بالکل ڈوب جانے کے بعد یہ کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔ بالفاظ دیگر سیدنا حضرت عمر فاروقؓ قرآن مجید کے رنگ میں اس طرح رنگ گئے تھے کہ ان کی زبان سے جو نکلا وہ بالآخر وحی الٰہی میں شامل ہوگیا۔

تفسیر قرآن کے مصادر کے بارہ میں ایک چھوٹی سی بات رہ گئی ہے۔ وہ یہ کہ صحابہ کرامؓ میں سے بہت کم اور تابعین میں سے نسبتاً زیادہ' بعض افراد نے قرآن مجید کے بعض مقامات کو سمجھنے میں یہود ونصاریٰ کے مذہبی ادب سے بھی کام لیا ہے۔ یہ وہ روایات ہیں جن کو اسرائیلیات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان روایات میں تین طرح کی چیزیں شامل ہیں۔ کچھ چیزیں تو وہ ہیں جن کی تائید قرآن مجید اور مستند احادیث سے ہوتی ہے، یعنی جو بات قرآن مجید اور احادیث میں بیان ہوئی ہے وہی بات اسرائیلیات میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اس طرح کی روایات بلا اختلاف قابل قبول ہیں۔ ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں جس میں تورات یا انجیل کے کسی بیان سے قرآن مجید کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی نہ قرآن مجید تصدیق کرتا ہے اور نہ تکذیب کرتا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تورات وانجیل سے منسوب وہ روایات صحیح ہیں یا غلط۔ نہ قرآن مجید سے وہ روایت ٹکراتی ہے اور نہ ہی قرآن مجید کے موافق ہے۔ اس طرح کی چیزوں کے بارہ میں حضورؐ نے فرمایا، لاتصدقوھم ولا تکذبوھم۔ نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ ان کی تردید کرو۔ اگر بیان کرنا چاہو تو بیان کردو۔ لیکن کسی بیان کی تصدیق اور تردید کیے بغیر۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں اصحاب کہف کا ذکر ہے، لیکن ان کی تعداد کے بارہ میں کوئی متعین بات نہیں بتائی گئی۔ عہد نامہ قدیم کی بعض مذہبی کتابوں میں ان کی تعداد سات بیان ہوئی ہے۔ گویا قرآن مجید میں سات کا جو عدد اصحاب کہف کے بارہ میں آیا ہے اس کی تھوڑی سی تائید بائبل کے اس بیان سے ہوجاتی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ان کے نام بھی بعض قدیم کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ واقعی ان کے یہ نام تھے یا نہیں تھے۔ ہم نہ ان ناموں

کی تصدیق کر سکتے ہیں۔اس لیے کہ ہمارے پاس تصدیق کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور نہ اس امر کی تردید کر سکتے ہیں کہ ان کے یہ نام نہیں تھے۔اس لیے کہ تردید کرنے بھی کی کوئی بنیاد ہمارے پاس نہیں ہے۔ چنانچہ کوئی مفسر قرآن قطعیت کے ساتھ اس بات کو بیان نہیں کر سکتا کہ اصحاب کہف کے نام کیا تھے۔

اسرائیلیات کی تیسری قسم وہ ہے جس کے بیانات قرآن مجید یا احادیث صحیحہ سے متعارض ہیں۔ بائبل میں جس حصہ کو آپ تورات کہتے ہیں، وہ ان کی نظر میں سب سے مستند ہے۔ یہ بات شاید آپ کے علم میں ہو کہ بائبل یا کتاب مقدس کے دو حصے ہیں۔ ایک عہد نامہ قدیم کہلاتا ہے۔ دوسرا حصہ عہد نامہ جدید کہلاتا ہے۔ عہد نامہ قدیم میں انتالیس کتابیں ہیں اور عہد نامہ جدید میں ستائیس کے لگ بھگ کتابیں شامل ہیں۔ عہد نامہ قدیم وہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے یہودیوں میں مروج تھا۔اور عہد نامہ جدید میں وہ تحریریں شامل ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کے بعد مروج ہوئیں۔ ان دونوں کے مجموعے کو بائبل یا کتاب مقدس کہتے ہیں، اس پورے مجموعہ کو مذہبی کتاب کے طور پر کو عیسائی مانتے ہیں۔ یہودی صرف عہد نامہ قدیم کو مانتے ہیں۔ عہد نامہ قدیم کی ۳۹ کتابوں میں جو پہلی پانچ کتابیں ہیں وہ خامس خمس کہلاتی ہیں۔ ان ابتدائی پانچ کتابوں کے بارے میں یہودیوں کا بیان ہے کہ یہ وہ تورات ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ گویا عہد نامہ قدیم میں جو پہلی پانچ کتابیں ہیں وہ تورات کہلاتی ہیں۔اسی تورات میں جو ان کی نظر میں سب سے مستند سمجھی جاتی ہے انبیاء علیہم السلام پر ایسے غلیظ اور بیہودہ الزامات لگائے گئے ہیں جو کسی بھی شریف انسان کے نزدیک ناقابل تصور ہیں۔ اس میں جا بجا اس قدر فضول اور مہمل باتیں کی گئی ہیں جن کو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ بالکل فضول اور بے بنیاد خرافات ہیں۔

مسلمانوں میں عام طور پر طے شدہ اصول تفسیر کی رو سے اسرائیلیات میں سے صرف ان چیزوں کے نقل کرنے کی اجازت ہے جن کی یا تو قرآن مجید سے تائید ہوتی ہو، یا کم از کم ان کا کوئی پہلو مثبت یا منفی ایسا نہ ہو جس کا قرآن مجید، اور احادیث صحیحہ سے تعارض ہو تو ایسی روایات کو غیر جانبدارانہ انداز میں نقل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی اسرئیلیات صحابہ کرامؓ سے بہت تھوڑی تعداد میں منقول ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے چند اسرائیلی روایات منقول ہیں۔ کچھ بعض

دوسرے صحابہ سے مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام ایک مشہور صحابی تھے۔ جو یہودیت سے اسلام لائے تھے۔ ان کے علم میں بہت سی چیزیں تھیں۔ جن میں کچھ انہوں نے بیان کیں۔ لیکن اسرائیلیات کا اصل رواج بعد میں تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں اس وقت شروع ہوا جب کچھ لوگوں نے اس طرح کی چیزیں زیادہ تعداد میں روایت کیں جو عوام میں مقبول ہوگئیں۔ عوامی مقبولیت دیکھ کر عام قصہ گو لوگوں نے بھی بنی اسرائیل اور اہل کتاب کے حلقوں کی سنی سنائی باتوں کو بڑی تعداد میں پھیلا دیا۔

ایک آخری چیز جو تفسیر قرآن مجید کے ضمن میں بیان کرنا ضروری ہے' یہ ہے کہ ترجمہ قرآن بھی تفسیر قرآن کا ایک اہم حصہ ہے۔ ترجمہ بھی ایک طرح کی تفسیر ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک آپ قرآن مجید کی کسی آیت کو سمجھ کر اس کا مطلب متعین نہ کریں اس کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ترجمے کے لیے بھی فہم کی ایک سطح درکار ہے۔ جہاں جہاں قرآن مجید کی تفسیر کو سمجھنا ضروری ہے وہاں تفسیر سمجھے بغیر ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ جہاں تاویل کرنی ہے۔ وہاں تاویل کے بغیر ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا تفسیر اور تاویل کی ایک کم از کم سطح ترجمے کے لیے بھی ضروری ہے۔

قرآن مجید کا ترجمہ کرنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہوسکتا۔ ترجمہ کرنے میں اتنی پیچیدگیاں اور مسائل پیدا ہوتے ہیں کہ جب تک قرآن مجید کے مضامین پر بہت اچھی گرفت نہ ہو براہ راست کسی آدمی کا ترجمہ کے لیے قلم اٹھانا نہ صرف ایک بڑا دشوار اور مشکل کام ہے، بلکہ ایک بہت بڑی جسارت بھی ہے۔ ترجمہ کے لیے ضروری ہے کہ خود قرآنی زبان پر عبور ہو۔ احادیث پر عبور ہو۔ پھر جس زبان میں آپ ترجمہ کر رہے ہوں اس زبان پر عبور ہو۔ اور اس زبان کی نزاکتوں کا اندازہ ہو۔ پھر جہاں، جس زمانہ میں اور جس علاقے میں آپ ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس زمانہ کا محاورہ آپ کو پتہ ہو۔ اور وہاں کے رسم و رواج کا آپ کو علم ہو۔ بعض اوقات ایک خاص رواج کے پس منظر میں آپ ایک بات کو ایک انداز سے کہیں گے تو اس کا مطلب اور ہوگا۔ لیکن اُسی بات کو کسی دوسرے ماحول میں اسی انداز سے کہیں گے تو اس کا مطلب کچھ اور ہوگا۔ لغت میں دونوں کی گنجائش ہوگی۔ اس لیے ترجمہ کرتے وقت ان چاروں چیزوں کو پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔

میں ایک چھوٹی سی مثال دوں گا۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنا کتنا

مشکل کام ہے اور اس کام میں کتنی نزاکتیں ہیں۔ یہ بات تو آپ کو ضرور معلوم ہوگی کہ دیکھنے کے لیے عربی زبان میں کتنے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔ نظر، رآی، بصر، لغت میں ان تینوں کے معنی ہیں: اس نے دیکھا۔ اب قرآن مجید کی ایک آیت ہے۔ تراهم ينظرون اليك وهم لا يبصرون۔ اگر لغت کی مدد سے اس آیت مبارکہ کا لفظی ترجمہ کریں تو اس کا مطلب کچھ یوں ہوگا۔ کہ تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمہیں دیکھتے ہیں اور وہ تمہیں نہیں دیکھتے۔ بظاہر اس ترجمہ سے آیت مبارکہ کا کوئی مطلب فوری طور پر ذہن میں نہیں آئے گا۔ لیکن ترجمہ کرنے والے کو اگر عربی زبان کے مزاج سے آشنائی ہو، ادب کا گہرا ذوق ہو تو اس کو علم ہوگا کہ تراهم کا مفہوم اور ہے، ينظرون کا اور ہے اور يبصرون کا اور ہے۔ رآی یری کے معنی ہیں کسی چیز کو دیکھا اور دیکھ کر سمجھا۔ نظر کے معنی ہیں کہ دیکھنے والے نے محض نظر ڈالی، گویا دیکھا تو سہی لیکن دیکھ کر سمجھنے کی کوشش یا پروا نہیں کی، یعنی صرف دیکھا، اور نظر پڑ گئی، جیسے ہم گاڑی میں بیٹھ کر جا رہے ہوں تو بہت چیزیں راستے میں خود بخود نظر آتی رہتی ہیں۔ ہم ہر چیز کو نہ غور سے دیکھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ ان پر صرف نظر پڑ جاتی ہے۔ یہ ہے نظر۔ تیسرا لفظ ہے ابصر جس کے معنی ہیں کہ دیکھا بھی، سمجھا بھی اور تسلیم بھی کیا کہ واقعی ایسا ہی ہے۔ اب اس آیت کے معنی ہوئے: تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ تمہیں محض تکتے ہیں، لیکن ان کو سوجھتا کچھ نہیں۔ اب اردو زبان میں سوجھنا دیکھنے کو بھی کہتے ہیں۔ سوجھنا عقل میں آ جانے کو بھی کہتے ہیں۔ سمجھ لینے اور مان لینے کو بھی کہتے ہیں۔ جب تک عربی زبان کے ان تین لفظوں کا مفہوم الگ الگ معلوم نہ ہو کہ سوجھنا کسے کہتے ہیں۔ تکنا کیا ہوتا ہے۔ اور دیکھنے سے کیا مراد ہے، اور ابصر، رآی اور نظر کے معانی میں فرق معلوم نہ ہو تو محض لفظی ترجمہ کر دینے سے کام نہیں چلے گا۔ اس لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ترجمہ بھی تفسیر ہی کی ایک شاخ ہے اور تفسیر ہی کا ایک ذیلی اور چھوٹا سا شعبہ ہے۔ اس لیے جس طرح مفسر قرآن کے لیے بہت سی چیزیں ضروری ہیں۔ اسی طرح مترجم قرآن کے لیے بھی بہت سی چیزیں ضروری ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

خطبہ ششم

تاریخ اسلام
کے
چند عظیم مفسرین قرآن

۱۲ اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفسرین قرآن پر گفتگو کی ضرورت دو وجوہات سے محسوس ہوتی ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ تفسیری ادب میں جس طرح سے اور جس تیزی کے ساتھ وسعت پیدا ہوئی اس کے نتیجے میں بہت سی تفسیریں لکھی گئیں۔ پورے قرآن مجید کی باقاعدہ اور مکمل تفسیروں کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں تفسیری موضوعات پر مشتمل تیار ہوئیں اور آئے دن تیار ہو رہی ہیں۔ ان میں سے بعض تفسیروں میں ایسی چیزیں بھی شامل ہو گئی ہیں جو صحیح اسلامی فکر کی نمائندہ نہیں ہیں۔ قرآن مجید کے طلباء کو ان تمام رجحانات اور اسالیب سے باخبر اور متنبہ رہنا چاہیے۔ اس لیے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ چند ایسے نامور، مستند اور رجحان ساز مفسرین قرآن کا تذکرہ کیا جائے جو تفسیر کے پورے ذخیرے میں نمایاں اور منفرد مقام بھی رکھتے ہیں اور صحیح اسلامی فکر کی نمائندگی بھی کرتے ہیں، یہ وہ بالغ نظر اور تاریخ ساز مفسرین قرآن ہیں جنہوں نے قرآن مجید کے علوم کی نشر و اشاعت میں انتہائی مفید اور تعمیری کردار ادا کیا ہے، جن کے کام کے اثرات، نتائج اور ثمرات آج پوری دنیا کے سامنے ہیں، اور جن کے اخلاص اور برکت عمل سے آج قرآن مجید کے معانی اور مطالب اپنی اصل شکل میں ہم تک پہنچے ہیں اور ہمارے پاس موجود ہیں۔

مفسرین قرآن پر گفتگو کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ قریب قریب تمام بڑے اور نمایاں مفسرین قرآن تفسیر کے مختلف رجحانات کی نمائندگی اور فہم قرآن کے مختلف اسالیب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ بعض تفسیریں ایسی ہیں جو انتہائی جامع انداز کی ہیں، اور ان میں تمام بنیادی رجحانات کو سمو لیا گیا ہے۔ کچھ تفسیریں ایسی ہیں جو علم تفسیر کے کسی خاص رجحان یا اسلوب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اور اگر قرآن کے طلباء اس خاص رجحان یا اسلوب سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں تو وہ تفسیریں ان کے لیے خاص طور پر مفید ہیں۔ لیکن ان طلباء کے لیے ان تفاسیر کی افادیت

نسبتاً کم ہوگی جو قرآن مجید سے صرف عمومی اور ضروری واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور تفسیر کے کسی متعین اسلوب سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس لیے آج کی گفتگو میں اس پورے موضوع کی تمہید اور ابتدائی بیان ہوگا اور کل کی گفتگو میں مفسرین کے مناہج پر گفتگو ہوگی۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی کئی بار ذکر کیا جاچکا ہے تفسیری ادب کی جمع و تدوین اور توسیع و ارتقاء کا عمل صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے شروع ہوا۔ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں جتنا قرآن مجید سیکھا، اس کو پوری دیانت، امانت اور صحت کے ساتھ تابعین تک منتقل کر دیا۔ پھر صحابہ کرامؓ کی اپنی فہم و بصیرت اور تربیت نبویؐ کے نتائج کی روشنی میں جو فکر و شعور اور اجتہادی بصیرت ان کو حاصل ہوئی اس سے کام لے کر انہوں نے نئے نئے تفسیری نکتے دریافت فرمائے۔ پھر اس دور کے حالات، وسائل، اسلوب اور لغت پر جو عبور ان کو حاصل تھا' اس کی روشنی میں انہوں نے قرآن مجید کی بہت سی آیات اور الفاظ کی مزید تفسیر و تشریح کی۔ ان سب عوامل کے نتیجے میں متعدد صحابہ کرامؓ کو علم تفسیر میں مرکزیت اور مرجعیت کا درجہ حاصل ہوا۔

حوالہ اور مرجع کی حیثیت حاصل کرنے والے ان صحابہ کرامؓ میں نمایاں ترین نام ان صحابہ کرامؓ کے تھے جن کا کئی بار تذکرہ ان گذارشات میں کیا جاچکا ہے یعنی خلفاء اربعہ، اور ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ' حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ وغیرہ۔ ان سب میں نسبتاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خاص مقام حاصل ہے۔ ان کو عمر بھی خاصی طویل حاصل ہوئی۔ اس لیے ان کے شاگردوں کی تعداد بھی دوسروں سے زیادہ تھی اور ان کا کردار بھی علوم قرآن کی نشر و اشاعت کے بارے میں سب سے نمایاں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خود رسول اکرمؐ سے براہ راست استفادہ کا شرف بھی حاصل ہوا۔ چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین عزیز یعنی چچازاد بھائی تھے۔ پھر ام المومنین حضرت میمونہؓ کے بھانجے بھی تھے جو آپ کی سگی خالہ تھیں، اس لیے انہیں آپؐ کے گھر کے اندر بھی جانے کا اکثر اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ اور کئی مواقع پر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ایسے معمولات کا بھی مشاہدہ کیا جو کسی اور کے لیے اتنی آسانی سے ممکن نہیں تھا۔

ایک مرتبہ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ رات کس طرح گزارتے ہیں۔ آپؐ نے اس کی اجازت مرحمت فرمائی اور ایک رات انہیں اپنے ہمراہ

ٹھہرایا۔ جس رات آپؐ کو ام المومنین حضرت میمونہؓ کے گھر قیام فرمانا تھا وہ رات حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی حضورؐ کے دولت کدہ پر گزاری۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رات گزارنے کی پوری کیفیت کا مشاہدہ کیا۔ اور پھر ایک مفصل روایت میں ان سارے حالات و مشاہدات کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا کہ آپؐ کے آرام فرمانے کا کیا طریقہ تھا۔ تہجد کے لیے کیسے اٹھا کرتے تھے، وضو کرنے کا کیا طریقہ تھا، رات کی نماز کس طرح ادا کیا کرتے تھے، تہجد کی نماز کتنی طویل ہوتی تھی، اور اس کے بعد کیا کرتے تھے، نماز فجر کے لیے کیسے تشریف لے جاتے تھے۔ یہ ساری تفصیلات انہوں نے بیان فرمائیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے مواقع ان کو حاصل رہے۔

رسول اللہؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو حضرت عمر فاروقؓ کی بھی قریبی صحبت اور خصوصی شفقت حاصل رہی۔ وہ کم و بیش بارہ سال ان کے ساتھ رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو ہمیشہ کبار صحابہ کرامؓ کے مقام پر رکھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب بعض خاص اور اہم امور پر مشورہ کرنے کے لیے صف اول کے صحابہ کرامؓ کو بلایا گیا۔ تو ان کے ساتھ ہی نوعمر اور نوجوان عبداللہ بن عباسؓ کو بھی بلایا گیا۔ اس موقع پر بعض صحابہ کرامؓ نے پوچھا کہ اتنے معمر صحابہ کی موجودگی میں ایک کم سن اور نو آموز نوجوان کو کس لیے بلایا گیا ہے تو حضرت عمر فاروقؓ نے براہ راست کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن جب محفل کا آغاز ہوا تو آنجناب نے وہاں موجود صحابہ کرامؓ سے کوئی سوال کیا۔ لیکن وہاں موجود حضرات میں سے اکثریت اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے اشارہ پر حضرت ابن عباسؓ نے اس کا وہ جواب دیا کہ سب لوگ عش عش کر اٹھے۔ اس وقت لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ انہیں اپنی کم سنی کے باوجود کس لیے بلایا گیا تھا۔

علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بن عباس کو حضرت علیؓ سے بھی ایک خاص مناسبت تھی۔ دونوں آپس میں چچازاد بھائی تھے۔ دونوں کا آپس میں وہی رشتہ تھا جو دونوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا۔ اس لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علم و فضل سے بھی ان کو کسب فیض کے بہت سے مواقع حاصل ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کا شمار ان کے قریب ترین رفقاء اور معتمد ترین مشیروں میں ہوتا تھا۔ اس مسلسل ہمراہی سے ان کو حضرت علی کے علم و فضل سے استفادہ کے قیمتی مواقع حاصل ہوئے۔ یوں حضرت عبداللہ بن

عباس نے علوم قرآن میں مہارت حاصل کرنے کے وہ تمام ممکنہ ذرائع استعمال فرمائے جو کسی اور شخص کو حاصل نہ ہو سکتے تھے۔

ان سب مواقع و ذرائع سے بڑھ کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طلب علم کا غیر معمولی شوق بھی عطا ہوا تھا۔ وہ گرمی اور سردی کی پروا کیے بغیر اور دن رات کا خیال کیے بغیر مختلف جید صحابہ کرامؓ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور ان سے وہ تمام مسائل معلوم کیا کرتے تھے جو فہم قرآن کے لیے ضروری تھے۔ ایک مرتبہ قرآن مجید کی کسی آیت پر غور فرما رہے تھے۔ غور و خوض کے دوران میں اندازہ ہوا کہ معاملہ اٹک گیا ہے اور بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہی۔ شدید گرمی کا زمانہ تھا اور تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ کسی انصاری صحابی کی طرف خیال گیا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس اس آیت کا علم موجود ہو۔ اسی وقت گھر سے نکلے اور صحابی کے دروازہ پر جا پہنچے۔ جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ صحابی رسولؐ غالباً آرام فرما رہے ہیں۔ انہیں بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ان کے گھر کی دہلیز پر ہی بیٹھ گئے۔ گرم گرم لو کے تھپیڑے ان کے مبارک چہرہ کو جھلساتے رہے۔ گرد آلود ہوا کے ساتھ سوکھے اور خشک پتے اڑ اڑ کر ان کے بالوں میں پھنستے رہے۔ لیکن وہ صبر و ہمت سے وہیں بیٹھے انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ جب تھکن سے نیند آ گئی تو ایک پتھر پر سر رکھ کر سو گئے۔

عصر کا وقت ہوا۔ صحابی رسولؐ نماز ادا کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلے۔ دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی گرمی میں پتھر پر سر رکھے سو رہے ہیں۔ وہ ایک دم گھبرا سے گئے اور یہ منظر دیکھ کر پریشان ہو گئے، بے ساختہ بولے: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی! آپ نے مجھے یاد فرما لیا ہوتا! آپ خود کیوں تشریف لائے؟ آپ نے فرمایا: العلم یوتی ولا یاتی۔ علم کے پاس حاضر ہوا جاتا ہے، علم خود چل کر نہیں آتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنی مشقت اور محنت سے قرآن مجید کا علم حاصل کیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس کے تلامذہ کی بھی بہت بڑی تعداد ہے، جنہوں نے بڑے پیمانہ پر ان سے کسب فیض کیا۔ اگرچہ ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے، لیکن ان کے شاگردوں میں سب سے نمایاں نام حضرت مجاہد بن جبیر کا ہے۔ یہ ۲۱ھ میں پیدا ہوئے، یہ حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ تھا۔ کبار صحابہ حیات تھے اور ہر طرف قرآن فہمی کے چرچے تھے۔ اس

ماحول میں مجاہد بن جبیر نے کسب فیض تو بہت سے صحابہ سے کیا، لیکن ان کو اصل تلمذ حضرت ابن عباس ہی سے حاصل رہا۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے انتقال تک وہ ان کے ساتھ رہے اور ان سے تمام علوم وفنون اخذ کیے۔ قرآن مجید کے علوم پر بالآخر ان کو وہ گرفت حاصل ہوئی جو سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے شاگردوں میں سے کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی۔ ان کی تمام عمر مکہ مکرمہ میں گزری۔ وہاں جو مسند درس حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے سنبھال رکھی تھی وہ ۶۸ھ میں ان کے انتقال کے بعد مجاہد نے سنبھال لی۔

حضرت مجاہد بن جبیر نے کم وبیش چھتیس سال یہ مسند درس سنبھالی اور ہزاروں تشنگان علم کو سیراب کیا۔ ۱۰۴ھ میں حرم شریف میں حالت سجدہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی مرتب کردہ ایک تفسیر ہے۔ جو تفسیر مجاہد بن جبیر کے نام سے معروف ہے۔ یہ تفسیر خاصے عرصہ سے الگ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوسکی تھی۔ البتہ اس کے تمام اہم مضامین اور بنیادی مطالب بڑے بڑے مفسرین نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کرر کھے تھے۔ یہ سعادت ادارہ تحقیقات اسلامی کے ایک فاضل رفیق مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی مرحوم کو حاصل ہوئی جنہوں نے اس کتاب کو متعدد مخطوطات اور قدیم تفسیری مصادر کی مدد سے بڑی محنت سے ایڈٹ کر کے مرتب کردیا اور حکومت قطر کے خرچہ پر آج سے ۲۵ سال پہلے ایک ضخیم کتابی شکل میں بڑے سائز پر شائع کرایا۔

حضرت مجاہد بن جبر نے جو تفسیری روایات حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کی ہیں ان کو امام بخاریؒ اور امام شافعیؒ نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔ امام بخاریؒ کی جامع صحیح میں بہت سے مقامات پر بالخصوص کتاب تفسیر میں قرآن مجید کی بہت سی آیات کی تشریح میں سیدنا عبداللہ بن عباس اور مجاہد بن جبر کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ یوں امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علوم وفنون کو آئندہ آنے والوں کے لیے محفوظ کردیا۔ اسی طرح امام شافعی کی کتابوں، بالخصوص احکام القران، احکام الحدیث اور اختلاف الحدیث میں جگہ جگہ جہاں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تفسیری اقوال کو حضرت مجاہد کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے وہیں خود حضرت مجاہد کے ارشادات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

حضرت مجاہد بن جبر نے پورا قرآن مجید ۳۰ مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پڑھا۔ یہ ۳۰ مرتبہ تو اس طرح عمومی انداز میں پڑھا جس میں انہوں نے قرآن مجید کی ہر آیت کے معنی اور

مطلب کو ان سے سنا اور سمجھا۔ لیکن تین مرتبہ پورے قرآن مجید کو اول سے لے کر آخر تک اس طرح توجہ اور گہرائی سے پڑھا کہ ان کے اپنے الفاظ ہیں، اقف عند کل ایة اسئله فیمس نزلت کیف کانت، میں ہر آیت پر ٹھہرتا تھا اور پوچھتا تھا کہ یہ کس بارے میں نازل ہوئی اور کس صورتحال میں نازل ہوئی، جب نازل ہوئی تو اس کے کیا اثرات ظاہر ہوئے اور کیا نتائج برآمد ہوئے۔ اس طرح ایک ایک آیت کے بارے میں ان سے کسب فیض کیا۔ گویا انہوں نے ۳۳ مرتبہ پورے قرآن مجید کا اول سے لے کر آخر تک سبق لیا اور بالآخر تفسیر کے بہت بڑے امام قرار پائے۔ مجاہد بن جبر کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباس سے جو کچھ سنتا تھا اسے لکھتا جاتا تھا اور اپنے تحریری ذخائر کو بار باران سے پوچھ پوچھ کر بہتر بناتا رہتا اور اپنی تحریری یادداشتوں کی اصلاح کیا کرتا تھا اور انہیں بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ حضرت مجاہدؒ کی تفسیری روایات تمام کتب حدیث، بالخصوص صحاح ستہ میں شامل ہیں۔ صحاح ستہ میں بہت کم راوی ایسے ہیں جن کی روایات ان چھ کی چھ کتب احادیث میں موجود ہوں۔ حضرت مجاہد بن جبر ان معتمد ترین اور معتبر ترین خوش نصیب اہل علم میں سے ہیں جن کی روایات کتب صحاح ستہ کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس درجہ کے انسان تھے۔ اور ان کے کام کو کس قدر سراہا گیا۔

حضرت مجاہد بن جبر کے علاوہ تابعین میں مفسرین قرآن کی ایک بڑی تعداد اور بھی ہے جن سے تفسیری روایات منقول ہیں۔ ان تابعین میں سے ایک بہت بڑی تعداد تو ان لوگوں کی ہے جو خود سیدنا عبداللہ بن عباسؓ یا دوسرے صحابہ کرامؓ کے شاگرد ہیں۔ اور کچھ وہ حضرات ہیں جن کو صحابہ کرام سے براہ راست استفادہ کا تو زیادہ موقع نہیں ملا، البتہ انہوں نے اکابر تابعین سے کسب فیض کیا۔ صحابہ سے براہ راست کسب فیض کرنے والے تابعین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ اور حضرت علیؓ سے کوفہ میں قیام کے دوران میں کسب فیض کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ ان سب کا تفسیری ذخیرہ جیسے جیسے کتابی شکل میں آتا گیا دوسروں تک پہنچتا گیا۔

پہلی صدی ہجری اس اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ صحابہ اور تابعین کے ذریعے سے آنے والے تمام ذخائر اور تمام روایات تحریری شکل میں آ گئیں اور ایک دوسرے کو دستیاب ہو گئیں۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عباس جن کا قیام اکثر و بیشتر مکہ مکرمہ یا طائف میں رہا۔ مکہ مکرمہ میں تو ان کی روایات ان کے تلامذہ کو میسر تھیں، لیکن حضرت علیؓ جو کوفہ میں قیام فرما

تھے ان کی روایات کا خاصا بڑا حصہ شروع شروع میں مکہ مکرمہ کے بعض تابعین کو میسر نہیں تھا۔ اسی طرح کچھ صحابہ کرامؓ جو دمشق میں تھے، مثلاً حضرت ابودرداء یا حضرت عبادہ بن صامت، ان کی روایات کوفہ اور مدینہ والوں کو شروع شروع میں حاصل نہیں تھیں۔ لیکن پہلی صدی ہجری کے اواخر تک جب ان تمام تابعین نے اپنے اپنے ذخائر تحریری شکل میں مدون و مرتب فرما لیے اور انہیں کتابی شکل دے دی تو پھر یہ نسخے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں پہنچنا شروع ہو گئے اور یوں دوسری صدی کے اوائل تک یہ تمام ذخیرہ معلومات تمام تابعین تک پہنچ گیا۔

اب دوسری صدی ہجری میں اس عمل کا ایک دوسرا مرحلہ شروع ہوا جس کی تفصیلات اگر دیکھی جائیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے اتنا بڑا کام لے لیا۔ جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت شدہ مواد کا تعلق تھا' وہ تو صحابہ کرامؓ کے ذریعے سے سامنے آ گیا، انہوں نے تابعین تک پہنچا دیا۔ تابعین نے پورے مواد کو مرتب کر لیا اور ایک دوسرے تک پہنچا دیا۔ اور یوں پہلی صدی ہجری کے اواخر تک یہ سارا کام مرتب و مدون مجموعوں کی شکل میں ضبط تحریر میں آ گیا۔ یہ سارا تفسیری ذخیرہ وہ تھا جو اکثر و بیشتر احادیث و آثار پر مشتمل تھا۔

لیکن تفسیر قرآن مجید کا ایک پہلو وہ تھا جس کا تعلق زبان و ادب اور لغت سے تھا۔ لغت کے ذخائر کو محفوظ کرنے کے لیے زباں داں حضرات میدان میں آئے اور انہوں نے اس قدر باریک بینی، محنت اور عرق ریزی سے اس کام کو کیا کہ انہوں نے قرآن مجید اور حدیث رسول کا ہر وہ لفظ، ہر وہ عبارت اور ہر وہ جملہ جس کو سمجھنے کے لیے کسی قدیم شعر کی یا کسی قدیم ادبی حوالہ کی ضرورت تھی یا ضرب المثل اور محاورہ کے بارہ میں وضاحت درکار تھی ان سب سے متعلق ضروری علمی، لغوی اور ادبی مواد کو پورے عرب میں پھر پھر کر جمع کیا۔ وہ شخصیتیں جنہوں نے یہ کام کیا ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔ سب کا ذکر تو یہاں نہیں کیا جا سکتا صرف ایک عظیم شخصیت کا حوالہ یہاں دیتا ہوں۔

عبدالملک اصمعی اس شان کے انسان ہیں کہ ایک مرتبہ خلیفہ وقت نے انہیں کسی دوسرے ملک میں سفیر اور ایلچی کے طور پر بھیجا۔ غالباً سلطنت روما کی طرف بھیجے گئے تھے۔ وہاں جب وہ پیغام لے کر گئے اور گفتگو کر کے واپس آ رہے تھے تو اس ملک کے بادشاہ نے جوابی خط میں مسلمان خلیفہ کو لکھا کہ اگر آپ انہیں میرے ملک میں ٹھہرنے کی اجازت دے دیں تو جو قیمت

آپ کہیں گے میں ادا کروں گا، اس لیے کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنا عقل مند انسان نہیں دیکھا۔ یہ تھے عبدالملک اصمعی۔ ان کی اصل شہرت بطور ایک ادیب اور بطور ایک ماہر لغت اور بطور ایک نقاد کے رہی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگی کے ستر ۷۰ سال اس مشقت میں گزارے کہ عرب کے گوشے گوشے میں گئے، ایک ایک قبیلے میں پھرے اور ریگستانوں میں اونٹ کی، گدھے کی اور خچر کی پیٹھوں پر اور پیدل سفر کیا۔ کوشش یہ تھی کہ عربی زبان کے جتنے اسالیب، امثال، عبارات، کلمات اور محاورات کسی نہ کسی حیثیت سے قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہیں انہیں جمع کرلیا جائے۔ کبھی سنا کہ فلاں قبیلہ میں ایک بوڑھا آدمی ہے جس کی زبان بہت رواں اور معیاری ہے اور قدیم اسالیب زبان سے واقف ہے۔ اس کے پاس جا کر مہینوں قیام کیا، ظاہر ہے کہ علم و ادب سکھانے اور معلومات فراہم کرنے کے لیے لوگ ہر وقت فارغ تو نہیں بیٹھے ہوتے تھے۔ کوئی سفر پر گیا ہوا ہوگا، کوئی بیمار ہوگا۔ کوئی مصروف ہوگا۔ لہٰذا ان لوگوں سے کسب علم کے لیے ٹھہرنا بھی پڑتا تھا۔ ان کا انتظار بھی کرنا پڑتا تھا۔ قیام وطعام کا بندوبست بھی کرنا پڑتا تھا۔ ٹھہرنے کا انتظام بھی مشکل ہوتا ہوگا۔ اپنے نوٹس بھی ساتھ رکھتے ہوں گے۔ آج ان مشکلات کا اندازہ کرنا ممکن نہیں جو اس سارے عمل میں اہل علم کو پیش آتی ہوں گی۔ ان سب مشکلات کے باوجود انہوں نے ۷۰ سال یہ کام کیا اور قرآن مجید کے لغوی اور ادبی اسالیب کے بارے میں اتنا مواد جمع کر گئے کہ پھر ہمیشہ کے لیے دنیا کو مستغنی کر دیا۔ اس کام سے دلچسپی لینے والے اصمعی کی طرح کے اور حضرات بھی تھے۔ لیکن یہ ان میں سب سے نمایاں تھے۔

اس طرح نقل اور روایات سے متعلق جمع وتدوین کا کام تو پہلی صدی میں مکمل ہوگیا۔ جو کام زبان، لغت اور ادب سے متعلق تھا وہ دوسری صدی ہجری میں مکمل ہوگیا۔ یہ تمام تحریری تفسیری ذخائر، عبدالملک اصمعی اور ان کے ہم عصر اہل علم کے ادبی اور لغوی ذخائر، سب دوسری صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے پہلے مرتب ہوگئے۔ دوسری صدی ہجری کے جن اہل علم نے قرآنی زبان اور قرآنی ادبیات کی یہ خدمت کی ان میں ابوالعباس ثعلب، المبرد، مفضل ضبی، یحیٰ بن زیاد الفراء وغیرہ شامل تھے۔

جب تیسری صدی کا آغاز ہوا تو قرآن مجید کے تمام طلباء کے سامنے یہ سارا مواد مرتب شدہ موجود تھا۔ تحریری ذخائر کی شکل میں بھی، اساتذہ کی شکل میں بھی اور مختلف مدارس اور

مکاتب کی شکل میں بھی جہاں درس دینے والے موجود تھے۔ اب گویا تیسری صدی ہجری میں وہ مرحلہ آیا کہ قرآن مجید کی جامع تفسیرات مرتب کی جائیں۔ ایسی تفسیرات جن میں صحابہ کرامؓ کے ذریعہ سے آنے والی تمام روایات بھی موجود ہوں، تابعین کے ذریعہ سے آنے والا سارا علم بھی یکجا ہو، لغت اور ادب سے متعلق وہ سارا ذخیرہ جو اصمعی اور ان کے معاصرین کے ذریعہ سے آیا تھا اس سے بھی کام لیا گیا ہو، اور اس وقت تک قرآن مجید کے بارہ میں جو کچھ لوگوں نے سوچا وہ بھی سارا کا سارا موجود ہو۔

پھر پہلی صدی ہجری کے اواخر ہی سے اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد نے قرآن مجید کے فقہی احکام پر اس نقطہ نظر سے خاص طور پر غور وخوض شروع کر دیا تھا کہ کس آیت سے کتنے احکام نکلتے ہیں، اور قرآن مجید کے کون سے الفاظ میں کون سا اسلوب ایسا استعمال ہوا ہے جس سے کوئی نیا حکم معلوم ہوتا ہے۔ یہ اتنا بڑا اور اتنا غیر معمولی کام تھا جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے بارہ میں ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی آیات سے براہ راست جتنے احکام مستنبط کیے ہیں ان کی تعداد چھیاسی ہزار سے زائد ہے، اور ان کے مرتب کردہ احکام کی روشنی میں ان کے تلامذہ اور منتسبین نے جو مزید تفریعات (فروعی احکام اور جزوی تفصیلات) مرتب کی ہیں ان سب کو اگر جمع کیا جائے تو ان کی تعداد دس لاکھ بنتی ہے۔ گویا انہوں نے قرآن مجید کی چند سو آیات احکام سے دس لاکھ چھیاسی ہزار احکام کا استنباط کیا۔

امام شافعیؒ کا محبوب اور محترم نام ہم سب نے سنا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے نامور ترین مفسرین، محدثین اور فقہائے اسلام میں سے ہیں، اسلامی تاریخ کیا معنی، انسانی تاریخ کے صف اول کے چند قانونی دماغوں میں سے ایک ہیں۔ اگر انسانی تاریخ کے دس بہترین قانونی دماغوں کی کوئی فہرست بنائی جائے تو امام شافعیؒ لازماً ان میں سے ایک ہوں گے۔ انہوں نے عالم انسانیت کو اصول فقہ کا علم دیا۔ آج دنیا کے ہر قانون میں علم اصول قانون، یعنی jurisprudence پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ اس دقیق اور عمیق فن کے موجد ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر لیجیے کہ جو شخص اصول قانون جیسے غیر معمولی علم کو مدون کر ڈالے وہ کس درجہ کا انسان ہوگا۔

امام شافعی کے شاگرد امام احمد ابن حنبل سے بھی ہر مسلمان واقف ہے۔ ان کے بارے میں امام ابن تیمیہ کا یہ جملہ دہرا دینا کافی ہے کہ امام احمدؒ سے محبت اس بات کی کافی دلیل ہے کہ اس انسان کو سنت رسولؐ سے محبت ہے۔ یعنی جس شخص کو سنت رسولؐ سے محبت ہوگی اس کو امام احمدؒ سے لازماً محبت ہوگی۔ ان کا مقام و مرتبہ واضح کرنے کے لیے یہ ایک جملہ ہی کافی ہے۔ امام احمد کی زندگی غیر معمولی طور پر عبادت اور انابت الی اللہ کی سرگرمیوں میں گزرتی تھی۔ وہ اس معاملہ میں اپنے زمانہ میں ضرب المثل تھے کہ ان کے دن علم حدیث کی تدریس میں اور ان کی راتیں مصلے پر کھڑے ہو کر زار و قطار رو کر گزرا کرتی تھیں۔ لیکن جب بھی عبادت سے فارغ ہوتے تو یہ دعا کرتے کہ اے اللہ امام شافعیؒ کی عمر میں برکت عطا فرما۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں نے گذشتہ تیس سال میں کوئی ایک نماز بھی ایسی نہیں پڑھی جس میں میں نے امام شافعی کے لیے دعا نہ کی ہو۔

امام احمد حنبل کی ایک ننھی سی بچی تھی جو یہ سوچا کرتی تھی کہ میرے والد اتنی غیر معمولی عبادت کرتے ہیں کہ دنیا ان کی عبادت کو ضرب المثل سمجھتی ہے۔ وہ کہتی کہ آخر اس سے زیادہ کیا عبادت ممکن ہے کہ دن مسجد میں حدیث پڑھانے میں گذریں اور راتیں مصلے پر کھڑے ہو کر رونے میں۔ ان دو مشاغل کے علاوہ میرے والد کو کسی چیز سے غرض نہیں ہے۔ وہ یہ بھی سوچا کرتی کہ امام شافعیؒ، جن کے لیے میرے والد ہر وقت دعا کرتے ہیں آخر وہ کس درجہ کے انسان ہوں گے۔ اور آخر ان کی عبادت گزاری کس درجہ اور کس شان کی ہوگی۔ امام شافعی قاہرہ میں رہتے تھے اور امام احمد بن حنبلؒ بغداد میں رہا کرتے تھے۔ قاہرہ اور بغداد کا فاصلہ اتنا تھا کہ اگر آپ اس زمانہ کے لحاظ سے دیکھیں تو ملاقات کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ امام شافعیؒ کا پیغام امام احمدؒ کو ملا کہ میں بغداد آنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ بغداد میں فلاں محدث کے علم میں ایک حدیث ہے اور میں ان سے براہ راست اس حدیث کو سننے کے لیے آنا چاہتا ہوں۔ ان کی عمر اتنی ہوگئی ہے کہ مجھے خطرہ ہے کہ وہ دنیا سے چلے نہ جائیں۔ چنانچہ ان سے ایک روایت سننے کے لیے انہوں نے قاہرہ سے بغداد کا سفر اختیار کیا۔ اس زمانے میں نہ ریل گاڑیاں ہوتی تھیں، اور نہ جہاز ہوتے تھے۔ لیکن قافلے چلا کرتے تھے، اور قافلوں کو منظم کرنے والے ہوتے تھے، جیسے آج کل ٹریول ایجنٹ ہوتے ہیں۔ انہیں جمال کہا جاتا تھا۔ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک کاروان لے کر جایا کرتے تھے۔ تنہا سفر کرنا مشکل ہوتا تھا۔ راستے میں

نہ کھانے کا انتظام ہے، نہ پانی ہے، اور نہ سرائے۔ البتہ پورا کارواں جب چلے گا تو چار سو پانچ سو افراد پر مشتمل ہوگا۔ وہ اپنا انتظام بھی کرے گا اور کھانے پینے کا بندوبست بھی اسی کے ذمہ ہوگا۔ اور راستہ میں اپنی حفاظت کا انتظام بھی وہی کرے گا۔ اس لیے لوگ بہت پہلے سے قافلے میں بکنگ کرالیا کرتے تھے۔ اعلان ہوجاتا تھا کہ فلاں تاریخ کو قافلہ روانہ ہوگا۔ جسے جانا ہو وہ پیسے جمع کرادے اور قافلہ میں شامل ہو کر روانہ ہوجائے۔ چنانچہ امام شافعیؒ نے بھی اپنے کرائے کے پیسے جمع کروائے اور قافلے کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ کرائے کے پیسے پہلے سے جمع کروانے پڑتے تھے اور کھانے کے پیسے ساتھ لے لیے جاتے تھے اور وقت پر جمع کروانے پڑتے تھے۔ اس لیے کہ جس جگہ قافلہ پڑاؤ ڈالا کرتا تھا۔ اس جگہ قرب و جوار سے لوگ آ کر دکانیں بھی لگایا کرتے تھے۔ ان سے قافلے والے نقد پیسوں پر کھانا لیا کرتے تھے۔ اس طرح کئی ماہ کا سفر کر کے امام شافعیؒ بغداد پہنچ گئے۔

قیام امام احمد بن حنبل کے ہاں ہی ہوا۔ امام احمد ابن حنبلؒ نے اپنی کمسن بیٹی کو خصوصی ہدایات دے دیں کہ تمہیں میرے استاد کا خاص خیال رکھنا ہے۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اب بچی کو بڑا اشتیاق پیدا ہوا کہ اب یہ دیکھنے کا موقع ملے گا کہ ان کی رات کی عبادت کیسی ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ نے عشاء کی نماز مسجد میں جا کر ادا کی اور واپس آ کر آرام کی غرض سے بستر پر لیٹ گئے۔ اب بچی تھوڑی تھوڑی دیر میں اپنے والد کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھتی کہ وہ مصلے پر کھڑے ہیں۔ اور رو رہے ہیں۔ پھر امام شافعی کے کمرہ کا دروازہ کھول کر دیکھتی کہ وہ بستر پر دراز ہیں اور سو رہے ہیں۔ اس کو خیال ہوا کہ شاید آج سفر سے آئے ہوئے ہیں۔ تھکن کی وجہ سے سو گئے ہیں۔ شاید تہجد میں اٹھیں گے۔ لیکن امام شافعی تہجد میں بھی نہیں اٹھے۔ فجر کی اذان پر بھی نہیں اٹھے۔ جب امام احمد بن حنبلؒ نماز فجر کے لیے مسجد جانے لگے تو انہوں نے آواز دی کہ حضرت! جماعت تیار ہے، تشریف لے چلیے۔ امام شافعیؒ نے چادر اتار کر پھینکی اور ان کے ساتھ مسجد روانہ ہوگئے۔ بچی حیرانی سے یہ تمام منظر دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ معلوم نہیں کیا معاملہ ہے۔ ویسے تو میرے والد کے بھی شیخ اور استاد ہیں۔ مگر تمام رات سوتے رہے۔ صبح کو فجر کی نماز کے لیے وضو کیے بغیر ہی مسجد میں چلے گئے اور وضو کا پانی جوں کا توں رکھا رہا۔ آخر میرے والد ان کے کس عمل کی وجہ سے ان کے اتنے قائل ہیں کہ ہر وقت ان کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔ امام

احمدؒ سنت کے مطابق فجر کے بعد مسجد میں بیٹھے رہے اور ذکر کرتے رہے۔ سورج نکلنے کے بعد اشراق کے نوافل ادا کر کے گھر واپس آئے کہ مسنون طریقہ یہی ہے۔ امام شافعیؒ فجر پڑھ کر ہی واپس آ گئے اور پھر بستر پر لیٹ گئے۔ جب ناشتہ لگ گیا اور انہیں ناشتہ کے لیے بلایا گیا تو وہ دوبارہ چادر پھینک کر ناشتہ کے لیے آ کر بیٹھ گئے۔ اب یہ بچی دیکھتی تھی کہ اس کے والد ہمیشہ سے بہت تھوڑا کھاتے ہیں۔ اس نے شاید یہی سنا تھا کہ بزرگ بہت تھوڑا کھاتے ہیں۔ لیکن امام شافعیؒ کو دیکھا کہ انہوں نے خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ اس کو یہ خیال ہوا کہ اگر یہ واقعی بزرگ ہیں تو ان کے اندر یہ باتیں کیوں ہیں؟ اور اگر ان کے اندر یہ باتیں ہیں تو پھر یہ بزرگ کس طرح ہیں۔

اسی اثناء میں امام احمدؒ نے استاد گرامی سے پوچھا کہ رات آرام سے گذری؟ ٹھیک طرح سے سو گئے تھے؟ امام شافعی نے جواب دیا کہ رات تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے آرام سے گذری، مگر میں سویا ایک لحہ کے لیے بھی نہیں۔ انہوں نے پوچھا: کیا وجہ ہوئی؟ امام شافعی نے جواب دیا کہ رات جب تم نے عشاء کی نماز پڑھائی تو تم نے یہ آیت تلاوت کی، وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ۔ یہ سورۃ بقرہ کی آخری آیات میں سے ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اگر مقروض تنگدست ہو تو اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک اسے خوشحالی نصیب نہ ہو جائے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اس آیت مبارکہ کو سن کر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس آیت سے تو اسلامی قانون افلاس نکلتا ہے۔ پھر میں نے غور کیا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس قانون افلاس کی بنیاد اخلاقی اصول پر ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس سے تو یہ حکم بھی نکلتا ہے، اس کے بعد خیال آیا کہ اس سے تو فلاں حکم بھی نکلتا ہے۔ وہ بیان کرتے گئے اور امام احمدؒ سنتے گئے۔ پھر انہوں نے کہا کہ جب میں ۱۰۸ ویں مسئلہ پر پہنچا تو تم نے مجھے فجر کی نماز کے لیے آواز دے دی۔ اب جا کر بچی کو معلوم ہوا کہ امام شافعی کی ایک رات میرے والد کی ہزاروں راتوں کے اوپر بھاری ہے۔ اس لیے کہ اس کے والد جو کچھ کر رہے ہیں۔ اپنی ذات کے لیے کر رہے ہیں۔ اور امام شافعی جو کچھ کر رہے ہیں، وہ پوری امت کے لیے ہے، اور امت آج تک ان کے اس کام سے استفادہ کر رہی ہے۔ مسلمانوں میں آج تقریباً ۴۰، ۴۵ کروڑ انسان ہیں جو امام شافعی کی کی تعبیرات اور اجتہادات کے مطابق دین کی تعلیمات پر عمل کر رہے ہیں۔ ان کے یہ اثرات تو آج بھی ہمارے سامنے ہیں۔

سوال کا دوسرا حصہ اگرچہ موضوع سے متعلق نہیں ہے، لیکن بچی کے دل میں یہ بھی خیال تھا کہ یہ زیادہ کیوں کھاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں بھی سوال پیدا ہو۔ امام احمدؒ نے ان سے پوچھا کہ آپ کا سفر کیسا گزرا۔ امام شافعی نے کہا کہ سفر میں تھوڑی سی پریشانی رہی۔ اس لیے کہ جب میں قاہرہ سے روانہ ہوا تو میرے ساتھ پیسوں کی جو تھیلی تھی، درہم اور دینار کی، وہ راستے میں گم ہوگئی۔ اب میرے سامنے دو ہی صورتیں تھیں: ایک تو یہ کہ قاہرہ واپس چلا جاؤں اور دوبارہ پیسوں کا انتظام کر کے آؤں۔ اس عرصہ میں یہ قافلہ نکل جاتا اور جس محدث کی خدمت میں جارہا ہوں وہ چراغ سحری ہیں، نہ معلوم کب گل ہوجائے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اللہ کا نام لے کر روانہ ہوجاؤں کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے اس دوسری صورت پر عمل کرنے کو ترجیح دی۔ میرے قافلے کے ساتھیوں نے میری بہت عزت اور خدمت کی۔ لیکن مجھے ان کی آمدنی پر بہت زیادہ اعتماد نہیں تھا کہ جائز ہے یا ناجائز۔ اس صورت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب انسان کی جان پر بن جائے تو مشکوک آمدنی میں سے بقدر ضرورت کھا سکتا ہے۔ اس لیے میں نے تیسرے چوتھے دن ان سے بقدر ضرورت کھانا قبول کیا اور پورے چھ ماہ کے سفر میں شکم سیر ہوکر کھانا نہ کھا سکا۔ آج پہلی مرتبہ مجھے حلال اور جائز کھانا ملا۔ دوسرے یہ کہ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ حلال رزق میں ایک خاص نور ہوتا ہے جس کا اندازہ دسترخوان پر بیٹھ کر ہی ہوجاتا ہے۔ آج تمہارے دسترخوان پر بیٹھ کر مجھے جتنا نور نظر آیا اتنا کسی اور دسترخوان پر کبھی نظر نہیں آیا تھا، اس لیے میں نے آج اس نور سے خوب استفادہ کیا۔ ان کی اس بات سے بچی کے دوسرے سوال کا جواب بھی مل گیا۔ امام شافعی بہت سے ائمہ فقہ میں سے ایک امام فقہ تھے اور ان کی طرح کے اللہ تعالی نے سینکڑوں ائمہ فقہ پیدا کیے تھے۔ انہوں نے ایک رات میں قرآن مجید کے تین الفاظ سے ۱۰۸ مسائل کا استنباط کیا۔ کتنے فقہا نے کتنے مسائل قرآن مجید سے نکالے ہوں گے۔ اس کا اب کچھ نہ کچھ اندازہ آپ میں سے ہر شخص کر سکتا ہے۔

یہ سارا کام دوسری صدی ہجری میں ہوا۔ یہ مواد کی فراہمی کا کام تھا۔ جو روایت سے آنا تھا، وہ صحابہ کرامؓ کے ذریعہ سے آ گیا۔ جو لغت کے ذریعہ سے آنا تھا وہ اصمعی اور ان کے معاصرین کے ذریعہ آ گیا، اور جو بنیادی اصولوں اور اساسی قواعد پر غور وفکر کا کام تھا وہ ان فقہاء اسلام اور ائمہ مجتہدین نے کیا۔

جب تیسری صدی ہجری شروع ہوئی تو جامع تفسیروں کا کام شروع ہوا۔ اور بہت سے لوگوں نے اس سارے مواد سے کام لے کر جامع تفاسیر تیار کرنی شروع کیں۔ ان جامع تفسیروں میں سب سے قابل ذکر اور قدیم ترین جامع تفسیر جو قرآن مجید کے تمام پہلوؤں سے بحث کرتی ہو اور مرتب شکل میں پورے قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتی ہو اور منتخب آیات ہی کی تفسیر پر مشتمل نہ ہو، وہ امام طبری کی جامع البیان فی تفسیر آیات القران ہے۔ پہلے انہوں نے ایک بہت جامع اور مبسوط تفسیر لکھی تھی۔ جس کے بارے میں مورخین کا بیان ہے کہ وہ تیس ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔ جب امام طبری اس طویل اور مبسوط تفسیر کو لکھ کر مکمل کر چکے تو انہیں خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے لیے اتنی مفصل تفسیر پڑھنا مشکل ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ میں ایک مختصر تفسیر تیار کروں۔ چنانچہ انہوں نے ایک نسبتاً مختصر تفسیر تیار کی جو آج تفسیر طبری کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ تفسیر ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور تقریباً ایک پارہ ایک جلد میں ہے۔

امام طبری مشہور مورخ بھی ہیں۔ ان کی معروف تاریخ طبری کا نام بھی آپ نے سنا ہوگا۔ مفسر و مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ امام طبری ایک بہت بڑے فقیہہ بھی تھے اور ایک بہت بڑے فقہی مسلک کے بانی بھی۔ جیسے امام مالکؒ، امام احمدؒ وغیرہ۔ امام شافعیؒ کے تلامذہ سے ان کا تعلق تھا۔ امام طبری اس اعتبار سے بہت نمایاں ہیں کہ وہ علم قانون کی ایک خاص شاخ یا شعبہ کے موجد اور مدون اول ہیں۔

آج قانون کی ایک شاخ ہے، comparative jurisprudence یعنی دنیا کے قوانین اور اصولہائے قوانین کا تقابلی مطالعہ۔ اس شعبہ علم میں قانون کے طلباء یہ مطالعہ کرتے ہیں کہ مثلاً کسی خاص موضوع کے بارہ میں ہندو قانون میں بنیادی اصول کیا ہے اور اس موضوع پر دیے گئے احکام کیا ہیں۔ پھر دیکھا جاتا ہے کہ دوسرے قوانین میں اس موضوع کے بارہ میں کیا کہا گیا ہے، مثلاً رومن قانون میں بنیادی اصول کیا ہے، اور کیا تفصیلی احکام دیے گئے ہیں اس طرح کا تقابلی مطالعہ موضوعات کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ امام طبریؒ اس فن کے موجد ہیں۔ اس لیے کہ اس فن پر قدیم ترین کتاب ان ہی کی پائی جاتی ہے۔ ان کی کتاب اختلاف الفقہاء کا ایک حصہ مشہور جرمن مستشرق جوزف شخت نے مدون کیا تھا۔ اور ۱۹۳۴ میں شائع ہوا۔ جوزف شخت ایک مشہور یہودی مستشرق تھا جس نے اسلامی قانون کے بارہ میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا

کی تھیں۔ لیکن یہ ایک اچھا کام بھی کر گیا تھا۔

امام طبری کی یہ تفسیر بہت جامع ہے اور ۳۰ جلدوں میں ہے۔ اس کی ایک خاص بات جس نے اس تفسیر کو بقیہ تمام تفاسیر کے لیے ایک مرجع اور ماخذ کی شکل دے دی ہے' یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے ذریعہ سے جتنا مواد بھی آیا تھا اور امام طبری تک پہنچا تھا۔ اس سارے مواد کو انہوں نے اس کتاب میں سمو دیا۔ گویا اگر ہمارے پاس تابعین کے تفسیری مجموعے نہ ہوتے، تفسیر مجاہد بن جبر نہ ہوتی، تو بھی دیگر تابعین اور مجاہد بن جبر کے جتنے اقوال اور تفسیری روایات ہیں' وہ ضائع نہ ہوتیں، اس لیے کہ وہ سب کی سب امام طبری کی اس تفسیر میں موجود ہیں۔ اسی طرح بقیہ تابعین کے جتنے تفسیری اقوال و روایات ہیں جو صحابہ کرامؓ کے تفسیری خیالات کا سب سے بڑا ماخذ ہیں' وہ سب اس تفسیر میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جتنی تفسیرات بیان ہوئیں ہیں وہ ساری کی ساری انہوں نے اس کتاب میں سمو دی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بہت منفرد ہے کہ اگر ہمارے پاس صرف یہی ایک کتاب ہوتی تو صدر اول کے تفسیری سرمایہ کے لیے کسی اور کتاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ پڑتی، اس لیے کہ صحابہ اور تابعین کی تمام اہم تفسیری روایات اس کتاب سے مل سکتی ہیں۔

دوسرا کام انہوں نے یہ کیا ہے کہ ہر روایت کی پوری سند بیان کی ہے اور شروع میں ہی یہ واضح کر دیا ہے کہ میں نے ہر روایت کی سند نقل کر دی ہے۔ اب یہ پڑھنے والوں کا کام ہے کہ وہ جانچ کر دیکھیں کہ کون سی سند کس درجہ کی ہے۔ انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ میں نے یہ تحقیق نہیں کی کہ کون سی سند کتنی مضبوط ہے اور کتنی کمزور ہے۔ سندوں کی گویا چھان بھٹک میں نے ہر جگہ نہیں کی۔

یہ بات میں نے اس لیے بیان کرنی ضروری سمجھی کہ محض تفسیر طبری میں لکھی دیکھ کر کسی چیز کی سو فیصد نسبت رسول خداؐ کی طرف کرنا مناسب نہیں ہے۔ جب تک ہر روایت کا الگ سے فنی طور پر داخلی اور خارجی شواہد کی بنیاد پر جائزہ نہ لے لیا جائے اور محدثین کے اصولوں کی روشنی میں اس کو پرکھ نہ لیا جائے اس وقت تک کسی چیز کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے نہ کی جائے۔

امام طبری کی یہ تفسیر بہت مقبول ہوئی، اتنی زیادہ کہ ایک بہت بڑے مفسر نے یہ لکھا ہے

کہ اگر کسی شخص کو پیدل چین تک سفر کرنا پڑے اور چین میں یہ تفسیر ملتی ہو اور وہاں سے لے کر آنا چاہے تو یہ تفسیر اس بات کی مستحق ہے کہ اس کو پیدل سفر کر کے چین سے جا کر لایا جائے۔ یاد رہے کہ جن مفسر نے یہ بات کہی ہے ان کا تعلق بغداد سے تھا اور بغداد ہی میں بیٹھ کر انہوں نے یہ بات لکھی تھی۔

امام ابن جریر طبری کی یہ تفسیر اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ انہوں نے اس میں جہاں تفسیری روایات جمع کی ہیں، وہاں لغت اور کلام کے مباحث بھی بیان کیے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود علم قراءت کے امام بھی تھے۔ لہٰذا جہاں جہاں قراءت میں فرق ہے وہ بھی انہوں نے بیان کیا ہے۔ ابن جریر طبری کی اس تفسیر کے بعد بہت سی تفاسیر لکھی گئیں۔ ان تفاسیر کی تدوین میں اہل علم اور مفسرین نے علامہ ابن جریر کی تفسیر میں بیان کردہ مواد سے خوب کام لیا۔ اور ان کے اسلوب کی پیروی کی۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ ہوتا ہے۔ اور تقریبا سو سال بعد پانچویں صدی میں ہسپانیہ کے ایک بزرگ علامہ ابن عطیہ اندلسی نے تفسیر قرآن کے باب میں ایک اور نقش قائم کیا۔ علامہ ابن عطیہ غرناطہ کے رہنے والے تھے جو مسلمانوں کی فردوس گم گشتہ ہے۔ ان کی تفسیر کا نام ہے **المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز**۔ یعنی بظاہر انہوں نے اسے مختصر قرار دیا ہے لیکن یہ مختصر بھی تقریبا پندرہ بیس جلدوں میں ہے۔ یہ تفسیر اس اعتبار سے بڑی نمایاں حیثیت اور انفرادی شان رکھتی ہے کہ مسلم اسپین کی نمائندہ تفاسیر میں اس کا بہت اونچا مقام ہے۔ نہ صرف پورے تفسیری ادب میں بلکہ مسلم اسپین میں علامہ ابن عطیہ سے قبل جتنا بھی کام ہوا، وہاں کے علماء، فقہا، محدثین ارباب لغت اور اہل ادب نے جو جو تحقیقات کیں، ان کے کام سے انہوں نے استفادہ کیا اور یہ کتاب تیار کی جو آج سے دس پندرہ سال پہلے مراکش کی وزارت اوقاف نے اپنے خرچ پر شائع کی ہے، وزارت نے اس کتاب کا ایک بہت خوبصورت ایڈیشن شائع کر دیا جو غالباً ۱۵ جلدوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے فاضل محققین نے کتاب پر بہت سے قیمتی اور عالمانہ حواشی بھی لکھے ہیں۔

یہ تفسیر نہ صرف مغربی دنیائے اسلام یعنی مسلم اسپین، مراکش، الجزائر، تیونس، لیبیا کا مغربی حصہ اور مغربی افریقہ کے وہ حصے جہاں مسلمانوں کی آبادی پائی جاتی ہے اس پورے علاقہ

کی وہ بہترین نمائندہ تفسیر ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے بھی بہت نمایاں ہے کہ جو کام امام ابن جریر طبری نے شروع کیا تھا اسے انہوں نے آگے تک پہنچایا اور مکمل کیا۔ ابن جریر نے اکثر و بیشتر روایات میں تقابل اور محاکمہ نہیں کیا ہے۔ اگر ایک صحابی کی ایک رائے ہے، اور دوسرے صحابی کی دوسری رائے، تو انہوں نے ان دونوں آراء کے مابین کوئی موازنہ نہیں کیا تھا اور نہ یہ بتانے کی کوشش کی کہ ان میں تطبیق کس طرح ہوسکتی ہے۔ اس طرح کی گفتگو ابن جریر نے بہت کم کی ہے۔ لیکن علامہ ابن عطیہ نے یہ گفتگو بھی کی ہے اور بتایا ہے کہ متعدد تفسیری اقوال میں تطبیق کیسے کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح محدثین کے ذریعہ سے جو مواد صحابہ کرام سے پہنچا تھا اس کو بھی انہوں نے ایک فنی اور منظم انداز میں مرتب کیا۔

علامہ ابن جریر کے تھوڑے ہی عرصہ بعد آنے والے ایک اور انتہائی نامور اور بالغ نظر مفسر علامہ قرطبی ہیں۔ ان کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن تفسیری ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ یہ تفسیر کئی اعتبار سے ایک قابل ذکر تفسیر ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تفسیر ہے۔ پوری دنیائے اسلام میں وہ ایک خاص رجحان کی نمائندہ ہے اور اس میں بعض ایسے اوصاف پائے جاتے ہیں جو اسے عام تفاسیر سے ممتاز بناتے ہیں۔ یہ عظیم تفسیر ۳۰ جلدوں میں ہے اور اور تفسیر قرآن کے متعلق جتنا مواد اس وقت تک موجود تھا وہ سارا انہوں نے اپنی اس فاضلانہ کتاب میں سمو دیا ہے۔ الجامع لاحکام القرآن واقعی قرآن مجید کے تمام احکام وقوانین کی جامع ہے۔ علامہ قرطبی قرطبہ کے رہنے والے تھے اور علامہ ابن عطیہ غرناطہ کے رہنے والے تھے۔ ان دونوں حضرات کی یہ دونوں تفسیریں مسلم اسپین (اندلس مرحوم) میں لکھی جانے والی بہترین تفاسیر ہیں۔ جب تک یہ تفاسیر دنیا میں زندہ رہیں گی اسپین کے علماء اور مفسرین قرآن کا تذکرہ بھی زندہ رہے گا اور اندلس کی فردوس گم گشتہ کو یاد رکھنے کا سبق بھی ہمیں ملتا رہے گا۔

اس کے بعد تفسیر قرآن کے بارے میں ایک اور اہم بلکہ سب سے اہم اور نمایاں ترین کام جو ہوا ہے وہ قرآن پاک کی فصاحت اور ادبی اعجاز کے موضوع پر ہے۔ یہ کام علامہ محمود بن عمر جار اللہ زمخشری کا ہے۔ جن کو تاریخ تفسیر و مفسرین میں بہت اونچا اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کو قرآن مجید کی ادبی، نحوی اور بلاغی تفسیر میں جو رتبہ حاصل ہوا وہ شاید کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ ابن خلدون کا نام آپ نے سنا ہوگا، وہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم، مفکر اور مورخ تھے۔ ابن

خلدون نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے قرآن کی فصاحت اور بلاغت کو اس طرح سمجھا ہے جیسا کہ اسے سمجھنا چاہیے تو وہ صرف دو آدمیوں نے سمجھا ہے ایک تھے عبدالقاہر جرجانی، اور دوسرے تھے علامہ جاراللہ زمخشری، جن کا اصل نام محمود تھا اور جو میرے ہم نام تھے، یہ اپنی زندگی کے آخری دور میں ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں آباد ہو گئے تھے۔ اور بیت اللہ کا پڑوس انہوں نے اختیار کر لیا تھا اس لیے لوگ ان کو احتراماً جاراللہ کہا کرتے تھے۔

علامہ جاراللہ زمخشری اپنے خیالات و مسلک کے اعتبار سے معتزلی تھے، جو اہل سنت والجماعت کے نزدیک چند قابل اعتراض خیالات اور بعض غلط تصورات پر مبنی مسلک ہے۔ انہوں نے اپنی اس تفسیر میں جہاں قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر گفتگو کا حق ادا کر دیا ہے وہاں جا بجا اپنے معتزلی عقائد کا بھی دفاع کیا ہے اور قرآن مجید سے ان کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے ان کی اس تفسیر پر بڑی تنقید بھی کی گئی۔ لیکن جس پہلو سے ان کی تفسیر بہت نمایاں ہے وہ قرآن مجید کی فصاحت اور بلاغت کا پہلو ہے۔ واقعتاً قرآن مجید کی فصاحت اور بلاغت کو جس طرح زمخشری نے سمجھا اس طرح کوئی نہیں سمجھ سکا۔ بعد میں جتنے آنے والے اہل علم اور مفسرین ہیں۔ ان میں سے جس کسی نے بھی قرآن مجید کی فصاحت اور بلاغت پر کچھ لکھنا چاہا وہ زمخشری کی تحقیقات سے صرف نظر نہ کر سکا۔ خواہ اس کا تعلق مسلمانوں کے کسی بھی فرقہ سے رہا ہو۔ ان کی کتاب کا اصل نام ہے الکشاف عن غوامض التنزیل۔ جس کو اختصار کے پیش نظر کشاف بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کا علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں ذکر کیا ہے:

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

صاحب کشاف سے مراد علامہ زمخشری ہیں، اس لیے کہ یہ اسی کشاف کے مصنف ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگر دل میں کوئی جذبہ صادق نہ ہو اور قرآن کے اندر اتر جانے کی کوئی دلی خواہش نہ ہو تو پھر کشاف کی بلاغت سے بھی کچھ حاصل نہ ہوگا۔

زمخشری کے فوراً بعد جس شخصیت کا درجہ آتا ہے۔ وہ امام رازی ہیں۔ امام رازی جن کا لقب فخر الدین رازی تھا اصلاً رے کے رہنے والے تھے، لیکن ان کی آخری عمر افغانستان اور ہرات میں گذری تھی۔ اپنے زمانہ کے نامور ترین مفسرین قرآن میں سے ہیں۔ اتنے بڑے

مفسر قرآن ہیں کہ ساتویں صدی ہجری گویا امام رازیؒ کی صدی ہے۔ ان کی وفات ۶۰۶ھ میں ہوئی۔ ان کی تفسیر اس لحاظ سے بے حد ممتاز ہے کہ اس زمانہ میں عقلیات کی جتنی ترقی ہوئی تھی۔ منطق، فلسفہ، کلام، عقائد کے میدان میں اس وقت تک جو جو تحقیقات ہوئی تھیں ان سب سے امام رازی نے تفسیر قرآن میں کام لیا۔ حامیان منطق و فلسفہ کی طرف سے اسلام کے عقائد، پر اعتراضات اور ان کے جوابات، اور اسلام کے نقطہ نظر کا عقلی اور منطقی دفاع، یہ تمام چیزیں امام رازیؒ کے یہاں جس شان سے ملتی ہیں وہ نہ پہلے کسی کے ہاں ملتی ہیں اور نہ بعد میں کسی کے ہاں۔ امام رازیؒ اس فن کے امام ہیں۔

ہم اہل پاکستان کا بھی امام رازیؒ سے ایک خاص تعلق ہے اور ایک اعتبار سے ہر پاکستانی پر امام رازیؒ کا اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ اس احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اگر آپ نے برصغیر کی تاریخ پڑھی ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ محمد بن قاسم کی فتح سندھ ملتان کے علاقے تک ہوئی تھی۔ اور اس سے آگے وہ نہیں آسکا۔ محمد بن قاسم کے واپس جانے کے بعد جب سلطنت بنوامیہ کمزور پڑی تو بعض لوگوں نے سلطنت بنوامیہ کے مختلف علاقوں، خاص طور پر دور افتادہ علاقوں اور صوبوں میں اپنی اپنی ذاتی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ پھر بنو عباس کے آنے کے بعد دوبارہ مرکزی حکومت سے تعلق قائم ہوا۔ جب بنو عباس کی حکومت کمزور ہوئی تو اس سے فائدہ اٹھا کر سندھ اور ملتان کے علاقوں پر باطنیوں اور قرامطہ نے قبضہ کر لیا اور زور شور سے اس پورے علاقہ کو انہوں نے باطنیت کا مرکز بنانا چاہا۔ مسلمانوں میں اکثریت سیدھے سادھے نومسلموں کی تھی۔ وہ باطنیوں کی ان سازشوں کو سمجھنے سے قاصر تھے، باطنی زور شور سے یہاں کے ہندوؤں کو بجائے مسلمان بنانے کے اسماعیلی بنا رہے تھے اور کمزور مسلمانوں کو بھی اسماعیلیت کے فریب میں مبتلا کر رہے تھے۔ اسی زمانہ میں یہاں کے لوگوں نے افغانستان کے حکمرانوں سے اپیل کی کہ آ کر ان کی مدد کریں اور اسماعیلیوں کی ان سازشوں کو ختم کریں۔

برصغیر کی تاریخ میں یہ ایک عجیب واقعہ رہا ہے کہ جب بھی یہاں کے مسلمانوں کو کوئی پریشانی لاحق ہوئی اور وہ یہاں کسی غیر اسلامی قوت کے ظلم وستم کا شکار ہوئے تو انہوں نے مدد طلب کرنے کے لیے ہمیشہ افغانستان ہی کی طرف دیکھا، اور افغانستان ہی کے حکمرانوں سے درخواست کی کہ ان کی مدد کے لیے آئیں اور وہ ہمیشہ مدد کے لیے آئے۔ چنانچہ افغانستان کے

حکمراں شہاب الدین غوری سے بھی درخواست کی گئی کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں۔ اسی زمانہ میں ہندو راجہ پرتھوی راج نے بھی سر اٹھا رکھا تھا۔ اور وہ اس پورے علاقہ میں، جو حدود سندھ اور ملتان سے لے کر کشمیر اور راجستھان تک پھیلا ہوا تھا، مسلمانوں پر مظالم کر رہا تھا۔ غرض یہ پورا علاقہ پرتھوی راج کے مظالم کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ پرتھوی نے ایک بہت بڑی سلطنت بنالی تھی۔ موجودہ پاکستان یعنی پشاور سے لے کر یوپی اور دہلی تک اور پورا سندھ اور راجپوتانہ تک کے علاقے اس کے حکومت میں شامل تھے۔

شہاب الدین غوری نے مسلمانوں کو اس کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن اس کا پہلا حملہ کامیاب نہ ہوسکا۔ افغانستان واپس پہنچ کر اس نے قسم کھائی کہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک برصغیر کے مسلمانوں کی مدد نہیں کرلوں گا اور شکست کا داغ ان کے اوپر سے نہیں دھودوں گا۔ چنانچہ شہاب الدین نے زور شور سے فیصلہ کن حملہ کی تیاری شروع کی۔ افغانستان ہمیشہ سے ایک غریب ملک رہا ہے۔ شہاب الدین غوری کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ ہندوستان جیسے دولت مند ملک اور پرتھوی راج جیسے بڑے راجہ سے ٹکر لے سکیں۔ انہوں نے چندے کی اپیل کی، جس کے جواب میں امام رازیؒ نے ایک خطیر رقم چندہ کے طور پر شہاب الدین غوری کو دی۔ جس کی تفصیل بہت دلچسپ اور عجیب ہے۔

امام رازیؒ کے دو صاحبزادے بہت حسین، جمیل اور لائق فائق تھے۔ ہرات میں ایک بہت بڑا تاجر تھا جس کی تجارت پورے علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس تاجر کی دو بیٹیاں تھیں اور اس کے پاس دولت بھی بے حساب تھی۔ وہ ایک علم دوست شخص تھا۔ اس کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنی دونوں بیٹیاں امام رازیؒ کے سپرد کردیں اور درخواست کی کہ ان کا خیال بھی رکھیں اور جوان ہونے پر اپنے تعلیم یافتہ اور خوبرو صاحبزادوں سے ان کی شادیاں کردیں۔ امام رازیؒ نے ایسا ہی کیا۔ یوں وہ ساری دولت امام رازیؒ کے گھر میں آگئی۔ امام رازی نے یہ تمام دولت قرض کے طور پر شہاب الدین غوری کے حوالہ کردی۔ اس سے لشکر تیار ہوا اور اس لشکر نے پرتھوی راج کو شکست دی۔ اور یوں اسماعیلیوں کے چنگل سے یہ علاقہ آزاد ہوگیا۔ پہلی مرتبہ شہاب الدین غوری نے یہاں آزاد مسلم مملکت قائم کی۔ اور آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہاں آزاد مسلم مملکت قائم ہے۔ اس طرح ہم سب امام رازیؒ اور شہاب الدین غوری کے مرہون منت ہیں۔

امام کا پیسہ نہ ہوتا اور غوری کا حوصلہ اور ہمت نہ ہوتی تو شاید آج یہ جگہ اسلام کے زیر نگیں نہ ہوتی۔

غرض امام رازیؒ کی تفسیر اس اعتبار سے بہت ممتاز اور نمایاں ہے کہ انہوں نے اپنے بے پناہ عقلی استدلال اور منطقی انداز گفتگو سے قرآن مجید کے حقائق و معارف کی تائید میں دلائل کے انبار لگا دیے ہیں۔ رازی اور زمخشری دونوں کی تفاسیر نے بعد کے قریب قریب تمام مفسرین پر بہت اثر ڈالا۔ زمخشری کے فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار نے اور امام رازیؒ کی عقلیات کے بلند معیار نے ہر طالب علم کو اپنا گرویدہ کیا۔ لیکن عام طور پر قرآن مجید کے طلباء کو امام رازیؒ سے یہ شکایت تھی کہ ان کے ہاں خالص قرآنی مسائل اور اصل تفسیری معاملات پر زور کم ہے اور عقلیات پر زور ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ خود بہت اونچے درجہ کے فلسفی تھے اور عقلیات میں ان کے ہاں بے شمار مباحث ملتے ہیں، لیکن لوگ تفسیر قرآن کے باب میں عقلیات کی اس بہتات اور منطقی استدلال و قیاس کی اس کثرت اور زیادتی سے مطمئن نہیں تھے۔

دوسری طرف زمخشری کی فصاحت اور بلاغت سے تو متاثر تھے، لیکن ان کے معتزلی عقائد کے بارہ میں لوگوں کو شدید تحفظات تھے۔ اس لیے بعد میں ایسی تفسیریں لکھی گئیں جن میں ان دونوں کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔ کوشش کی گئی کہ جہاں تک فصاحت اور بلاغت کے نکتوں کا تعلق ہے وہ زمخشری سے لے لیے جائیں، اور جہاں تک عقلیات کا معاملہ ہے اس میں امام رازیؒ کی تفسیر سے راہنمائی لی جائے اور توازن کے ساتھ قرآن مجید کی تفسیر صحیح عقائد کے ساتھ بیان کر دی جائے۔ یہ کام کرنے کا متعدد حضرات نے بیڑا اٹھایا۔ ان میں سب سے قابل ذکر نام قاضی ناصر الدین بیضاوی کا ہے۔ جن کی تفسیر بیضاوی مشہور ہے۔ قاضی بیضاوی نے ان دونوں مصنفین سے بھرپور استفادہ کیا۔ زمخشری سے فصاحت و بلاغت کے نکتے لیے اور امام رازی کے عقلی استدلال سے فائدہ اٹھایا۔ بیضاوی شافعی المسلک تھے۔ انہوں نے شافعی نقطہ نظر سے فقہی احکام کو بیان کیا۔

اسی زمانے میں دو اور مفسر مشہور ہوئے۔ علامہ نسفی اور علامہ بغوی۔ یہ دونوں حنفی تھے۔ انہوں نے دو تفسیریں مدارک التنزیل اور معالم التنزیل کے نام سے لکھیں۔ یہ دونوں نہ صرف اپنے زمانہ میں بہت مقبول تفسیریں رہیں بلکہ آج بھی ان کا شمار معروف اور مستند تفسیروں میں ہوتا ہے۔ پورے وسطی ایشیا، برصغیر، افغانستان اور بنگلا دیش جہاں جہاں فقہ حنفی کے ماننے والے ہیں

وہاں یہ دونوں تفسیریں آج بھی خصوصیت سے مقبول ہیں۔ تفسیر بیضاوی نسبتاً وہاں زیادہ مقبول ہوئی جہاں فقہ شافعی کے ماننے والے زیادہ تھے۔ لیکن بیضاوی ہمارے برصغیر میں بھی بہت مقبول رہی، اس لیے کہ اس کا اور اس کے مصنف کا علمی درجہ اتنا اونچا تھا کہ فقہی اختلاف کے باوجود ان کی تفسیر غیر شافعی علاقوں میں بھی بہت مقبول ہوئی۔

اس کے بعد کی تفصیلات میں چھوڑ دیتا ہوں۔ اب آٹھویں صدی ہجری میں آتے ہیں جب ایک ایسے مفسر پیدا ہوئے جن کی تفسیر آج تک ہر جگہ اور ہر طبقہ میں مقبول ہے۔ اس کے انگریزی، اردو، فارسی، انڈونیشی، اور ملائی زبان میں ترجمے موجود ہیں۔ یہ ہیں علامہ ابن کثیر دمشقی۔ علامہ ابن کثیر اپنے زمانہ کے انتہائی نامور اور صف اول کے محدثین میں سے تھے۔ وہ دنیائے اسلام کے صف اول کے مورخ بھی ہیں اور محدث بھی۔ علم تاریخ اور علم حدیث دونوں میں ان کا درجہ بہت اونچا ہے۔ دنیائے اسلام میں تاریخ پر جو چند بہترین اور مقبول ترین کتابیں لکھی گئیں ان میں سے ایک کتاب ان کی کتاب البدایہ والنہایہ ہے۔ یہ کتاب پوری دنیا کی تاریخ سے بحث کرتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر اپنے زمانہ تک کی تاریخ انہوں نے مرتب کردی ہے۔

علامہ ابن کثیر نے ایک تفسیر لکھی جو تفسیر القرآن العظیم کے نام سے معروف ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے تفسیر کا جو بنیادی ڈھانچہ کھڑا کیا وہ روایات واحادیث کی بنیاد پر کیا۔ غالباً انہوں نے یہ محسوس کیا کہ علامہ زمخشری کے زیر اثر لوگ قرآن مجید سے ہدایت اور رہنمائی لینے پر کم توجہ دے رہے ہیں اور اس کے ادبی محاسن پر توجہ زیادہ دے رہے ہیں۔ قرآن مجید میں بے شک غیر معمولی ادبی محاسن موجود ہیں اور بلاغت میں اس کا معیار اتنا اونچا ہے کہ وہ معجزہ کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے، مگر اصل میں یہ کتاب ایک کتاب ہدایت ہے۔ اس سے راہنمائی لینا ہی اس کا مقصد نزول ہے۔ اگر سارا وقت محض اس کے لغت اور ادب پر عش عش کرنے میں گزار دیں اور بس اسی بات پر زندگی بھر سر دھنتے رہیں کہ اس کا اسلوب بڑا ادیبانہ ہے اور اس کا انداز بڑا خطیبانہ ہے اور اس سے ہدایت لینے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کریں تو قرآن مجید کی تفسیر کا یہ صحیح استعمال نہیں ہوگا۔ لیکن زمخشری نے اتنا بھرپور کام کیا تھا کہ یہ اثر پیدا ہونا شاید فطری تھا۔

اسی طرح امام رازی کی عقلیات اتنی زوردار تھیں کہ ان سے متاثر مفسرین قرآن کے

طالب علم بننے کے بجائے، عقلیات کے طالب علم زیادہ ہو گئے۔ پہلے دن جو میں نے علم حضوری اور علم حصولی کی بات کی تھی وہ آپ کو یاد ہوگی۔ امام رازی کے بہت سے قارئین کے ہاں قرآن پڑھتے وقت علم حضوری کی جو کیفیت ہونی چاہیے تھی وہ ختم یا کمزور ہوگئی۔ اور علم حصولی کے دلائل زیادہ ہو گئے اور عقلی استدلال کا عنصر بڑھتا چلا گیا۔

غالباً یہ پس منظر تھا جس میں علامہ ابن کثیرؒ نے یہ چاہا کہ ایک ایسی تفسیر لکھی جائے جو اس غیر ضروری عقلیاتی رجحان کو تھوڑا سا کم کر کے کچھ توازن پیدا کرے اور قرآن مجید کو اصلاً ایک کتاب ہدایت کے طور پر پیش کرے۔ چنانچہ انہوں نے یہ تفسیر مرتب کی جو تفسیر ابن کثیر کے نام سے معروف ہے۔ انہوں نے تفسیری روایات کے پورے ذخیرے میں سے چھانٹ کر ان کے نزدیک جو صحیح ترین، مستند ترین اور جامع ترین روایات تھیں وہ جمع کیں اور ایک ایسی تفسیر مرتب کی جو اس وقت سے لے کر آج تک مقبول چلی آرہی ہے۔ علامہ ابن کثیرؒ کا انتقال ۷۷۴ء میں ہوا تھا۔ گویا ان کے انتقال کو ساڑھے چھ سو سال ہو چکے ہیں۔ لیکن ان ساڑھے چھ سو سال میں تفسیر ابن کثیر کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دنیائے اسلام میں انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک شاید کوئی ایسی اعلیٰ دینی درسگاہ نہیں ہے جس میں بلا اختلاف مسلک، بلا اختلاف فقہ اور بلا اختلاف نقطہ نظر تفسیر ابن کثیر نہ پڑھی جاتی ہو۔ اور اس سے استفادہ نہ کیا جاتا ہو۔ یہ علامہ ابن کثیر کے غیر معمولی اخلاص اور علمیت کی دلیل ہے۔

اس کے بعد ایک طویل عرصہ گزرا جسے ہم چھوڑ دیتے ہیں۔ اس عرصہ میں تفسیری کام جاری رہا۔ اہل علم مختلف پہلوؤں سے تفسیر قرآن کا کام کرتے رہے۔ لیکن آٹھویں صدی ہجری کے بعد آئندہ چار سو سال تک کسی نئے اسلوب اور کسی قابل ذکر نئے رجحان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس لیے ہم براہ راست تیرہویں صدی ہجری میں آجاتے ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری میں دو تفسیریں قابل ذکر ہیں ایک تفسیر صدی کے شروع کی ہے۔ اور دوسری صدی کے آخر کی ہے۔ تیرہویں صدی کے شروع کی نمایاں ترین تفسیر روح المعانی ہے۔ جو اسی بغداد میں لکھی گئی جو آج خونم خون ہے۔ بغداد کے نامور سپوت اور دنیائے اسلام کے قابل فخر عالم، علامہ محمود آلوسی بغدادیؒ، نے ایک تفسیر لکھی تھی، جو روح المعانی کے نام سے ۳۰ جلدوں میں ہر جگہ دستیاب ہے۔ اس تفسیر کے بہت سے ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ اس اعتبار سے بہت مقبول تفسیر ہے کہ دنیائے

اسلام کے ہر طبقے اور ہر علاقے میں اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور اہل علم کے ہر طبقہ میں اس کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ جو حضرات عقلی رجحان رکھتے تھے انہوں نے اس میں عقلی مواد پایا۔ جو لوگ روحانی اور صوفیانہ مزاج رکھتے تھے ان کی دلچسپی کا سامان بھی اس میں موجود ہے۔ اس لیے کہ علامہ آلوسی خود ایک روحانی سلسلہ سے وابستہ تھے۔ فقہی رجحان رکھنے والوں کے لیے اس تفسیر میں فقہی احکام بھی تفصیل سے موجود ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک جامع تفسیر ہے اور برصغیر کے کم و بیش تمام مفسرین پر اس تفسیر کے اسلوب اور مندرجات نے اثر ڈالا ہے۔ برصغیر کی اردو تفاسیر میں شاید کوئی تفسیر ایسی نہیں ہے جس پر بالواسطہ یا بلاواسطہ علامہ آلوسی بغدادی کے اثرات نہ ہوں۔ یہ تفسیر تیرہویں صدی کے شروع میں لکھی گئی۔

ایک دوسری تفسیر تیرہویں صدی کے آخر میں لکھی گئی جو اپنے اعلیٰ علمی معیار کے باوجود دنیائے اسلام میں اتنی معروف نہیں ہوئی جتنی روح المعانی معروف ہوئی۔ یہ تفسیر علامہ جمال الدین قاسمی کی ہے جو علامۃ الشام کہلاتے تھے اور اپنے زمانہ میں شام کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ ان کو یہ عجیب وغریب خصوصیت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی کہ انہوں جو کتاب بھی لکھی وہ اپنے موضوع پر بہترین کتاب قرار پائی۔ ان کی جتنی بھی کتب ہیں وہ اس وقت تک اپنے موضوع کی بہترین کتابوں میں گنی جاتی ہیں۔ تفسیر پر ان کی کتاب کا نام محاسن التاویل ہے، یعنی بہترین شرح، یہ برصغیر میں زیادہ متعارف نہیں ہوئی، شاید اس لیے کہ شام میں ہی چھپی۔ چونکہ لوگ مختلف اسباب کی بناء پر یہاں سے بغداد آتے جاتے رہتے تھے اس لیے بغداد کی تفسیر یہاں پہنچ گئی لیکن شام کی تفسیر یہاں نہ پہنچی۔

بیسویں صدی تفسیر کے ایک نئے دور کے آغاز کی صدی ہے۔ بیسویں صدی میں جتنی تفاسیر لکھی گئیں ان کی تعداد شاید اتنی ہی ہے جتنی پورے تیرہ سو سال میں لکھی جانے والی تفسیروں کی ہے۔ تعداد کے اعتبار سے چودہویں صدی ہجری کی تفاسیر گذشتہ تیرہ صدیوں میں لکھی جانے والی تفاسیر کے تقریباً برابر ہی ہیں۔ گویا علم تفسیر کے باب میں اب ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ اور متعدد نئے نئے رجحانات سامنے آئے ہیں۔ جن کے بارے میں کسی آئندہ نشست میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ بیسویں صدی عیسوی کے تفسیری ادب اور تفسیری رجحانات پر گفتگو خود ایک نئے سلسلہ خطبات کی متقاضی ہے۔

گذشتہ صدی (یعنی چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی) میں جن تفاسیر نے تفسیری ادب اور مسلمانوں کے عمومی فکر پر بہت زیادہ اثر ڈالا ان کے بارے میں تفصیل اور قطعیت سے کچھ کہنا بہت دشوار ہے۔ دو ماہ قبل کی بات ہے کہ کسی مغربی ادارہ سے ایک سوال نامہ آیا، جس میں وہ یہ جاننے میں دلچسپی رکھتے تھے کہ بیسویں صدی میں مسلمانوں پر کن علمی اور فکری شخصیات اور نامور لوگوں کے سب سے زیادہ اثرات ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی مذہبی فکر کی تشکیل میں کن شخصیتوں یا عوامل کا سب سے زیادہ اثر رہا ہے۔ اس کے بارے میں وہ شاید کچھ معلومات جمع کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے اداروں اور نامور شخصیتوں کو خطوط لکھے اور یہ پوچھا کہ دنیائے اسلام کی وہ دس اہم شخصیتیں کون سی ہیں جن کا مسلمانوں پر بہت گہرا اثر ہے۔ اور وہ کون سی دس اہم ترین تفاسیر ہیں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھنے میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ مدد کی۔

ہماری یونیورسٹی میں بھی یہ سوال آیا اور کئی اہل علم حضرات نے بیٹھ کر اس پر غور وخوض کیا۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس کا تعین کرنا بے حد دشوار ہے کہ بیسویں صدی عیسوی اور چودہویں صدی ہجری کی وہ کون سی تفاسیر ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ وہ سب سے مقبول اور سب سے زیادہ نمائندہ حیثیت کی حامل تفاسیر ہیں۔ اس لیے کہ ہر تفسیر کے اپنے اپنے اثرات ہیں۔ جن لوگوں نے جو تفاسیر زیادہ پڑھی ہیں یا جو لوگ جس مفسر سے زیادہ مانوس ہیں ان کے خیال میں وہی تفسیریں اور وہی مفسرین اس باب میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اور جنہوں نے کسی دوسری تفسیر کو زیادہ پڑھا ہے اور اس کے مفسر سے زیادہ کسب فیض کیا ہے ان کے خیال میں وہ نمایاں ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تفاسیر ہی اپنی اپنی جگہ نمایاں ہیں۔

بعض تفاسیر ایسی ہیں کہ انہوں نے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا ہے۔ مثلاً مولانا مودودی صاحب کی تفہیم القرآن جسے لاکھوں انسانوں نے پڑھا ہے اور آج بھی لاکھوں قارئین اس کو پڑھ رہے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے بڑی تعداد میں لوگوں کو متاثر کیا اور ایک نیا رجحان تفسیر میں پیدا کیا۔ مفتی محمد شفیع صاحب کی تفسیر ہے جس کے پچیس تیس ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اتنی کثرت سے شاید کسی اور تفسیر کے ایڈیشن (تفہیم القران کے علاوہ) نہیں نکلے۔

عرب دنیا میں سید قطبؒ کی فی ظلال القران ہے۔ جس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

اس قدر کثرت سے اس کے بھی ایڈیشن نکلے ہیں کہ اب تعداد کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔حالانکہ یہ تفسیر جیل میں بیٹھ کر لکھی گئی تھی جہاں ان کے پاس نہ کتابیں تھیں، نہ وسائل تھے اور نہ مآخذ ومصادر تھے۔انہوں نے اس تفسیر کو اپنے تاثرات کے سے انداز میں لکھا ہے۔عربی زبان کے ایک بالغ نظر ادیب کا کہنا ہے کہ بیسویں صدی میں عربی زبان میں کوئی تحریر اتنی جاندار اور اتنی زوردار نہیں لکھی گئی ہے جتنی سید قطبؒ کی فی ظلال القرآن ہے۔ یہ کتاب زور بیان، غیر معمولی زبان دانی، خطابت اور قلمکاری کا شاہکار ہے۔ایسا نمونہ بیسویں صدی کی کسی اور عربی تحریر میں نہیں ملتا۔ پڑھنے والا اس تفسیر میں ایسا بے خود ہو کر بہتا چلا جاتا ہے کہ اس کو کچھ خبر نہیں رہتی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

بیسویں صدی کی اور بھی تفاسیر ہیں جن پر رجحان کے سلسلہ میں گفتگو کی جائے تو بات طویل ہوتی چلی جائے گی۔ آخری دو تفاسیر کا حوالہ دے کر گفتگو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ ایک تفسیر عربی میں ہے اور دوسری اردو میں ہمارے برصغیر کی ہے۔آپ نے نام سنا ہوگا، ڈاکٹر وھبہ زحیلی ایک مشہور اور جید عالم ہیں، میرے گہرے دوست اور پاکستان کے بڑے خیر خواہ ہیں، شام کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے دو کتابیں بہت غیر معمولی لکھی ہیں۔ بہت کم لوگوں کے ساتھ ایسا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی میں اتنی مقبولیت دی ہو جتنی ڈاکٹر وھبہ زحیلی کو حاصل ہوئی۔ ان کی یہ دونوں کتابیں حوالہ کی کتابیں بن گئی ہیں اور ان کے درجنوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ایک کتاب ہے الفقہ الاسلامی وادلتہ۔ اس میں فقہ کے سارے ذخیرے کا انہوں نے گویا عطر نکال کر رکھ دیا ہے۔ فقہ اسلامی کے بحر ناپیدا کنار کی روح نکال کر دس جلدوں میں مرتب کر دی ہے۔ میں نے کوئی اسلامی لائبریری ایسی نہیں دیکھی کہ جہاں لوگ فقہ یا اسلامی قانون پر کام کر رہے ہوں اور یہ کتاب ان کے پاس موجود نہ ہو۔ ڈاکٹر وھبہ زحیلی کی اس ایک کتاب نے اہل علم کو بہت سی دوسری کتابوں سے مستغنی کر دیا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے فقہ اسلامی کے اداروں کی ڈاکٹر وھبہ زحیلی کو رکنیت حاصل ہے۔

انہوں نے اس کتاب کو مکمل کرنے کے بعد اسی انداز میں ایک تفسیر بھی لکھی ہے جس کی ۳۰ جلدیں ہیں۔ انہوں نے پورے تفسیری ذخیرے کا عطر اور اس کی روح نکال کر اس تفسیر میں جمع کر دی ہے۔ اس تفسیر کے بھی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اور یہ دنیا میں مقبول ہو رہی ہے۔ اس

تفسیر کے بارے میں بقیہ تفصیل پرسوں پیش کروں گا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، برصغیر میں گذشتہ دو صدیوں میں تفسیر پر بہت کام ہوا ہے۔ کمی اعتبار سے بھی اور کیفی اعتبار سے بھی۔ اس میں سب سے نمایاں کام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان کا ہے۔ انہوں نے خود تو اردو میں کام نہیں کیا، اس لیے کہ ان کی علمی اور تحریری زبان اردو نہیں تھی، بلکہ اس زمانہ کی علمی زبان فارسی تھی۔ لیکن ان کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن مجید کا سب سے پہلا اردو ترجمہ کیا۔ یہ بات ہمارے لیے بے حد خوشی اور فخر کی ہے کہ جو لقب صحابہ اور تابعین نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو دیا تھا وہی لقب برصغیر کے مسلمانوں نے شاہ عبدالقادر صاحب کو دیا۔ یعنی ترجمان القران۔ شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادوں میں یہ تیسرے نمبر پر تھے۔

شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا تھا جو اب ذرا قدیم ہوگیا ہے، لیکن یہ ترجمہ ان کے پچاس سالہ مطالعہ قرآن کا نچوڑ تھا۔ انہوں نے خود پچاس سال قرآن مجید کا درس دیا۔ ان کے والد شاہ ولی اللہؒ قرآن مجید کا درس دیتے رہے، اور ان کے والد شاہ عبدالرحیم بھی قرآن مجید کا درس دیتے رہے۔ گویا کم وبیش ۱۰۰ برس کی خاندانی روایت فہم قرآن اور اپنا پچاس سالہ ذاتی مطالعہ۔ اس سب کی روشنی میں انہوں نے وہ ترجمہ کیا جو نہ صرف اردو کا سب سے پہلا ترجمہ قرآن ہے بلکہ صحت کے اعتبار سے اردو کا بہترین ترجمہ قرآن بھی ہے۔ اگر آپ اس سے استفادہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ قرآن مجید کے بہت سے مشکل مقامات جہاں مفسرین نے بہت لمبی لمبی بحثیں کی ہیں اور بہت سے سوالات اٹھائے ہیں وہاں شاہ صاحب ترجمہ اس طرح کردیتے ہیں کہ کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ خود بخود ترجمہ سے ہی مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔ ترجمہ اگرچہ پرانا ہے اور اس کا اسلوب بھی اب متروک ہو چکا ہے لیکن اردو زبان میں اس سے بہتر ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

شاہ عبدالقادر کس درجہ کے انسان تھے۔ اس کا اندازہ دو چیزوں سے کرلیں۔ سرسید احمد خان نے انہیں بچپن میں دیکھا تھا۔ انہوں نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سرسید کی کتاب آثار الصنادید میں لکھا ہوا ہے۔ دوسری چیز ان کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے منسوب ہے۔ اس سے شاہ صاحب کے اعلیٰ روحانی مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس شام مہینے کا

چاند دیکھنا ہوتا تھا تو شاہ عبدالعزیز صاحب کسی کو عصر کی نماز کے بعد اکبرآبادی مسجد میں بھیجا کرتے تھے، اکبرآبادی مسجد وہ تھی جہاں ان کا قیام تھا اور وہیں انہوں نے ۵۰ سال گزارے، کہ دیکھ کر آؤ کہ میاں عبدالقادر نے آج کے سپارے پڑھے ہیں۔ وہ صبح کے وقت فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن کیا کرتے تھے۔ جس دن ایک پارہ پڑھتے اس دن چاند نہیں ہوتا تھا اور جس دن دو سپارے سنایا کرتے تھے اس دن ۲۹ کا چاند ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے اس چیز کو بارہا دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ یہاں تک کہ قمری مہینہ کی ۲۹ تاریخ کو لوگ پوچھنے لگے تھے کہ آج شاہ عبدالقادر صاحب نے ایک سپارہ پڑھا ہے یا دو سپارے پڑھے ہیں۔ ایک پڑھتے تو چاند نہیں ہوتا تھا اور دو پڑھتے تو چاند ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد برصغیر میں ترجمہ قرآن اور اردو میں تفسیر نویسی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ آیات احکام پر بھی نئی تفاسیر لکھی گئیں۔ شاہ عبدالقادرؒ کی پیروی میں قرآن مجید کی خدمات کرنے والوں نے تقریباً ساڑھے تین سو تراجم اردو میں کیے، اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور نئے آنے والے مفسرین اور اہل علم نئی نئی ضروریات کے پیش نظر اردو زبان میں قرآن مجید کے نئے نئے ترجمے کرتے چلے جارہے ہیں۔ ہر ترجمہ میں ایک نئی شان اور ایک نئی آن پائی جاتی ہے۔

اردو میں بے شمار تفاسیر ہیں۔ لیکن ایک تفسیر نہایت جامع ہے جس کے بارے میں نہ تو لوگوں کو بہت زیادہ علم ہے اور نہ ہی وہ بہت مقبول ہے۔ اس تفسیر کا نام مواہب الرحمن ہے۔ یہ تفسیر بے نظیر مولانا سید امیر علی ملیح آبادی نے تحریر فرمائی تھی۔ مولانا سید امیر علی ایک غیر معمولی اور جید عالم، لیکن نسبتاً ایک غیر معروف بزرگ تھے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ بنگال میں گذرا۔ اس کے بعد وہ ندوۃ العلماء لکھنو کے صدر ہو گئے اور انہوں نے وہاں قیام کے دوران میں یہ تفسیر لکھی جو قدیم انداز کی تقریباً ۱۵'۱۶ ضخیم جلدوں میں ہے۔ اگر اس کتاب کو نئے انداز طباعت سے ازسرنو شائع کیا جائے تو غالباً چالیس پچاس جلدیں بنیں گی۔ اس سے زیادہ جامع اور مفصل کوئی تفسیر اردو زبان میں موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کی زبان بھی بہت پرانی ہے اور انداز بھی بہت قدیم ہے، نہ کوئی عنوان ہے، اور نہ پیراگراف۔ الفاظ کے ہجے بھی پرانے ہیں۔ اس لیے آج کل کے پڑھنے والے اسے پڑھنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔ ان کی اردو زبان بھی ایسی ہے کہ اس میں بے شمار عربی فارسی کے الفاظ ہیں۔ جو لوگ عربی فارسی نہیں جانتے ان کے لیے اس تفسیر کو پڑھنا دشوار

ہے۔ ان کے بعد کی تفاسیر آپ کے سامنے ہیں ان پر بعد میں کسی اور فرصت میں بات کریں گے۔

ایک اور قابل ذکر تفسیر اردو کی ایک نامکمل تفسیر ہے جو سیالکوٹ کے ایک بزرگ مولانا محمد علی صدیقی نے تیار کی تھی۔ وہ انتہائی عالم فاضل انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عجیب وغریب ملکہ زود نویسی بلکہ زود تحقیق کا عطا فرمایا تھا۔ جب ۱۹۶۵ کی پاک بھارت جنگ ہوئی تو سترہ دن تک بلیک آؤٹ چلتا رہا۔ اور اس دوران میں انہوں نے ایک مضمون لکھنا شروع کیا۔ امام ابوحنیفہ اور علم حدیث۔ کسی نے ان سے کہا تھا کہ ہم نے سنا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ علم حدیث سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ اس پر انہوں نے ایک مضمون لکھنا شروع کیا اور سترہ دنوں میں انہوں نے سات سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تیار کر دی۔ جو اس موضوع پر بہترین کتاب ہے۔

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں انہوں نے ایک تفسیر لکھنی شروع کی تھی۔ اور خود مجھ سے یہ بات فرمائی تھی کہ جتنی تفاسیر آج اردو میں دستیاب ہیں وہ کسی نہ کسی مسلک سے وابستہ ہو گئی ہیں، مفتی محمد شفیع صاحب کی تفسیر بہت اچھی ہے۔ لیکن بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دیوبندی تھے، اس لیے غیر دیوبندی اس کو نہیں پڑھتے۔ مولانا مودودی صاحب کی تفسیر بہت عمدہ ہے۔ لیکن جو لوگ جماعت اسلامی کے حلقے سے باہر ہیں وہ اس کو نہیں پڑھتے۔ اسی طرح اور بھی متعدد تفاسیر ہیں، جن سے استفادہ کرنے میں لوگوں کو گروہی تعصب مانع آتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی ایسی تفسیر لکھی جائے جس میں تمام تفاسیر کی روح نکال کر رکھ دی جائے اور اس طرح اس کو پیش کیا جائے کہ ہر طبقہ کے لوگ اس کو پڑھیں اور تمام مفسرین کے خیالات وتحقیقات سے استفادہ کریں۔ اس ارادہ سے انہوں نے ایک تفسیر لکھنی شروع کی۔ تفسیر معالم القران۔ ابھی اس کی چودہ جلدیں ہی مرتب کی تھیں کہ وہ دنیا سے تشریف لے گئے۔ ابھی سولہ جلدوں کا کام باقی ہے۔ غالباً بارہ یا تیرہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ چودھویں ابھی شائع نہیں ہوئی۔ لیکن جتنا لکھا ہے اس کی بھی بڑی غیر معمولی حیثیت ہے۔ ان کا کام اس درجہ اور اس مقام کا ہے کہ لوگ اس سے استفادہ کریں۔ برصغیر کے تمام تفسیری رجحانات اور بیسویں صدی کے تمام تفسیری کام کا خلاصہ مولانا محمد علی صدیقی کی اس کتاب میں آ گیا ہے۔

یہ ایک ابتدائی تعارف تھا تاریخ اسلام کے چند اہم ترین مفسرین قرآن کا۔ ان میں

سے بہت سے اہم لوگوں کے صرف نام ہی لیے جا سکے۔ بہت بڑی تعداد میں اہل علم کے نام بھی نہیں لیے جا سکے۔ اس لیے کہ اس محدود وقت میں اس سے زیادہ ممکن نہیں تھا۔

خطبہ ہفتم

مفسرین قرآن کے تفسیری مناہج

۱۴۔اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مناہج، منہج کی جمع ہے جس کے معنی اسلوب کے آتے ہیں۔ مناہج مفسرین سے مراد وہ اسلوب، انداز اور طریق کار ہے جس کے مطابق کسی مفسر نے قرآن مجید کی تفسیر کی ہو، یا اس طریق کار کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر مرتب کرنے کا ارادہ کیا ہو۔ ہم سب کا ایمان ہے کہ قرآن مجید رہتی دنیا تک کے لیے ہے، اور دنیا کے ہر انسان کے لیے ہدایت فراہم کرتا ہے۔ اس عارضی دنیاوی زندگی میں انسانوں کو اچھا انسان بنانے میں جن جن پہلوؤں اور گوشوں کا تصور کیا جا سکتا ہے، ان سب کے بارہ میں قرآن مجید راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قرآن مجید ایک تاجر کے لیے بھی راہنما کتاب ہے، ایک معلم اور مدرس کے لیے بھی راہنما کتاب ہدایت ہے، ایک فلسفی، ماہر معاشیات اور ماہر قانون کے لیے بھی بنیادی اصول فراہم کرتا ہے۔ غرض زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کا تعلق انسان کو بہتر انسان بنانے سے ہو اور اس کے بارہ میں قرآن مجید راہنمائی نہ فراہم کرتا ہو۔

چنانچہ یہ بات بجا طور پر بالکل درست اور حقیقت حال کے عین مطابق تھی کہ گذشتہ چودہ صدیوں کے دوران میں مختلف رجحانات رکھنے والے علماء کرام نے، اور مختلف فکری ضروریات کو پورا کرنے والے اہل علم نے اپنی اپنی ضروریات اور اپنے تقاضوں کے مطابق قرآن مجید کی طرف رجوع کیا اور قرآن مجید سے راہنمائی حاصل کی۔ پھر انھوں نے اس راہنمائی کو اپنے ہم خیال، ہم ذوق اور ہم ضرورت لوگوں تک پہنچانے کا بندوبست کیا۔

پھر چونکہ قرآن مجید عربی زبان میں ہے، بلکہ عربی مبین میں ہے، اور عربی بھی وہ جو فصاحت اور بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اور عربیت کا مطالعہ بھی اہل علم کی دلچسپی کا مرکز اور محور رہا ہے، (اس جانب اس سے قبل ایک خطبہ

میں اشارہ کیا جاچکا ہے) چنانچہ بہت جلد جہاں دوسرے علم وفنون میں تخصص شروع ہوا وہاں قرآن مجید کے علوم وفنون میں بھی مختلف رجحانات کے مطابق تخصص کا عمل شروع ہو گیا۔ اس پورے عمل کی بنیاد صحابہ کرامؓ کے تفسیری دروس اور ان سے منقول تفسیری روایات ہیں۔

جیسا کہ پہلے کئی بار عرض کیا گیا، جن صحابہ کرام سے تفسیری روایات مروی ہیں یا جن کے تفسیری اجتہادات کا بعد کے تفسیری ادب پر گہرا اثر ہے ان میں نمایاں ترین صحابہ کرامؓ دو ہیں۔ سیدنا علی بن ابی طالبؓ اور سیدنا عبداللہ بن عباسؓ۔ ان دونوں بزرگوں کی تفسیری روایات میں وہ تمام بنیادی عناصر روز اول ہی سے واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں جن کے مطابق بعد میں تفسیریں لکھی جاتی رہیں۔ یہ دونوں حضرات صحابہ کرام میں اپنے ادبی ذوق کے اعتبار سے، عربیت میں اپنی مہارت کے لحاظ سے، غیر معمولی خطابت کے اور بلاغت کے نقطہ نظر سے، اپنی فقہیانہ بصیرت کے اعتبار سے، اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ اپنی غیر معمولی بالغ نظری، غیر معمولی وسعت نظر اور غیر معمولی تعمق فکر میں بہت نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ یہ بات اس لیے یاد رکھنی ضروری ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کے جتنے رجحانات اور اسالیب مختلف اوقات میں سامنے آئے ہیں ان میں سے کسی اسلوب کے بارے میں یہ تصور کرنا درست نہیں ہوگا کہ وہ صحابہ کرام سے مروی ان روایات کے تسلسل سے بالکل ہٹ کر کوئی نئی چیز ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان تمام رجحانات کی سند صحابہ کرام کے اقوال وارشادات سے ملتی ہے۔ ان سب اسالیب ومناہج کی بنیادیں صحابہ کرام سے مروی روایات اور ان اجتہادات میں موجود ہیں، جو صحابہ کرام نے قرآن مجید کے بارے میں کیے۔ اور خاص طور پر ان دو صحابہ کرام کے تفسیری اقوال واجتہادات میں وہ سب عناصر موجود ہیں جن سے بڑی تعداد میں تابعین نے استفادہ کیا۔ ان میں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ان کے بعض مشہور تلامذہ کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ سیدنا علیؓ اور ان کے تفسیری رجحانات کے بارے میں بھی اشارہ کیا جاچکا ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بہت بڑی ہے۔ جن سے خاص طور پر کوفہ اور مدینہ منورہ میں تفسیری روایات عام ہوئیں۔

یہ تعین تو قطعی طور پر کرنا ممکن نہیں ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں کل کتنے رجحانات پیدا ہوئے۔ اس لیے کہ جب تک انسانی ذہن کام کرتا رہے گا، نئے نئے رجحانات پیدا ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ خود بیسویں صدی میں کئی نئے رجحانات سامنے آئے جن کا آگے چل کر تذکرہ کیا

جائے گا۔ جب تک انسان روئے زمین پر موجود ہے اور قرآن مجید کے ماننے والے موجود ہیں وہ قرآن مجید کے نئے نئے مطالب اور معانی پر غور کرتے رہیں گے اور یوں علم تفسیر کے نئے نئے اسالیب، نئے نئے مناہج اور نئے نئے رجحانات سامنے آتے رہیں گے۔

مطالعہ قرآن کی ایک خاص جہت اور اس سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ جو ابھی ابھی میرے ذہن میں آیا ہے، میں پہلے اس کا ذکر کر دیتا ہوں۔ اس دلچسپ واقعہ کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ مطالعہ قرآن مجید کے ابھی اتنے اچھوتے میدان موجود ہیں جو ابھی تک زیر غور بھی نہیں لائے گئے۔ تفسیر قرآن کے تو اتنے لامتناہی سمندر موجود ہیں جن میں ابھی غوطہ زنی شروع بھی نہیں کی گئی۔ نہیں کہہ سکتے کہ ابھی علوم قرآن کے کتنے صدف اور ان میں کتنے گوہر پنہاں ہیں۔ قرآنی حقائق و معارف کے سمندروں میں غوطہ زنی جتنی ہو گئی ہے' ان کا کچھ اندازہ آج کی گفتگو سے ہو جائے گا لیکن جو نہیں ہوئی وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو اب تک ہوئی ہے۔

آپ نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا نام سنا ہوگا۔ انھوں نے خود براہ راست مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ غالباً ۱۹۵۷۔۱۹۵۸ء میں ایک شخص ان کے پاس آیا۔ ان کی زندگی کا یہ ایک عام معمول تھا کہ ہر روز دو چار لوگ ان کے پاس آتے اور اسلام قبول کرتے تھے۔ وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا کہ ایک صاحب آئے اور کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب عادت ان کو کلمہ پڑھوایا اور اسلام کا مختصر تعارف ان کے سامنے پیش کر دیا۔ اپنی بعض کتابیں انہیں دے دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ان کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی شخص ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا تھا تو وہ اس سے یہ ضرور پوچھا کرتے تھے کہ اسے اسلام کی کس چیز نے متاثر کیا ہے۔

۱۹۴۸ سے ۱۹۹۶ تک یہ معمول رہا کہ ڈاکٹر صاحب کے دست مبارک پر اوسطاً دو افراد روزانہ اسلام قبول کیا کرتے تھے۔ عموماً لوگ اسلام کے بارے میں اپنے جو تاثرات بیان کیا کرتے تھے وہ ملتے جلتے ہوتے تھے۔ ان میں نسبتاً زیادہ اہم اور نئی باتوں کو ڈاکٹر صاحب اپنے پاس قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ اس شخص نے جو بات بتائی وہ ڈاکٹر صاحب کے بقول بڑی عجیب و غریب اور منفرد نوعیت کی چیز تھی اور میرے لیے بھی بے حد حیرت انگیز تھی۔ اس نے جو کچھ کہا اس کے بارہ میں ڈاکٹر صاحب کا ارشاد تھا کہ میں اسے بالکل نہیں سمجھا اور میں اس کے بارے میں کوئی

فنی رائے نہیں دے سکتا۔ اس شخص نے بتایا: میرا نام ژاک ژیلیبر ہے۔ میں فرانسیسی بولنے والی دنیا کا سب سے بڑا موسیقار ہوں۔ میرے بنائے اور گائے ہوئے گانے اور ریکارڈ فرانسیسی زبان بولنے والی دنیا میں بہت مقبول ہیں۔

آج سے چند روز قبل مجھے ایک عرب سفیر کے ہاں کھانے کی دعوت میں جانے کا موقع ملا۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہاں سب لوگ جمع ہو چکے تھے اور نہایت خاموشی سے ایک خاص انداز کی موسیقی سن رہے تھے۔ جب میں نے وہ موسیقی سنی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ تو موسیقی کی دنیا کی کوئی بہت ہی اونچی چیز ہے جو یہ لوگ سن رہے ہیں۔ میں نے خود آوازوں کی جو دھنیں اور ان کا جونشیب وفراز ایجاد کیا ہے یہ موسیقی اس سے بھی بہت آگے ہے، بلکہ موسیقی کی اس سطح تک پہنچنے کے لیے ابھی دنیا کو بہت وقت درکار ہے۔ میں حیران تھا کہ آخر یہ کس شخص کی ایجاد کردہ موسیقی ہوسکتی ہے اور اس کی دھنیں آخر کس نے ترتیب دی ہیں۔ جب میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ یہ دھنیں کس نے بنائی ہیں تو لوگوں نے مجھے اشارہ سے خاموش کر دیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پھر یہی بات پوچھی۔ لیکن وہاں موجود حاضرین نے مجھے پھر خاموش کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے دوران میں وہ فن موسیقی کی کچھ اصطلاحات بھی استعمال کر رہا تھا جن سے میں واقف نہیں کیونکہ فن موسیقی میرا میدان نہیں۔

قصہ مختصر جب وہ موسیقی ختم ہوگئی اور وہ آواز بند ہوگئی تو پھر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ سب کیا تھا لوگوں نے بتایا کہ یہ موسیقی نہیں تھی بلکہ قرآن مجید کی تلاوت ہے اور فلاں قاری کی تلاوت ہے۔ موسیقار نے کہا کہ یقیناً یہ کسی قاری کی تلاوت ہوگی اور یہ قرآن ہوگا، مگر اس کی یہ موسیقی کس نے ترتیب دی ہے اور یہ دھنیں کس کی بنائی ہوئی ہیں؟ وہاں موجود مسلمان حاضرین نے بیک زبان وضاحت کی کہ نہ یہ دھنیں کسی کی بنائی ہوئی ہیں اور نہ ہی یہ قاری صاحب موسیقی کی ابجد سے واقف ہیں۔ اس موسیقار نے جواب میں کہا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ دھنیں کسی کی بنائی ہوئی نہ ہوں۔ لیکن اسے یقین دلایا گیا کہ قرآن مجید کا کسی دھن سے یا فن موسیقی سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ یہ فن تجوید ہے اور ایک بالکل الگ چیز ہے۔ اس نے پھر یہ پوچھا کہ اچھا پھر مجھے یہ بتاؤ کہ تجوید اور قراءت کا یہ فن کب ایجاد ہوا؟ اس پر لوگوں نے بتایا کہ یہ فن تو چودہ سو سال سے چلا آرہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کو قرآن مجید عطا فرمایا تھا تو فن تجوید کے

اصولوں کے ساتھ ہی عطا فرمایا تھا۔ اس پر اس موسیقار نے کہا کہ اگر محمدؐ نے اپنے لوگوں کو قرآن مجید اسی طرح سکھایا ہے جیسا کہ میں نے ابھی سنا ہے تو پھر بلاشبہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس لیے کہ فن موسیقی کے جو قواعد اور ضوابط اس طرز قراءت میں نظر آتے ہیں وہ اتنے اعلیٰ اور ارفع ہیں کہ دنیا ابھی وہاں تک نہیں پہنچی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب فرماتے تھے کہ میں اس کی یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ بعد میں میں نے اور بھی قراء کی تلاوت قرآن کو سنا، مسجد میں جا کر سنا اور مختلف لوگوں سے پڑھوا کر سنا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اگر یہ اللہ کی کتاب ہے تو اس کے لانے والے یقیناً اللہ کے رسول تھے۔ اس لیے آپ مجھے مسلمان کر لیں۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اسے مسلمان کر لیا۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ کس حد تک درست تھا۔ اس لیے کہ میں اس فن کا آدمی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں نے ایک الجزائری مسلمان کو جو پیرس میں زیر تعلیم تھا اس نئے موسیقار مسلمان کی دینی تعلیم کے لیے مقرر کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد وہ دونوں میرے پاس آئے اور کچھ پریشان سے معلوم ہوتے تھے۔ الجزائری معلم نے مجھے بتایا کہ یہ نومسلم قرآن مجید کے بارے میں کچھ ایسے شکوک کا اظہار کر رہا ہے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ جس بنیاد پر یہ شخص ایمان لایا تھا وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اب اس کے شکوک کا میں کیا جواب دوں گا، اور کیسے دوں گا، لیکن اللہ کا نام لے کر پوچھا کہ بتاؤ تمہیں کیا شک ہے؟ اس نومسلم نے کہا کہ آپ نے مجھے یہ بتایا تھا اور کتابوں میں بھی میں نے پڑھا ہے کہ قرآن مجید بعینہ اسی شکل میں آج موجود ہے جس شکل میں اس کے لانے والے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام نے اسے صحابہ کرام کے سپرد کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ واقعی ایسا ہی ہے۔ اب اس نے کہا کہ ان صاحب نے مجھے اب تک جتنا قرآن مجید پڑھایا ہے اس میں ایک جگہ کے بارہ میں مجھے لگتا ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور حذف ہو گئی ہے۔

اس نے بتایا کہ انہوں نے مجھے سورہ نصر پڑھائی ہے اور اس میں افواجا اور فسبح کے درمیان خلا ہے۔ جس طرح کہ انہوں نے مجھے پڑھایا ہے وہاں افواجاً پر وقف کیا گیا ہے۔ وقف کرنے سے وہاں سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے جو نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ جبکہ میرا فن کہتا ہے کہ یہاں خلا نہیں

ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ یہ سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس شبہ کا جواب کیا دیں اور کس طرح مطمئن کریں۔ کہتے ہیں کہ میں نے فوراً دنیائے اسلام پر نگاہ دوڑائی تو کوئی ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آیا جو فن موسیقی سے بھی واقفیت رکھتا ہو اور تجوید بھی جانتا ہو۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ چند سکینڈ کی شش و پنج کے بعد بالکل اچانک اور یکا یک میرے ذہن میں ایک پرانی بات اللہ تعالیٰ نے ڈالی کہ میں اپنے بچپن میں جب مکتب میں قرآن مجید پڑھا کرتا تھا تو میرے معلم نے مجھے نے بتایا تھا کہ افواجا پر وقف نہیں کرنا چاہیے بلکہ افواجاً کو بعد کے لفظ سے ملا کر پڑھا جائے۔ ایک مرتبہ میں نے افواجا پر وقف کیا تھا تو اس پر انہوں نے مجھے سزا دی تھی اور سختی سے تاکید کی تھی کہ افواجاً کو آگے ملا کر پڑھا کریں۔ میں نے سوچا کہ شائد اس بات سے اس کا شبہ دور ہوجائے اور اس کو اطمینان ہوجائے۔ میں نے اسے بتایا کہ آپ کے جو پڑھانے والے ہیں وہ تجوید کے اتنے ماہر نہیں ہیں۔ دراصل یہاں اس لفظ کو غنہ کے ساتھ آگے سے ملا کر پڑھا جائے گا۔ افواجاً فسبح۔ ڈاکٹر صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ وہ خوشی سے اچھل کر کھڑا ہوگیا اور مجھے گود میں لے کر کمرے میں ناچنے لگا اور کہنے لگا کہ واقعی ایسے ہی ہونا چاہیے۔ یہ سن کر اس کو میں نے ایک دوسرے قاری کے سپرد کردیا جس نے اس شخص کو پورے قرآن پاک کی تعلیم دی۔ وہ وقتاً فوقتاً مجھ سے ملتا تھا اور بہت سر دھنتا تھا کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ وہ بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا، اور ایک کامیاب اسلامی زندگی گذارنے کے بعد ۱۹۷۰ کے لگ بھگ اس کا انتقال ہوگیا۔

اس واقعہ سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی جو صوتیات ہے، یہ علم و فن کی ایک ایسی دنیا ہے، جس میں کوئی محقق آج تک نہیں اترا ہے۔ اور نہ ہی قرآن مجید کے اس پہلو پر اب تک کسی نے اس انداز سے غور و خوض کیا ہے۔ اس واقعہ کے سننے تک کم از کم میرا تاثر کیا خیال بھی یہی تھ کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کو بہت اچھی طرح پڑھتا ہے، غنہ اخفا، اظہار وغیرہ کا خیال کرتا ہے تو یہ ایک اچھی بات ہے۔ لیکن اس فن کی اتنی زیادہ اہمیت سے میں اس سے قبل واقف نہیں تھا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تجوید کا یہ فن بھی بے حد اہم چیز ہے۔

آج سے کچھ سال پہلے ایک شخص نے جو بعد میں اسلام دشمن ثابت ہوا قرآن مجید کے

حروف وکلمات کی تعداد پر کمپیوٹر کی مدد سے تحقیق شروع کی تھی۔ چونکہ اس نے بعد میں بہت سی غلط باتیں کہیں اور ایک گمراہ فرقہ سے اس کا تعلق ثابت ہوا اس لیے اس کی بات کو جلد ہی لوگ بھول گئے اور توجہ نہیں دی۔ لیکن اس نے کوئی ۲۵، ۳۰ سال قبل قرآن مجید کے اعداد وشمار کو کمپیوٹر کی بنیاد پر جمع کیا تھا اور یہ کوشش کی تھی کہ وہ یہ دیکھے کہ قرآن مجید میں کون کون سے الفاظ وکلمات کتنی بار آئے ہیں اور ان میں کیا حکمت ہے۔ پھر یہ کہ قرآن مجید میں جو الفاظ آئے ہیں وہ کیوں آئے ہیں۔ اور جو نہیں آئے وہ کیوں نہیں آئے۔ اس تحقیق سے اس نے بہت نکتے نکالے۔

مثال کے طور پر اس نے ایک بات یہ دریافت کی کہ قرآن مجید کی جن سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات آئے ہیں ان حروف مقطعات کا ہر حرف اس سورت میں یا تو ۱۹ مرتبہ استعمال ہوا ہے یا اتنی مرتبہ کہ اس کو ۱۹ پر برابر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت اس کی اہمیت کا کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ مثلاً اگر کسی سورت میں ب ۱۰۰ مرتبہ استعمال ہوا ہو، اور ش ۹۰ مرتبہ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ البتہ اس نے کئی چیزیں ایسی دریافت کیں جن سے اندازہ ہوا کہ یہ بات اتنی غیر اہم نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس قابل ہے کہ اس پر گہرائی سے غور کرنا چاہیے۔ مثلاً اس نے کہا کہ قرآن مجید میں ہر جگہ قوم لوط کا ذکر آیا ہے کہ قوم لوط نے یہ کیا، اور قوم لوط نے وہ کیا۔ سورۃ ق کے آغاز میں حرف ق جو بطور حروف مقطعات کے استعمال ہوا ہے، وہ ۱۹ کے عدد کے ساتھ وابستہ ہے اور اس سورۃ میں قرآن مجید کا وہ واحد مقام ہے جہاں قوم لوط کے بجائے اخوان لوط کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ اگر قوم لوط کا لفظ ہوتا تو ق کا ایک عدد بڑھ جاتا تھا۔ قرآن پاک میں ۱۹ کے اس عدد کی تکرار کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر ان دو مثالوں سے یہ ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابھی قرآن مجید پر غور وخوض کے نئے نئے دروازے کھلتے ہیں اور نئے نئے رجحان پیدا ہوتے ہیں۔

آج کی گفتگو میں ان دو دلچسپ تمہیدی مثالوں کے بعد، تفسیر قرآن میں روز آغاز سے لے کر اب تک جو بڑے بڑے رجحانات سامنے آئے ہیں ان کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ ان رجحانات میں سب سے بڑا اور سب سے نمایاں رجحان تفسیر بالماثور کا ہے۔ یعنی اس بات کا التزام کرنا کہ قرآن مجید کی تفسیر صرف ان روایات کی بنیاد پر کی جائے جو صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور ماخذ، یا کسی اور مصدر کو تفسیر قرآن کے باب میں اثر

انداز ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔حتیٰ عربی زبان، اس کے ماخذ، ذاتی اجتہاد، فکر اور بصیرت کسی چیز کو اس میں دخل دینے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ رجحان شروع میں یعنی ابتدائی دو تین صدیوں میں تفسیر قرآن کا مضبوط ترین اور اہم ترین رجحان تھا۔ اس رجحان کے زیادہ مضبوط اور مقبول ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ صحابہ کرام سے آنے والا وقیع تفسیری سرمایہ لوگوں کے سامنے موجود تھا اور تابعین نے اس کو بہت تفصیل، احتیاط اور دقت نظر سے مرتب کر دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے اہل علم کا انتہائی تقویٰ اور انتہائی محتاط رویہ بھی اس رجحان کے فروغ میں مدد معاون ثابت ہوا کہ وہ تفسیر بالماثور کے علاوہ کسی اور انداز کی تفسیر کے عمل کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔ اس لیے جتنی بھی تفاسیر ابتدائی صدیوں میں لکھی گئیں وہ اکثر و بیشتر تفسیر بالماثور ہی کے انداز کی لکھی گئیں۔یعنی تمام تفسیری روایات کو جمع کر کے اور ان کو سامنے رکھ کر قرآنی آیت کی تفسیر بیان کر دی جائے۔

تفسیر بالماثور کے نام سے جو مواد جمع ہوا وہ بلاشبہ تفسیر کے اہم ترین ماخذ میں سے ایک ماخذ ہے۔ بہت سی تفسیریں ایسی ہیں جو صرف تفسیر بالماثور کی بنیاد پر لکھی گئیں۔لیکن بعض تفاسیر ایسی بھی ہیں، متاخرین کے ہاں بھی اور بیشتر متقدمین کے ہاں بھی، جن کا اصل دار و مدار تو ماثور پر ہے۔لیکن انہوں نے بقیہ ماخذ اور مصادر پر بھی کچھ نہ کچھ توجہ دی ہے۔

لیکن تفسیر بالماثور کی ساری اہمیت کے باوجود وقت جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، دوسری صدی کے بعد کسی حد تک اور تیسری صدی کے بعد وسیع پیمانہ پر تفسیر بالماثور میں کمزور روایات شامل ہونے لگیں۔ دنیا کا عام قاعدہ اور مشاہدہ ہے کہ جو چیز مقبول ہو اور بازار میں چل رہی ہو اس میں دھوکے باز بھی شامل ہونے لگتے ہیں۔ یہ ہر انسانی کاوش کے ساتھ ہوتا ہے کہ جس چیز کا بازار میں چلن ہو اس میں جعل ساز اور دو نمبر کا مال پیدا کرنے والے بھی گھس جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اصل چیز بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی ایک بہت ہی لطیف بات ہے، مجھے پسند آئی۔ انہوں نے کسی جگہ بیان کیا ہے کہ انسان کو کسی مربی کو تلاش کر کے اس کے پاس اپنی تربیت کے لیے جانا چاہیے۔ کسی نے کہا کہ آج کل تو جعلساز بہت پیدا ہو گئے ہیں اور تربیت کے نام پر چالبازیاں کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اصل لوگ بھی موجود ہیں۔ انہوں نے کہا بازار میں جعلی سکہ اسی وقت چلتا ہے جب اس بازار میں اصلی

سکہ بھی موجود ہو۔ جس بازار میں اصلی سکہ نہیں ہوگا وہاں جعلی بھی سکہ نہیں چلے گا۔ یہ معاشیات کا بڑا زبردست اصول ہے، جو بعد میں دریافت ہوا لیکن مولانا نے اس کو سب سے پہلے بیان کیا۔

چونکہ تفسیر بالماثور سکہ رائج الوقت تھا اور علمی دنیا میں اس کا چلن تھا۔ اس لیے بہت سے کم علم اور بعض جعلساز بھی میدان میں آگئے۔ اور انہوں نے بہت سی کمزور روایات بھی پھیلا دیں۔ ان کمزور روایات کا بڑا ماخذ اسرائیلیات تھیں۔ متقدمین تو جب تک تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ تھا اسرائیلی روایات سے قرآن کی تفسیر بیان کرنے میں حد درجہ احتیاط سے کام لیتے تھے۔ انہوں نے اسرائیلیات کو قبول کرنے اور آگے بیان کرنے میں حد سے زیادہ ذمہ داری سے کام لیا تھا۔ بعد میں نہ ذمہ داری کی وہ سطح باقی رہی اور نہ احتیاط کی اتنی سطح ملحوظ رکھی جا سکی۔ مزید برآں بعض حضرات نے نیک نیتی سے بھی بہت سی کمزور چیزیں قبول کرلیں۔ کمزور روایات کے بارے میں یہ نہ سمجھیے گا کہ جن حضرات نے یہ کمزور روایات بیان کیں وہ سارے کے سارے خدانخواستہ جعل ساز اور بددیانت تھے۔ ایسا نہیں ہے۔ یقیناً کمزور روایات بیان کرنے والوں میں کئی جعل ساز بھی تھے، ان میں کئی بددیانت بھی تھے، دشمن اسلام بھی تھے۔ لیکن ان میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے بڑی نیک نیتی سے کمزور روایات کو قبول کرلیا۔ مثلاً کسی شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے کوئی ایسی چیز بیان کرتے سنا جس سے کسی اخلاقی قدر کی تائید ہوتی ہو تو انہوں نے اسے فوراً ارشاد رسول سمجھ کر قبول کرلیا اور یہ خیال ہی نہیں کیا کہ آپؐ کے اسم گرامی کا حوالہ دے کر کوئی شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ اب انہوں نے اس کمزور بات کو آگے بیان کرنا شروع کردیا۔ یوں نیک نیتی سے بھی کمزور روایات داخل ہوگئیں۔ لیکن یہ وہ نیک نیتی تھی جس میں فہم شامل نہیں تھا۔ اسی لیے اگر نیک نیتی کے ساتھ فہم اور بصیرت بھی شامل ہو تبھی کام چلتا ہے، محض نیک نیتی کام نہیں آتی۔ ان اسباب کی بناء پر بہت سی کمزور روایات تفسیر بالماثور کے لٹریچر میں شامل ہوگئیں۔

تفسیر بالماثور کا سب سے بڑا ماخذ، قدیم ترین تفاسیر میں، تفسیر طبری ہے۔ اس میں صحابہ کرام سے آئی ہوئی تمام روایات کو جمع کیا گیا اور محفوظ کردیا گیا۔ تفسیر طبری میں اسرائیلیات بھی اچھی خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ لیکن یہ وہ اسرائیلیات ہیں جن کے بارے میں امام طبریؒ کا خیال تھا کہ وہ قابل قبول ہیں اور ان روایات میں کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ...

کہ یہ امام طبریؒ کی ذاتی رائے تھی جس سے بعد میں آنے والے بہت سے لوگوں نے اتفاق بھی کیا اور بہت سوں نے اختلاف بھی کیا۔ جس طرح امام طبریؒ کو اسرائیلیات کے بارہ میں ایک رائے قائم کرنے کا حق تھا اسی طرح بعد والوں کو بھی حق تھا کہ اپنی تحقیق کے مطابق رائے قائم کریں۔

اسرائیلیات کے بارہ میں اس اخذ و قبول سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا مزاج علمی توسع کا ہے۔ یعنی وسعت علمی اور وسعت نظری ہمیشہ مسلمانوں کا خاصہ رہی ہے۔ مسلمانوں نے کبھی بھی دوسروں سے کوئی علمی چیز حاصل کرنے میں کسی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ماضی میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی مسیحی مصنف نے یا کسی یہودی یا ہندو مصنف نے اپنی کسی مذہبی کتاب کی شرح یا تائید میں مسلمانوں کے کسی نقطہ نظر کو بیان کیا ہو اور اپنی کسی مذہبی چیز کی تائید میں قرآن پاک یا مسلمانوں کے نقطہ نظر سے کام لیا ہو۔ اس سے ان کے تعصب کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ایسی شاید ایک بھی مثال نہیں ملے گی کہ کسی بڑے مفسر قرآن نے قرآن مجید کی تفسیر اور تشریح بیان کرنے میں دوسروں بالخصوص اہل کتاب کی مذہبی کتابوں کا حوالہ نہ دیا ہو۔ اس سے مسلمانوں کی وسعت ظرفی کا بھی پتا چلتا ہے اور عدم تعصب کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن اس غیر متعصبانہ رویے سے بعض لوگوں نے بہت غلط فائدہ اٹھایا اور ایسی چیزیں مسلمانوں میں پھیلا دیں جو اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں تھیں۔ اب یہ بات کہ کس نے یہ چیزیں دیانت داری سے پھیلائیں، کس نے غلط فہمی سے پھیلائیں اور کس نے بد دیانتی سے پھیلائیں یہ اللہ بہتر ہی جانتا ہے۔ کسی کی نیت کے بارے میں فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

اسرائیلی روایات کو مسلمان اہل علم میں معروف و مقبول بنانے میں بعض لوگوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ جو نام اس پورے عمل میں بہت نمایاں رہے ہیں ان میں ایک نام پر بہت بحث ہوئی ہے۔ وہ تھے کعب الاحبار۔ یہ صاحب یہودیوں کے ایک بڑے عالم تھے۔ آپؐ کے زمانہ میں عرب میں موجود تھے، لیکن آپؐ کے زمانہ میں انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں بھی انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں کہیں جا کر وہ مسلمان ہوئے۔ مسلمانوں میں جلد ہی ان کو بہت احترام کا مقام حاصل ہو گیا۔ وہ اپنی سابقہ مذہبی روایات کو بیان کیا کرتے تھے اور مسلمانوں میں بہت سے لوگ دلچسپی سے بیٹھ کر ان کی روایات کو سنا کرتے تھے۔ اس طرح بہت سی باتیں ان کے حوالے سے مشہور ہو گئیں اور

آہستہ آہستہ تفسیری ادب میں ان میں سے بہت سی چیزیں شامل ہوگئیں۔ وہ کس درجہ کے انسان تھے؟ اسلام سے کتنے مخلص تھے؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ بعض حضرات نے ان کی شخصیت کے بارے میں بہت اچھا تبصرہ کیا ہے اور بعض حضرات نے منفی تبصرہ کیا ہے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن مشہور مفسر، مورخ اور محدث علامہ ابن کثیرؒ جو علم وتقویٰ دونوں میں انتہائی اونچا مقام رکھتے ہیں، اور علم تفسیر میں، تاریخ میں اور فقہ میں یعنی ہر فن میں بلند مقام کے حامل ہیں اور اپنے زمانہ کے صف اول کے علماء میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس امت کو کعب الاحبار کی طرف سے آنے والے کسی علم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گویا اس جملہ میں بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس جملہ میں کوئی منفی تبصرہ نہیں کیا گیا لیکن ان کی روایات کی علمی اور دینی اہمیت واضح کردی گئی۔

تفسیر بالماثور کے بارے میں ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ شروع شروع میں جب یہ رجحان سامنے آیا تو اس رجحان کا علم حدیث سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ کیونکہ حدیث کے ذخائر ہی میں سے تفسیری ذخائر بھی آرہے تھے۔ آپؐ سے جو کچھ مواد روایت ہوا تھا وہ سارا کا سارا علم حدیث میں مرتب ہو رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ سے منسوب ان منقولات میں تفسیری منقولات بھی شامل تھے۔ اس لیے شروع شروع میں علم حدیث اور تفسیر بالماثور ایک ہی چیز کے گویا دو نام تھے۔ چنانچہ آج بھی آپ حدیث کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں۔ وہ امام بخاریؒ کی جامع صحیح ہو، یا امام ترمذی کی جامع یا کوئی اور مجموعہ حدیث، آپ کو ان میں سے ہر ایک کتاب میں تفسیری مواد پر مشتمل ایک باب ضرور ملے گا۔ جو سارا کا سارا تفسیر بالماثور ہی سے عبارت ہوگا۔ پھر جتنی مستند وہ کتاب ہوگی اتنا ہی مستند اس میں شامل تفسیری مواد کا درجہ ہوگا۔ چنانچہ صحیح بخاری کا تفسیری حصہ دوسرے مجموعہ ہائے حدیث کے تفسیری ذخائر و روایات سے زیادہ مستند ہے۔ جو تفسیری سرمایہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں ہے وہ حدیث کی بقیہ کتابوں کے تفسیری مواد سے زیادہ مستند ہے۔ جو ان دونوں میں کسی ایک میں ہے وہ بھی بقیہ کتابوں سے نسبتاً زیادہ مستند ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تفسیر بالماثور کا شعبہ علم حدیث سے الگ بھی ایک منفرد شعبہ کے طور پر متعارف ہوتا گیا اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ علم حدیث اس علم کے ایک ماخذ کے طور پر تو رہا، لیکن یہ علم، علم حدیث سے جدا ایک الگ شعبہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس شعبہ علم میں علم

حدیث کے علاوہ بھی دیگر ذرائع سے مواد آتا گیا اور کتابیں لکھی جاتی رہیں۔

اس تفسیری ذخیرہ کی وجہ سے، خاص طور پر اسرائیلیات کی وجہ سے، مسلمانوں میں بہت سے ایسے سوالات بھی پیدا ہوئے جو نہیں پیدا ہونے چاہیے تھے۔ مثال کے طور پر ایک چیز عرض کرتا ہوں: ہر مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جس فرزند کی قربانی دی وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے اور اس میں کسی کو بھی کوئی شک نہیں۔ لیکن جب اسرائیلیات کی آمد شروع ہوئی تو چونکہ اسرائیلی یہ کہتے تھے کہ ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام تھے۔ اس لیے مسلمانوں میں بھی یہ غلط فہمی پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ یہودیوں نے یہ دعویٰ کیوں کیا؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ اتنا بڑا اور اہم تاریخی واقعہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں اتنی بے مثال قربانی ہے کہ یہودی یہ چاہتے تھے کہ اس عظیم الشان واقعہ کے حوالہ میں آنجناب کے جس صاحبزادے کا نام آئے وہ عربوں کے جد امجد (حضرت اسماعیل) کے بجائے یہودیوں کے جد امجد (حضرت اسحاق) ہوں۔ اس لیے انہوں نے حضرت اسحاق علیہ السلام کے نام سے یہ روایات پھیلانی شروع کردیں۔ اور ان روایتوں میں سے سوفی صد روایات کے راوی کعب الاحبار تھے۔ اس وجہ سے بہت سے مسلمانوں کو یہ خیال ہوگیا کہ شاید حضرت اسحاق علیہ السلام ہی ذبیح ہوں گے۔ لہذا مسلمان مصنفین کو اس وضاحت کی ضرورت پیش آئی کہ ذبیح کون سے صاحبزادے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ الرای الصحیح فی من ھو الذبیح۔ اس کتاب میں انہوں نے نہ صرف قرآن مجید سے بلکہ بائبل اور تورات سے قطعی دلائل دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح تھے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی ایک دلیل تو ایسی ہے جس کا کسی یہودی اور عیسائی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ بائبل میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اللہ نے ابراہیمؑ سے کہا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے۔ گویا جس بیٹے کی قربانی دی وہ اکلوتے تھے۔ اس کے بعد ایک اور جگہ بائبل میں لکھا ہے کہ جب اسحاق پیدا ہوا تو اسماعیل دس برس کا تھا اور اس کے ساتھ ٹھٹھا کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسماعیل علیہ السلام پہلے پیدا ہوئے اور حضرت اسحاق سے دس سال بڑے تھے۔ اور اکلوتے بھی وہی تھے جو پہلے پیدا ہوئے۔ اور قربانی اکلوتے بیٹے کی کی گئی۔ اس لیے بائبل ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبیح اسحاق نہیں تھے بلکہ اسماعیل تھے۔

جو تفاسیر ماثور رجحان پر لکھی گئیں ان میں سے دو کا قدرے تفصیلی تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ یعنی علامہ طبریؒ کی تفسیر طبری اور علامہ ابن کثیرؒ کی تفسیر ابن کثیر۔ تفسیر بالماثور کے موضوع پر ایک اور تفسیر ہے جو نسبتاً بعد میں لکھی گئی۔ لیکن وہ اس اعتبار سے بڑی ممتاز ہے کہ اس میں پورے ماثور ادب کا استقصاء کر کے پورے دستیاب مواد کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب علامہ جلال الدین سیوطی کی الدر المنثور ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ مشہور مفسر، محدث اور فقیہہ، بلکہ ہر فن مولا تھے، جن کی کم وبیش پانچ سو کتابیں موجود ہیں۔ انہوں نے الدر المنثور فی التفسیر بالماثور بھی لکھی، یہ تفسیر عام ملتی ہے۔ اس کے مختلف ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے پورے تفسیری ذخیرہ سے ماثوری ادب کو یکجا کر کے ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ الاتقان فی علوم القرآن، جو علوم قرآن پر علامہ سیوطی کی مشہور کتاب ہے، اسی کا مقدمہ ہے، جو ایک ایک اور دو دو جلدوں میں الگ سے بارہا چھپی ہے۔ غالباً الدر المنثور کا اردو ترجمہ بھی کوئی دوڈھائی سو سال قبل ہو چکا ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے پہلے کسی بزرگؒ نے کیا تھا۔ یہ سلطنت مغلیہ کے آخری دور کا ذکر ہے۔

ایک اور کتاب کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے۔ جو اس اعتبار سے بہت منفرد ہے کہ اہل سنت کے تمام طبقوں اور شیعہ حضرات دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ یہ ایک ایسے مصنف کی ہے کہ مسلک کے اعتبار سے ان کا تعلق اہل سنت سے نہیں بلکہ زیدی شیعہ فرقہ سے تھا۔ لیکن ان کی کتابوں کو زیادہ مقبولیت اہل سنت ہی میں حاصل ہوئی۔ یہ مصنف یمن کے علامہ محمد بن علی شوکانی ہیں۔ ان کا تعلق تیرہویں ہجری صدی کے اوائل سے ہے۔ زیادہ پرانے نہیں ہیں۔ ان کا تعلق فقہ زیدی سے تھا۔ جو شیعہ فقہ کی ایک نسبتاً معتدل شاخ ہے۔ اس فقہ کے بڑے گہرے اثرات یمن میں آج بھی موجود ہیں۔ علامہ شوکانی کی کتابیں خاص طور پر ان کی تفسیر فتح القدیر بڑا عالمانہ مقام رکھتی ہے۔ اس کو دنیائے اسلام میں ہر جگہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی ایک اور کتاب نیل الاوطار بھی مشہور ہے۔ یہ احادیث احکام کا بہت عمدہ مجموعہ اور شرح ہے، گویا فقہ الحدیث کی کتاب ہے۔ نیل الاوطار کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے، اور ہماری یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈمی اس کو شائع کر رہی ہے۔ علامہ شوکانی کی ایک کتاب اصول الفقہ پر بھی ہے جو دنیا کی ہر اسلامی یونیورسٹی میں، وہ شیعہ ہو یا سنی ہو، پڑھائی جاتی ہے۔ علامہ شوکانی دنیائے اسلام کی ایک ایسی منفرد

شخصیت ہیں جو دنیائے اسلام کے ہر مسلک کے لیے قابل احترام ہیں، اور عملاً ان کی کتابوں سے ہر جگہ استفادہ کیا جاتا ہے۔ ان کی کتاب فتح القدیر بھی تفسیر ماثور کے انداز میں لکھی جانے والی آخری قابل ذکر کتاب ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں انہوں نے بہت سی کتب سے استفادہ کیا ،جن میں علامہ سیوطی کی الدر المنثور بھی شامل ہے۔

تفسیر کا دوسرا رجحان جو تاریخی اعتبار سے تفسیر بالماثور کے بعد دوسرا رجحان ہے۔ وہ تفسیر کا لغوی اور ادبی انداز ہے۔ قرآن مجید عربی مبین میں ہے اور قریش مکہ کی معیاری اور ٹکسالی زبان میں ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں اس کام کے لیے وقف کیں کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے جن اسالیب سے واقفیت درکار ہے ان سب کے بارے میں عرب قبائل میں پھر کر معلومات جمع کی جائیں اور اس ادب کو جمع کیا جائے۔ جیسے جیسے یہ ادب جمع ہوتا گیا اس موضوع پر کتابیں تیار ہوتی گئیں۔ بالآخر ایک ایسی لائبریری تیار ہوگئی۔ جو قرآن مجید کی غوی اور ادبی تفسیر سے عبارت ہے۔ ان کتابوں میں قدیم ترین کتاب مجاز القران کے نام سے ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ کی ہے۔ ان کے غیر معمولی علمی مقام اور ادبی رتبہ کے بارے میں اتنا ذکر کر دینا کافی ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں بیسیوں جگہ ان کا حوالہ دیا ہے اور ان کے جمع کیے ہوئے تفسیری مواد سے استفادہ کیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی کا علوم حدیث کی تاریخ میں جو درجہ ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ حدیث کے شارحین میں ان سے اونچا درجہ کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ ابن خلدون نے ایک جگہ لکھا ہے (ابن خلدون کا زمانہ حافظ ابن حجر سے تھوڑا ہی پہلے ہے) کہ صحیح بخاری جس شان کی کتاب ہے اس شان کی اس کی شرح ابھی تیار نہیں ہوئی اور یہ پوری امت مسلمہ کے ذمہ ایک قرض ہے۔ جب فتح الباری لکھی گئی تو دنیائے اسلام نے بالاتفاق یہ کہا کہ ابن خلدون نے جس قرض کا ذکر کیا تھا وہ فتح الباری کی شکل میں اتارا جاچکا۔ اس کے بعد صحیح بخاریؒ کی اس سے بہتر شرح نہیں لکھی گئی۔ ایک مشہور حدیث ہے **لا ھجرۃ بعد الفتح**۔ جب مکہ فتح ہوگیا تو ہجرت اب ناگزیر نہیں رہی۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ لاھجرۃ بعد الفتح۔ یعنی فتح الباری کے بعد اب علم حدیث کی طرف ہجرت کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ان حافظ ابن حجر نے ابوعبیدہ کی پوری کتاب مجاز القران کو اپنی کتاب میں سمو دیا ہے اور مجاز القران میں اب شاذ و نادر ہی کوئی ایسا مواد باقی رہ گیا ہوگا جو حافظ

ابن حجر کی کتاب میں بکھرا ہو نہ ہو۔ ابوعبیدہ کی وفات ۲۱۰ھ میں ہوئی۔ یہ امام شافعیؒ کے تقریباً ہم عصر تھے۔ انہی کے ایک اور ہم عصر تھے: یحیٰ بن زیاد الفراء۔ ان کی کتاب معانی القران پانچ جلدوں میں ہے۔ یہ اپنی جگہ بہت بڑے ادیب، اور صرف ونحو کے امام تھے۔ اور ان کا حوالہ ہر جگہ بطور امام فن کے ملتا ہے۔

یحیٰ بن زیاد الفراء کی معانی القران اس فن کی اولین اور انتہائی اہم کتابوں میں ہے۔ قرآن مجید کے لغوی محاسن اور ادبی اسالیب پر سب سے پہلے جس مفسر نے جامع کام کیا وہ یہی فراء تھے جن کو ان کے زمانہ میں امیر المومنین فی النحو کہا جاتا تھا۔ ان کی یہ کتاب معانی القران پہلے روز سے ہی اس موضوع کی بہترین تصانیف میں شمار کی گئی۔ وہ اس کتاب کا عام درس بھی دیا کرتے تھے جس میں بڑی تعداد میں اہل علم بھی شریک ہوا کرتے تھے۔

یہ دونوں کتابیں یعنی ابوعبیدہ کی مجاز القران اور فراء کی معانی القران لغوی اعتبار سے قرآن مجید کی تشریح اور تفسیر کا اولین ماخذ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے بعد اور بھی کتابیں قرآن مجید کے لغوی مباحث پر لکھی گئیں۔ لیکن جو مواد انہوں نے یعنی ابوعبیدہ اور یحیٰ بن زیاد الفراء نے مرتب کر دیا تھا وہ بعد کے تمام مفسرین کے سامنے رہا۔ حتیٰ کہ اردو زبان کے مفسرین قرآن نے بھی الفراء کی معانی القران سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً مولانا مودودیؒ، مولانا اصلاحیؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مفتی محمد شفیعؒ وغیرہ کی تفاسیر میں اس استفادہ کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا کام کتنا قابل قدر تھا۔

اس کے بعد جب یہ دونوں طرح کے مواد جمع ہو گئے، یعنی تفسیر بالماثور بھی اور تفسیر بالادب بھی، تو ایک تیسرا رجحان سامنے آیا، جس کے بارے میں بڑی لمبی بحثیں ہوئیں کہ اس رجحان کو جنم لینے اور پنپنے اجازت دی جائے یا نہ دی جائے۔ یہ رجحان تفسیر بالرائے کا تھا۔ یعنی مفسر اپنی رائے، بصیرت اور اجتہاد کے مطابق بھی قرآن مجید کی تفسیر کرے اور دستیاب مواد سے بھی کام لے۔ ابھی تک یہ رواج تھا کہ قرآن مجید کی آیت کی تفسیر بڑے سادہ سے انداز سے کی جاتی تھی۔ جیسے **انعمت علیھم** کا ذکر آیا تو وہ آیت نقل کر دی جس میں انعام یافتہ خوش نصیبوں کی وضاحت ہے۔ **غیر المغضوب** اور ضالین کا ذکر آیا تو وہ حدیث نقل کر دی جس میں بتایا گیا ہے کہ مغضوب علیہم سے مراد یہودی اور ضالین سے مراد عیسائی ہیں، یا اگر کوئی لغوی ادبی چیز دستیاب

تھی وہ بیان کردی۔ اس سے زیادہ مفسرین نے پیش قدمی نہیں کی تھی۔ ان کی غیر معمولی احتیاط، ان کا غیر معمولی تقویٰ، ان کی تواضع اور ذمہ داری کا گہرا احساس ان کو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اپنے کسی ذاتی خیال کو اس قابل بھی سمجھیں کہ اس سے قرآن مجید کے فہم میں کام لیا جا سکتا ہے۔

جب یہ سارا مواد مرتب ہو گیا، اور تفسیر بالماثور اور تفسیر باللغتہ پر کتابیں دستیاب ہو گئیں تو اب لوگوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور تفسیر بالرائے سے بھی کام لینا شروع کیا۔ تفسیر بالرائے کے بارے میں تین نقطہء نظر پیدا ہونے شروع ہوئے۔ ایک اہم نقطہ نظر تو یہ تھا کہ تفسیر بالرائے ایک بالکل غلط رجحان ہے، اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی، اس لیے اس کی سرے سے اجازت ہی نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ تفسیر کا یہ انداز مسلمانوں میں غلط فہمی کا راستہ کھولے گا ۔قرآن مجید بازیچہء اطفال بن جائے گا اور ہر کس و ناکس اٹھ کر اپنی رائے کے مطابق کتاب الٰہی کے معنی بیان کرنے کی کوشش کرے گا۔ متقدمین میں سے اکثریت کی یہی رائے تھی اور انہوں نے اس کے لیے وقیع دلائل بھی دیے۔

جب متاخرین کا دور آیا تو ان میں دو نقطہء نظر سامنے آئے۔ ایک متوازن اور معتدل رجحان یہ تھا کہ تفسیر بالرائے کی عمومی مخالفت نہ کی جائے، بلکہ یہ دیکھا جائے کہ جو رائے دی جا رہی ہیں وہ اپنی جگہ کیا حیثیت رکھتی ہے۔ اگر وہ رائے قابل قبول ہے جس کو وہ رائے محمود کہا کرتے تھے' تو ٹھیک ہے۔ اور اگر رائے غلط ہے جس کو وہ رائے مذموم کا نام دیتے تھے تو وہ قابل قبول نہیں ہے ۔تیسرا رجحان جو بہت تھوڑے لوگوں کا تھا' یہ تھا کہ انسان کی ہر رائے قابل قدر ہے۔ قرآن مجید نے خود اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے، غور و فکر کی تلقین جابجا کی ہے۔ رائے اور نظر کی دعوت دی ہے، عقل، فکر اور تدبر پر زور دیا ہے۔ اس لیے کسی بھی رائے کا راستہ نہیں روکنا ہے۔

بالآخر امت مسلمہ میں نہ تو آخری رائے کو پذیرائی ملی، اور نہ پہلی رائے کو زیادہ دیر تک پذیرائی حاصل رہی۔ امت مسلمہ نے ان دونوں آراء کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ ایک درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے اچھی رائے اور بری رائے میں فرق کیا۔ پسندیدہ رائے کی بنیاد پر تفاسیر لکھی گئیں اور مرتب ہوئیں۔ لیکن ذرا غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ متقدمین میں سے جن حضرات نے تفسیر بالرائے کی مخالفت کی یا اس کو مسترد کیا وہ کلی طور پر رائے اور اجتہاد کے مخالف نہیں تھے۔ بلکہ تفسیر بالرائے کے بارہ میں ان میں سے تقریباً سب کی رائے وہی تھی جو متاخرین کی رائے تھی۔ وہ

یہ سمجھتے تھے کہ یہاں تفسیر بالرائے سے مراد وہ رائے ہے جو ظن وتخمین پر مبنی ہو۔ اور لوگوں کی ذاتی پسند اور ناپسند پر اس کا دارمدار ہو، اسی رائے کے بارہ میں وہ حضرات کہتے تھے کہ یہ قول بالتشھی ہے، کہ لوگ اپنی ذاتی شہوات اور میلانات کے مطابق رائے دینے لگیں گے ایسی رائے یقیناً ناقابل قبول ہے۔

متاخرین اور متقدمین دونوں کے نزدیک صرف وہ رائے قابل قبول ہے۔ جو صحیح اجتہاد اور دینی بصیرت پر مبنی ہو، وہ رائے جو قلب سلیم اور عقل سلیم کے مطابق ہو، اور قرآن وسنت کی حدود کے اندر اندر ہو، ایسی رائے بلاشبہ سب کے نزدیک قابل قبول ہے۔ اس کے مقابلے میں جو رائے ناپسندیدہ اور قابل مذمت ہے وہ رائے ہے جس کی بنیاد محض ظن وتخمین پر ہو۔ اس لیے کہ قرآن مجید نے ظن وتخمین کو علم کا ذریعہ نہیں مانا، ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔ ایک جگہ ہے، و لا تقف مالیس لک بہ علم۔ لہٰذا ظن وتخمین کی بنیاد پر جتنی آراء ہیں وہ چونکہ علم ویقین پر مبنی نہیں ہیں، اس لیے انہیں قرآن مجید کی تفسیر میں دخل دینے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

یہ حضرات حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایک مشہور قول کا بھی حوالہ دیتے تھے۔ کسی شخص نے ان سے قرآن مجید کی کسی آیت کا مطلب پوچھا تو آپ نے جواب دیا کہ مجھے اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد معلوم نہیں۔ پوچھنے والے نے عرض کیا کہ پھر آپ اپنی فہم اور سمجھ کے مطابق اس کا جواب ارشاد فرمایئے تو آپ نے جواب دیا، ای سماءٍ تظلنی و ای ارضٍ تقلنی۔۔۔ کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین مجھے ٹھکانہ دے گی اگر میں قرآن مجید کے بارے میں اپنی رائے سے کام لوں۔ گویا انہوں نے نہ صرف اپنی رائے سے کام لینے سے انکار کر دیا۔ بلکہ ذاتی رائے سے قرآن مجید کی تفسیر کرنے کو ایک بڑی جسارت بھی قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین میں سے بیشتر لوگ اس معاملہ میں غیر معمولی احتیاط اور شدت سے کام لیا کرتے تھے۔

مشہور تابعی حضرت سعید بن المسیب پہلی صدی کے اواخر کے نامور اہل علم میں سے تھے۔ آپ تابعین میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ بلکہ تابعین میں جو چند شخصیات قیادت اور سیادت کے مقام پر فائز تھیں ان میں سے ایک تھے، وہ ایک طویل عرصہ حضرت ابوہریرۃؓ کے ساتھ رہے، ان کے شاگرد بھی تھے اور بعد میں ان کے داماد بھی بنے۔ ایک طویل عرصہ درس وتدریس

کے کام میں مدینہ منورہ میں مشغول رہے، لوگ آتے اور ان سے فقہ اور حدیث کے بارہ میں سوالات کرتے اور وہ جواب دیتے۔ لیکن جب کوئی شخص ان سے قرآن مجید کی کسی آیت کی تفسیر کے بارے میں کچھ پوچھتا تو ایسے ہو جاتے جیسے انہوں نے سنا ہی نہیں، کان لم یسمع۔

یہ مثالیں میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ یہ حضرات احتیاط، تقویٰ اور تواضع کی انتہا کی بناء پر کوئی رائے ظاہر کرنے سے گریز کرتے تھے، حالانکہ وہ علم وفضل کے جس بلند مقام پر فائز تھے اس کا اندازہ سب کو ہے۔

عبدالملک اصمعی جن کا میں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ طویل عرصہ عرب کے ریگستانوں میں پھرتے رہے کہ قرآن مجید کے معانی اور مطالب سے متعلق لغت اور ادب کے نظائر جمع کریں۔ جب ان سے کوئی شخص قرآن مجید کی کسی آیت کے معنی پوچھتا تھا تو کہا کرتے تھے کہ قرآن مجید کے الفاظ کے معنی تو معلوم نہیں، لیکن عرب اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ گویا اگر کوئی غلطی ہو جائے، ایک فی ہزار بھی، تو وہ قرآن مجید سے منسوب نہ ہونے پائے۔ حالانکہ جو وہ کہتے تھے وہ سو فیصد صحیح ہوتا تھا۔ اسی غیر معمولی احتیاط پسندی کی وجہ سے تفسیر بالرائے کو صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین کے دور میں زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن خود ان حضرات کے زمانہ میں بھی کئی مواقع ایسے آئے کہ انہوں نے بعض مسائل کے بارہ میں اپنی رائے دی، امت نے قبول کی اور آج تک اسی رائے کی بنیاد پر قرآن مجید کی تفسیر بیان ہو رہی ہے۔ اجتہاد جس طرح بقیہ احکام میں جاری ہے اسی طرح تفسیر قرآن کرنے میں بھی جاری ہے۔ جو شخص صحیح رائے پر پہنچ جائے گا، اسے دو اجر ملیں گے اور جو خطا کرے گا اس کے لیے ایک اجر ہے۔ قرآن مجید میں تفکر، تدبر اور تعقل پر جو زور دیا گیا ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ تدبر وہیں ہوتا ہے جہاں نص صریح نہیں ہوتی۔ اس لیے بظاہر متاخرین کا یہ نقطہ نظر درست معلوم ہوتا ہے کہ وہ رائے جس کی بنیاد اجتہاد اور بصیرت پر ہو، وہ رائے جس کی بنیاد شریعت کے عمومی احکام پر ہو، وہ رائے جو عربی زبان وادب کے قواعد اور اصولوں سے ہم آہنگ ہو، اور وہ رائے جس سے اسلام کے عمومی تصور پر زد نہ پڑتی ہو وہ رائے قابل قبول ہے، اور اس کی بنیاد پر قرآن مجید کی تفسیر کی جانی چاہیے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس موضوع پر پورا ایک باب باندھا ہے اور زور وشور سے اس نقطہ نظر کی تائید کی ہے۔

کم از کم ایک مثال حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ کی بھی ملتی ہے جب آنجناب نے اپنے اجتہاد اور بصیرت کے مطابق قرآن پاک کے ایک لفظ کی تفسیر فرمائی۔ قرآن مجید میں کلالہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ کلالہ لغت میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ والدین زندہ ہوں اور نہ کوئی اولاد ہو۔ یعنی نہ اس کو کوئی وراثت دینے والا ہو اور نہ اس کی وراثت لینے والا ہو۔ اوپر اور نیچے کے رشتے موجود نہ ہوں۔ اطراف و جوانب میں ہوں جیسے بہن بھائی وغیرہ۔ یہ لفظ قریش کی زبان میں مروج نہیں تھا۔ یہ کسی اور قبیلہ کا لفظ تھا۔ اس سے چونکہ مفہوم پوری طرح ادا ہو رہا تھا، اس لیے قرآن مجید نے اس سیاق وسباق میں اس لفظ کو استعمال کیا۔ قریش اور حجاز کے لوگوں کو عام طور پر کلالہ کے معنی معلوم نہیں تھے۔ کسی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اس کے معنی دریافت کیے تو آپ نے فرمایا کہ میں اپنی طرف سے اس کے معنی بیان کر دیتا ہوں، اگر صحیح ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اور اگر غلط ہیں تو میری اور شیطان کی طرف سے۔ پھر انہوں نے کلالہ کے یہی معنی بیان کیے جو میں نے ابھی بتائے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تفسیر بالرائے کا رجحان بڑھتا گیا اور ہر آنے والا مفسر قرآن پچھلے مفسرین کی نسبت تفسیر بالرائے سے زیادہ کام لینے لگا۔ اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تفسیر بالماثور کا پورا مواد مکمل ہو چکا تھا، اب اس مواد میں کوئی مزید اضافہ ممکن نہیں تھا۔ لغت اور ادب سے متعلق جو مواد تھا وہ بھی سارا جمع ہو چکا تھا۔ اس میں بھی اب کوئی اضافہ ممکن نہیں تھا۔ اب علم تفسیر میں مزید پھیلاؤ جو ہو سکتا ہے وہ تفسیر بالرائے یا تفسیر بالاجتہاد ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ بقیہ جتنے رجحانات کا آگے چل کر ذکر کیا جائے گا وہ سب کے سب تفسیر بالرائے یا تفسیر بالاجتہاد ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔

تفسیر بالرائے کی مفسرین نے پانچ شرائط بیان کی ہیں جن کا میں مختصر طور پر ذکر کر چکا ہوں۔ ایک تو یہ ہے کہ یہ تفسیر کلام عرب کے اصولوں کے مطابق ہو، یعنی عربی زبان کے قواعد، لغت کے اسالیب، حجاز کے روزمرہ اور محاورہ کے مطابق کسی آیت یا لفظ کا وہی مطلب نکلتا ہو جو مفسر نے بیان کیا ہے۔ اگر عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے وہ مطلب نہ نکلتا ہو اور آپ زبردستی وہ مطلب نکالیں جو آپ کا من پسند ہو تو یہ گمراہی، الحاد اور زندقہ ہے۔ دوسری اور تیسری شرط یہ کہ اس تفسیری رائے کی کتاب وسنت سے موافقت ضروری ہے۔ اگر تفسیر بالرائے قرآن مجید اور سنت

رسول میں بتائے گئے اصولوں سے ہم آہنگ اور اسلام کی متفق علیہ تعلیمات کے مطابق ہے تو قابل قبول ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو ایسی تفسیر کو مسترد کیا جانا چاہیے۔ چوتھی شرط یہ کہ تفسیر کی جو عمومی شرائط مفسرین نے بیان کی ہیں کہ کون سا لفظ خاص ہے، کون سا عام ہے، کون سا ناسخ ہے اور کون سا منسوخ، پھر کب اور کہاں کوئی لفظ خاص ہے اور کہاں عام ہے۔ کہاں پہلے ہے اور کہاں بعد میں ہے، ان سب امور کا لحاظ رکھا جائے۔ اور پانچویں شرط یہ ہے کہ جن معاملات میں اجماع امت ہو چکا ہے ان کو از سر نو نہ چھیڑا جائے، اور قرآن مجید کی معنویت اور تسلسل کو برقرار رکھا جائے۔ ان پانچ چیزوں کی پابندی کے ساتھ جو رائے دی جائے گی وہ قابل قبول ہوگی اور تفسیر قرآن میں اس سے کام لیا جائے گا۔

جب یہ رجحان پختہ ہو گیا کہ ان شرائط کے مطابق اختیار کی جانے والی رائے اور اجتہاد کی بنیاد پر تفسیر لکھی جاسکتی ہے تو تحقیق اور غور و فکر کے بہت سے نئے دروازے کھل گئے۔ اس طرح اور بہت سے تفسیری رجحانات پیدا ہوئے۔ جن میں سے ایک بہت نمایاں رجحان فقہی تفاسیر کا ہے۔ یعنی قرآن مجید کی ان آیات کی خصوصی تفسیر جہاں فقہی احکام بیان ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں تقدم کا شرف کسے حاصل ہے، یہ کہنا بہت دشوار ہے۔ امام محمد بن حسن شیبانیؒ جو امام ابوحنیفہؒ کے تلمیذ خاص ہیں ان کی کتابوں میں قرآن مجید کی فقہی تفسیر پر مبنی بہت سے مباحث ملتے ہیں۔ امام مالکؒ کی مشہور کتاب المدونہ الکبریٰ میں قرآن مجید کی فقہی تفسیر کے اشارے ملتے ہیں۔ مگر جس مفسر کو ایک الگ اور مستقل بالذات فقہی تفسیر لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی وہ امام شافعیؒ تھے، جن کی کتاب احکام القرآن دو جلدوں میں موجود ہے اور آج بھی ملتی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب احکام الحدیث بھی ہے۔ امام شافعیؒ نے قرآن مجید کی ان تمام آیات کو جن سے فقہی احکام نکلتے ہیں اپنے خاص اسلوب اجتہاد کے مطابق مرتب فرمایا ہے اور ان سے وہ احکام نکالے ہیں جو آج فقہ شافعی کی اساس ہیں۔ امام شافعیؒ کا انداز بعض اوقات بہت عجیب اور دلچسپ ہوتا ہے۔ نہ صرف ان کا بلکہ ان کے زمانہ کے اکثر مفسرین اور محدثین کا یہ انداز تھا کہ وہ ایک علمی مکالمہ یا تبادلہ خیال کے انداز میں بات کرتے ہیں۔ خاص طور پر فقہی تفاسیر کے باب میں، امام شافعی اپنے تلامذہ سے تبادلہ خیال کرتے ہیں کہ یہ آیت فلاں فقہی حکم پر مشتمل ہے۔ میں نے اس سے یہ رائے قائم کی ہے۔ تلامذہ اختلاف کرتے۔ امام صاحب جواب دیتے۔ پھر تلامذہ اعتراض کرتے اور امام

صاحب جواب دیتے۔ اس طرح بحث چلتی۔ اگر اتفاق رائے ہوگیا تو لکھ دیا جاتا۔ اور اگر اختلاف رائے چلتا رہتا تو وہ بھی لکھ دیا جاتا۔ بعض اوقات باہر سے کوئی فقیہہ آتا اس سے بھی بحث ہوتی۔ وہ بھی لکھ لی جاتی، اور اس طرح بحث مکمل ہو جاتی، اس طرح ان کے مباحث امام محمد سے بھی ہوئے، امام ابو یوسف سے بھی ہوئے اور اپنے تلامذہ سے بھی ہوئے۔ یہ ایک مناظرانہ انداز ہوتا تھا۔

یہ سلسلہ کم و بیش سو سال جاری رہا اور ایک ایک چیز واضح اور منقح ہو کر سامنے آگئی کہ قرآن مجید کی فقہی تفسیر کا یہ اسلوب ہے۔ قرآن مجید کی فقہی تفسیر میں جس چیز سے زیادہ کام لیا گیا، وہ یقیناً قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبوی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں عربی زبان کے اسالیب اور قواعد و ضوابط سے بھی کام لیا گیا۔ سب سے پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی کہ کوئی لفظ کسی خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہو تو پھر اسی مفہوم کو بنیاد بنایا جائے۔ بعض اوقات کسی لفظ کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک قبیلہ کی زبان میں ایک مفہوم ہے اور دوسرے قبیلہ کے محاورہ میں دوسرا مفہوم ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ کس قبیلہ کی زبان زیادہ مستند سمجھی جاتی تھی۔ یوں فقہی تفسیر کے اس عمل میں لغوی بحثیں بھی شامل ہو جائیں گی۔

امام شافعیؒ کی احکام القران کے بعد فقہی تفسیر کے باب میں چار کتابوں کا ذکر میں اور کرتا ہوں۔ دو کتابیں کا برصغیر سے باہر کی اور دو کتابیں کا برصغیر کے اندر سے۔ برصغیر سے باہر فقہی تفاسیر کے باب میں دو کتابیں بہت مشہور اور نمایاں ہیں۔ ایک کتاب فقہ حنفی کی روشنی میں مرتب ہوئی۔ اور مشہور حنفی فقیہہ امام ابو بکر جصاص کی مرتب کردہ ہے۔ ان کی کتاب کا نام ہے احکام القران۔ اس کتاب میں انہوں نے تمام آیات احکام کو جمع کر کے ان کی فقہی تفسیر کی ہے۔ وہ اکثر و بیشتر منتخب آیات کی تفسیر کرتے ہیں۔ ان کی دلچسپی اور توجہ کا موضوع صرف آیات احکام ہیں۔ امام جصاص کی کتاب فقہی تفسیر کے ادب میں بہت اونچا مقام رکھتی ہے۔ امام جصاص خود ایک نامور فقیہہ اور ماہر اصول بھی تھے۔ انہوں نے اصول فقہ پر جو کتاب لکھی تھی وہ حنفی نقطۂ نظر سے اصول فقہ کی اولین اور بہترین کتابوں میں سے ہے۔ امام صاحب نے اپنی اس تفسیر میں علم اصول فقہ کے قواعد کو بھی منطبق کر کے دکھایا ہے۔ اس کتاب کا بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے اور چھپ بھی گیا ہے۔

دوسری کتاب بھی احکام القرآن ہی کے نام سے ہے۔ یہ ایک مالکی فقیہہ قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی کی تصنیف ہے۔ قاضی صاحب اندلس کے رہنے والے تھے۔ ان کی یہ کتاب عربی میں ہے اور عام ملتی ہے۔ اس کو آپ امام جصاص کی مذکورہ کتاب کی مالکی ہمشیرہ کہہ سکتی ہیں۔ ان دونوں کے تقابل پر بھی خاصا کام ہوا ہے۔ ایک صاحب کو ہم نے اس موضوع پر اپنی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے موضوع دیا ہے جس میں وہ دونوں کا تقابل کر کے بتائیں گے کہ ان دونوں کے استدلال کا انداز کیا ہے۔ فقہی تفاسیر میں ایک اور اہم کتاب، یعنی علامہ قرطبی کی احکام القران کا میں پہلے ذکر چکا ہوں۔

برصغیر میں دو قابل ذکر تفسیریں فقہی انداز کی لکھی گئیں۔ ایک تھی التفسیرات الاحمدیہ۔ ملا احمد جیون کے نام سے ہندوستان میں ایک بزرگ تھے، اورنگ زیب عالمگیرؒ کے استاد تھے۔ یہ بزرگ امیٹھی کے رہنے والے تھے اور اصلاً فقہ اور اصول فقہ کے متخصص تھے۔ تفسیرات احمدیہ کو خدانخواستہ قادیانیوں سے منسوب نہ کیجیے گا، ان کا نام احمد تھا اور انہوں نے اس کتاب کو اپنے نام سے منسوب کیا۔ اس کتاب میں انہوں نے فقہی آیات کی تفسیر لکھی ہے۔ کتاب مختصر اور ایک جلد میں ہے، لیکن معنف کی وسعت علم اور تعمق کی غماز ہے۔

فقہی تفسیر کے میدان میں ایک اور کتاب ہے جو خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسے علماء کی ایک ٹیم نے تیار کیا تھا۔ مولانا اشرف علی تھانوی جو برصغیر کے مشہور مفسر قرآن بھی ہیں، انہیں یہ خیال ہوا کہ حنفی نقطہ نظر سے قرآن مجید کی کوئی جامع فقہی تفسیر نہیں ہے۔ ایسی فقہی تفسیر جس میں قرآن مجید کی شروع سے آخر تک مسلسل تفسیر بھی کی گئی ہو۔ اور فقہائے احناف کے دلائل بھی اس میں تفصیل سے جمع کر دیے گئے ہوں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے تلامذہ کی جو اپنی اپنی جگہ جید علماء تھے ایک ٹیم تیار کی اور قرآن مجید کے مختلف حصے ان کے ذمے لگائے کہ وہ اس کام کو کریں، اس ٹیم میں مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا مفتی جمیل احمد جیسے جید اہل علم شامل تھے۔ تقریباً ۶۰۔۶۵ سال کے عرصے میں یہ کتاب مکمل ہوگئی۔ لیکن اس کے مختلف اجزاء الگ الگ شائع ہوئے۔ کچھ ہندوستان میں اور کچھ پاکستان میں۔ کچھ بعد، میں کچھ پہلے۔ اگر ان سب کو یکجا شائع کیا جائے تو یہ شاید پچیس تیس جلدوں پر مشتمل ایک کتاب بنے گی۔ ماضی قریب میں اس کے آخری اجزاء بھی مکمل ہو گئے ہیں۔ اس میں

پورے قرآن مجید کی فقہی تفسیر کو مکمل کیا گیا ہے۔ اور اس کا نام بھی احکام القران ہے۔ فقہائے احناف کا نقطہ نظر جو پہلے بہت سی کتابوں میں بکھرا ہوا اور منتشر تھا اب بڑی حد تک ایک جگہ سامنے آجاتا ہے۔ علمی اعتبار سے یہ ایک قابل قدر کام ہے۔

فقہی رجحان کے بعد ایک بڑا رجحان نظریاتی اور عقائدی پیدا ہوا۔ ہر طبقہ نے یہ کوشش کی کہ اپنے عقائد کی بنیاد پر ایک تفسیر مرتب کرے اور اپنے دلائل اس میں بیان کر دے۔ یہ کوشش اس اعتبار سے بہت مثبت اور خوش آئند تھی کہ مسلمانوں میں کوئی طبقہ اور فرقہ ایسا نہیں ہوا۔ جس نے اپنے مذہبی عقیدے کی بنیاد قرآن مجید کے علاوہ کسی اور چیز پر رکھی ہو۔ اختلاف رائے سے قطع نظر اس سے یہ بات ضرور پتہ چلتی ہے کہ مسلمانوں کا ہر فرقہ اپنے عقائد کی اساس قرآن مجید ہی پر رکھتا ہے جو ایک مشترک چیز ہے۔ آپ کسی فرقہ کی تعبیر یا تشریح سے اتفاق کریں یا اختلاف کریں۔ وہ الگ چیز ہے۔ لیکن سب کی اساس قرآن مجید ہی ہے۔

کلامی تفاسیر میں کچھ کتابیں تو وہ ہیں جو اہل سنت کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ پھر اہل سنت میں کلامی نقطہ نظر سے کئی رجحانات تھے۔ آپ نے حنبلی، اشعری اور ماتریدی کا ذکر سنا ہوگا۔ یہ تینوں عقائد میں اہل سنت کے تین مکاتب فکر یا رجحانات ہیں۔ ان سب کے بارے میں الگ الگ کتابیں لکھی گئیں۔ امام ابو منصور ماتریدی جن کا تعلق وسط ایشا سے تھا ان کی کتاب ہے تاویلات اہل السنہ۔ یہ قرآن مجید کی بڑی ضخیم تفسیر ہے۔ اسی طرح امام رازیؒ جو شافعی بھی تھے اور اشعری بھی۔ انہوں نے اپنے عقائد کے نقطہ نظر سے کام کیا اور اشعری عقائد کی بنیاد پر تفسیر لکھی ہے۔ زمخشری کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ جو معتزلی تھے۔ انہوں نے جہاں قرآن مجید کے ادبی اور لغوی کے محاسن بیان کیے ہیں وہاں معتزلی عقائد کی تائید بھی کی ہے۔ امام شوکانیؒ کا میں نے پہلے ذکر کیا، جو فرقہ زیدیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے فتح القدیر میں اپنے عقائد کی تشریح زیدی نقطہ نظر سے کی ہے۔

معتزلہ میں ایک اور تفسیر بہت نمایاں ہے۔ وہ قاضی عبدالجبار کی ہے۔ قاضی عبدالجبار ایک مشہور عالم تھے اور معتزلہ کے نقطہ نظر سے صف اول کے متکلم اور محقق سمجھے جاتے تھے۔ معتزلہ کے ہاں جب کہا جائے کہ قاضی القضاۃ نے یہ فرمایا تو اس سے مراد قاضی عبدالجبار معتزلی ہی ہوتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ہے جو بہت غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے، اور وہ ہے تنزیہ القران عن

المطاعن۔ یعنی قرآن مجید کا دفاع مختلف اعتراضات سے۔ اس نسبتاً مختصر کتاب میں انہوں نے غیر مسلموں اور ملحدوں کے قرآن مجید پر اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ خود معتزلی ہیں اس لیے معتزلی نقطہ نگاہ ہی سے انہوں نے یہ جوابات دیے ہیں۔ بعض جگہ ان کے جوابات غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

اسی طرح شیعہ حضرات کی بھی بہت سی تفاسیر ہیں جن میں قرآن مجید کی تفسیر شیعہ عقائد کے نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک تفسیر جو بہت معتدل اور متوازن مانی جاتی ہے وہ مجمع البیان ہے، جو علامہ ابو علی طبرسی کی ہے۔ یہ کتاب ۱۰ جلدوں میں تہران اور بیروت وغیرہ سے کئی بار چھپی ہے۔ جامعہ ازہر کا ایک ذیلی ادارہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مختلف اسلامی فقہوں اور فرقوں میں قربت پیدا کی جائے۔ اس ادارے نے اس تفسیر کو بہت معتدل اور متوازن پایا تو نمونہ کے طور پر اس تفسیر کو شائع کیا کہ تفسیر میں معتدل رجحان ایسے پیدا ہوسکتا ہے۔

یقیناً اس کتاب میں شیعہ عقائد اور تصورات ہی بیان کیے گئے ہیں لیکن کئی اعتبار سے یہ کتاب ایک خاص علمی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس میں بہت سا علمی مواد شامل ہے۔ سورتوں کا نظم اور آیات کے تناسب پر بہت سی نئی باتیں ہیں۔ لیکن اس کتاب کے بارے میں میں نے ایک دلچسپ واقعہ پڑھا ہے۔ معلوم نہیں وہ تاریخی طور پر درست ہے یا غلط۔ وہ یہ کہ اپنی نوجوانی میں یہ مصنف سکتہ کا شکار ہو گئے تھے۔ لوگوں نے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا۔ جب سکتہ کی کیفیت ختم ہوئی اور پتہ چلا کہ قبر میں دفن ہیں تو بہت ڈرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ اگر یہاں سے نکل جاؤں تو شکر کے طور پر قرآن مجید کی تفسیر کروں گا۔ اسی اثناء میں ایک کفن چور آ گیا۔ اس نے کفن چوری کی غرض سے قبر کھودی۔ اندر سے یہ زندہ برآمد ہوئے تو وہ ڈر گیا۔ لیکن انہوں نے اسے بہت کچھ انعام دے کر رخصت کیا اور بعد میں یہ تفسیر لکھی۔ یہ واقعہ ان کے بارے میں مشہور ہے۔

اس کے بعد ایک بڑا رجحان صوفیانہ تفسیر کا پیدا ہوا، جس میں صوفیائے کرام نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق قرآن مجید کی تفاسیر لکھیں۔ مثلاً آلوسی کی تفسیر میں بھی صوفیانہ انداز ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی میں بھی بہت سا صوفیانہ مواد ملتا ہے جس میں انہوں نے بہت سی قرآنی آیات کی صوفیانہ انداز سے تفسیر کی ہے۔

ایک آخری کتاب جو صوفیانہ رجحان رکھتی ہے' مولانا اشرف علی تھانوی کی ایک مختصر

کتاب ہے جو ان کی تفسیر بیان القران کے ایک حصہ کے طور پر چھپی تھی۔ اس میں انہوں نے وہ تمام اصول جو تصوف میں برتے جاتے ہیں ان کا قرآن مجید سے ماخذ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب الگ سے بھی شائع ہوئی ہے۔

ایک اور رجحان جو بیسویں صدی میں بہت نمایاں ہوا وہ سائنسی تفسیر کا رجحان تھا۔ اگرچہ قرآن مجید نہ سائنس کی کتاب ہے اور نہ طب کی۔ لیکن بعض لوگوں نے محسوس کیا کہ قرآن مجید میں سائنسی نوعیت کے بیانات بھی آئے ہیں اس لیے ان پر بھی الگ سے تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس میدان میں سب سے نمایاں کام مصر کے علامہ طنطاوی جوہری کا ہے۔ علامہ جوہری نے جواہر القران کے نام سے ایک بہت مفصل تفسیر لکھی۔ اس میں انہوں نے قرآن مجید کی سائنسی انداز میں تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے زمانہ تک جتنی سائنسی ترقی ہوئی تھی انہوں نے اس کتاب میں اس سب سے کام لیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ یہ دکھائیں کہ قرآن میں جتنے سائنسی بیانات آئے ہیں ان کی اب تک کے تجربہ اور سائنسی تحقیقات سے تائید ہوگئی ہے۔

اکثر و بیشتر علماء اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ مجھے بھی اس اسلوب سے اتفاق نہیں ہے۔ قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے، بلکہ ہدایت اور راہنمائی کے لیے اتاری گئی ہے۔ یہ کتاب انسانوں کی اخلاقی اور روحانی زندگی کی بہتری کے لیے نازل کی گئی ہے۔ قرآن مجید کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ انسانی ایجادات کے لیے راہنمائی فراہم کرے۔ اس کام کے لیے وحی الٰہی کی ضرورت نہیں تھی۔ وحی الٰہی کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جہاں انسانی عقل اور تجربہ کام نہ کر سکے۔ اب اگر زبردستی کسی سائنسی تجربے کو قرآن کے ساتھ ملا دیں اور ۵۰ سال بعد وہ سائنسی تجربہ غلط ثابت ہو تو پھر آپ کیا کہیں گے۔

ایک آخری رجحان جس کی طرف مختصر اشارہ کرنا کافی ہے یہ ہے کہ جب تفسیر قرآن مجید کا سارا مواد اکٹھا ہو گیا اور جامع تفسیرات لکھی جانے لگیں تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ مختلف موضوعات پر الگ الگ بھی قرآن مجید کی تفسیرات آنی چاہئیں۔ اس کو تفسیر موضوعی کہتے ہیں۔ مثلاً قصص قرآنی پر الگ کتابیں، جغرافیہ قرآنی پر الگ کتابیں۔ اس طرح کی تفسیروں کی تعداد اس قدر لامتناہی ہے کہ ایسی کتابوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ اردو، عربی، فارسی، جرمن، انگریزی، فرانسیسی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں قرآن مجید کے مختلف موضوعات پر الگ الگ

کتابیں نہ لکھی گئی ہوں۔ ان میں سے کسی ایک کتاب کو نمائندہ حیثیت دینا بھی بہت دشوار ہے۔ اس لیے کہ ایسی کتابیں بھی بے شمار ہیں جن میں سے ہر ایک نمائندہ حیثیت رکھتی ہے۔ یہ وہ رجحان ہے جو آج کل بھی زور شور سے جاری ہے، اور جب سے یہ رجحان شروع ہوا ہے اس میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ دس بارہ سال قبل یونیسکو نے ایک منصوبہ بنایا تھا کہ قرآن مجید کے بنیادی موضوعات پر ایک جامع کتاب تیار کرائی جائے۔ ہمارے محترم رفیق کار ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری' یونیسکو کی طرف سے اس پراجیکٹ کے جنرل ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے یہ کام بڑے پیمانے پر دنیا بھر کے اہل علم سے کروایا ہے۔

اس مثال سے یہ بتانا مقصود ہے کہ غیر مسلموں کے ادارے بھی قرآن مجید کی موضوعاتی تفسیر میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کے لیے کوشاں ہیں۔

یہ تفسیر کے بڑے بڑے رجحانات ہیں جنہیں اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

خطبہ ہشتم

اعجاز القرآن

۱۵۔اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن مجید کے حوالہ سے اعجاز القرآن ایک انتہائی اہم موضوع ہے۔قرآن مجید کی عظمت کو سمجھنے اور اس کے مرتبے کا اندازہ کرنے کے لیے اعجاز القرآن کو سمجھنا انتہائی لازمی ہے۔ اعجاز القرآن پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے دو امتیازی پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک پہلو تو علم اعجاز القرآن کے آغاز وارتقاء اور تاریخ کا ہے۔یعنی اعجاز القرآن بطور ایک علم اور ایک شعبہ تفسیر وعلوم قرآن' کس طرح مرتب ہوا اور کن کن اہل علم نے کن کن پہلوؤں کو قرآن مجید کا اعجازی پہلو قرار دیا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن مجید جس کو حضورؐ نے اپنی نبوت اور صداقت کی دلیل اور علامت کے طور پر پیش کیا کس اعتبار سے آپؐ کی صداقت کی دلیل اور کس پہلو سے آپؐ کی نبوت کی علامت اور معجزہ ہے۔ پھر دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات کے سیاق وسباق میں معجزہ قرآن کی حیثیت کیا ہے۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ اعجاز القرآن نے علوم القرآن کے ایک شعبہ کی حیثیت کب اور کیسے اختیار کی، یہ علوم قرآن کی تاریخ کا موضوع ہے،اس موضوع پر اہل علم نے غور وفکر اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں ہی شروع کر دیا تھا۔ چوتھی صدی سے اہل علم نے اس موضوع پر باقاعدہ کتابیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ اس طرح بہت تھوڑے عرصہ میں اس موضوع کو ایک مستقل بالذات مضمون بلکہ علم کی شکل دے دی۔ اور آج بھی علوم القرآن کے اہم مضامین میں سے یہ ایک انتہائی اہم مضمون ہے۔ غالباً سب سے پہلی شخصیت جس نے اعجاز القرآن کے موضوع پر ایک الگ اور منفرد کتاب لکھی، وہ مشہور شافعی فقیہہ اور متکلم قاضی ابو بکر باقلانی ہیں۔ جنہوں نے اعجاز القرآن کے نام سے ایک مستقل بالذات کتاب تیار کی۔ جو آج بھی دستیاب ہے اور اس موضوع پر قدیم ترین کتاب ہے۔ پھر اس موضوع پر مختلف

اہل علم نے کام کیا اور اپنی اپنی تحقیقات کے نتائج کو الگ الگ کتابوں کی شکل میں مرتب کیا۔

ابن خلدون کے بقول جن دو شخصیتوں نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کو کما حقہٗ سمجھا ہے۔ ان میں علامہ زمخشری اور شیخ عبدالقاہر جرجانی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ شیخ عبدالقاہر جرجانی نے بھی اعجاز القرآن پر ایک الگ کتاب لکھی جو بعد میں آنے والے تمام لوگوں کے لیے ایک ماخذ اور مصدر قرار پائی۔ جن حضرات نے بھی بعد میں قرآن مجید کی فصاحت اور بلاغت اور اس کی بنیاد پر مرتب ہونے والے اصولوں پر کام کرنا چاہا، وہ شیخ عبدالقاہر کی کتاب سے مستغنی نہیں ہو سکے۔

شیخ عبدالقادر جرجانی کے کام کی ایک اور اہمیت بھی ہے جس نے ان کی کتاب کو دوسری کتابوں سے ممتاز بنا دیا ہے۔ بقیہ حضرات مثلاً قاضی ابو بکر نے اعجاز القرآن پر ایک کتاب لکھی اور بتایا کہ قرآن مجید کی روشنی میں فصاحت اور بلاغت کے کیا اصول ہونے چاہئیں۔ فصاحت و بلاغت کے ان معیارات کے پیش نظر قرآن مجید کی فصاحت اور بلاغت کا کیا درجہ ہے۔ انہوں نے صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کس معیار اور کس درجہ کی ہے۔

لیکن شیخ عبدالقاہر جرجانی اس سے ایک قدم آگے بڑھے۔ انہوں نے پہلے یہ متعین کیا کہ قرآن مجید سے فصاحت و بلاغت کے جو اصول معلوم ہوتے ہیں وہ کیا ہیں، یعنی قرآن مجید کے اسلوب سے فصاحت و بلاغت کا جو انداز معلوم ہوتا ہے، وہ کیا ہے۔ پھر ان اصولوں پر مزید تحقیق کر کے انہوں نے ایک مستقل بالذات کتاب لکھی، جو بعد میں آنے والوں کے لیے عربی بلاغت کی ایک بنیادی کتاب قرار پائی، جس کا نام ہے اسرار البلاغۃ۔ یہ کتاب بہت دفعہ چھپی ہے اور عام دستیاب ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآن مجید کو بنیاد بنا کر عربی بلاغت کے مستقل اصول مدون کر دیے ہیں۔ جن کو سامنے رکھ کر قرآن کی بلاغت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے اور اس بلاغت سے خود ان اصولوں کی صداقت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ان دونوں چیزوں کو ایسے انداز سے ملا دیا ہے کہ اب یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ الگ ہو نہیں سکتیں۔ اس لیے ابن خلدون کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ عبدالقاہر جرجانی سے زیادہ قرآن مجید کی بلاغت کو کسی نے نہیں سمجھا۔

عبدالقادر جرجانی اور زمخشری کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات نے قرآن مجید کی

لغوی اور ادبی تحقیق کو اپنا موضوع بنایا اور اعجاز القرآن کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے لکھا۔ یہی وجہ ہے علوم قرآن کے موضوع پر لکھی جانے والی کوئی قابل ذکر کتاب اعجاز القرآن کے مباحث سے خالی نہیں ہے۔

قاضی عیاض ایک مشہور اندلسی فقیہہ اور سیرت نگار تھے۔ ان کی ایک کتاب انتہائی نفیس اور بڑی منفرد نوعیت کی ہے۔ یعنی الشفاء فی تاریخ حقوق المصطفیٰ۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ حضورؐ کے امت پر کیا حقوق ہیں۔ اور اس ضمن میں یہ بحث بھی کی ہے کہ حضورؐ کو کون سے خصائص عطا فرمائے گئے ہیں۔ اور دوسرے انبیاء پر آپؐ کو اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے پیغام پر آپ کے پیغام کو جو برتری اور فوقیت حاصل ہے اس کے کون کون سے پہلو نمایاں ہیں۔ اس سیاق وسباق میں انہوں نے اعجاز القرآن پر بھی بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے جس میں انہوں نے اس موضوع کو بہت نکھار کر بیان کیا ہے۔

جب ہم اعجاز القرآن پر بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعجاز یا معجزہ سے کیا مراد ہے؟ اعجاز کے معنی ہیں معجزہ کے طور پر سامنے آنا یا معجزہ دکھانا، یا دوسروں کو معجزہ دکھا کر عاجز کر دینا۔ یہ اعجاز کے لفظی معنی ہیں۔ لیکن اعجاز کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک معجزہ کو نہ سمجھا جائے۔ معجزہ اسلامی ادبیات میں ایک دینی یا مذہبی اصطلاح کے طور پر مروج ہے۔ لیکن یہ بڑی دلچسپ اور اہم بات ہے کہ معجزہ کی اصطلاح نہ قرآن مجید میں کہیں آئی ہے اور نہ ہی احادیث نبوی میں استعمال ہوئی ہے۔ اور نہ صحابہ کرامؓ نے اور نہ ہی تابعین نے اس اصطلاح کو استعمال کیا۔ یہ اصطلاح بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے آیت (نشانی، دلیل، علامت) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے لیے آیت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو کھلی کھلی نشانیاں دیں۔ گویا قرآن مجید کی اصل اصطلاح اس مفہوم کے لیے آیت کا لفظ ہے جس کا لفظی ترجمہ تو نشان اور منزل ہے، لیکن قرآن مجید اور نبوت کے سیاق وسباق میں اس کا ترجمہ معجزہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید کی دوسری اصطلاح برہان ہے، جس کے معنی ایک ایسی دلیل کے ہیں جو

ناقابل تردید ہو اور جس سے کوئی بات پورے طور پر واضح ہو کر سامنے آجائے۔ یہ دو اصطلاحات تو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوئی ہیں۔ دو اصطلاحات جو ان سے ملتی جلتی ہیں وہ حدیث اور صحابہ کرام کے لٹریچر میں بھی استعمال ہوئی ہیں اور بعد کے اسلامی ادب میں بھی آئی ہیں۔ وہ ہیں دلیل اور علامت۔ یعنی نبوت کی علامات اور نبوت کے دلائل۔ چنانچہ دلائل النبوۃ کے نام سے الگ کتابیں بھی ملتی ہیں اور سیرت کی بڑی کتابوں میں اس عنوان سے ابواب اور مباحث بھی موجود ہیں۔ دلیل کے معنی بھی راستہ بتانے والے راہنما اور منزل کا پتا بتانے والے نشانات کے ہیں۔ راستے میں جو نشانات منزل لگائے جاتے ہیں ان کو بھی دلیل کہتے ہیں۔ اور راستہ بتانے والے ساتھی کے لیے بھی دلیل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ گویا جس چیز کو ہم معجزہ قرار دے رہے ہیں یہ ہمیں راستہ بتا کر اس منزل تک لے جاتا ہے، جو ایمان کی اور حضورؐ کے پیغام کو مان لینے کی منزل ہے۔ یہ وہ اصطلاحات ہیں جو قرآن وسنت اور اسلامی ادب میں استعمال ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اصطلاح کے مفہوم کو زیادہ جامع اور قابل فہم بنانے کے لیے بعض علماء کرام نے معجزہ کی اصطلاح استعمال کی جو اپنی جامعیت کی وجہ سے بہت جلد عام ہوگئی۔ یعنی وہ نشانی جو عاجز کردے۔ معجزہ دراصل صفت تھی آیت کی، یعنی آیت معجزہ، وہ نشانی جو مخاطب یا خصم کو عاجز کردے۔ اسی سے اعجاز کی اصطلاح بھی نکلی۔

اعجاز کے اصطلاحی معنی ہیں وہ خارق عادت امر جو اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کی نبوت کی صداقت کے لیے دنیا پر ظاہر کیا ہو۔ یہاں تین چیزیں قابل ذکر ہیں۔ ا۔ وہ امر جو ظاہر ہوا ہے وہ خارق عادت ہو۔ ۲۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی پیغمبر کے دعویٰ نبوت کی صداقت کے لیے بھیجا گیا ہو۳۔ اور تیسرے یہ کہ وہ اس پیغمبر اور انسانوں پر اس طرح سے واضح کر دیا جائے کہ ان کے سامنے انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے اور وہ کوئی تاویل نہ کرسکیں۔ خارق عادت سے مراد یہ ہے کہ وہ چیز عام انسانوں کے بس میں نہ ہو اور ان کی سکت سے باہر ہو۔ وہ لوگ جو اس وقت اس پیغمبر کے مخاطب ہیں وہ اس کام کو کر کے نہ دکھا سکیں اور پیغمبر اس کام کو اپنی نبوت کی صداقت کے لیے کر کے دکھا دے، اور لوگ اس کے سامنے لاجواب ہو جائیں، اور عاجز ہو کر اس کو مبہوت ہو کر دیکھیں ایسی خارق عادت چیز کو معجزہ کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ اس نے اپنے انبیاء کی تائید اور حمایت کے لیے ہمیشہ

نشانیاں (آیات) اور معجزے بھیجے۔ اگرچہ یہ بات بھی انبیاء کی نبوت اور تاریخ سے سامنے آتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے انتہائی قریبی انسانوں کو کبھی بھی معجزے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک سلیم الطبع انسان کے سامنے جب بھی پیغمبر نے اپنی دعوت پیش کی تو انہوں نے بلا تردد اس طرح اس پر لبیک کہا، جیسے وہ پہلے سے اس کے منتظر تھے۔ پھر ایک اور بات بھی انبیاء کرام کی زندگی میں ملتی ہے، وہ یہ کہ جو شخص جتنا زیادہ قلب سلیم کا مالک تھا اور اپنے نبی کی سیرت اور کردار سے جتنی گہرائی سے واقف تھا اس نے اتنی ہی شدت سے اپنے نبی کے اس دعوے کو قبول کیا۔

حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی ذات گرامی اور شخصیت و کردار سے جس انداز سے واقف تھیں وہ سب جانتے ہیں۔ آپؐ کے اپنے قبیلے قریش سے ان کا تعلق تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف بیس بائیس سال تھی اس وقت سے آپؐ کا براہ راست حضرت خدیجہؓ سے واسطہ تھا۔ پہلے بطور شریک کاروبار کے اور بعد میں بطور شریک حیات کے۔ اور اس شراکت میں زندگی کے بیس سال گزر چکے تھے۔ اتنا عرصہ کسی شخص کی عظمت کردار کو جاننے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پھر جو شخص کسی شخص سے جتنا قریب ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کی کمزوریوں سے بھی واقف ہوتا ہے۔ لیکن انبیاء کی زندگیوں کو ہمیشہ یہ غیر معمولی استثناء حاصل رہا ہے کہ ان کی ذات سے جو جتنا زیادہ قریب ہوا اتنا ہی ان کی شخصیت کی عظمت، خوبیوں اور کمالات سے واقف اور ان کا دل کی گہرائیوں سے معترف ہوتا چلا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے بیٹے، یعنی حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر کے صاحبزادے ہند بن ابی ہالہ، جو سیدنا حسن اور سیدنا حسین کے ماموں تھے، انہوں نے حضورؐ کے مزاج اقدس کے بارے میں ایک نہایت بلیغ اور عمیق تبصرہ فرمایا۔ ان کی روایت ہے کہ جو شخص حضورؐ کو پہلی بار دیکھتا تھا اس کے اوپر ایک رعب اور ہیبت کی کیفیت طاری ہوتی تھی اور پھر جو شخص جتنا ساتھ رہتا تھا اس کے دل میں اتنی ہی محبت پیدا ہو جاتی تھی۔ یہی وہ اچھائیاں تھیں جو نبی کے قریب رہنے والوں کو پہلے سے معلوم ہوتی تھیں۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے جوں ہی آپ کی نبوت کی خبر سنی تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا، اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، آپ بہت مہمان نواز ہیں، اور حق کے معاملہ میں ہمیشہ لوگوں کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ گویا حضورؐ کی عظمت اخلاق کا احساس جو حضرت خدیجہؓ کے دل میں پہلے سے موجود تھا اس کی بنیاد پر انہوں نے فوراً جس ردعمل کا مظاہرہ

کیا وہ یہ تھا کہ جو شخصیت اس شان کی ہو اور اتنے کمالات کا حسین مرقع ہو اسے اللہ کا نبی ہونا ہی چاہیے۔

یہی کیفیت بقیہ صحابہ کرام کی بھی تھی۔ اس لیے جس کے دل میں پہلے سے مکارم اخلاق، سلامت طبع اور راست فکری کے عناصر موجود ہوں، جس کے اندر پہلے سے اسلام اور ایمان کے لیے آمادگی کا جذبہ موجود ہو وہ کبھی معجزہ طلب نہیں کرتا، اور ان میں سے کبھی بھی کسی نے معجزہ نہیں مانگا۔ جیسے ہی دعوت دی گئی فوراً قبول کر لی۔ جو لوگ معجزہ مانگتے ہیں وہ اکثر و بیشتر ایمان نہیں لایا کرتے۔ فرعون نے معجزہ مانگا لیکن ایمان نہیں لایا۔ ابوجہل اور ابولہب ساری عمر معجزے ہی طلب کرتے رہے لیکن ایمان نہیں لائے۔

ایک طرف سلیم الفطرت لوگ بلندی کی ایک انتہاء پر ہوتے ہیں۔ جن کو کسی معجزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف کچھ لوگ پستی کی انتہائی حالت میں ہوتے ہیں۔ جو کسی بھی معجزے کو نہیں مانتے۔ مثلاً چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا پھر بھی نہیں مانا۔ لیکن ان دونوں انتہاؤں کے درمیان جو لوگ ہوتے ہیں ان کی بڑی تعداد ایسی ہوتی ہے جن کے دل میں قبول حق کی استعداد تو ہوتی ہے لیکن دل پر ایک پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے۔ معجزہ دیکھنے کے بعد وہ پردہ ہٹ جاتا ہے۔ پردہ ہٹتے ہی انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور آخر کار اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ معجزہ ایسے ہی لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ وہ ایسے ہی لوگوں کو یہ باور کروانے کے لیے ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم الشان شخصیت ہے جو اللہ رب العالمین کی طرف سے ترجمان بنا کر بھیجی گئی ہے اور یہ معجزہ اس کو بطور نشانی کے دیا گیا ہے جس کو کوئی انسان چیلنج نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ کی ایک سنت یہ بھی رہی ہے کہ اس نے جس پیغمبر کو جس علاقہ اور جس قوم میں بھیجا اس کو وہ معجزہ دیا جو اس علاقے کے حالات، ماحول اور اس علاقے کے لوگوں کی ذہنی، عقلی، علمی، ثقافتی اور تمدنی سطح کے مطابق تھا۔ مثال کے طور پر حضرت صالح علیہ السلام کا تعلق جزیرہ عرب سے تھا جہاں پہاڑی اور ریگستانی علاقہ تھا۔ وہاں کوئی لکھنے پڑھنے کا رواج یا کوئی علمی اور فکری زندگی موجود نہیں تھی۔ نہ کوئی صنعت و حرفت تھی۔ خالص اونٹ چلانے والے بدو تھے۔ ان کو ایک ایسی اونٹنی معجزہ کے طور پر دی گئی جو ایک منفرد نوعیت رکھتی تھی۔ یہ سیدھا سادھا معجزہ ان کے مخاطبین کی فہم کے قریب تھا۔ یہ معجزہ ان کے مطالبہ پر ہی ان کو دیا گیا تھا۔ پھر اس اونٹنی کی شرائط

بھی رکھی گئیں۔ اوران سے کہا گیا کہ تم نے معجزہ مانگا ہے۔اب اس کی ذمہ داری بھی ادا کرو۔لیکن وہ اس ذمہ داری کو پورا نہ کر سکے۔اونٹنی کو قتل کر دیا۔انجام کار وہ لوگ بھی تباہ کیے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں تھے ۔وہاں جادوگری کا فن انتہائی عروج پر تھا۔ جادوگری کی بنیاد پر ہی لوگوں کو معاشرہ میں مقام اور برتری حاصل ہوتی تھی۔ بائبل سے پتہ چلتا ہے کہ مصر میں اس زمانہ میں جادوگری کا فن جاننے والوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات دیے گئے وہ اس نوعیت کے تھے کہ مصر کی جادوگری کو ایسے ہی معجزات سے لاجواب اور عاجز کیا جاسکتا تھا۔ ان کے زمانے میں بڑے پیمانے پر جادو سیکھا اور سکھایا جاتا تھا۔ ملک میں لاکھوں کی تعداد میں جادوگر موجود تھے۔ان کو بادشاہ کے دربار میں خوب پذیرائی حاصل تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ایسا زبردست اور غیر معمولی تھا کہ بالاتفاق سارے جادوگروں نے بلا استثناء اور بیک زبان یہ تسلیم کیا کہ یہ معجزہ ہی ہوسکتا ہے۔ یہ جادو نہیں ہوسکتا۔ اور بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ گویا انسانی کمال جہاں تک جاسکتا تھا وہاں تک پہنچے ہوئے اعلیٰ ترین کاملین نے اس کو اپنے اختیار سے باہر اور اپنے کمال سے ماوراایک چیز تسلیم کیا اور اس کو معجزہ مانا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت فلسطین میں ہوئی ۔ان دنوں فلسطین، شام، موجودہ اردن اور عراق کا کچھ حصہ، یہ سب مشرقی سلطنت روما کا حصہ تھا۔اس علاقہ میں جس چیز کا سب سے زیادہ چرچا تھا وہ یونانیوں کے علوم وفنون تھے۔ یونان کا فلسفہ، یونان کی منطق، یونان کے علوم اور یونان کی ہر چیز وہاں مروج تھی۔ یونانیوں میں جو چیز علمی اعتبار سے سب سے نمایاں تھی وہ ان کی طب تھی۔ اب یونانیوں کے باقی علوم تو قریب قریب ناپید ہو گئے، لیکن ان کے علوم وفنون میں جو چیز آج تک چلی آرہی ہے وہ ان کی طب یونانی ہے۔ یونانیوں کا فلسفہ اور منطق آج اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ لیکن جو چیز آج تک مفید اور مقبول چلی آرہی ہے، وہ ان کی طب ہی ہے۔ مثلاً یہاں اس شہر میں اس وقت بھی آپ کو یونانی دوائیں ملیں گی۔ جوارش جالینوس آج بھی ہر جگہ دستیاب ہے۔ معجون بقراط آج بھی لوگوں کے استعمال میں ہے۔

ان حالات اور اس ماحول میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزہ دیا گیا اس کی نوعیت طبی تھی۔ ان کے اس مسیحائی معجزہ کو دیکھ کر یونانی طب کے بڑے سے بڑے ماہر نے یہ تسلیم کیا کہ یہ

طب سے ماوراء کوئی چیز ہے۔ علم طب وہاں تک نہیں پہنچ سکتا جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نفس مسیحائی پہنچا ہے۔ علم طب کے لیے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ایک پیدائشی نابینا کو پھونک ماردی جائے اور اس کی بینائی بحال ہو جائے، یا محض ہاتھ پھیر دینے سے ایک کوڑھی کا کوڑھ ٹھیک ہو جائے۔ ایسی کوئی طب تو ابھی تک بھی ایجاد نہیں ہوئی کہ طبیب کے پھونک مارنے سے مرض ٹھیک ہو جائے۔ لہٰذا سب نے اس کو اللہ تعالیٰ کا معجزہ تسلیم کر لیا۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جس علاقہ میں جو معجزہ بھیجا جائے وہ اس علاقے کے اعلیٰ ترین انسانی کمال سے ماوراء اور اس کی عظمت کی انتہاء سے بہت آگے ہو۔ اور لوگ یہ تسلیم کر لیں کہ یہ ہمارے بس سے باہر کی چیز ہے۔ ایک بنیادی صفت تو معجزہ کی یہ ہے۔ دوسری صفت جو پہلے تمام معجزات میں مشترک رہی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت رہی ہے کہ جب تک اور جس علاقے میں کسی نبی کی نبوت کارفرما رہی اس وقت تک وہ معجزہ بھی باقی رہا۔ اور جب نبوت کا دور ختم ہوا تو معجزہ بھی ختم ہو گیا۔ تیسری صفت یہ تھی کہ سابقہ انبیاء کو حسی معجزات عطا فرمائے گئے جن کو انسان اپنے ظاہری حواس سے محسوس کر سکتا تھا کہ یہ معجزہ ہے۔ چوتھا اہم وصف یہ تھا کہ بقیہ انبیاء کرام کے معجزات وقتی معجزات تھے، جو ایک خاص زمانہ کے بعد ختم ہو گئے۔ آج ہم یہ مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنا عصا پھینکتے تھے تو وہ اژدہا بن جایا کرتا تھا۔ لیکن آج نہ وہ عصا ہے اور نہ وہ اژدہا ہے۔ ہم میں سے کسی نے نہ وہ عصا دیکھا اور نہ وہ اژدہا دیکھا۔ اس لیے کہ یہ معجزہ صرف اس دور کے لیے تھا۔ وہ دور گزرا تو وہ معجزہ بھی ختم ہو گیا۔

اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہمیشہ کے لیے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس لیے آپ کا پیش کردہ وہ معجزہ بھی باقی ہے، جو اس نبوت کی تصدیق اور دلیل کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ جب تک حضور علیہ السلام کا دین باقی ہے، آپ کا معجزہ بھی باقی رہے گا۔ قرآن مجید حضورؐ کے معجزات میں سب سے بڑا معجزہ ہے اور اس اعتبار سے منفرد ہے کہ حضورؐ نے اپنی نبوت کی تائید و تصدیق میں جب بھی کوئی چیز پیش فرمائی تو وہ قرآن ناطق اور قرآن صامت ہے۔ ان دونوں کے علاوہ جتنے معجزات بھی آپؐ کے دست مبارک پر ظاہر ہوئے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر پیش نہیں فرمایا۔

سیرت کے بہت سے واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے کسی بھی غیر مسلم کو اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر کوئی حسی چیز پیش نہیں فرمائی۔ صرف اپنی شخصیت اور قرآن مجید کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کس اعتبار سے معجزہ ہے اور حضورؐ کی ذات گرامی کس اعتبار سے معجزہ ہے۔ ایک اعتبار سے اصل معجزہ تو حضورؐ کی ذات گرامی ہے جس کو دیکھ کر ہر قلب سلیم نے بلا تامل یہ قبول کیا کہ یہ پیغام اور یہ دعوت سچ ہے۔ عبداللہ بن سلام ایک صاحب علم شخصیت تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی ذات گرامی کے بارے میں منفی پروپیگنڈہ سنا ہوا تھا لیکن جونہی ملاقات ہوئی اور چہرہ مبارک پر نظر پڑی تو فوراً پکار اٹھے کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے انسان کا نہیں ہوسکتا۔ حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مثالیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں صحابہ کرام کی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

قرآن مجید کی معجزانہ حیثیت کو سمجھنے کے لیے ایک بنیادی بات یہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دور کے لیے بھیجے گئے تھے وہ دور نزول وحی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے، یعنی ۲۷ رمضان ۱۳ قبل ہجرت سے وہ زمانہ شروع ہوا۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ اس کائنات کو باقی رکھتا ہے اس وقت تک یہ دور جاری رہے گا۔ یہ سارا زمانہ حضورؐ کا اور آپؐ کے پیغام کا دور ہے۔ اگر اس زمانہ کی کوئی ایسی انفرادی خصوصیت تلاش کی جائے جو اس زمانہ کو سابقہ زمانوں سے ممیز کردے تو وہ صرف علم و تحقیق اور معرفت ہے۔ آپؐ سے پہلے کا دور لاعلمی اور جہالت کا دور ہے۔ اور یہ دوسرا دور علم و حکمت اور دانائی کا دور ہے۔ اس لیے حضورؐ کو جو معجزہ عطا فرمایا گیا وہ ایسا علمی معجزہ ہے جسے دیکھ کر ہر دور کا صاحب علم یہ تسلیم کرلے گا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور ہماری قدرت سے ماوراء ہے۔

یہ بات تو ان انبیاء کرام کو دیے جانے والے معجزات کے خصائص کی وجہ سے سامنے آئی۔ لیکن یہ بات کہ قرآن مجید کے اعجاز کے اہم پہلو کون سے ہیں۔ اس پر ابھی بات کرنی ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے ایک بات اور ذہن میں رکھیں۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بعثتیں ہوئی ہیں۔ سورۃ جمعہ میں بتایا گیا کہ وہی ذات ہے جس نے عرب کے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم، یہ تو پہلی بعثت ہوئی، جو عرب کے امیوں کی طرف ہوئی۔ اس کے بعد دوسری بعثت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ کچھ اور لوگوں کی

طرف بھی بھیجا۔ یعنی ان بہت سے لوگوں کی طرف جو ابھی تک آئے ہی نہیں، جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ وآخرین منھم لما یلحقوا بھم۔

اب یہ تو نہیں ہوسکتا تھا کہ حضورؐ کی عمر مبارک کئی ہزار سال ہوتی اور آپؐ براہ راست ہر انسان کو دین کی دعوت دیتے۔ ایسا ہونا سنت الٰہی کے خلاف ہے۔ اس لیے جس طرح عام انسانوں کو بھیجا گیا اسی طرح رسول کو بھی بھیجا گیا۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ حضورؐ کی ایک بعثت تو پہلے کی جائے۔ پہلے مرحلے میں جو براہ راست مخاطبین رسول ہوں وہ حضورؐ کے ذریعے سے تیار ہوجائیں اور تربیت پا جائیں۔ پھر ان تربیت یافتگان کے ذریعے سے دوسرے انسانوں تک دعوت پہنچائی جائے۔ یوں آگے اور آگے تک یہ سلسلہ چلتا رہے۔ ظاہر ہے کہ یہی زیادہ بہتر، عقلی، انسانی اور منطقی انداز تھا۔ آپؐ کی نبوت اور دعوت کو تا قیام قیامت انسانوں تک پہنچانے کا اس سے بہتر اور موثر نظام نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے حضورؐ کی دو بعثتیں ہوئی ہیں، اور دونوں بعثتوں کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ ایک براہ راست بعثت جس کی سعادت عربوں کو اور صحابہ کرام کو حاصل ہوئی اور دوسری بعثت ان لوگوں کی طرف جن کو بالواسطہ یعنی صحابہ کرام یا تابعین یا ان کے بعد آنے والی نسلوں کے ذریعہ سے پیغام پہنچانا تھا۔

اب قرآن مجید کی ان دونوں بعثتوں کے لحاظ سے اور قرآن مجید کے ان دو مختلف مخاطبین کے لحاظ سے دو مختلف طرح کا اعجاز قرآن میں پایا جاتا ہے۔ پہلی نوعیت کے اعجاز پر تو لوگ اکثر و بیشتر بہت زور دیتے ہیں، کتابیں بھی اکثر و بیشتر اعجاز کے اسی پہلو پر لکھی گئی ہیں۔ دوسرے دور کے اعجاز پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے۔ رسول اللہؐ کے اولین مخاطبین کفار عرب اور مشرکین مکہ تھے۔ ان کو جو چیز متاثر کرسکتی تھی وہ کلام اللہ کے لفظی معنی، اس کی فصاحت و بلاغت، اس کے اسلوب کی بلندی، اس کے صنائع اور بدائع اور اس کے نظم کا کمال۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو اہل عرب کو براہ راست متاثر کرسکتی تھیں۔ وہ لوگ قانون، فلسفے، ریاضی سے واقف نہیں تھے۔ زبان دانی اور فصاحت اور بلاغت ہی ان کا میدان تھا۔ وہ اپنے آپ کو فصیح اللسان اور اپنے علاوہ ہر ایک کو عجم یعنی گونگا سمجھتے تھے۔ گویا ان کو اپنی زبان دانی پر اتنا ناز تھا کہ ان کی نظر میں ساری دنیا گونگی تھی۔ کوئی نوجوان شعر کہنا شروع کرتا تو خوشی مناتے اور دعوتیں کیا کرتے تھے۔

حضرت حسان ابن ثابتؓ مشہور صحابی اور صف اول کے شاعر ہیں۔ ان کا چھوٹا بچہ

ایک مرتبہ روتا ہوا آیا۔ اس کو بھڑ نے کاٹ لیا تھا۔ حضرت حسانؓ نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ بچہ نے جواب دیا: مجھے کسی چیز نے کاٹ لیا ہے۔ حضرت حسان نے پوچھا: وہ چیز کیا اور کیسی تھی۔ بچہ بولا: کہ مجھے ایک ایسی چیز نے کاٹ لیا ہے جو اس طرح کی تھی جیسے اس نے دھاری دار چادر اوڑھ رکھی ہو۔ حضرت حسانؓ یہ سن کر خوشی سے جھوم اٹھے کہ خدا کی قسم، میرا بیٹا تو شاعر ہو گیا۔ یعنی صرف اس کی طرف سے یہ منفرد سی تشبیہ دینے پر خوش ہوئے کہ بچہ کے اندر شاعری کے جراثیم موجود ہیں۔

عربوں میں زبان دانی کا معیار تین چیزیں مانی جاتی تھیں۔ انہی تینوں چیزوں سے زبان دانی کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک خطابت، دوسرے شاعری، تیسرے کہانت۔ کہانت سے مراد وہ چھوٹے چھوٹے بے معنی یا مبہم جملے ہوتے تھے جو کاہن لوگ غیب کے علم کے اظہار کے لیے بولا کرتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ انھیں غیبیات کا علم ہے۔ عربوں نے شعر و شاعری کے ذخائر بھی محفوظ رکھے۔ خطابت کے بہت سے ذخائر بھی محفوظ رکھے۔ کاہنوں کے جملے بھی نسلاً بعد نسل نقل ہوتے رہے۔

سب سے نمایاں درجہ شاعری کا تھا۔ عربوں نے جن بڑے بڑے شاعروں کی بڑائی کو بالاتفاق تسلیم کیا ان میں سات شعراء سب سے بڑے مانے جاتے تھے۔ ان کے سات بڑے قصائد تھے۔ ان کو مذہبات کہا جاتا تھا۔ یعنی سونے سے لکھے جانے کے قابل۔ ان سات شعراء کی عظمت کو عرب کے تمام شعراء نے مانا اور تسلیم کیا۔ یہاں تک جب کوئی شاعر ایسا شعر کہا کرتا جس کے بارے میں تمام شعراء بے اختیار یہ پکار اٹھتے کہ اس شعر سے اونچا کوئی شعر نہیں ہے تو وہ اس شاعر کے آگے سجدے میں گر جایا کرتے تھے۔ یہ گویا کسی شاعر کے شاعرانہ کمال کی معراج تھی کہ دوسرے شعراء اس کی عظمت کے اعتراف میں سجدہ میں گر جائیں۔

قرآن مجید کی عظمت کا ایک پہلو یہ تھا کہ اس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے ایسے بڑے بڑے زبان دانوں نے سر تسلیم خم کیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ بڑے بڑے مخالفین نے قرآن مجید کو سنا اور اس کے زور بیان اور قوت کے سامنے سپر رکھ دی۔ اس کے زور بیان کی مزاحمت نہیں کر سکے اور فوراً متاثر ہو گئے۔ اس تاثر کی واقعاتی مثالیں دی جائیں تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

سیدنا عمر فاروقؓ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ شروع شروع میں اسلام کے سخت

مخالف تھے اور ذات رسالت مآبؐ کے بارہ میں بھی اچھے خیالات نہیں رکھتے تھے، اس لیے نہ انہوں نے اس وقت تک آپؐ کی زبان مبارک سے کلام الٰہی سنا اور نہ ہی آپؐ سے کبھی با قاعدہ کوئی ملاقات کی۔ مخالفین سے جو کچھ سن رکھا تھا بس اسی کے اثر میں تھے۔ خود ان کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے ان کے دل میں جو اسلام کا بیج پڑا جس نے ان کو بالآخر قبول اسلام پر آمادہ کیا وہ دراصل قرآن پاک سننے کا ایک واقعہ ہے۔

بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو کسی محفل سے واپس آ رہے تھے۔ آدھی رات کا وقت تھا اور ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں موجود ہیں، بیت اللہ کی طرف رخ کیے نماز ادا کر رہے ہیں۔ اور بلند آواز سے تلاوت قرآن بھی فرما رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اس وقت تو کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے، کیوں نہ ٹھہر کر اس کلام کو سنا جائے۔ شاید دوسروں کے سامنے سننے سے عار محسوس کرتے ہوں گے کہ لوگ کہیں گے کہ اتنا زیرک اور ہوشمند شخص اسلام کی باتیں سنتا ہے۔ یہ سوچ کر خاموشی سے بیت اللہ کے دوسری جانب کھڑے ہو گئے اور پردے کے اندر چھپ گئے۔

اس وقت بیت اللہ کے پردوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی تھی جو آج ہے۔ آج پردے بیت اللہ کے دیواروں کے ساتھ کسے ہوئے ہوتے ہیں اور بیت اللہ کے سائز کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ آج ان کے اندر کوئی نہیں جا سکتا۔ لیکن اس وقت بیت اللہ کے پردوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے اوپر ایک نہیں بلکہ چھوٹے بڑے بہت سے پردے چادروں کی طرح لٹکے ہوتے تھے۔ جس کسی کا دل چاہتا تو جب بھی موقع ملتا وہ کوئی چادر لا کر باندھ دیا کرتا تھا۔ کسی نے بڑا کپڑا لٹکا دیا اور کسی نے چھوٹا۔ اس طرح ایک ایک سمت میں کئی کئی پردے لٹکے رہتے تھے۔ ان پردوں کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہونا آسان تھا۔

اس طرح کے ایک پردے کے اندر چھپ کر حضرت عمر فاروقؓ نے حضورؐ کی تلاوت سننی شروع کر دی۔ حضورؐ اس وقت سورۃ حاقہ کی تلاوت فرما رہے تھے۔ عمر فاروقؓ کہتے ہیں کہ تلاوت سنتے ہوئے مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرا دل اب نکل پڑے گا۔ میں اس کلام کے زور اور اس کی گہری تاثیر کی مزاحمت نہ کر سکا۔ میں نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے اور اپنے آپ کو اس کے اثر سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے فوراً اپنے آپ کو یہ تسلی دینے کی کوشش کی کہ یہ تو بڑا زبردست

شاعرانہ کلام ہے۔ اسی وقت حضورؐ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے وما ھو بقول شاعر۔ حضرت عمر فاروقؓ کہتے ہیں کہ میں نے فوراً ہی دوبارہ اپنے دل کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کی اور دل میں کہا کہ: تو پھر یہ کہانت ہے۔ اسی وقت حضورؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی، و لا بقول کاھن، یہ سن کر وہ مزید اس کلام کو برداشت نہ کر سکے۔ اور وہاں سے واپس چلے آئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد دو تین دن وہ ایک شدید ذہنی الجھن، پریشانی اور ایک سخت قسم کی نفسیاتی کیفیت میں گرفتار رہے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ اسی کیفیت میں یہ طے کیا کہ اس سارے قصہ ہی کو ختم کر دیتے ہیں۔ نہ حضورؐ رہیں گے اور نہ یہ پریشانی ہوگی۔ یہ فیصلہ کر کے گھر سے چلے اور بالآخر قبول اسلام کی نوبت آئی، جیسا کہ واقعہ کی تفصیل آپ سب کے علم میں ہے۔

دوسرا واقعہ حضرت خالد بن ولید کے باپ کا ہے۔ اس کا نام ولید بن مغیرہ تھا۔ یہ خود بھی قریش کا ایک بہت بڑا سردار تھا اور خالدؓ جیسے فاتح جنرل کا باپ تھا۔ ولید کو ایک مرتبہ یکسوئی کے ساتھ تنہائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا موقع ملا۔ آپؐ نے غالباً اسے کھانے کی دعوت دی۔ وہ اس کشمکش میں گرفتار تھا کہ جائے یا نہ جائے۔ لوگوں سے مشورہ کیا۔ لوگوں نے کہا جانے میں کیا حرج ہے، آپ پڑھے لکھے ہیں، سمجھدار ہیں، آپ کو جانا چاہیے۔ لہٰذا وہ آپؐ کی دعوت قبول کرتے ہوئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھانے کے بعد قرآن مجید کا کچھ حصہ سنایا۔ وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ بہت متاثر ہو کر واپس آ گیا اور اگلے دن قریش کی مجلس میں جا کر کہنے لگا کہ تم انکی مخالفت چھوڑ دو۔ اس لیے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ تم اس کلام کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ابو جہل نے یہ سن کر اس کا بہت مذاق اڑایا اور بولا کیا کھانا زیادہ مزیدار تھا کہ اس کھانے نے تمہیں اتنا متاثر کیا کہ تم بالکل بدل کر آ گئے ہو؟۔ اس نے کہا کہ جو چاہو سو کہو، کہنی تھی وہ کہہ دی۔ پھر وہ زندگی بھر اس تاثر پر قائم رہا۔ اسلام کی مخالفت میں جتنا پہلے سرگرم عمل تھا اتنا نہیں رہا۔ لیکن اسلام اس کے مقدر میں نہیں تھا اس لیے وہ مسلمان نہیں ہوا۔ البتہ اسے یہ یقین ہو گیا کہ یہ کوئی غیر معمولی چیز ہے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ مشہور سردار عتبہ بن ربیعہ کا ہے۔ یہ بھی قریش کا ایک بہت بڑا سردار تھا۔ اس کو قریش نے باقاعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ پوچھنے کے لیے

بھیجا کہ آخر حضورؐ چاہتے کیا ہیں۔ وہ آیا اور اس نے حضورؐ کو بہت سی پیش کشیں کیں کہ بھتیجے! اگر تم دنیاوی مال و دولت چاہتے ہو تو ہم تمہارے لیے مال و دولت کا ڈھیر لگا دیں گے۔ اگر اقتدار چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سربراہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اور اگر عرب کی کسی بھی خاتون سے شادی کے خواہاں ہو تو اس کا انتظام کیے دیتے ہیں۔ لیکن تم اپنے اس کام سے باز آ جاؤ۔ جب وہ ساری بات کہہ چکا تو آپؐ نے پوچھا کہ چچا، آپ کو جو کہنا تھا آپ کہہ چکے؟ اس نے کہا ہاں کہہ چکا۔ آپؐ نے اس کی ان تمام باتوں کے جواب میں سورہ حم السجدہ کی ابتدائی آیات کی تلاوت کرنی شروع کر دی۔ جس وقت آپؐ تلاوت فرما رہے تھے تو وہ ہاتھ باندھ کر مبہوت حالت میں سنتا رہا۔ جب آپؐ ان آیات پر پہنچے جن میں عاد اور ثمود پر آنے والے عذاب کا ذکر ہے تو اس نے بے اختیار ہو کر اپنا ہاتھ آپؐ کے دہن مبارک پر رکھ دیا اور کہنے لگا کہ بس کیجیے! ایسا نہ کیجیے! آپ کی قوم پر عذاب آ جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا اور جا کر اپنی قوم کو متنبہ کیا کہ بہتر ہے کہ تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ لیکن اسلام اس کے مقدر میں بھی نہیں تھا۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں۔

یہ اعجاز کا ایک پہلو ہے جس کے براہ راست اور اولین مخاطب تو عرب تھے، بعد میں آنے والے بالواسطہ اعجاز کے اس درجہ کے مخاطب تھے۔ دوسرا پہلو وہ ہے جس کے اولین مخاطب بعد والے تھے اور اہل عرب اس کے بالواسطہ مخاطب تھے۔ یہ قرآن مجید کے اعجاز کا وہ پہلو ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا۔ جتنا زیادہ لوگ اس پر غور وخوض کرتے جائیں گے نئی نئی چیزیں۔ سامنے آتی جائیں گی۔ قرآن مجید نے اپنے علمی اعجاز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مخالفین کو اس بات کی دعوت دے رکھی ہے کہ اگر تمہیں اس کتاب کے آسمانی کتاب ہونے میں شک ہے تو ایسی ہی ایک کتاب تم بھی بنا کر لے آؤ۔ پھر یہ چیلنج دیا گیا کہ اس جیسا کلام لے آؤ۔ فلیاتو بحدیث مثلہ۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بھی کسی کے بس کی نہیں تھی۔ اس چیلنج کو سالہا سال دہرایا جاتا رہا۔ عرب اور قریش کے بڑے بڑے شعراء وہاں موجود تھے، خطباء اور زبان دان موجود تھے، دیگر اہل علم ودانش موجود تھے۔ وہ بھی تھے جن کو زمانہ جاہلیت میں کامل کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہود ونصاریٰ بھی تھے۔ ان کے علماء اور ربی بھی موجود تھے۔ ان کی درسگاہیں اور علمی ادارے بھی تھے۔ لیکن کسی کو مقابلہ کی جرات نہیں ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد اس چیلنج میں تخفیف کر دی گئی اور کہا گیا کہ اس جیسی دس

سورتیں ہی بنا کر لے آؤ۔ یہ بات بھی بار بار دہرائی جاتی رہی۔ سالہا سال صحابہ کرام اس آیت مبارکہ کی تلاوت اور تحریر وتسوید میں مصروف رہے۔ پھر آخر میں کہا گیا کہ اس جیسی ایک سورت ہی بنالاؤ۔ چونکہ چھوٹی سے چھوٹی سورت تین آیتوں پر مشتمل ہے' یعنی سورۃ کوثر۔ تو گویا یہ کہا گیا کہ اس جیسی تین آیتیں ہی بنا کر دکھادو۔

لیکن اس چیلنج کا بھی آج تک کوئی جواب نہیں دے سکا۔ یہ چیلنج اب بھی موجود ہے۔ اور دنیا بھر کے لیے ہے، یہ کہنا غلط ہوگا کہ شاید دنیا کو اس چیلنج کا علم نہیں، اس لیے کہ اب تک قرآن مجید کا ترجمہ دنیا کی ۲۰۵ زبانوں میں ہو چکا ہے اور قرآن پاک کا علم رکھنے والے اور اس چیلنج کی بابت جاننے والے مشرق اور مغرب میں ہر جگہ موجود ہیں۔ قرآن پاک کے ان سینکڑوں تراجم پر مشتمل کروڑوں نسخے ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن آج تک کسی بڑے سے بڑے فلسفی، سائنس دان حکیم، عالم' شاعر اور ادیب نے اس چیلنج کو قبول کرنے کی جراءت نہیں کی۔ ایسی کوئی ایک مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی کہ کسی نے قرآن مجید یا اس جیسی کوئی سورت یا کوئی آیت لکھ کر اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی غرض سے دنیا کے سامنے پیش کی ہو۔ مقابلہ کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ مسیلمہ کذاب اپنے ماننے والوں سے کہا کرتا تھا کہ اس پر بھی وحی نازل ہوتی ہے، اور وہ وحی کے نام پر کچھ فضول قسم کی باتیں بیان کیا کرتا تھا۔ غالباً اس کو بھی کسی نے نہیں مانا۔ یہ بات درست نہیں ہے کہ مسیلمہ کو لوگوں نے واقعی پیغمبر مان لیا تھا۔ یہ محض قبائلی عصبیت تھی جس کی وجہ سے اس کے قبیلہ کے بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ کلمات یا وہ الفاظ جو وہ اپنی قوم کے سامنے بطور وحی کے پیش کیا کرتا تھا' ان الفاظ کو اس نے یا اس کے ماننے والوں نے کبھی بھی قرآن مجید کے مقابلہ پر نہیں رکھا۔ وہ قرآن مجید کو بھی مانتا تھا کہ یہ بھی آسمانی کتاب ہے۔ گویا قرآن کا مقابلہ اس نے بھی نہیں کیا اور نہ ایسا کرنے کی وہ جراءت کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اتنا زبان دان اور فہیم تھا کہ وہ یہ سمجھ گیا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔

قرآن مجید کے بارے میں یہ تو ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس کو آسمانی کتاب نہ مانتے ہوں، یا اس کو کتاب ہدایت نہ سمجھتے ہوں۔ ان میں بہت سے یہودی اور عیسائی بھی شامل ہیں۔ لیکن ایک چیز کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے اور یہ انسانی لسانیات وادبیات کی تاریخ کا ایک بڑا عجیب وغریب واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ارشادات گرامی جن کو ہم احادیث

کہتے ہیں ان کے اسلوب اور قرآن مجید کے اسلوب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہر وہ شخص جس نے کچھ عرصہ قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ پڑھی ہوں اس کو تھوڑی سی کاوش سے یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ قرآن کے اسلوب اور حدیث کے اسلوب میں امتیاز کر سکے۔ قرآن کی آیت یا حدیث کا متن سنتے ہی اس کو پتہ چل جائے گا کہ ان دونوں عبارتوں میں سے کون سی قرآنی آیت ہے اور کون سی حدیث ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو کسی اور انسان کے بس میں نہیں ہے۔ کوئی انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ کلام کے دو مختلف انداز اختیار کر لے اور دونوں اسلوبوں میں مسلسل تئیس سال تک الگ الگ کلام کرتا رہے۔ دونوں کلام الگ الگ مدون ہوں، اور دیکھنے والے مبصر کو پہلی ہی نظر میں پتہ چل جائے کہ یہ الگ کلام ہے اور یہ الگ کلام ہے۔ یہ امتیاز اسی وقت ممکن ہے کہ جب ایک حصہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہو اور معجز ہو، اور دوسرا حصہ حضورؐ کے اپنے الفاظ ہوں اور غیر معجز ہوں۔ اگرچہ حدیث نبوی کا فصاحت اور بلاغت میں بہت اونچا مقام ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلا شک وشبہ افصح العرب تھے، لیکن آپؐ نے اپنے الفاظ و ارشادات کو کبھی معجزہ کے طور پر پیش نہیں کیا۔ آپؐ نے قرآن مجید ہی کو ہمیشہ معجزہ کے طور پر پیش کیا اور اسی کو ماننے کی دعوت دی۔

اعجاز قرآن کا سب سے اہم پہلو اس کی غیر معمولی فصاحت و بلاغت ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ کی بندش اور اس کا اسلوب اتنا منفرد ہے کہ کلام عرب میں اس کی کوئی نظیر نہ اس وقت تھی اور نہ بعد کے چودہ سو سال کے دوران میں سامنے آئی۔ عربی زبان کے اسالیب بیان میں کوئی اور اسلوب اس سے ملتا جلتا موجود نہیں ہے۔ نہ یہ خطابت ہے۔ نہ نظم ہے، نہ عام اور معروف مفہوم میں نثر ہے، نہ شعر ہے۔ نہ کہانت ہے، نہ ضرب المثل۔ قرآن مجید کا اسلوب ان سب سے الگ ہے۔ کوئی شخص کبھی بھی قرآن مجید کے اسلوب کی پیروی نہیں کر سکا اور نہ آئندہ کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس اسلوب کی پیروی کی ہی نہیں جا سکتی۔ کوئی بڑے سے بڑا ادیب قرآن مجید کی فصاحت اور بلاغت کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ فصاحت کے معنی ہیں کسی خاص موقع پر کسی بہترین اور موزوں ترین لفظ کا استعمال، اور بلاغت سے مراد یہ ہے کہ الفاظ کی عمومی بندش اور باہمی ترکیب سے جو مفہوم نکلتا ہے وہ اس طرح نکلے کہ بالکل حقیقت حال کے مطابق ہو۔ اس لیے قرآن مجید بہت بلیغ بھی ہے اور فصیح بھی۔ جو الفاظ فصاحت کے نقطۂ نظر سے عربی زبان میں ذرا کم سمجھے جاتے

تھے۔ وہ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوئے۔

مثال کے طور پر ارض کی جمع عربی زبان میں ارضین آتی ہے۔ یہ لفظ حدیث میں بھی آیا ہے اور فقہاء کے یہاں بھی بہ کثرت استعمال ہوا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں ارضین کا لفظ استعمال نہیں ہوا، اس لیے کہ یہ لفظ (بصیغہ جمع) فصاحت کے اس اعلیٰ معیار کے خلاف ہے جو قرآن میں ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جب قرآن مجید نے سات زمینوں کا ذکر کیا تو اس کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان بنائے اور اتنی ہی زمینیں، ومن الارض مثلھن۔ اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ زمینیں سات ہیں، لیکن اس وضاحت کے باوجود قرآن مجید نے غیر معیاری لفظ استعمال نہیں فرمایا۔ قرآن مجید میں وہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو زبان پر بہت رواں ہیں۔ اور بہت آسانی سے لوگوں کے دلوں میں اتر جانے والے ہیں۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا ایک عجیب و غریب وصف یہ ہے کہ یہ کلام ایک ایسی شخصیت کی زبان مبارک سے جاری ہوا جس نے کبھی کسی مکتب میں بیٹھ کر تعلیم نہیں پائی، کبھی کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا، کسی درسگاہ میں کبھی لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن کے لیے بھی کسی مکتب میں بطور طالب علم تشریف لے گئے ہوتے تو عرب لوگ فوراً کہتے کہ فلاں شخص سے یہ سب کچھ سیکھ لیا ہے، اگر ایسا ہوا ہوتا تو آج مغرب کے مستشرقین آسمان سر پر اٹھا چکے ہوتے اور یہ کہہ کہہ کر ہر ایک کو گمراہ کر رہے ہوتے کہ یہ سب کچھ وحی الٰہی کا فیض نہیں، بلکہ فلاں استاد اور فلاں مدرس کا کمال ہے۔ اب کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے حضورؐ کو ایک نقطہ کی بھی تعلیم دی ہے۔ اگر ایک مرتبہ ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا ہو جاتا تو بات کا بتنگڑ بنانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے ماحول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت فرمائی جہاں کسی انسان کے یہ جھوٹا دعویٰ کرنے کا بھی کوئی امکان نہیں ہے کہ حضورؐ کو سکھانے میں اس کا یا کسی اور انسان کا بھی کوئی ہاتھ ہے۔

یہ کلام جو یکایک حضورؐ کی زبان مبارک پر جاری ہوگیا اس میں ماضی کی اقوام کے واقعات بھی شامل تھے، ایسے ایسے تفصیلی واقعات اس کلام میں شامل تھے جو کبھی بھی عربوں کے علم میں نہیں تھے۔ اسی طرح اس کلام میں ان سوالات کے جوابات بھی نہایت تفصیل سے دیے گئے جو یہودیوں کے اکسانے پر کفار مکہ نے آپؐ سے کیے۔ جن میں اصحاب کہف کا واقعہ، حضرت موسیٰ

اور خضر علیہم السلام کا واقعہ، ذوالقرنین کا واقعہ اور متعدد دوسرے واقعات شامل ہیں جن سے عرب واقف نہیں تھے۔ قرآن مجید میں اتنی تفصیل سے ان سوالات کے جوابات دیئے گئے کہ پوچھنے والوں کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

قدیم تاریخی واقعات کے علاوہ بہت سے مواقع پر قرآن مجید میں لوگوں کے دلوں کی باتیں بھی بیان کردی گئیں۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہم پر تشریف لے گئے جو بنو مصطلق کی سرکوبی کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ وہاں شدید گرمی اور پانی کی کمی تھی۔ پانی کا صرف ایک چشمہ تھا اور سب لوگ اس سے پانی بھر رہے تھے۔ ایک صحابی جہجاہ بن عمرو غفاری جو حضرت عمر فاروقؓ کے ملازم تھے۔ وہ پانی لینے گئے۔ ان کی باری آئی اور انہوں نے پانی لینا چاہا تو ان سے پیچھے جو صاحب کھڑے تھے وہ ایک بہت سینئر انصاری صحابی تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر میں پہلے پانی لے لوں تو شاید انھیں کوئی اعتراض نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے آگے بڑھ کر پانی لینا چاہا۔ اس پر حضرت عمرؓ کے ملازم نے انہیں کہنی سے پیچھے کرنا چاہا۔ وہ انصاری صحابی گر گئے اور دونوں کے درمیان تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ مشہور منافق عبداللہ ابن ابی بھی قریب ہی موجود تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور وہاں موجود نوجوان انصاریوں کو بھڑکانا شروع کر دیا اور بولا کہ یہ مہاجر کس قدر شیر ہو گئے ہیں۔ اگر میرے بس میں ہو تو میں یہ کر دوں اور وہ کر دوں، اور پھر بولا: مدینہ پہنچ کر عزت والا ذلت والوں کو نکال باہر کرے گا۔ وہاں ایک کمسن صحابی زید بن ارقم بھی موجود تھے۔ انہوں نے یہ بات سنی اور آ کر حضورؐ کو بتائی۔ آپؐ نے بعض انصاری صحابہ کو بلا کر ان سے فرمایا کہ سفر کے دوران میں ایسا جھگڑا کرنا مناسب نہیں ہے۔ ان صحابہ نے عبداللہ بن ابی سے یہ بات کی تو وہ مزید اکڑ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں آ کر بدتمیزی سے بھی پیش آیا اور اپنی بات سے بھی مکر گیا۔ ابھی اس جگہ سے روانہ بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ حضورؐ پر وحی کے آثار نمودار ہوئے۔ سورہ منافقون نازل ہوئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے کمسن صحابی زید بن ارقم کی بات کی تائید کر دی۔ حضورؐ نے اسی وقت زید بن ارقمؓ کو بلوایا اور پیار سے ان کا کان مروڑ کر فرمایا، بچے کے کان نے صحیح سنا تھا! بچے کے کان نے صحیح سنا تھا! بچے کے کان نے صحیح سنا تھا! غالباً تین مرتبہ یہ بات ارشاد فرمائی۔

کئی مرتبہ اور بھی ایسا ہوا کہ منافقوں نے کوئی بات دل میں سوچی اور وہ قرآن مجید میں

آ گئی۔ سورۃ توبہ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ بہت سے مواقع پر قرآن میں مستقبل کے بارے میں بھی ایسی پیش گوئیاں کی گئیں کہ جب وہ پوری ہوئیں تو دنیا دنگ رہ گئی۔ ان پیشین گوئیوں کی سب سے بڑی مثال روم وفارس کی جنگ میں روم کی فتح کی پیشین گوئی تھی۔ اس زمانہ میں روم اور فارس دنیا کی دو عظیم سلطنتیں تھیں۔ ان میں آپس میں لڑائی چھڑ گئی۔ اس زمانہ میں حضورؐ مکہ مکرمہ میں تھے۔ وہاں ان کی اس جنگ کی خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ مشرکین مکہ کی ہمدردیاں فارسیوں کے ساتھ تھیں، اس لیے کہ وہ آتش پرست تھے اور مشرکین مکہ بت پرست تھے۔ یوں ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے سے اس لحاظ سے قربت تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی ہمدردی رومیوں کے ساتھ تھیں، اس لیے کہ وہ عیسائی تھے، نبوت پر ایمان رکھنے والے تھے۔ ان کو مسلمانوں کی ہمدردیاں اس بناء پر حاصل تھی کہ دونوں میں یہ قدر مشترک تھی کہ وہ آسمانی مذاہب، نبوت، آخرت وغیرہ پر ایمان رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں فارسیوں نے ابتداءً رومیوں کو شکست دے دی اور تقریباً بالکل ختم کر کے رکھ دیا۔ مشرکین مکہ نے اس موقع پر بہت خوشی منائی اور مسلمان مغموم ہوئے۔

اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی، **الم ۔ غلبت الروم**۔۔۔ان آیات میں مسلمانوں کو یہ خوش خبری دی گئی کہ چند سال کے اندر اندر رومیوں کو کامیابی حاصل ہوگی، اگرچہ اس وقت وہ مغلوب ہو گئے ہیں۔ اور جب انھیں کامیابی حاصل ہوگی تو اس دن مسلمان بھی اپنی فتح کی خوشی منا رہے ہوں گے۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت رومیوں کی فتح کا کوئی ظاہری امکان دور دور بھی نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ چند سال کے اندر اندر رومی سردار ہرقل نے فارس پر حملہ کیا اور اس کو پہلی کامیابی اس دن حاصل ہوئی جس دن مسلمان یوم بدر میں کامیابی کی خوشی منا رہے تھے۔ ہرقل کو دوسری کامیابی اس دن حاصل ہوئی جس دن مسلمان حدیبیہ سے کامیاب واپس جا رہے تھے، اور تیسری اور آخری کامیابی اس وقت ہوئی جب مسلمان فتح مکہ کی مہم سے فارغ ہوئے تھے۔ عام حالات کے نقطہ نظر سے اس فتح کا کوئی امکان نہ تھا۔ لیکن ایسا ہو کر رہا، اور قرآن مجید کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ قرآن مجید میں اس پیش گوئی کے پورے ہونے کے لیے بضع سنین کا لفظ استعمال کیا گیا تھا جس کا اطلاق تین سے نو تک کے عدد پر ہوتا ہے۔ چنانچہ پورے نو سال کے اندر اندر یہ پیشین گوئی مکمل طور پر پوری ہوگئی۔

اسی طرح قرآن مجید میں ایک جگہ فرعون کے بارے میں آیا ہے، فالیوم ننجیك ببدنك ۔۔۔، آج ہم تیرے بدن کو باقی رکھیں گے تا کہ تیرے بعد آنے والوں کے لیے نشانی رہے۔ اب اس وقت فرعون کی میت تو کہیں محفوظ نظر نہیں آتی تھی۔ اس لیے عام طور پر مفسرین اس آیت کی تاویلیں کیا کرتے تھے۔ ایک تاویل تو کتب تفسیر میں یہ ملتی ہے کہ جب فرعون مر گیا تو اس کی میت کو کئی ہفتہ یا کئی مہینہ باقی رکھا گیا تا کہ آئندہ آنے والوں کے لیے عبرت ہو۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ بدن کا لفظ عربی زبان میں زرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ فرعون کے مرنے کے بعد اس کی زرہ باقی رہی اور لوگ آ آ کر اس کو دیکھتے اور عبرت حاصل کرتے رہے کہ یہ بادشاہ کی زرہ ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ زرہ والی بات دل کو نہیں لگی۔ ہر مرنے والے کے استعمال کی چیزیں باقی رہتی ہیں۔ اس میں عبرت کی کون سی ایسی خاص بات ہے۔

لیکن آج سے تقریباً سو یا سوا سو سال قبل جب قاہرہ کے قریب کھدائی شروع ہوئی اور وہ عمارتیں کھولی گئیں جو اہرام مصر کہلاتی ہیں تو وہاں سے بہت سے قدیم مصری فرمانرواؤں کی میتیں برآمد ہوئیں۔ مصریوں کا طریقہ تھا کہ جب کوئی اہم شخص مرتا تھا تو خاص طریقہ سے مصالحہ لگا کر اس کی میت کو محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ اس میت کو ایک صندوق میں رکھتے اور پھر صندوق کے اوپر مرنے والے کی پوری تفصیل لکھ دیتے تھے کہ یہ شخص کون تھا اور اس کی زندگی کب اور کیسے گذری تھی۔ پھر دیوار میں ایک طاق بنا کر صندوق اس میں کھڑا کرتے اور طاق کو سامنے سے بند کر دیتے تھے۔ اس طرح بے شمار میتیں ہزاروں سال سے محفوظ تھیں۔ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں نہ کبھی اس چیز پر توجہ دی اور نہ کبھی کھول کر دیکھا کہ ان بلند و بالا عمارتوں کے اندر کیا ہے۔

جب دنیائے اسلام پر مغربی ممالک کا غلبہ ہوا تو چونکہ ان کو آثار قدیمہ سے بہت دلچسپی ہے اور وہ ایسے قدیم آثار کی تحقیق اور حضریات میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اس لیے انہوں نے اہرام مصر کو بھی کھولا اور وہاں موجود مردہ لاشوں کو کھنگالا۔ چنانچہ جب انہوں نے جستجو کی اور ان طاقوں کو کھولا تو معلوم ہوا کہ یہاں تو مصر کی تاریخ کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اسی دوران میں جب ایک میت کا صندوق کھولا تو پتہ چلا کہ یہ رعمسیس دوم کی میت ہے۔ جو ایک طویل عرصہ غالباً ۴۸ سال مصر کا فرمانروا رہا۔ جب زمانہ کا اندازہ کیا گیا تو یہ وہ زمانہ نکلا جب حضرت موسیٰ علیہ

السلام مصر میں موجود تھے۔ پھر جب اس کی میت کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ اس کے جسم پر پوری طرح نمک لگا ہوا ہے۔ اس سے ماہرین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ سمندر میں ڈوب کر مرا ہے اور ڈوبنے سے سمندر کے پانی کے ساتھ سمندر کا نمک بھی اندر چلا گیا، اور یہ وہی نمک ہے جو میت کے جسم سے نکل نکل کر باہر آتا رہا اور یوں میت کے جسم پر باہر بھی لگا رہ گیا۔ گویا پورے طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ یہ وہی فرعون ہے جس کے ڈوبنے کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے اور جس کے جسم (بدن) کو محفوظ رکھے جانے کی خبر دی گئی ہے۔ فرعون کی یہ میت آج بھی قاہرہ کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ اور دیکھنے والے اس کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح فالیوم ننجیك ببدنك والی بات سچ ثابت ہو گئی۔

قرآن مجید کے اعجاز کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ قرآن مجید میں کئی ایسے بیانات آئے ہیں جن کے بارے میں ہمارے دور کے بعض لوگوں نے شکوک اور شبہات کا اظہار کیا ہے اور مستشرقین نے بھی ان پر بہت سے اعتراضات کا طوفان اٹھایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات جو قرآن مجید میں آئی ہے وہ تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ اب عیسائیوں کے بارے میں تو سب جانتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن یہودیوں کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ تو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا نہیں مانتے، اور نہ ہی یہودیوں کی کسی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ عزیر اللہ تعالیٰ کے بیٹے تھے۔ نہ ہی آج کل کے یہودی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہودیوں کا کبھی یہ عقیدہ رہا ہو۔ جب پہلی دفعہ یہ اعتراض سامنے آیا تو مسلمان علماء میں سے بعض حضرات نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا کہ جس زمانے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی اس زمانہ میں یہودیوں میں ایک شخص فنحاص نے یہ دعویٰ کیا تھا۔ کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ یہودیوں میں ایک فرقہ پایا جاتا تھا جو حضرت عزیر کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتا تھا۔ امام رازی اور دوسرے متعدد مفسرین نے غالباً خود اہل کتاب کی روایات کی بنیاد پر لکھا ہے کہ جب حضرت عزیر علیہ السلام نے گم شدہ تورات دوبارہ اپنی یادداشت سے لکھوادی تو یہودی اس پر ان کے بہت شکر گزار ہوئے اور ان کی عظمت کے اعتراف میں ان کو اللہ کا بیٹا کہنے لگے۔

مغربی علماء عموماً مسلمانوں کے اس بیان کی کہ یہودیوں میں ایک فرقہ حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا مانتا تھا یہ کہہ کر تردید کرتے ہیں کہ ایسا کوئی فرقہ کبھی بھی موجود نہیں تھا۔ مسلمان مفسرین نے اس کا جواب الجواب یہ دیا کہ اگر یہودیوں میں ایسا کوئی فرقہ موجود نہ رہا ہوتا تو یثرب اور خیبر وغیرہ کے یہودی ضرور اس آیت پر اعتراض کرتے اور لازماً کہتے کہ یہ بات ان سے غلط طور پر منسوب کی جارہی ہے۔ ان کا اعتراض نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں ایسا فرقہ موجود تھا۔ یہ واقعی بڑا وزنی اور معقول جواب تھا۔ لیکن چونکہ مغربی مصنفین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے انہوں نے سرے سے یہ بات ہی ماننے سے انکار کر دیا کہ مدینہ اور خیبر و فدک میں یہودی پائے جاتے تھے۔ اب انہوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ مدینہ منورہ اور اس کے شمال کی بستیوں میں جو یہودی رہتے تھے وہ اصل میں یہودی تھے ہی نہیں، اور یہ کہ عرب میں کبھی یہودی آباد ہی نہیں ہوئے۔ جب انہیں یاد دلایا گیا کہ پوری اسلامی تاریخ میں اور خاص طور پر قبل از اسلام اور صدر اسلام میں عرب کی تاریخ میں مدینہ کے یہودیوں کا مفصل اور مسلسل ذکر ملتا ہے تو انہوں نے یہ دعویٰ کر ڈالا کہ یہ لوگ ویسے ہی اپنے آپ کو یہودی کہتے تھے۔ اصلاً وہ یہودی نہیں تھے۔ بلکہ یہودیوں کے ساتھ میل جول، شادی بیاہ اور تجارت وغیرہ کرنے کی وجہ سے یہودی مشہور ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے یہودیوں کی سی عادات اپنالی تھیں۔ لہٰذا ان کی طرف سے قرآن پاک کے اس بیان پر اعتراض نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ بات یہودیوں کے ہاں قابل قبول تھی۔ ان اعتراضات کے بہت سے جوابات مسلم علماء دیتے رہے۔ لیکن کبھی بھی مغربی علماء نے ان جوابات سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ بدستور اعتراضات کرتے رہے۔

آج سے ۵۴ سال قبل اردن کے علاقے میں بڑا عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

Dead Sea جس کو بحر میت (یا بحر مردار) بھی کہتے ہیں اس کے ایک طرف پہاڑ ہے اور پہاڑ کے اختتام پر بحر میت شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے دوسرے کنارے پر اس علاقہ کی حدود شروع ہوتی ہیں جس کو مغربی کنارہ کہتے ہیں جس پر اب اسرائیل نے قبضہ کر رکھا ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں ایک چرواہا رہتا تھا جس کا نام احمد تھا۔ وہ روزانہ اس جگہ اپنی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنی بکریاں چراتا چراتا پہاڑ کے اوپر چلا گیا اور شام تک وہاں بکریاں چراتا رہا۔ جب واپس جا رہا تھا تو ایک بکری گم ہو گئی۔ وہ اس بکری کی تلاش میں نکلا۔ چلتے چلتے اسے ایک غار

دکھائی دیا۔ اس نے سوچا کہ شاید بکری غار کے اندر چلی گئی ہے۔ بکری کو بلانے کے لیے اس نے آواز دی تو اندر سے بکری کی آواز آئی۔ وہ غار کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ غار کے اندر چلتا گیا اور بکری بھی آگے آگے چلتی گئی۔ جب خاصا اندر چلا گیا تو اسے کچھ اندھیرا سا محسوس ہوا۔ یہ اپنی بکری چھوڑ کر واپس آ گیا اور اگلے دن کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر گیا اور ساتھ ہی روشنی کا انتظام کرنے کے لیے کوئی شمع یا لالٹین بھی ساتھ لیتا گیا۔ جب وہ اندر داخل ہوا اور بکری کو ساتھ لانے لگا تو اس نے دیکھا کہ غار کے اندر مٹی کے بہت سارے بڑے بڑے گھڑے رکھے ہوئے ہیں۔ اس کو یہ خیال ہوا کہ شاید یہ کوئی پرانا خزانہ ہے جو یہاں چھپا ہوا ہے۔ اس نے ایک مٹکے میں ہاتھ ڈالا تو اس میں پرانے کاغذ اس طرح لپٹے ہوئے رکھے ہوئے تھے جیسے طومار لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک کو چھیڑا وہ پھٹ گیا، دوسرے کو چھیڑا وہ بھی پھٹ گیا۔ ہر مٹکے میں ایسے ہی طومار بھرے ہوئے تھے۔ وہ واپس آ گیا اور اس نے آ کر گاؤں والوں کو بتایا کہ شاید وہاں کوئی خزانہ دفن ہے۔ بہت سے گاؤں والے وہاں پہنچے اور انہوں نے ان مٹکوں میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں بہت کاغذ پھٹ گئے۔

اتفاق سے وہاں ماہرین آثار قدیمہ کی ایک ٹیم آئی ہوئی تھی جو چند مغربی ماہرین پر مشتمل تھی۔ جب انہیں یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ بھی وہاں پہنچے اور ان میں سے بہت سے کاغذات اور کتابیں چرا کر لے گئے۔ مقامی حکومت کو جب ان کی اس حرکت کا پتہ چلا تو انہوں نے انہیں روکا اور یہ تمام کاغذات اور کتابیں سرکاری قبضہ میں لے کر ایک مرکز میں رکھ دیں اور ماہرین کی ایک ٹیم مقرر کی کہ وہ کاغذوں اور طوماروں کا مطالعہ کر کے دیکھیں کہ یہ کیا کتابیں ہیں۔ کہاں سے آئی ہیں اور کس نے لکھی ہیں اور ان میں کیا لکھا ہوا ہے۔ ان آثار و دستاویزات کا جو حصہ مغربی ماہرین لے گئے تھے انہوں نے بھی ان کاغذات کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ قدیم خطوط اور مذاہب کے ماہرین کو بلوایا گیا۔ انہوں نے بھی ان کتابوں کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جو کسی بڑے عیسائی عالم کی ملکیت تھا۔ وہ عیسائی عالم اس زمانہ میں تھا جب عیسائیوں پر مظالم ہو رہے تھے اور یہودیوں کی حکومت تھی۔

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ۱۰۰، ۱۵۰ سال بعد کا واقعہ ہے۔ یہ لوگ اہل ایمان اور صاحب توحید تھے۔ جب ان پر مظالم ہوئے تو یہ اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اس کتب

خانہ کے مالک عالم کو خیال ہوا کہ کتابوں کا یہ قیمتی ذخیرہ لوگ ضائع کر دیں گے۔ اس لیے وہ اس ذخیرہ کو غار میں چھپا کر چلا گیا کہ اگر زندگی بچی تو واپس آ کر لے لوں گا۔ اس کے بعد اس کو واپس آنے اور اپنے کتب خانہ کو حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یوں یہ کتب خانہ کم وبیش اٹھارہ سو سال وہاں غاروں میں محفوظ رہا۔ گویا تقریباً سن ۱۰۰ یا ۱۵۰ عیسوی سے یہ کتابیں وہاں رکھی ہوئی تھیں۔

کوئی پونے دو ہزار سال پہلے کے لکھے ہوئے یہ ذخائر قدیم عبرانی اور سریانی زبانوں میں تھے۔ ان میں سے ایک ایک کر کے چیزیں اب شائع ہو رہی ہیں۔ کچھ چیزیں اردن میں شائع ہوئی ہیں اور کچھ انگریزی زبان میں یورپ میں شائع ہو رہی ہیں۔ یونیسکو اس عظیم کام کے لیے پیسہ دے رہی ہے۔ ان میں سے کچھ حصے جو ۱۹۶۰ یا اس کے لگ بھگ شائع ہوئے تھے ان میں ایک پوری کتاب ہے جو غالباً کسی عیسائی عالم کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا کچھ حصہ یہودیوں کی تردید میں ہے۔ خاص طور پر ان یہودیوں کی تردید میں جو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے تھے۔ کتاب میں اس عقیدے کی برائی بیان کی گئی ہے۔ اور اس مشرکانہ عقیدہ پر ان یہودیوں کو شرم دلائی گئی ہے اور پھر یہ وضاحت بھی لکھی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ایک ہے۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ اور عزیر علیہ السلام تو اللہ کے نیک بندے اور انسان تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے کیسے ہو سکتے ہیں؟

گویا اسلام سے بہت پہلے کا یہودیوں کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا، عیسائیوں کا محفوظ کیا ہوا اور اہل مغرب کا چھاپا ہوا ایک مسودہ مل گیا کہ جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس زمانہ میں یہودیوں میں ایک فرقہ ایسا موجود تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتا تھا۔

قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ فرعون کے وزیروں میں ایک ہامان بھی تھا۔ لیکن یہودیوں کے کسی لٹریچر سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی تھی کہ ہامان بھی فرعون کا کوئی ہمراز یا وزیر تھا۔ دستیاب قدیم مصری ادب سے بھی اس بات کی تائید نہیں ہوتی تھی۔ مغربی مفکرین نے اس پر ایک طوفان اٹھا دیا اور کہا کہ یہ نعوذ باللہ غلط ہے۔ جب یہ بات پھیلی تو مسلمان اہل علم نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن آج سے کچھ سال قبل جب مصر سے وہ دستاویزات نکلنی شروع ہوئیں اور قدیم فراعنہ کے بارے میں ساری معلومات جمع ہو کر سامنے آنا شروع ہوئیں تو آج سے کچھ عرصہ قبل ایک میت دریافت ہوئی جس کے تابوت پر پوری تفصیل لکھی ہوئی تھی کہ یہ کون شخص

ہے اور کس زمانہ کا شخص ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اس کا نام ہامان ہے اور یہ اس دور کا ایک بہت با اثر انسان تھا۔ اور یہ اسی زمانے میں تھا جس میں فرعون مصر کا حکمران تھا۔ اس سے قرآن کے اس بیان کی بھی تصدیق اور تائید ہو گئی۔ ایسی اور بھی مثالیں ہیں کہ مغربی اہل علم نے قرآن مجید کے بیان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن پھر بعد میں ایسے شواہد مل گئے جن سے قرآن مجید کے بیان کی خود بخود تصدیق ہو گئی۔

ایک اور چیز جو قرآن مجید کی فصاحت اور بلاغت میں بڑی معنویت رکھتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیا میں بڑے سے بڑے ادیب اور بڑے سے بڑے صاحب کمال کا سارا کلام یکساں نہیں ہوتا۔ بڑے سے بڑے ادیب کے ہاں بعض بہت بلند اور بعض بہت گرے ہوئے جملے ملتے ہیں۔ جو کسی اعتبار سے بھی معیاری نہیں ہوتے۔ یہی حال شعراء کا ہے۔ ان کے ہاں بھی بہت کم اشعار بہت اونچے پایہ کے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے شعراء کے بارہ میں یہ تبصرہ کیا گیا کہ بلندش بغایت بلند، پستش بغایت پست۔ اس کے برعکس قرآن مجید وہ واحد کتاب ہے جو اول سے لے کر آخر تک اپنے اس معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ پڑھنے والے کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کلام کہاں زیادہ اونچا ہے۔ یہاں تک کہ احادیث میں بھی یہ بات نہیں ہے۔ وہاں زیادہ بلند احادیث اور زیادہ بلند پایہ خطبات کی نشان دہی کرنا آسان ہے۔

ایک اور پہلو، اعجاز قرآن کا، قرآن مجید کی حیرت انگیز تاثیر ہے۔ کسی اور کتاب میں یہ خاصیت نہیں پائی جاتی جو قرآن مجید میں نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے ایک ایک جملے بلکہ ایک ایک لفظ نے انسانوں کی زندگیاں بدل دی ہیں۔ انسانوں کے نظریات، عقائد حتیٰ کہ لباس اور طور طریقے تک بدل دیے ہیں۔ ایسی کوئی اور کتاب تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ چاہے وہ ادبی ہو یا غیر ادبی، مذہبی ہو یا غیر مذہبی۔

اعجاز القرآن کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اس کتاب کی تعلیم، اور اس کا پیغام اتنا وسیع اور اتنا ہمہ گیر ہے کہ کسی اور کتاب کو اس کا ہزارواں بلکہ لاکھواں حصہ بھی نہیں حاصل ہوا۔ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ قرآن مجید کی محدود نصوص کی بنیاد پر لامتناہی احکام اور اصول و قواعد نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ معانی و مطالب کے سوتے ہیں کہ مسلسل بہتے چلے جا رہے ہیں لیکن یہ سمندر ہے کہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ دنیا کی ہر

کتاب کی ایک مدت ہوتی ہے۔ ہر تحریر کی ایک عمر ہوتی ہے۔ تھوڑے عرصے بعد یہ کتابیں اور تحریریں پرانی ہو کر آثار قدیمہ میں چلی جاتی ہیں۔ اخبار شام تک ردی ہو جاتا ہے۔ دیگر کتابیں چند سال یا چند عشروں یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ صدی کے بعد بے کار ہو جاتی ہیں۔ قرآن مجید وہ واحد کتاب ہے جو ہر وقت اور ہر لحہ زندہ ہے۔

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت اولا یزال است و قدیم

آج بھی اس وقت بھی روئے زمین پر ہزاروں مفسرین قرآن موجود ہیں۔ اور لاکھوں قرآن مجید کے طالبعلم ہیں۔ ہر جگہ ہر محفل سے درس قرآن سننے والا اس کی آیات کے نئے معانی اور اس کے الفاظ سے نئے مطالب کا ہدیہ لے کر اٹھتا ہے۔ یہ چیز قرآن مجید کے علاوہ کسی اور کتاب میں ممکن نہیں ہے۔

قرآن مجید کے اعجاز کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اس میں انسانی ضروریات کی تکمیل کا لامتناہی سامان موجود ہے۔ انسانوں میں جو لوگ فلسفے سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو فکری راہنمائی اس کتاب سے مل رہی ہے۔ جو لوگ معاشیات سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو اپنے مسائل کا حل اس کتاب سے مل رہا ہے۔ جو لوگ سیاسیات یا قانون سے یا کسی بھی ایسے پہلو سے دلچسپی رکھتے ہیں جو انسان کی فلاح و صلاح کے لیے ناگزیر ہے۔ اس پہلو کے بارے میں قرآن مجید کی راہنمائی اس طرح تسلسل کے ساتھ جاری ہے جیسا کہ آب زمزم کا چشمہ جاری ہے۔ جو کبھی ختم نہیں ہو رہا۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں لینے آ رہے ہیں۔ لیکن وہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ اس سے کہیں زیادہ قرآن مجید کا چشمہ جاری ہے۔

ایک آخری چیز جو ہم سب جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا اور ۲۳ سال کے عرصہ میں مکمل ہوا۔ اس عرصہ میں شاذ و نادر ہی شاید کبھی ایسا ہوا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرضی سے جو ہدایات دینی چاہیں وہ دی ہوں بلکہ ہمیشہ ایسا ہوا کہ جب کوئی سوال پیدا ہوا' اس کے جواب میں قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں۔ کسی نے کوئی اعتراض کیا اس کا جواب قرآن مجید میں نازل ہوا۔ کوئی اور مسئلہ پیدا ہوا۔ اس کا حل قرآن مجید میں نازل ہو گیا۔ غزوہ بدر میں جنگی قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے تو سوال پیدا ہوا کہ ان کا کیا کریں۔ فوراً

قرآن مجید کی آیات نازل ہوگئیں۔ مال غنیمت حاصل ہوا تو سوال اٹھا کہ اس کی تقسیم کیسے کریں۔ اس پر سورہ انفال کی آیات نازل ہوگئیں۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کا رد یہ کیسا ہونا چاہیے تھا، اس پر آیات نازل ہوئیں۔ حالات پیدا ہوتے جارہے تھے اور جوابات نازل ہوتے جارہے تھے۔ یہ جوابات حضورؐ نے قرآن مجید میں مختلف جگہ رکھوائے کہ فلاں آیت کو ادھر رکھو اور فلاں آیت کو اُدھر رکھو۔

جب یہ سارا قرآن مجید مکمل ہوکر سامنے آگیا تو اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی داخلی تنظیم اور اندرونی ترتیب اب خود ایک معجزہ ہے۔ جیسے آپ کے پاس چپس کی دس بیس ڈھیریاں مختلف رنگوں کی رکھی ہوں اور ۲۳ سال تک آپ لوگوں کے مطالبہ پر ان ڈھیروں میں سے تھوڑی کنکریاں اٹھاتے رہیں اور کسی کو مسلسل یہ ہدایات دیتے رہیں کہ ایک مٹھی ڈھیری کی ادھر رکھیں اور ایک مٹھی ڈھیری کی، اُدھر رکھیں۔ کبھی صرف ایک یا دو ہی کنکریاں رکھوادیں۔ اور چوتھائی صدی بعد جب یہ ساری ڈھیریاں ختم ہوجائیں تو ایک مکمل اور بھرپور خوبصورت نقشہ سامنے آجائے۔ اسی طرح جب ۲۳ سال کے عرصہ میں نزول قرآن مکمل ہوا تو ایک بہت خوبصورت موزائیک کی شکل سامنے آئی جو حسن و جمال کا ایک عجیب و غریب مرقع تھی اور نظم اور ترتیب کا ایک انتہائی حسین نمونہ تھی۔

قرآن مجید کی ہر چیز اپنی جگہ محفوظ ہے۔ عربی زبان بھی محفوظ ہے۔ عربی قواعد بھی محفوظ ہیں۔ دنیا میں زبانیں مٹتی رہتی ہیں۔ ان میں تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے۔ قواعد بدلتے رہتے ہیں۔ محاورے اور روزمرہ بدلتے رہتے ہیں۔ نزول قرآن کے زمانہ کی سب زبانیں یا مٹ چکیں یا بدل کر کچھ سے کچھ ہوگئیں۔ صرف عربی زبان اس سے مستثنیٰ ہے۔ یہ خود اپنی جگہ ایک اعجاز ہے۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا اعجاز القرآن کے نئے نئے پہلو سامنے آتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ لوگ گواہی دیں گے کہ یہی کتاب برحق ہے۔ حضورؐ کے کلام یعنی حدیث میں بھی آپ کو لگے گا کہ یہ حصہ زیادہ زوردار ہے۔ اور وہ حصہ زیادہ اثر انگیز ہے۔ یہ فرق حضورؐ کے کلام میں بھی نظر آتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں یہ فرق نہیں ہے۔ اور اس میں ایک ہی سطح ہے فصاحت اور بلاغت کی۔

آج سے کچھ سال قبل مصر کے ایک مسلمان طالبعلم پیرس کی ایک یونیورسٹی میں تعلیم

پار ہے تھے۔ وہاں ایک مستشرق ان کا استاد تھا۔اس نے ایک دن ایک مسلمان طالب علم سے پوچھا: کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ قرآن مجید ایک معجزہ ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں! بالکل یہی سمجھتا ہوں۔اس نے کہا کہ تم جیسے پڑھے لکھے آدمی کو جو یہاں یا کسی بڑی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہو تم کو تو کم از کم یہ نہیں کہنا چاہیے۔ مسلمان طالبعلم نے اسے سمجھانا چاہا، اور سمجھانے کی غرض سے اس کے سامنے ایک تجویز رکھی۔ وہ یہ کہ ایسا کرتے ہیں کہ ہم ۲۰'۲۵ لوگ جو عربی زبان سے واقف ہیں - ایک ایسے مضمون کو عربی میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو قرآن مجید میں بھی بیان ہوا ہے۔ وہ مستشرق جو بہت بڑا عربی داں تھا اس بات کے لیے تیار ہو گیا اور ان سب نے قرآن مجید کی اس آیت کو منتخب کیا۔یوم نقول لجهنم هل امتلات و تقول هل من مزيد۔جس دن جہنم سے کہا جائے گا کیا تو بھر گئی اور وہ کہے گی کیا ابھی اور کچھ ہے؟

ان تمام لوگوں نے اپنی اپنی عربی میں اس مضمون کو بیان کیا۔کسی نے کہا جهنم كبيرة جداً کسی نے کہا، جهنم واسعة جدا، کسی نے لکھا جهنم لن تملا۔یعنی مضمون یہ بیان کرنا تھا کہ جہنم کی وسعت بہت زیادہ ہے۔سب لوگوں نے اپنی پوری پوری زبانی دانی خرچ کر دی۔اس کے بعد انہوں نے قرآن مجید کی یہ آیت سامنے رکھی اور بتایا کہ اس مضمون کو جس انداز سے قرآن مجید نے بیان کیا ہے اس کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے۔سب نے بالاتفاق تسلیم کیا کہ قرآن مجید کے اس اسلوب کا مقابلہ ممکن نہیں ہے۔

خطبہ نہم

علوم القرآن

ایک جائزہ

۱۶۔اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علوم القرآن سے مراد وہ تمام علوم و معارف ہیں جو علماء کرام اور مفسرین اور مفکرین ملت نے گذشتہ چودہ سو سال کے دوران میں قرآن مجید کے حوالہ سے مرتب فرمائے ہیں۔ ایک اعتبار سے اسلامی علوم وفنون کا پورا ذخیرہ قرآن مجید کی تفسیر سے عبارت ہے۔ آج سے کم و بیش ایک ہزار سال قبل مشہور مفسر قرآن اور فقیہہ قاضی ابوبکر ابن العربی نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کے جتنے علوم وفنون ہیں، جن کا انہوں نے اس وقت اندازہ سات سو کے قریب لگایا تھا، وہ سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح ہیں، اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کی شرح ہے۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کے سارے علوم وفنون علوم القرآن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلام سے وابستگی کا بھی یہی تقاضہ ہے، وحدت علوم کا منطقی نتیجہ بھی یہی ہے، اور وحدت فکر اور تصور وحدت کائنات کا بھی یہی ثمرہ ہے کہ سارے علوم وفنون کو قرآن مجید سے وہی نسبت ہو جو پتوں کو اپنی شاخوں سے، شاخوں کو اپنے تنے سے اور تنے کو اپنی جڑ سے ہوتی ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے حصول کے لیے گذشتہ ساٹھ ستر سال سے اہل فکر و دانش کوشاں ہیں۔ یہ وہ کوشش ہے جس کو آج تمام عصری علوم کو اسلامی بنانے یعنی **Islamization of knowledge** کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آج مسلمانوں کے پاس رائج الوقت تمام علوم وفنون اکثر و بیشتر مغربی ذرائع و مصادر سے پہنچے ہیں۔ ان سب علوم کی اساس اور ان سب نظریات کی اٹھان ایک غیر اسلامی ماحول میں ہوئی ہے۔ غیر اسلامی نظریات و تصورات اور لادینی افکار و اساسات پر ان سارے علوم وفنون کا ارتقاء ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی علوم وفنون میں اور دور جدید کے مغربی علوم وفنون میں بہت سے مقامات پر ایک تعارض اور تناقض محسوس ہوتا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ ذہن جو مغربی علوم وفنون کی تعلیم

پا کر مغربی ثقافت وتہذیب کے ماحول میں تیار ہوا ہے وہ بہت سے ایسے تصورات کو ایک منطقی اور بدیہی نتیجے کے طور پر قبول کر لیتا ہے جو قرآن مجید کی نگاہ میں سرے سے ناقابل قبول ہیں۔ اسی طرح سے بہت سی ایسی چیزیں جو قرآن مجید کی نظر میں بدیہیات میں شامل ہیں اور جن کو ماضی میں ایک صاحب ایمان شخص اصول موضوعہ کے طور پر قبول کر لیتا تھا اور آج بھی ایک مسلمان کو انہیں قبول کرنا چاہیے وہ دورِ جدید کے نظریات اور تصورات کی روشنی میں مشکوک، مشتبہ اور ناقابل قبول یا کم از کم قابل بحث وتکرار قرار پاتے ہیں۔

اس لیے جب ہم علوم القرآن کی بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دو دائرے ہوتے ہیں۔ ایک نسبتاً تنگ اور چھوٹا دائرہ وہ ہے جس میں وہ علوم اور فنون شامل ہیں جن کا تعلق براہ راست قرآن مجید کی تفسیر اور فہم سے ہے، جس پر آج بات ہوگی۔ علوم القرآن کا ایک اور نسبتاً وسیع اور بڑا دائرہ بھی ہے، اور وہ دائرہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں انسان کی وہ تمام فکری کاوشیں شامل ہیں جن کی سمت درست ہو اور جن کی اساس صحیح ہو۔ یہ وہ دائرہ ہے جس میں آئے دن نئے نئے علوم و معارف شامل ہو رہے ہیں، اور جن میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس دائرے میں ہر وہ چیز شامل ہے جس سے مسلمانوں نے اپنی فکری اور علمی سرگرمیوں میں کام لیا ہو، اور جو قرآن مجید کے بتائے ہوئے تصورات کے مطابق ہو، اور اس کی بنیادی تعلیم سے ہم آہنگ ہو۔

جب مسلمان اپنے تمام موجودہ معاشرتی اور انسانی علوم کو از سر نو مدون کر لیں گے تو پھر وہ اسی طرح سے قرآن فہمی میں مددگار ثابت ہوں گے جس طرح ماضی میں مسلمانوں کے معاشرتی اور انسانی علوم نے قرآن فہمی میں مدد دی۔ مسلمانوں کا فلسفہ اور تاریخ اپنے زمانہ میں اسلامی نظریہ اور اسلامی تعلیم کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ جب آج کا اصول قانون، آج کی سیاسیات، آج کی معاشیات اور آج کے دوسرے تمام علوم اسلامی اساس پر از سر نو مرتب ہو جائیں گے، تو اس وقت ایک بار پھر ان سب علوم کی حیثیت قرآن مجید کے خادم اور قرآن فہمی کے آلات و وسائل کی ہوگی۔ اس وقت یہ علوم اسی تصور حیات اور نظریہ کائنات کو فروغ دیں گے جو قرآن مجید نے دیا ہے۔ اس وقت یہ علوم قرآن مجید کی تہذیبی اقدار کو نمایاں کریں گے اور اس تصور کی بنیاد پر مزید نئے علوم اور فنون کو جنم دیں گے جو قرآن مجید میں ملتا ہے۔

آج کی گفتگو کا مرکز صرف پہلا دائرہ ہوگا۔ اس لیے کہ یہ ان علوم اور فنون کا دائرہ ہے

جن کا قرآن مجید کی تفسیر سے براہ راست تعلق ہے۔ ان علوم ومعارف کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ لیکن وہ اپنے اندر ایک خاص طرح کی محدودیت رکھتے ہیں۔ یعنی ان فنون میں سے کسی ایک خاص فن میں توسیع تو ہوسکتی ہے، لیکن نئے علوم اور نئے فنون کے جنم لینے کے امکانات اس دائرہ میں نسبتاً محدود ہیں۔ اس لیے کہ قرآن مجید کے براہ راست مطالعہ اور تفسیر کے لیے جن امور اور معاملات پر غور کرنے کی ضرورت ہے ان پر بہت تفصیل کے ساتھ ائمہ اسلام نے کلام کیا ہے، اور اب بہت تھوڑے پہلو ایسے رہ گئے ہیں جن میں کوئی نئی بات کہی جاسکے۔ موجودہ دلائل میں توسیع تو ہوسکتی ہے، اور موجودہ افکار میں مزید گہرائی تو پیدا ہوسکتی ہے لیکن کسی مستقل بالذات نئی فکر کو پیش کرنے کا امکان یہاں بہت کم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم القرآن کے اس دائرہ میں توسیع اور اضافہ اب بہت کم ہوتا ہے۔ شاید صدیوں میں ایک آدھ ایسا صاحب علم سامنے آتا ہے جو اس باب میں کوئی بالکل نئی طرح ڈال سکے، وہ بھی اتنے تواتر اور کثرت سے نہیں ہوتا۔

ان علوم القرآن میں وہ چیزیں شامل ہیں جن کا تعلق نزول قرآن کی کیفیت، اس کی تاریخ اور مراحل تدوین، اس کے طریق کار، اس طریق کار کی حکمت اور مصلحت سے ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کے جمع وتدوین کی تاریخ، اس کی آیات اور سورتوں کے انداز نزول، مقام نزول اور حالات نزول جن کے لیے جامع اصطلاح علم اسباب نزول ہے۔ اس سے مراد وہ واقعات یا وہ صورت حال ہے جن میں قرآن مجید کی کوئی آیت یا آیات نازل ہوئی ہوں۔ اسباب نزول کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

ترتیب نزولی کی اس اعتبار سے بھی بے حد اہمیت ہے کہ اس سے احکام کے ارتقاء کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ قرآن مجید میں کس طرح تدریج سے کام لے کر ہدایت اور راہنمائی کی گئی اس تدریج کے عمل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آیات اور سورتوں کے بارے میں ترتیب نزولی کا علم ہو۔ پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کون سی آیت مکی ہے اور کون سی مدنی۔ اس لیے کہ مکی دور میں احکام کی نوعیت اور تھی اور مدنی دور میں اور تھی۔ مکی سورتوں میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا مفہوم سمجھنے کے لیے انہیں مدنی سورتوں کے ساتھ ملا کر پڑھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر مکی سورتوں میں بیشتر جگہوں پر یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ لست علیھم بمصیطر۔ آپ ان پر ٹھیکیدار نہیں ہیں، یعنی اگر وہ مانتے ہیں تو مانیں اور اگر نہیں مانتے تو نہ مانیں۔ یہ گویا اظہار برات ہے ان

ضدی مشرکین سے جو قبول اسلام کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور مسلمانوں کا ایک الگ معاشرہ وجود میں آ گیا اور ایک الگ اسلامی حکومت قائم ہوگئی، جس میں اسلام اقتدار میں آ گیا اور اسلامی قانون نافذ العمل ہو گیا تو اس وقت اسلامی قانون کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مانو یا نہ مانو۔ اب صورتحال یہ تھی کہ آپ نظریہ اسلام پر ایمان رکھیں یا نہ رکھیں اس کی تو غیر مسلموں کو اجازت تھی، لیکن قانون اور نظام شریعت کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ قانون تو ریاستی نظام تھا وہ سب کو لازماً ماننا پڑتا ہے۔ کوئی چور یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے چونکہ اسلام کو نہیں قبول کیا، اس لیے میں اسلام کے قانون کو بھی نہیں مانتا، اس لیے میں ہاتھ کٹوانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اب اس طرح کے عذر کی بنیاد پر ریاست کے نظام کو مختلف فیہ نہیں بنایا جا سکتا اور نہ اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اب وہ تمام آیات جن میں مشرکین کے ماننے یا نہ ماننے کا ذکر ہے صرف مذہبی اصولوں کے ماننے یا نہ ماننے تک محدود رہیں گی۔ ان آیات کا حوالہ دے کر اسلامی ریاست کے قانون اور نظام کو ماننے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور نہ اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ ان غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے مکی اور مدنی سورتوں کے بارے میں علم ہونا ضروری ہے۔

علوم القرآن کا ایک اہم مضمون محکم اور متشابہ ہے۔ محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کا مفہوم، جن کے الفاظ اور جن کا پیغام اتنا واضح اور دوٹوک ہے کہ اس کے بارے میں کوئی دو انسانوں کے درمیان اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور ان آیات کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے واقیموا الصلواۃ، اور نماز قائم کرو۔ اب نماز قائم کرنے سے کیا مراد ہے یہ ہر مسلمان جانتا ہے۔ اس کے بارہ میں کسی شبہ، تاویل یا التباس کا کوئی امکان نہیں۔ یا مثال کے طور پر قرآنی آیت ہے، وفی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم۔ ان کے مالوں میں محروم اور سائلین کا حق ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہاں مالی حق سے کیا مراد ہے۔

لیکن کچھ آیات ایسی ہیں جن میں یا تو مجاز کا رنگ اختیار کیا گیا ہے، یا استعارے کی زبان میں بات کی گئی ہے، یا انسانوں کی سمجھ کے قریب لانے کے لیے ایک مضمون کو انسانوں کے فہم کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔ یہ وہ معاملات ہیں جو غیبیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ پیدائش سے

پہلے اور مرنے کے بعد کی زندگی سے متعلق ہیں، جن کا تعلق عالم برزخ اور عالم قیامت سے ہے ، کہ وہاں کیا معاملات اور کیا کیفیات پیش آئیں گی۔ ایسی تمام آیات متشابہات کہلاتی ہیں جن میں انسانوں کے فہم کے مشابہ الفاظ وعبارات کے ذریعہ سے کسی چیز کو بیان کیا گیا ہو۔

علوم القرآن کا ایک اہم مضمون اسالیب مفسرین یا مناہج مفسرین بھی ہے۔ اس عنوان کے تحت اس امر پر بحث کی جاتی ہے کہ مفسرین نے قرآن مجید کی تفسیر کے دوران میں کون کون سے اسالیب اور مناہج اختیار کیے۔ اس پہلو پر ہم اس سے قبل گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے تفسیر قرآن کے ادبی، فقہی، لغوی اور فلسفیانہ مناہج پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی تھی اور تقریباً دس مناہج زیر بحث آئے تھے۔ ان سب کا مطالعہ بھی علوم القرآن میں شامل ہے۔

علوم القرآن کا ایک شعبہ قراءت ہے، یعنی قرآن مجید کو پڑھنے کا انداز اور اس میں آوازوں کی ترکیب، اتار چڑھاؤ اور ان کا نشیب وفراز۔ اس پر ہم ابھی گفتگو کریں گے۔ تلاوت قرآن میں آوازوں کی بندش، نشیب اور فراز اور آوازوں کے اتار چڑھاؤ کے ضمن میں میں نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے حوالے سے ایک نومسلم کا واقعہ گذشتہ ایک خطبہ میں نقل کیا تھا۔ اس سے اس فن کی اہمیت اور گہرائی کا ایک بار پھر اندازہ کر لیں۔ قرآن مجید میں اوقاف کہاں کہاں ہیں۔ کہاں وقف کرنا ضروری ہے اور کہاں وقف کرنا ضروری نہیں ہے، اس کا قرآن مجید کے مضمون سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ پھر رسم عثمانی یعنی قرآن مجید کے وہ ہجے جو حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں حضرت زید بن ثابتؓ نے اختیار فرمائے' وہ کیا تھے اور اس میں کون کون سے نمایاں پہلو ہیں۔ پھر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوا کہ کیا رسم عثمانی کی پیروی لازمی ہے۔ اور اگر لازمی نہیں ہے تو اس سے کس حد تک انحراف کیا جا سکتا ہے۔

علوم القرآن میں یہ سب اور اس طرح کے دوسرے بے شمار مضامین ہیں جو علماء کرام کی تحقیق وتدریس اور تصنیف وتالیف کا موضوع رہے ہیں۔ اس موضوع پر چوتھی پانچویں صدی ہجری سے اہل علم نے لکھنا شروع کیا۔ اس سے پہلے ابتدائی تین صدیوں میں علوم قرآن پر زیادہ نہیں لکھا گیا۔ باقاعدہ تحریریں اس موضوع پر چوتھی صدی کے بعد ہی کی ہیں۔ اس موضوع پر اس سے قبل غالباً زیادہ اس لیے نہیں لکھا گیا کہ پہلی تین صدیاں دراصل متعلقہ مواد کی فراہمی کی صدیاں تھیں۔ جب پورا مواد رسم عثمانی، اسلوب قراءت، فقہی اصولوں پر اور عربی زبان کے ادبی

اسالیب پر یکجا ہو کر سامنے آ گیا تو اس کے بعد ہی الگ الگ موضوعات کو مرتب کرنے کا عمل شروع ہوا اور وہ چیزیں سامنے آنی شروع ہوئیں جن کو ہم آج علوم القرآن کہتے ہیں۔

اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب جو آج دستیاب ہے وہ علامہ ابن الجوزی کی کتاب فنون الافنان فی علوم القرآن ہے۔ یہ ایک بہت بڑے مفسر بھی تھے، محدث بھی تھے اور فقیہہ بھی، اور ایک اعتبار سے ماہر نفسیات بھی تھے۔ اس لیے کہ انسان کے مزاج، نفس، قلب اور عادات میں جو گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں، ان پر انہوں نے ایک انتہائی مفید اور عالمانہ کتاب لکھی ہے جو اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے۔ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ اس کتاب کا نام تلبیس ابلیس ہے۔ اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب ابلیس انسان کو بہکاتا ہے تو کیسے بہکاتا ہے اور اس کے بہکانے کے کیا طریقے ہوتے ہیں۔ پھر اس کتاب میں انہوں نے ایک ماہرانہ کاوش یہ کی ہے کہ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ مختلف طبقے کے لوگوں کو شیطان کے بہکانے کا مختلف طریقہ ہوتا ہے۔ شیطان ہر ایک کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ عالم کے ساتھ جو شیطان ہوگا وہ بھی عالم ہوگا، تا کہ اس کی سطح پر اس کو بہکا سکے۔ اب اس کے راستے کون کون سے ہیں۔ یہ چیز پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ ایک تاجر کیسے بہکتا ہے، ایک علم، قاضی اور عالم کیسے بہکتا ہے۔ غرض بہت دلچسپ کتاب ہے۔

ایک بہت بڑی قابل قدر کتاب علامہ جلال الدین سیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی عام طور پر دستیاب ہے۔ علامہ سیوطی کا تعلق مصر سے تھا وہاں سیوط نامی شہر جو علامہ کا وطن تھا' آج بھی موجود ہے۔ اگر کہا جائے کہ اسلامی تاریخ میں چند لوگ جو ہر فن مولا گزرے ہیں یہ ان میں سے ایک ہے' تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے تقریباً ۵۰۰ کتابیں لکھی ہیں اور اسلامی علوم وفنون کا کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس میں ان کی کتابیں موجود نہ ہوں۔ تفسیر، حدیث، منطق، ادب، تاریخ، سیرت، طب غرض ہر موضوع پر ان کی تصانیف موجود ہیں۔ ان کی وفات ۹۱۱ھ کی ہے۔ ان کی کتاب الاتقان فی علوم القرآن کو پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے زمانہ تک علوم القرآن کے موضوع پر کتنا وسیع کام ہو چکا تھا۔

ہماری اردو زبان میں بھی اس موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔ قدیم ترین کتاب انیسویں صدی کے ایک بزرگ مولانا عبدالحق حقانی کی ہے' جو تفسیر حقانی کے بھی مصنف ہیں۔

مولانا حقانی ٹھوس اور جید عالم تھے۔علوم القرآن کے موضوع پران کا بہت سا کام ہے۔انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی،التبیان فی علوم القرآن،مولانا کی تفسیر حقانی اس اعتبار سے نمایاں مقام رکھتی ہے کہ دور جدید کے علوم وفنون کے نتیجہ کے طور پر قرآن مجید اور اسلام کے بارہ میں جو شبہات نئے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوئے ہیں ان کا انہوں نے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

اردو میں ایک اور کتاب علوم القرآن پر مولانا محمد تقی عثمانی کی ہے جو آج سے کم وبیش تیس سال قبل چھپی تھی۔اس کتاب کے مندرجات اکثر وبیشتر وہی ہیں جو الاتقان فی علوم القرآن میں علامہ سیوطی نے شامل کیے ہیں۔ایک کتاب مولانا محمد مالک کاندھلوی نے منازل العرفان فی علوم القرآن کے نام سے لکھی تھی جو عام مل جاتی ہے۔

جہاں تک قرآن مجید کے اسلوب اور انداز بیان کا تعلق ہے اس کے متعلق بھی کچھ چیزیں علوم القرآن میں زیر بحث آتی ہیں۔اور جن لوگوں نے علوم القرآن پر لکھا ہے انہوں نے ان سوالات کو اٹھایا ہے۔ان میں سے بعض کا ذکر ہم آج کی گفتگو میں کریں گے۔

مختلف اہل علم نے علوم القرآن کے عنوان سے بہت سے مباحث پر قلم اٹھایا ہے،ان میں سے بعض اہم مباحث پر ان خطبات میں گفتگو ہو چکی ہے،لیکن چند ایسے موضوعات جن پر علوم قرآن کے نام سے اہل علم نے بحث کی ہے درج ذیل ہیں:

۱۔ فضائل القرآن علوم قرآن کا ایک اہم موضوع ہے۔خود قرآن مجید کے علاوہ احادیث مبارکہ میں قرآن مجید اور اس کی مختلف سورتوں کے فضائل کے بارہ میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اہل علم نے یکجا کر دیا ہے۔ان فضائل کا مستند ترین ماخذ امام بخاری کی الجامع الصحیح ہے،جس میں کتاب فضائل القرآن کے عمومی عنوان کے تحت امام بخاری نے ۳۷ ابواب باندھے ہیں اور مستند اور معتبر احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ فضائل القرآن کے موضوع پر جمع کر دیا ہے۔امام بخاری اور دوسرے کبار محدثین کے علاوہ جن بزرگوں نے سب سے پہلے فضائل قرآن کے عنوان سے الگ کتابیں لکھیں ان میں امام نسائی (۳۰۳ھ) امام ابوبکر بن ابی شیبہ (متوفی ۲۳۵ھ) اور امام ابوعبید القاسم بن سلام (متوفی ۲۲۴ھ) کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

فضائل قرآن پر ایک مشہور حدیث جو امام ترمذی اور امام دارمی وغیرہ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے،ان شاءاللہ آخری خطبہ میں سند کے ساتھ بیان کروں گا اور اسی پر اس سلسلہ

خطبات کا اختتام ہوگا۔

۲۔ خواص القرآن بھی فضائل قرآن ہی کی گویا ایک شاخ ہے۔اس عنوان کے تحت ان روایات واحادیث کو جمع کیا جاتا ہے' جن میں قرآن مجید، اس کی مختلف سورتوں اور مختلف آیات کی خصوصی برکات اور ثمرات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ روایت کہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر مریض کو جھاڑا جائے تو اس کی شفاء کی امید ہے۔ یا یہ روایت کہ زہر خورانی کا علاج سورۃ فاتحہ ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم کی یہ روایت کی جس گھر میں سورۃ بقرہ کی تلاوت کی جائے وہاں شیطان داخل نہیں ہوتا وغیرہ۔

اس طرح کی بہت سی احادیث الگ الگ سورتوں اور آیات کے بارہ میں کتب حدیث میں بکھری ہوئی ہیں۔ خواص القرآن کے موضوع پر لکھنے والوں نے ان سب احادیث کو جمع کر کے ان کے الگ الگ مجموعے بھی مرتب کیے ہیں۔

۳۔ اسماء سور قرآن و تفصیل آیات۔اس عنوان کے تحت قرآن مجید کی ذیلی تقسیموں، آیات، سورت، اجزاء، وغیرہ کے بارہ میں معلومات جمع کی جاتی ہیں۔ ان معلومات میں آیات وحروف کی تعداد وغیرہ بھی شامل ہوتی ہے۔

آیت کی فنی تعریف، لفظ آیت کے لغوی معانی، سورت کے لغوی معانی اور سورت کے اصطلاحی معانی پر بھی علوم قرآن پر لکھنے والے اہل علم نے کلام کیا ہے۔ آیات قرآنی کی تعداد کے بارہ میں قراء حضرات میں قدرے اختلاف ہے۔ جس کی وجہ سے صرف یہ ہے کہ بعض حضرات نے ایک ہی عبارت کو ایک آیت اور بعض دوسرے حضرات نے دو آیتیں قرار دیا۔ اس اختلاف کی بنیادی وجہ وقف کا اختلاف ہے کہ کہاں وقف مطلق یا وقف لازم ہے اور کہاں وقف جائز۔ اس جزوی اختلاف کی وجہ سے آیات کی تعداد کے بارہ میں متعدد اقوال سامنے آئے۔ بیشتر اقوال میں چھ ہزار دو سو تک کا عدد تو مشترک ہے۔ اس سے اوپر کے بارہ میں اقوال مختلف ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی کی تحقیق کی رو سے قرآن پاک کے کل الفاظ کی تعداد ستتر ہزار نو سو چونتیس ۷۷۹۳۴ ہے۔ ماضی قریب کے ایک اور محقق علامہ عبدالعظیم زرقانی کی تحقیق بھی یہی ہے۔ جہاں تک حروف کا تعلق ہے تو ان کی تعداد علامہ سیوطی نے تیس لاکھ بیس ہزار چھ سو اکہتر (۳۰۲۰۶۷۱) بیان کی ہے۔

قرآن مجید کی طویل ترین آیت سورۃ بقرہ کی آیت ۲۸۲ یعنی آیت مداینہ ہے۔ چھوٹی ایک لفظی بلکہ ایک حرفی آیات بھی قرآن میں موجود ہیں۔

۴۔ علوم قرآن کا ایک اہم مضمون محکم اور متشابہ آیات کی تحقیق اور تفصیل ہے۔ اس میں متشابہ کی اقسام، متشابہات کی حکمت اور ضرورت وغیرہ پر بھی گفتگو ہے۔ اسی طرح عام اور خاص، مطلق اور مقلد، مجمل اور مبین اور منطوق اور مفہوم کے مباحث میں جو دراصل تفسیر اور علوم قرآن سے زیادہ اصول فقہ کے مباحث ہیں' ان کا مقصد زیادہ تر احکام اور قوانین کا استنباط ہے۔

۵۔ امثال القرآن علوم قرآن کا ایک اہم اور ضروری میدان ہے۔ بہت سے اہل علم و ادب نے امثال القرآن کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا اور اس پر الگ سے بھی کتابیں لکھیں اور علوم القرآن اور تفسیر کے موضوع پر جامع کتابوں میں بھی امثال القرآن سے بحث کی۔ امثال القرآن پر جن حضرات نے لکھا ہے انہوں نے قرآنی مثالوں کے ادبی اور فنی محاسن پر بھی گفتگو کی ہے اور ان کے دینی اور اخلاقی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

قرآن مجید میں بہت سے دینی حقائق کو سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کے لیے مثالوں سے کام لیا گیا ہے اور قرآن پاک کے بہت سے معانی اور حقائق کو ایسے خوبصورت لباس میں پیش کیا گیا ہے جس سے بات فوراً پڑھنے اور سننے والے کے دل میں اتر جاتی ہے۔ اس ضمن میں کہیں تشبیہ سے کام لیا گیا ہے، کہیں مجاز کا استعمال ہے، کہیں استعارہ کی کارفرمائی ہے۔

امثال القرآن کے موضوع پر علامہ ماوردی، علامہ ابن القیم اور علامہ سیوطی نے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ علامہ سیوطی نے بہت سے ایسے قرآنی جملے بھی بطور مثال نقل کیے ہیں جو عربی زبان میں ضرب المثل کے طور پر عام ہو گئے ہیں' مثلاً:

۔ولا یحیق المکر السیی الا باھلہ

۔ کل یعمل علی شاکلتہ

۔ماعلی الرسول الا لبلاغ

۔ کل حزب بما لدیھم فرحون

ھل جزاء الاحسان الا الاحسان

۔ولاینبئك مثل خبیر

۔وقلیل ماھم

۶۔ امثال القرآن سے ملتا جلتا ایک اہم مضمون اقسام القرآن بھی ہے۔یعنی قرآن مجید میں کھائی جانے والی قسمیں۔قرآن مجید کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآن مجید میں کئی جگہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔مثلاو النجم اذا ھوی۔قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے۔سوال یہ ہے کہ یہ قسم کیوں کھائی گئی ہے۔اور اس میں کیا حکمت ہے۔قرآنی قسموں کی حکمتوں پر ابتداہی سے اہل علم غور کرتے رہے ہیں۔ بہت سے اہل علم نے اس موضوع پر الگ سے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارے برصغیر کے مشہور عالم مولانا حمید الدین فراہی نے بھی الامعان فی اقسام القرآن کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب اس موضوع پر لکھی تھی۔ان کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے،ان کا اس مضمون کے سیاق وسباق سے گہرا تعلق ہے۔

مثلاً اسی والنجم کی مثال میں دیکھیے کہ اس کے فوراً بعد یہ آیت آئی ہے کہ تمہارے یہ ساتھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ گمراہ ہوئے ہیں اور نہ بھٹکے ہیں اور جو بات کہہ رہے ہیں بالکل درست کہہ رہے ہیں اور وحی الٰہی کی بنیاد پر فرمارہے ہیں۔اب یہاں نجم کی قسم کیوں کھائی گئی ۔نجم کی قسم کھانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس سورت میں آگے چل کر کاہنوں کا بھی ذکر ہے۔اور کاہنوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ان کے جنات اور شیاطین سے تعلقات ہوتے ہیں اور وہ جنات اور شیاطین آسمانوں میں جاکر اور وہاں کی سن گن لے کر اور جھوٹ میں سچ ملا کر بیان کرتے ہیں ۔کہا گیا ہے کہ یہ غلط ہے اور اگر کوئی آسمانوں سے قریب ہونے کی کوشش بھی کرے گا تو اس پر شہاب ثاقب سے ضرب لگائی جائے گی اور وہ وہاں سے بھاگ جانے پر مجبور ہو جائے گا۔اللہ تعالیٰ کے دربار میں کوئی بھی یوں رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔اب جب کہا گیا کہ قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے،تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ پورا تصور ہی غلط ہے،اور جو بات اتاری جارہی ہے وہ سوفی صد درست ہے،اس لیے کہ اس کو فرشتہ ربانی لے کر آیا ہے۔یعنی ستارے کی قسم کھا کر قرآن کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے جس کا تعلق وحی کے نزول سے ہے اور وحی کے غلط دعوے کرنیوالے اور ستاروں سے ضرب کھانے والوں کی طرف اشارہ ہے۔اقسام القرآن پر مزید گفتگو ذرا آگے چل کر کریں گے۔

۷۔ قرآن مجید کا ایک اور اہم مضمون قصص القرآن بھی ہے۔یعنی قرآن مجید میں انبیائے

ماقبل اور امم سابقہ کے جو واقعات آئے ہیں، ان کا مطالعہ اور ان کی حکمت پر غور وخوض۔ اس ضمن میں ایک اہم سوال تکرار کا ہے، یعنی قرآن مجید میں تکرار کیوں ہے۔ اور واقعات کی اس تکرار میں کیا حکمت ہے پھر جن انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ قرآن مجید میں آیا ہے ان کے انتخاب میں کیا حکمت ہے۔ قصص القرآن کے باب میں مغربی مستشرقین۔ یہودی اور عیسائی دونوں۔ نے اعتراضات کرنے میں کسر نہیں چھوڑی، ان اعتراضات کا جواب مسلمان اہل علم گذشتہ سوسوا سو برس دیتے آرہے ہیں۔

قصص القرآن کے بارہ میں ایک اصولی بات ہمیشہ یادرکھنی چاہیے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید بنیادی طور پر ایک صحیفہء ہدایت ہے۔ اس کا مقصد انسانوں کو اچھا انسان بنانا اور اس دنیاوی زندگی میں اس کی صلاح اور اخروی زندگی میں اس کی دائمی فلاح کا راستہ بتانا ہے۔ قرآن کا مقصد نہ تاریخ بیان کرنا ہے۔ نہ وہ واقعات کی کھتونی ہے۔ قرآن مجید کے برعکس عہد نامہ قدیم کی بہت سی کتابیں دراصل قدیم یہودی تاریخ کی تفصیلات پر مشتمل ہیں، بلکہ عہد نامہ قدیم کے بعض حصے تو کسی قدیم محکمہ شماریات کے رجسٹر معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب عموماً اپنی مذہبی کتابوں کو تاریخ سمجھ کر پڑھتے ہیں اور اسی اسلوب سے مانوس ہیں۔ جب یہ اسلوب ان کو قرآن میں نہیں ملتا تو الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

قصص القرآن کے موضوع پر قدیم و جدید بہت سے مسلمان اہل علم نے قلم اٹھایا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر ایک بہت جامع کتاب مشہور فاضل اور تحریک آزادی کے ایک قائد مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کی قصص القرآن ہے۔ جس کے متعدد ایڈیشن پاکستان اور بھارت کے مختلف شہروں سے شائع ہو چکے ہیں۔

قصص القرآن کا ایک اہم پہلو واقعات کی ترتیب اور تکرار کا ہے۔ تکرار کے موضوع پر آئندہ ایک خطبہ میں بات ہوگی۔ قصص میں تکرار کے موضوع پر ہندوستان ہی کے ایک مشہور صاحب علم مولانا ابواللیث اصلاحی نے ایک بڑا عالمانہ مقالہ تحریر کیا تھا جو کئی بار شائع ہوا ہے۔ اس مقالہ میں مولانا نے بڑی تفصیل سے تکرار کے موضوع پر گفتگو کی ہے اور بطور مثال یہ بتایا ہے کہ قصہ آدم و ابلیس میں تکرار کیوں ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے الگ الگ ہر واقعہ کا جائزہ لیا ہے اور ایک ایک آیت کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ اس خاص سیاق و سباق میں اس واقعہ سے کیا بتانا مقصود

ہے اور اس خاص موقع پر اس میں کیا درس پنہاں ہے۔

۸۔ ایک اور موضوع ہے حجج القرآن، یعنی قرآن مجید کی دلیلیں اور حجتیں۔ قرآن مجید میں بہت سے بیانات اور دعاوی کی دلیلیں دی گئی ہیں اور ہر بنیادی دعوے کے ثبوت میں کوئی نہ کوئی دلیل ضرور دی گئی ہے۔ مفسرین اور ماہرین علوم قرآن نے اس سوال پر بڑی تفصیل سے غور کیا ہے کہ قرآن مجید جب کسی بات کی تائید میں کوئی دلیل دیتا ہے تو کس انداز سے دیتا ہے۔ اگر غور کریں تو دلیل دینے میں قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب سامنے آتا ہے۔

استدلال کے دو طریقے انسانی تاریخ میں رائج رہے ہیں۔ عقلی استدلال کی جتنی قسمیں ہیں وہ انہی دو میں سے کسی نہ کسی کے ذیل میں آتی ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی چیز کی علت کو سامنے رکھ کر اس کے معلول کا پتہ لگائیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی چیز کے معلول کو سامنے رکھ کر اس کی علت کا پتا چلائیں۔ مثلاً آگ جلتی دیکھ کر آپ کو پتہ چل جائے کہ یہاں دھواں بھی ہوگا۔ یا دھواں دیکھ کر یہ پتہ چل جائے کہ یہاں آگ بھی ہونی چاہیے۔ یہ دو قسم کی دلیلیں وہ ہیں جو مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو منطق کی اصطلاح میں دلیل انی اور دلیل لمی کہا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ دو قسم کی دلیلیں اور ہیں۔ یہ دلیلیں وہ ہیں جو استدلال اور عقل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کے اسلوب کے مطابق آپ نے بہت سی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بیان کیا۔ پھر ان جزئیات کی بنیاد پر ایک عمومی کلیہ اخذ کیا جو ان سب جزئیات پر منطبق ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید نے بیان کیا کہ زمین پہلے مردہ ہوتی ہے، پھر بارشوں اور طوفانوں کے ذریعہ سے زندہ ہو جاتی ہے۔ درخت مرجھا جاتا ہے، پھر ہرا بھرا ہو کر دوبارہ زندگی پا جاتا ہے۔ بستی اجڑتی ہے، پھر دوبارہ آباد ہو کر زندہ ہو جاتی ہے۔ جب یہ ساری چیزیں مرنے کے بعد بار بار زندہ ہو رہی ہیں تو ایک انسان آخر کیوں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ گویا جزوی مثالیں دے کر ایک کلی تصور ذہن میں بٹھایا گیا۔ وہ یہ کہ مرنے کے بعد ایک چیز دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے۔ اس اسلوب کو منطق استقرائی کہتے ہیں۔ یعنی **Inductive logic** قرآن مجید جو مثالیں دے کر سمجھاتا ہے وہ ہر ایک کے مشاہدہ میں ہیں۔ اس کے لیے کوئی ارسطو اور فارابی ہونا ضروری نہیں۔ زمین کے کیڑے مکوڑے اور پھل پھول کو زندہ ہوتے اور مرتے ہر شخص ہر وقت دیکھتا ہے۔ اس

کے لیے کسی غیر معمولی غور وخوض کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے مقابلے میں یونانیوں میں جو منطق پائی جاتی تھی وہ منطق استخراجی کہلاتی ہے۔جس میں پہلے کچھ عمومی کلیات بیان کیے جاتے ہیں جو اکثر و بیشتر مجرد انداز کے ہوتے ہیں۔ ان کلیات کو سامنے رکھ کر قیاس اور عقلی استدلال کے ذریعہ سے جزوی معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔مثلاً یونانی طب میں انہوں نے ایک اصول بنایا کہ ہر وہ چیز جو درجہ چہارم میں گرم اور خشک ہے وہ ایک خاص مقدار کے بعد انسانی جسم میں ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے۔اس کلیہ کو وہ الگ الگ دواؤں اور بوٹیوں پر منطبق کرتے ہیں۔ جہاں جہاں منطبق ہو جاتا ہے وہاں ان کا کلیہ درست ثابت ہو جاتا ہے جہاں یہ کلیہ ٹوٹ جاتا ہے وہاں وہ تاویل سے کام چلاتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس اسلوب کو اختیار نہیں کیا۔اس لیے کہ اس اسلوب کو اختیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ ایک خاص سطح تک اس فن کو جانتے ہوں۔اگر قرآن مجید منطق استخراجی کا یہ اسلوب اختیار کرتا تو اس کا خطاب صرف اہل علم اور فلسفیوں تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا۔ جو معاشرہ میں ہمیشہ بہت کم ہوتے ہیں۔اور بقیہ باشندے قرآن مجید کے خطاب کی حدود سے نکل جاتے۔

قرآن مجید کا خطاب چونکہ دنیا کے ہر انسان سے ہے، اس لیے اس نے منطق استخراجی کا اصول اختیار نہیں کیا۔قرآن مجید کا طرز استدلال استقرائی انداز کا ہے۔یہی وہ اسلوب ہے جس سے ایک فلسفی بھی استفادہ کر سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے استدلال کی بنیاد اصلاً مشاہدہ پر اٹھائی، اور جہاں عقل واستدلال کی بنیاد پر دلائل دیے ہیں وہاں عموماً منطق استقرائی کے اسلوب ہی کو اختیار کیا ہے۔منطق استخراجی کے اصول پر قرآن مجید نے زیادہ زور نہیں دیا۔اگر چہ کہیں کہیں اس اسلوب کا استعمال بھی ملتا ہے لیکن قرآن مجید نے اس کو اپنایا نہیں ہے۔

قرآن مجید کے اس استقرائی اسلوب نے مسلمان فقہاء اور مفکرین میں ایک نئے طرز فکر کو جنم دیا۔اس سے کام لے کر مسلمان مفکرین نے منطق استقرائی کے اصول طے کیے۔مثلاً امام غزالیؒ نے جو ان اصولوں کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے مدون ہیں' اس اسلوب سے بہت کام لیا۔فقہائے احناف نے اسی اسلوب سے کام لے کر بہت سے قواعد فقہیہ اور علم اصول

فقہ کے احکام مرتب کیے۔امام غزالیؒ کی عربی کتابوں کا رومن اور لاطینی ترجمہ مغربی مفکرین نے دیکھا۔فرانسیس بیکن نے انہی کتابوں کو دیکھ کر inducticive logic کے اسلوب استدلال کے پر اصول بیان کیے۔مغربی مفکرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ہاں منطق استقرائی کے ارتقاء پر مسلمان مفکرین کے گہرے اثرات ہیں۔ساری سائنسی ترقی کی بنیاد inductive logic پر ہے۔اسی پر سائنس کی ساری عمارت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔منطق استقرائی جیسے جیسے ترقی کرتی گئی سائنس کی پیش رفت کے دروازے کھلتے گئے۔یہی وجہ ہے کہ یورپ میں مسلم اندلس اور مسلم صقلیہ سے علمی روابط کے نتیجہ میں سائنس کا ارتقا شروع ہوا۔یہ قرآن مجید کی ایک بہت بڑی دین اور اس کی عطا ہے۔

۹۔ اسی سے ملتا جلتا ایک میدان وہ ہے جس کو بعض اہل علم نے جدل القرآن اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے علم المخاصمہ کے نام سے یاد کیا ہے۔یعنی قرآن مجید کا اسلوب مناظرہ اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے مکالمہ کا انداز۔قرآن پاک کے اس اسلوب مخاصمہ پر یوں تو بہت سے اہل علم نے اظہار خیال کیا ہے: مثلاً امام رازی، علامہ ابن تیمیہ، علامہ جلال الدین سیوطی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، لیکن اس موضوع پر الگ الگ اور جداگانہ کتابیں لکھنے کا شرف بھی کئی حضرات نے حاصل کیا۔

قرآن مجید میں نہ صرف دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے مخاصمہ اور مکالمہ کیا گیا، بلکہ جا بجا اس کے بنیادی اصول بھی بیان کیے گئے اور مسلمانوں کو اس کے لیے تیار کیا گیا۔ مثلاً یہ ہدایت کی گئی: و لا تجادلوا اهل الکتاب الا بالتی هی احسن۔اسی طرح ارشاد ہوا: و جادلهم بالتی هی احسن۔

بعض اہل علم نے خاص ان آیات پر زور دیتے ہوئے جو جدل ومخاصمہ کے موضوع پر ہیں، پورے قرآن پاک کی تفسیر کی ہے۔ ہماری اردو زبان میں مولانا عبدالحق حقانی کی تفسیر حقانی اور مولانا غلام اللہ خان کی تفسیر جواہر القرآن بنیادی طور پر جدل ومخاصمہ ہی کے موضوع پر ہیں۔ بالخصوص تفسیر جواہر القرآن کا تو سارا اسلوب ہی مناظرانہ ہے۔

۱۰۔ علوم القرآن کا ایک اور میدان بدائع القرآن ہے۔بدیعہ کے لفظی معنی ہیں انہونی اور عجیب وغریب چیز۔یعنی کسی جگہ قرآن مجید نے بہت اچھوتا اسلوب اختیار کیا، کسی جگہ کوئی بہت

اچھوتی مثال دی، کسی جگہ کوئی حکم اچھوتا ہے۔ یہ سارے بدائع ہیں۔ ان کو اہل علم نے الگ سے تحقیق کا موضوع بنایا اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں۔

۱۱۔ علوم قرآن مجید کا ایک اہم میدان غریب القرآن ہے۔ غریب القرآن سے مراد قرآن مجید کے وہ کلمات یا وہ الفاظ ہیں جن کے معانی یا تو ذرا مشکل ہیں یا عرب میں زیادہ مروج نہیں تھے، اس لیے ان کے معانی اور مطالب کو الگ سے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس موضوع پر ایک بہت عمدہ کتاب امام راغب اصفہانی کی المفردات فی غریب القرآن ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ملتا ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید کے جتنے مشکل الفاظ ہیں ان سب کی تشریح اور معانی مل جاتے ہیں۔

۱۲۔ علوم القرآن کے باب میں ایک اور چیز جو بہت اہم ہے وہ ناسخ اور منسوخ کا علم ہے۔ ہمارے زمانہ میں بہت سے اہل علم سے اس موضوع کو سمجھنے میں بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔ نسخ کے معنی ہر جگہ مکمل تبدیلی کے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک عمومی اصطلاح ہے جس کے معنی متقدمین کے ہاں نہایت وسیع تھے۔ لیکن متاخرین نے اس کو ذرا محدود مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

نسخ سے مراد متقدمین کے ہاں یہ ہے کہ کوئی سابقہ آیت یا کوئی حکم جو نازل کیا گیا اس کو بعد میں آنے والے کسی حکم نے محدود یا مخصوص (qualify) کر دیا۔ یا کسی نئی صورتحال کو اس عمومی حکم سے نکال کر اس کے لیے الگ حکم دے دیا۔ مثال کے طور پر مکہ مکرمہ کی بہت سی سورتوں میں بار بار یہ بیان ہوا تھا کہ آپ ؐ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔ یہ ایک عام حکم ہے جس میں نبی کی تبلیغی ذمہ داریوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ گویا ایک مبلغ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ ماننا یا نہ ماننا یہ لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے۔ لیکن مکہ مکرمہ سے ہجرت کر جانے کے بعد مدینہ منورہ میں جب اسلامی ریاست وجود میں آ گئی تو وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک مبلغ، ایک داعی، ایک نبی اور ایک رسول کے ساتھ ساتھ ایک قانون دہندہ، ایک سربراہ ریاست، ایک قاضی القضاۃ اور ایک سپہ سالار اعظم کی بھی تھی۔ اب آپ کو بہت سے احکام ایسے بھی دینے تھے جو نبی کی تبلیغی ذمہ داریوں سے بڑھ کر تھے۔ ان احکام کے بارہ میں وہ ہدایات اب جوں کی توں منطبق نہیں ہو سکتی تھیں جن میں کہا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے مانے جس کا جی چاہے نہ مانے۔ اب اگر مدینہ

منورہ میں چوری کا ایک مجرم لایا گیا اور اس کو قطع ید کی سزا ہوئی تو وہ چور اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے، یا یہ کہ چونکہ میں اس کتاب کو نہیں مانتا، اس لیے اس کے مطابق میرا ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ اب تو یہ ایک ریاستی قانون ہے جو ہر کسی پر لازماً چلے گا۔ گویا حکم کا یہ حصہ جو ریاستی قانون سے تعلق رکھتا ہے اُس عمومی حکم سے نکل گیا۔ اب یہاں نیا حکم آ گیا۔ اب اس سابقہ حکم کو اِس نئے حکم کی روشنی میں پڑھا جائے گا۔ اس کو متقدمین کی اصطلاح میں نسخ کہتے ہیں۔

یا مثال کے طور پر کوئی عمومی ہدایت دی گئی۔ پہلے کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ طیبات سب جائز' اور خبائث سب ناجائز ہیں۔ اب ہو سکتا کہ عرب لوگ اس زمانے میں اپنے خیال میں جس چیز کو طیب سمجھتے ہوں وہ دراصل طیب نہ ہو، اور بعد میں اس کی حرمت کو نازل کر کے بتایا جائے کہ یہ چیز طیب نہیں، بلکہ خبیث ہے۔ اب یہ کہنا کہ اس وقت اسے طیبات کہا گیا تھا، اب خبائث میں شامل کر کے حرام قرار دیا گیا ہے' درست نہ ہوگا۔ بلکہ کہا جائے گا کہ نئے حکم نے سابقہ حکم کی مزید توضیح کر دی۔ یہ بھی نسخ ہی کہلائے گا۔ اس لیے کہ یہ بھی نسخ ہی کی ایک کیفیت ہے۔ گویا اس کے بعض اجزاء جن کو تم اس میں شامل سمجھتے تھے' ان کے بارہ میں بتایا گیا کہ وہ پہلے عمومی حکم میں شامل نہیں تھے۔

اس طرح کے احکام کو جاننے اور سمجھنے کے لیے موضوع سے متعلق تمام آیات کا علم رکھنا اور ان کی ترتیب نزولی کو جاننا بڑا ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔

پھر علم ناسخ و منسوخ کی اہمیت کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے بہت سے احکام تدریج کے ساتھ نازل ہوئے ہیں۔ مثلاً عربوں میں شراب بہت عام تھی۔ جن حضرات نے زمانہ جاہلیت میں شراب نہیں پی ان میں سے صرف دو صحابہ کرام کے نام معروف ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ۔ عرب کے باقی تمام لوگوں میں یہ چیز خوب رائج تھی۔ اور عربوں کی معاشرت کا حصہ بن چکی تھی۔ اسلام نے شراب کو فوراً حرام قرار نہیں دیا۔ بلکہ تدریج کے ساتھ حرام قرار دیا۔ پہلے کہا گیا، واثمهما اکبر من نفعهما۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ شراب میں کچھ فائدہ بھی ہو، سرور کی لذت سے تھوڑی دیر کے لیے انسان بے خود ہو جائے، لیکن اس کا گناہ اس کے محدود نفع سے کہیں بڑھ کر ہے۔ گویا اس آیت کے ذریعے سے ایک پیغام دے دیا گیا ہے کہ اسلام

شراب کو پسند نہیں کرتا۔ جو لوگ شعور رکھتے تھے وہ اسی سے سمجھ گئے کہ شراب نوشی اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ انہوں نے فوراً شراب چھوڑ دی۔ اس کے بعد حکم آیا کہ نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ گویا ایک اور بندش آ گئی۔ اس کے بعد آخر میں حتمی حکم نازل کیا گیا کہ انما الخمر والمیسر...... یعنی شراب نوشی اور جوا' یہ سب کے سب شیطانی کام ہیں اور ناپاک ہیں، لہٰذا ان سے بچو۔ اب اگر یہ تدریجی عمل سامنے نہ ہو تو پڑھنے والا شبہ میں پڑ سکتا ہے کہ اگر نماز کے موقع پر نشہ کرنا حرام ہے تو شاید نماز کے وقت کے سوا حلال ہوگا۔ اور اگر قرآن یہ تسلیم کرتا ہے کہ شراب میں کوئی فائدہ بھی ہے تو چلو اس فائدہ کی خاطر ہی تھوڑی سی شراب نوشی کر لینی چاہیے۔ ایسا سمجھنا درست نہ ہوگا اور یہ قرآن مجید کی غلط تفسیر ہوگی۔ بلکہ یہ ایک تدریج تھی جس میں ایک ایک کر کے یہ احکام دیے جا رہے تھے۔ اب وہ حکم ختم ہو گیا۔ اس حد تک یہ اجازت منسوخ کر دی گئی، اور گویا اس حکم کی total abrogation ہو گئی۔ اگرچہ یہ آیت اب بھی قرآن مجید میں لکھی ہوئی ہے کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو، اور اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ نماز سے باہر حالت نشہ ہو سکتی ہے، لیکن اس سابقہ موقت حکم پر عملدرآمد کی اب اجازت نہیں ہے۔

نسخ کی ایک اور مثال دیکھیے' ایک جگہ آتا ہے کہ تم میں سے ہر ایک پر یہ واجب ہے کہ وصیت کرے اپنے اقربا اور باقی لوگوں کے لیے۔ یہ حکم اس وقت تک ہر شخص کے لیے واجب التعمیل تھا جب تک وراثت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ جب وراثت کے احکام آ گئے تو پھر اس حکم پر عملدرآمد کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اور حضورؐ نے اعلان فرما دیا کہ اب وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہوگی۔ یہ بھی اسی تدریج کا ایک نمونہ ہے کہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ اگرچہ قرآن مجید میں یہ سابقہ حکم اب بھی لکھا ہوا ہے۔ لیکن اب اس پر عملدرآمد نہیں ہے۔

ایک اور بڑی واضح مثال جس میں خود قرآن مجید ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے۔ وہ سورۃ انفال کا وہ حکم ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم میں سے اگر بیس صبر کرنے والے بہادر ہوں تو وہ دوسو کا مقابلہ کریں گے اور اگر تم میں سو بہادر صابر ہوں تو وہ ایک ہزار کا مقابلہ کریں گے۔ گویا مثالی اور آئیڈیل صورتحال یہ ہے کہ تم میں سے ایک' دس کا مقابلہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی مدد اس کمی کو پورا کر دے گی۔ پھر بعد میں کہا گیا کہ اب اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری میں کمی کر دی۔ الان خفف الله عنكم۔ اس لیے کہ اب تم پر بھی یہ بات واضح ہو گئی کہ تم میں کمزوری پائی جاتی

ہے۔اب اگر سو بہادر اور صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو کا مقابلہ کریں گے۔ اور اگر ایک ہزار بہادر ہوں تو دو ہزار کا مقابلہ کریں گے۔ گویا ایک اور دو کی نسبت ہو تو مقابلہ کرنا واجب ہے، اور دشمن کے سامنے ڈٹ جانا دین کا ایک فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں کمزوری دکھانا ٹھیک نہیں ہے۔ اب یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخفیف کردی۔

یہ سارے معاملات نسخ کے دائرے میں آتے ہیں۔ نسخ میں کہیں مکمل ترمیم مراد ہے۔ اور کہیں جزوی ترمیم۔ کہیں تخصیص مراد ہے اور کہیں تقیید۔ کہیں اجمال کی تفصیل مراد ہے اور کہیں صرف یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ اس آیت کو فلاں آیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو دونوں کا مفہوم واضح ہوگا۔ اس ملا کر پڑھنے کو بھی نسخ کہتے ہیں۔ لیکن اس ناسخ و منسوخ اور تدریج احکام کے سارے معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ پہلے کون سی آیت نازل ہوئی اور بعد میں کون سی نازل ہوئی۔ کم از کم بڑے بڑے مسائل کے بارے میں یہ علم ہونا چاہیے۔ اس لیے یہ بھی علوم القرآن کا ایک اہم حصہ ہے۔

۱۳۔ علوم القرآن کے ضمن میں علماء اسلام نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ سب سے پہلے کون سی آیت نازل ہوئی اور سب سے بعد میں کون سی۔ عام طور پر علماء کرام کی یہ رائے ہے اور اس میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں ہے کہ سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات ہیں، اور سب سے آخری آیت جس پر ان صحابہ کرام کا اتفاق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین اعزہ اور رفقاء میں سے تھے، اور آپؐ کے اہل خاندان میں شامل تھے جیسے حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ یعنی جو لوگ آپؐ کے گھر میں کثرت سے آتے جاتے تھے ان کا کہنا ہے کہ آخری آیت جو آپؐ پر نازل ہوئی وہ سورہ بقرہ کی یہ آیت ہے: واتقوا یوماً ترجعون فیه الی الله..... ۔ اس پہلی اور آخری آیت کے تعین کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ نے اس کا بھی تعین کرنے کی کوشش کی کہ وہ کون سی آیات تھیں جو سفر میں نازل ہوئیں۔ کون سی آیات حضر میں نازل ہوئیں۔ بعض آیات اور سورتوں کے بارے میں واضح طور پر معلوم ہے کہ وہ سفر میں نازل ہوئیں۔ مثلاً سورہ فتح۔ جب حضورؐ صلح حدیبیہ سے واپس آرہے تھے اس وقت یہ پوری سورت نازل ہوئی۔ اسی طرح سورۃ منافقون غزوہ بنو المصطلق سے روانگی کے بعد دوران سفر میں نازل ہوئی۔ وہ آیات یا سورتیں جو سفر میں نازل ہوئے' سفری کہلاتی ہیں۔ ان کی تعداد

تھوڑی ہے۔قرآن پاک کا بیشتر حصہ حضری ہے جو مکہ یا مدینہ میں دوران قیام میں نازل ہوا۔

اسی طرح سے نہاری اور لیلی آیات ہیں جو دن اور رات پر تقسیم کی گئی ہیں۔یعنی رات میں نازل ہونے والی آیات اور دن میں نازل ہونے والی آیات۔ بہت سی آیات فراشی اور نومی کہلاتی ہیں۔یعنی وہ آیات جو بستر میں اور نیند کی حالت میں نازل ہوئیں۔انبیاء کرام کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ کہ انبیاء کی آنکھیں تو سوتی ہیں، لیکن ان کے دل جاگتے رہتے ہیں۔ان کے دل پر پر نیند کا اثر نہیں ہوتا۔وحی کا نزول چونکہ دل پر ہوتا ہے اس لیے نیند کے دوران میں بھی بعض اوقات نزول آیات ہوتا تھا۔اسی طرح صیفی اور شتائی آیات بھی ہیں۔یعنی قرآن پاک کا کون سا حصہ سردی میں نازل ہوا اور کون سا حصہ گرمی میں نازل ہوا۔اسی طرح یہ تعین کرنے کی کوشش کی گئی کہ کون سی آیات زمین پر نازل ہوئیں اور کون سی آسمان، پر یعنی ارضی اور سمائی۔ آسمانوں پر نازل ہونے والی تو ایک ہی آیت کا ذکر ملتا ہے کہ جب دوران سفر معراج حضورؐ براق پر سوئے افلاک تشریف لے جا رہے تھے۔یعنی براق پر سوار تھے' اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: واسئل من ارسلنامن قبلك من رسلنا...... یہ وہ آیت ہے جو آسمانوں سے آسمانوں پر نازل ہوئی۔

قرآنی آیات کی ان مختلف اقسام سے یہ ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اور علماء قرآن کو قرآن مجید کے نزول کی تفصیل جمع کرنے سے کتنی غیر معمولی دلچسپی تھی، اور اس کام کو انہوں نے کس محبت اور عقیدت سے انجام دیا۔اگر چہ تفسیر قرآن کے کام میں ان معلومات کو کہ یہ آیت رات کے وقت نازل ہوئی اور وہ آیت دن کے وقت نازل ہوئی' بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔کوئی آیت رات کو نازل ہوئی ہو یا دن کو۔دونوں صورتوں میں اس کے احکام کی اہمیت یکساں ہے۔لیکن اس سے مسلمانوں کی اس محبت اور تعلق کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے جو ان کو قرآن مجید سے رہی ہے۔

۱۴۔ ان علوم وفنون میں چند ایسے ہیں جو تفسیر قرآن اور فہم قرآن میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ان میں سے ایک اسباب نزول ہے۔اس سے مراد وہ صورتحال ہے جس میں کوئی آیت یا سورت نازل ہوئی۔بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اسباب نزول کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس بارے میں اگر معلومات دستیاب نہ بھی ہوں تو قرآن مجید کے سمجھنے میں کوئی رکاوٹ پیدا

نہیں ہوسکتی۔ اس رائے کی بنیاد جس اصول پر ہے وہ یہ ہے کہ اصل اعتبار قرآن مجید کے الفاظ کے عموم کا ہوگا۔ مثلاً ایک خاص صورتحال میں ایک حکم نازل ہوا تو یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ یہ حکم اس خاص صورتحال کے لیے ہے۔ بلکہ اگر الفاظ عام ہیں تو حکم عام ہوگا۔ مثلاً ایک خاتون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور بہت بلند آواز سے شکایت کی کہ میرے شوہر نے میرے ساتھ یہ معاملہ (ظہار: طلاق کی ایک قسم) کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اب میری قانونی حیثیت اور درجہ کیا ہے۔ آپ مجھے بتائیں۔ حضورؐ نے فرمایا! بی بی! میرے پاس ابھی تک تمہارے مسئلے کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں آئی۔ اس پر انہوں نے اور زیادہ واویلا کیا کہ آپؐ کے پاس بھی ہدایت نہیں آئی ہے تو پھر میں کیا کروں۔ اس موقعہ پر سورۃ مجادلہ نازل ہوئی، قد سمع اللہ قول التی تجادلك فی زوجها و تشتكی الی اللہ واللہ یسمع تحاوركما۔ اللہ نے اس عورت کی سن لی جو اپنے شوہر کے بارے میں آپ سے جھگڑا کر رہی تھی اور اللہ سے شکوہ کر رہی تھی ۔۔۔۔ اب ظاہری طور پر تو یہ آیت اس خاص خاتون کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جو آ کر حضورؐ سے جھگڑی تھی۔ لیکن جو احکام نازل ہوئے وہ بالاتفاق تمام مسلمانوں کے لیے ہیں اور اسلامی قانون کا حصہ ہیں۔

اس کے برعکس بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ایک خاص آیت آئی ہے، اور وہ ایک محدود صورتحال پر منطبق ہوتی ہے۔ لیکن اس کے الفاظ عام ہوتے ہیں۔ یہ بات سمجھنے کے لیے بھی اسباب نزول کا جاننا ضروری ہے۔ مثلاً ایک جگہ آیا ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو یہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ان کاموں کے لیے جو انہوں نے سرے سے کیے ہی نہیں۔ مروان بن حکم خلیفہ تھے۔ انہوں نے جب یہ آیت پڑھی تو انہیں فکر ہوئی کہ یہ تو ہر شخص چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ اگر یہ چیز اتنی بری ہے کہ قرآن مجید نے اسے برا بتایا ہے تو پھر تو اس سے بچنا چاہیے۔ اور بچنا مشکل ہے۔ انہوں نے بعض صحابہ کرام سے اس کا مطلب پوچھا اور اپنے اس خدشہ کا ذکر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس آیت کا مطلب وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس لیے کہ یہ تو ہر انسان کی فطرت ہے، ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی تعریف کی جائے، اور اسے اپنی تعریف سن کر خوشی بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ آیت ایک خاص سیاق وسباق میں نازل ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ یہودیوں کا ایک مقدمہ آیا

جس میں یہودیوں نے درخواست کی کہ آپ ہمارے مجرموں کا فیصلہ کر دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تمہاری کتاب کے مطابق اس مقدمہ کا فیصلہ کروں گا۔ بتاؤ تمہاری کتاب میں اس بارے میں کیا لکھا ہے۔ انہوں نے تورات کے متعلقہ احکام کے بارہ میں غلط بتایا۔ اور غلط بتانے کے بعد ایسی فاتحانہ نگاہوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھا جیسے اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تعریف کریں گے اور فرمائیں گے کہ تم نے بڑا اچھا کام کیا۔ فوراً ہی حضورؐ پر وحی نازل ہوئی اور آپؐ کو یہ اطلاع دی گئی کہ یہ لوگ تورات کے حکم کے بارہ میں آپ کو غلط بتا رہے ہیں، تورات کا حکم وہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے۔ اس سیاق وسباق میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ایسے لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اول تو جھوٹ بولتے ہیں اور جو کام نہ کیا ہو اس میں متوقع ہوتے ہیں کہ ہماری تعریف کی جائے۔ چنانچہ یہ خاص طور یہودیوں کے اس رویہ کے بارے میں ہے۔ اس طرح کا رویہ اگر کسی اور کا ہو تو پھر یہ وعید اس پر بھی منطبق ہو سکتی ہے۔

اسی طرح بعض اوقات قرآن مجید میں کسی جگہ کوئی خاص لفظ آیا ہوتا ہے جو کسی رائج الوقت غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اگر وہ غلط فہمی علم میں نہ ہو تو پھر اس لفظ پر غیر متعلق بحث پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ کے احکام دیے تو آپؐ نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کو لازمی قرار دیا۔ یہ سات چکر عمرے کے ارکان ہیں اور حج میں فرض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صفا اور مروہ کی سعی کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا۔ لیکن قرآن مجید میں ہے، ان الصفا والمروة من شعائر الله فمن حج البيت او اعتمر فلاجناح عليه ان يطوف بهما۔۔۔ اگر کوئی شخص حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ ان کی سعی کرے۔ اب بظاہر یہ لگتا ہے کہ اگر کوئی سعی کر لے تو کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر نہ کرے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر، یعنی ان کی بڑی بہن اسماء بنت ابی بکر کے صاحبزادے، ان کو یہی خیال ہوا۔ اس پر انہوں نے جا کر اپنی خالہ سے پوچھا۔ خالہ نے جواب دیا کہ اگر وہ بات ہوتی جو تم کہہ رہے ہو تو یوں ہوتا کہ کوئی حرج نہیں ہے اگر طواف نہ کرے ،یعنی اگر ان کی سعی نہ کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہاں ہے کہ اگر سعی کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا پس منظر اور ہے۔

پھر انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ جاہلیت کے زمانہ میں اسلام سے پہلے عرب کے

بعض مشرک قبائل نے صفا اور مروہ پر ایک ایک بت لا کر رکھ دیا تھا۔ تاکہ جب سعی کر کے ایک چکر مکمل ہو تو اس بت کو چوم لیں۔ دوسرا چکر مکمل ہو تو دوسرے بت کو چوم لیں۔ اسلام سے قبل ہر قبیلے کا بت علیحدہ ہوتا تھا۔ اس لیے وہ قبائل جو ان بتوں کے پجاری نہیں تھے وہ صفا اور مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے۔ ان میں انصار بھی شامل تھے۔ انصار کے قبائل اوس اور خزرج چونکہ ان بتوں کو نہیں مانتے تھے اس لیے اسلام سے قبل جب وہ حج یا عمرہ کے لیے آیا کرتے تو وہ صفا اور مروہ کی سعی کرنے میں تامل کرتے تھے۔ جب اسلام آیا اور حج اور عمرے کے تفصیلی احکام آ گئے تو سعی کو بھی لازمی قرار دے دیا گیا۔ اب جب انصاری صحابہ حج اور عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تو ان کو خیال ہوا کہ ہمیں یہاں سعی کرنی چاہیے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ گناہ ہو یا ناجائز ہو۔ تو ان کے جواب کے لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے، بلکہ یہ تو اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔

یہاں سعی کرنا ایک نبی کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مومن خاتون کی یاد منانے کا حکم ہے۔ یہ تو ایک خاتون کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلیٰ مقام دیا گیا ہے کہ جہاں اس نے سات چکر لگائے تو وہاں اب تم بھی سات مرتبہ چکر لگاؤ۔ چنانچہ اس پاکباز خاتون کی یاد میں اس جگہ نبیؑ بھی دوڑتا ہے اور ولی بھی دوڑتا ہے۔ گنہگار بھی دوڑتا ہے اور نیکوکار بھی۔ عالم بھی دوڑتا ہے اور جاہل بھی۔ لہٰذا اگر یہ سارا پس منظر سامنے نہ ہو تو پھر یہاں قرآن کا جو اسلوب بیان ہے کہ کوئی گناہ نہیں یہ کسی غلط فہمی کا سبب بھی بن سکتا ہے، جیسا کہ عبداللہ بن زبیر جیسی شخصیت کے لیے بنا۔

یہی وجہ ہے کہ اسباب نزول کی اہمیت اپنی جگہ ہے اور اس کا علم ہونا چاہیے۔ اگرچہ حکم کا دارومدار الفاظ پر ہوگا۔ اگر الفاظ عام ہیں تو حکم عام ہوگا اور اگر الفاظ خاص ہیں تو حکم خاص ہوگا۔ اسباب نزول کا علم رکھنے سے کسی بھی حکم کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس حکم کو واضح کرنے میں بھی مدد ملتی ہے اور یاد کرنے میں بھی مدد ملتی ہے اس لیے کہ واقعہ جلدی یاد ہو جاتا ہے۔

اسباب نزول پر یوں تو تمام مفسرین نے کلام کیا ہے اور ہر بڑے مفسر نے اسباب نزول، زمانہ نزول، اور حالات نزول کا ذکر کیا ہے۔ لیکن بعض حضرات نے اس پر الگ الگ کتابیں بھی لکھی ہیں اور اسباب نزول کو انہوں نے ایک الگ فن کے طور پر مرتب کیا ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب جس عظیم شخصیت سے منسوب ہے وہ امام بخاریؒ کے استاد اور مشہور فقیہ و محدث امام علی ابن مدینی ہیں۔ علی ابن المدینی تاریخ حدیث کی انتہائی اہم اور محترم شخصیتوں

میں سے ایک ہیں۔علم اسباب نزول پر پہلی کتاب امام علی بن المدینی کی بتائی جاتی ہے۔دوسری کتاب جو عام طور پر ہر جگہ ملتی ہے وہ علامہ علی بن احمد الواحدی کی ہے جو پانچویں صدی ہجری کے بزرگ تھے۔انہوں نے تفسیر کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔جن میں سے بعض آج بھی دستیاب ہیں۔اسباب نزول پر ان کی اس کتاب کا نام بھی اسباب النزول ہی ہے۔

ایک کتاب علامہ جلال الدین سیوطی کی بھی اسباب النزول کے موضوع پر ہے جس کا نام لباب النقول فی اسباب النزول ہے۔یہ کتاب بھی کئی بار طبع ہو چکی ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے۔

اگر اسباب النزول کا علم انسان کے سامنے ہو تو اس کو فہم القرآن میں بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ خاص حکم جس کے شان نزول سے بحث مقصود ہے اس کی حکمت اور اس کا سیاق اور سباق فوری طور پر سمجھ میں آجاتا ہے۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی حکم کسی خاص سبب کے ساتھ خاص ہوتا ہے جو صرف اسباب نزول یا شان نزول کے جاننے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کن حالات میں اس حکم کو منطبق کیا جائے گا۔اور کن حالات میں اس حکم کو منطبق نہیں کیا جائے گا۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز اتنی واضح نہیں ہوتی جتنی ہماری فہم کے لیے ضروری ہے۔اسباب نزول کو دیکھنے سے واضح ہو جاتی ہے، جیسے لا جناح کی مثال ابھی گذری۔

بعض اوقات قرآن مجید میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، کسی شخص کا کنایہ کے انداز میں ذکر ہوتا ہے لیکن نام نہیں ہوتا۔اب اگر نام معلوم ہو جائے تو واقعہ زیادہ بہتر انداز میں سمجھ آجاتا ہے۔قرآن مجید میں بالواسطہ طور پر کنایہ کے انداز میں کئی صحابہ کرام کا ذکر ہے۔جیسے قرآن مجید کی یہ آیت، ولا یاتل اولو الفضل منکم۔۔۔یعنی تم میں سے جو فضل والے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے خوشحالی دی ہے وہ ان لوگوں پر خرچ کرنے سے انکار نہ کریں۔اس آیت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ اسباب نزول کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے۔اب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہاں کس صاحب فضل کی طرف اشارہ ہے تو آیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اور زیادہ گہرائی سے بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

یہ وہ فوائد ہیں جو علم اسباب نزول سے حاصل ہوتے ہیں۔اس لیے مفسرین قرآن نے اسباب نزول کے بارے میں روایات کو جمع کیا اور ان کے ذریعے سے اس سیاق وسباق کا پتہ لگانے کی کوشش کی جس میں کوئی آیت نازل ہوئی تھی۔

علوم القرآن کا ایک اور اہم میدان مشکلات القرآن یا مشکل القرآن کہلاتا ہے۔ مشکل القرآن یا مشکلات القرآن سے مراد وہ مباحث ہیں جن کو سمجھنے کے لیے بڑی غیر معمولی احتیاط اور غور وفکر کی ضرورت ہے۔ یہ وہ مباحث ہیں کہ جن کے بارے میں غور وفکر اور احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو بہت سی الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ان الجھنوں کو دور کرنا بڑا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ سورۃ بقرہ میں آتا ہے۔ واتبعوا ما تتلوا الشیاطین۔۔۔ یہاں ہاروت ماروت کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ اب اگر آدمی ان آیات کو یہ سمجھ کر پڑھے کہ انبیاء کا مقام اور مرتبہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے بارے میں قرآن مجید کیا بتاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کن کن صورتوں میں ہوتی ہے۔ یہ ساری چیزیں سامنے ہوں تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی کسی لغوی غلط فہمی کی وجہ سے اور بعض اوقات اسرائیلیات اور دیگر خرافات بھرمار کی وجہ سے بھی غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اگر ایک مرتبہ کوئی الجھن پیدا ہو جائے اور اس کو درست تفسیر سے دور نہ کیا جائے تو وہ پھر بڑھتی رہتی ہے اور اس سے مزید الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ تفسیر کی بہت سی کتابوں میں ہاروت اور ماروت کے واقعہ میں بہت سا رطب و یابس بیان ہوا ہے ، اور علماء کرام نے اس پر بہت لمبی اور تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ یہ خود اپنی جگہ تحقیق کا اور علماء کرام کے مباحث کا ایک مستقل بالذات موضوع بن گیا ہے۔ اس لیے اس کو بھی مشکلات القرآن میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اب اس پورے ادب میں جو ادھر ادھر سے آکر جمع ہوا صحیح راستہ متعین کر کے یہ بتانا کہ اس سے مراد کیا ہے اور یہ کس طرح کی آزمائش تھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی مشکلات القرآن کا موضوع ہے۔ یہاں یہ ارشاد ربانی۔ انما نحن فتنۃ فلا تکفر، ہم آزمائش کے لیے بھیجے گئے ہیں لہٰذا تم کسی کفر کا ارتکاب نہ کرنا۔ پورے واقعہ کو سمجھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس آیہ مبارکہ کی تفسیر اس پوری بحث میں ایک بڑی بنیادی چیز ہے۔ اور نہایت ذمہ داری کا تقاضا کرتی ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے، وعلی الذین یطیقونہ......، جو لوگ اس کی (یعنی روزہ کی یا فدیہ کی) طاقت رکھتے ہیں یا طاقت نہیں رکھتے وہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ کے دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہاں طاقت رکھنے سے کیا مراد ہے، کس چیز کی طاقت رکھتے ہوں۔ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں طاقت رکھنے سے مراد یہ ہے کہ روزہ کی طاقت رکھتے ہوں، جو طاقت

رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھیں وہ فدیہ دے دیں۔ یہ قول بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے اور قرآن مجید کے اس پورے سیاق وسباق سے جس میں روزں کی فرضیت کا دوٹوک ذکر ہے بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ کچھ اور حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہوں۔ اس قول پر لغوی اور نحوی اعتبار سے کئی شبہات عائد ہوتے ہیں۔ ان سب اعتراضات سے بچنے کے لیے بعض حضرات نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی (روزہ کی) طاقت نہ رکھتے ہوں۔ اطاق یطیق باب افعال سے ہے۔ اس میں سلب ماخذ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مثلاً جیسے فلس سے افلاس۔ اس طرح اطاقہ یعنی طاقت نہ ہونا۔ اس پر مختلف حضرات نے بہت سی بحثیں پیش کی ہیں اور ایک نقطۂ نظر تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو مشکلات القرآن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس موضوع پر بھی علمائے قرآن نے الگ الگ بڑی بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کتاب مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی ہے جن کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ دنیائے اسلام گذشتہ تین سو سال میں مولوی انور شاہ کی نظیر نہیں پیش کر سکی۔

۱۶۔ ایک اور اہم چیز جس کا میں نے پہلے سرسری طور پر ذکر کیا تھا وہ اقسام القرآن ہے۔ یعنی قرآن مجید کی قسمیں۔ قرآن مجید میں قسمیں کیوں بیان کی گئی ہیں۔ اس کا ایک عام سا اور سادہ سا اور فوری جواب تو یہ ہے کہ عرب میں رواج تھا۔ چونکہ قرآن مجید عرب کے مانوس اسلوب کے مطابق ہے اور عرب کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس لیے عربوں میں جو انداز بیان رائج تھا اسی کو قرآن مجید نے اختیار کیا، اسی وجہ سے قرآن مجید میں قسمیں بھی آئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے ایک سنجیدہ طالب علم کے لیے یہ جواب کافی ہے۔

لیکن اس کے باوجود اہل علم نے اس موضوع کو خصوصی غور وفکر اور مطالعہ کا موضوع بنایا۔ انھوں نے جب قرآن مجید کی قسموں پر غور کیا اور اس کے مندرجات کا جائزہ لیا تو کئی نئی چیزیں سامنے آئیں۔ جہاں جہاں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنی ذات وصفات کی قسمیں کھائی ہیں۔ وہاں تو کسی سوال کی گنجائش نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس کی مستحق ہے کہ اس کی قسم کھائی جائے۔ لیکن جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی قسم کھائی ہے وہاں قسم سے کیا مراد ہے۔ مثلاً چاند اور سورج کی قسم کھائی گئی ہے۔ ایسی قسموں میں ذرا غور وخوض کی ضرورت ہے، اور اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ یہ قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے

کہ بعض جگہ تو ان مخلوقات کی قسم کھائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان خلاقی کا ایک خاص نمونہ ہیں۔ مثلاً: والسماء وما بناھا۔ آسمان اللہ کی مخلوقات میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کی قسم کھا کر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور شان خلاقی کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔

بعض جگہ ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے وابستہ بعض خاص مقامات کی قسم کھائی ہے۔ مثلاً طور سینا کی قسم ہے۔ والطّور۔ طور پر اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ طور سینا سے گویا نبوت کا ایک خاص رشتہ بنتا ہے۔ طور کی قسم کھانے کے معنی یہ ہیں کہ یاد کرو اس واقعہ کو جب طور پر اللہ تعالیٰ کی تجلی ہوئی اور یاد کرو اس کیفیت کو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا اور ان کو رسالت و نبوت سے سرفراز فرمایا۔ گویا یہاں قسم کھانے سے مراد اس واقعہ کی یاد دلانا مقصود ہے۔ اور یہ جتانا مقصود ہے کہ جب اس واقعہ کو یاد کرو گے تو وہ بات سمجھ میں آجائے گی جو آگے بیان کی جا رہی ہے۔

بعض جگہ ایسا ہے کہ جن چیزوں کی قسم کھائی گئی وہاں ان کی اہمیت بتانا مقصود ہے مثلاً قیامت کی قسم: لا، اقسم بیوم القیامۃ ولا اقسم با النفس اللوامہ نہیں! بلکہ میں قسم کھاتا ہوں روز قیامت کی۔ اور نہیں، بلکہ میں قسم کھاتا ہوں انسان کے نفس کی جو انسان کو ملامت کرتا ہے۔ اور برائی سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا انسان کے اندر اگر نفس لوامہ موجود ہے تو یہ ایک بڑی اچھی چیز ہے۔ اور اسی طرح روز قیامت کے سخت حساب کتاب کی اہمیت ہے۔ قیامت کی اہمیت یاد ہو تو انسان بہت سی برائیوں سے بچا رہتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے اور اسلوب بیان میں شدت پیدا کرنے کے لیے قسم کا اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے قسم کا استعمال فرمایا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صادق اور امین تھے، اس لیے آپؐ کو قسم کھانے کی ضرورت اس لیے تو پیش نہیں آسکتی تھی کہ لوگ نعوذ باللہ آپ کو جھوٹا سمجھ رہے ہوں یا سچا قرار دینے میں تامل کر رہے ہوں۔ جہاں دشمن بھی سچا سمجھتے ہوں، جہاں قتل کے لیے باہر جمع ہونے والے بھی اپنی امانتیں اندر رکھواتے ہوں وہاں کوئی جھوٹا کیوں سمجھے گا۔ لیکن کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قسم کھانے کا خاص انداز تھا۔ جب آپؐ کو کسی خاص بات پر زور دینا ہوتا تھا تو اپنے دائیں ہاتھ کے

انگوٹھے کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر ان الفاظ میں قسم میں کھایا کرتے تھے والذی نفس محمد بیدہ۔ یہ انداز محض زور بیان پیدا فرمانے کے لیے اختیار فرماتے تھے تاکہ لوگ متوجہ ہو جائیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں بعض جگہ صرف توجہ دلانے کے لیے قسم کا مضمون بیان ہوا ہے۔

کفار مکہ قسم پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ یہی اعتراض بعد میں مستشرقین نے بھی کیا اور آج کل کے مغربی مفکرین بھی کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ قسم تو وہ کھاتا ہے جس کو لوگ جھوٹا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی بات منوانے کی خاطر قسم کھاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کو آخر قسم کھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟۔ ایک اعتراض جو آج کل مستشرقین کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان جس چیز کی قسم کھاتا ہے اس چیز کی عظمت کا تصور اس کے دل میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ کوئی ماں کی قسم کھاتا ہے، کوئی بتوں کی قسم کھاتا ہے، اور کوئی خدا کی اور کوئی رسول کی قسم کھاتا ہے۔ غرض کہ جس کی بھی قسم کھائیں اس کی عظمت کا احساس پہلے سے قسم کھانے والے کے دل میں ہوتا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی عظمت کیوں بیان کر رہا ہے، اور یہ کہ یہ بات اس کی ذات پاک کے شایان شان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات وہی لوگ کہیں گے جو قرآن مجید کو آسمانی کتاب نہیں مانتے۔ نہ کفار مکہ مانتے تھے اور نہ آج کے مستشرقین مانتے ہیں۔

لیکن یہ اسباب جو قسم کے لیے اوپر بیان ہوئے ہیں یہ اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ قرآن مجید میں قسمیں کیوں بیان ہوئی ہیں۔ پھر مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ منکر کے لیے قسم بے کار ہے اور مومن کے لیے غیر ضروری۔ مسلمان کے لیے قسم کھانا ضروری نہیں اور منکر کے لیے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لیکن یہ سارے اعتراضات اسی وقت وارد ہوتے ہیں جب یہ فرض کر لیا جائے کہ قسم صرف وہاں کھائی جائے گی جہاں بات کو قسم کے بغیر مشکوک مانا جا رہا ہو۔ جبکہ بعض اوقات بات کو مشکوک سمجھے بغیر بھی زور دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بعض اوقات جن چیزوں کی قسم کھائی جا رہی ہے۔ ان کا حوالہ دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بعض اوقات بطور گواہ کے اور بطور ثبوت کے اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ والعصر، زمانے کی قسم، یعنی زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہے۔ زمانہ کس کو کہتے ہیں۔ انسان کی عمر کو زمانہ کہتے ہیں۔ میری اور آپ کی پیدائش سے لے کر مرنے تک جو وقت ہے وہ میرے لیے زمانہ ہے۔ اور وہ

مسلسل گھٹ رہا ہے، تو واقعہ یہ ہے انسان گھاٹے میں ہے۔ میری اور آپ کی جو سب سے قیمتی چیز ہے یعنی زندگی، وہ مسلسل گھٹ رہی ہے۔ لہٰذا انسان مسلسل خسارے میں ہے، سوائے اس انسان کے جو نیک عمل کرے اس کے خسارے کو اللہ تعالیٰ فائدہ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے خاص تاریخی واقعات کا حوالہ دیا ہوتا ہے اور اس حوالہ کا انداز قسم کا ہوتا ہے۔ مثلاً والتین، والزیتون۔۔۔ یہاں چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ طور کی، انجیر کی، زیتون کی اور اس امن والے شہر کی۔ اب طور سینین اور بلد الامین کا اشارہ تو معلوم ہے کہ ایک جگہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے۔ اور دوسری جگہ کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ زیتون سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے، زیتون سب سے پہلے فلسطین اور شام میں پیدا ہوا۔ پھر شام و فلسطین ہی سے ہر جگہ گیا۔ اور آج بھی شام و فلسطین میں دنیا کا بہترین زیتون پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ زیتون سے مراد وہ علاقہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے بظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ انجیر سے بھی کوئی ایسا علاقہ مراد ہوگا۔ جہاں کسی پیغمبر کی پیدائش ہوئی ہوگی۔ اہل علم نے انجیر کی تفسیر میں بہت کچھ لکھا ہے کہ یہاں انجیر سے کیا مراد ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے کسی ایسے پیغمبر کی سرزمین مراد ہے جہاں انجیر بہت پیدا ہوتے ہوں گے۔ کسی نے کچھ مراد لیا اور کسی نے کچھ، لیکن اس بات پر اہل تفسیر عام طور پر متفق ہیں کہ اس سے کسی خاص پیغمبر کے تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

۱۷۔ علوم القرآن میں ایک اور چیز علم قراءت ہے۔ یعنی قرآن مجید کو پڑھے جانے کا انداز، اس کے قواعد اور ان قواعد کا علم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد جب بڑے بڑے قبائل نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو ہر قبیلے کا لہجہ الگ الگ ہوا کرتا تھا، مختلف قبائل میں مختلف لہجے مروج تھے۔ ایک قبیلہ ع کو ح پڑھتا تھا۔ اب اس امر کا قوی امکان تھا کہ وہ حتی حین کو عتی عین پڑھ لیں۔ اسی طرح بعض قبائل تھے وہ ق کو ش بولتے تھے۔ بعض ال کو ام بولتے تھے۔ اس لیے شروع میں حضورؐ نے اجازت دے دی تھی کہ ہر قبیلہ اپنے لہجے میں قرآن پاک پڑھ سکتا ہے۔ ایسا آپؐ نے غالباً اس لیے کیا کہ قبائل کے درمیان کوئی فوری اختلاف یا تعصب پیدا نہ ہونے پائے۔ پھر جیسے جیسے لوگ قریش یا حجاز کے لہجے سے مانوس ہوتے جائیں گے ویسے ویسے حجاز کے لہجہ کو سیکھ کر اس میں قرآن پڑھتے جائیں گے۔ یہ کیفیت حضرت عثمان غنیؓ کے دور

تک رہی اور پھر اس کی ممانعت ہوگئی' جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد جب قرآن پاک سرکاری انتظام میں لکھا گیا تو قریش اور حجاز کے لہجے ہی کے مطابق لکھا گیا، اور جہاں ایک حرف کو دوسرا حرف پڑھنے کا امکان تھا' وہ امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ صحابہ کرامؓ نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ یہ وقتی سہولت اور عارضی ضرورت اب ختم ہو چکی ہے۔

لیکن اس قبائلی فرق کے علاوہ بھی کسی لفظ کو بولنے میں اہل زبان میں مختلف علاقوں یا قبیلوں کے لوگوں کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، کوئی ایک ہی لفظ کو زبر سے بولتا ہے اور کوئی زیر سے بولتا ہے۔ ایک ہی علاقے کی زبان ہوتی ہے اس کو لکھا بھی ایک ہی طرح جاتا ہے۔ مفہوم بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی زیر زبر کا اختلاف موجود ہوتا ہے۔ قریشی لہجہ اور حجازی زبان کی حدود کے اندر اس زیر زبر کے اختلاف کی بعد میں بھی اجازت رہی اور آج بھی اجازت ہے، اس لیے کہ یہ تنوع رسم عثمانی کے مطابق ہے۔ اس میں جس حد تک اجازت ہے اس حد تک اختلاف قراءات کی بھی اجازت ہے۔ اس لیے کہ یہ رسم عثمانی کے مطابق ہے۔ اس کے مطابق مختلف قراءتیں رائج ہیں، صحابہ کرام نے مختلف طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پاک سنا۔ انہوں نے دوسروں کو پڑھ کر سنایا، ان سے تابعین کو پہنچا اور پھر تبع تابعین تک، اور ان سے قراءت کے ائمہ تک۔ اور ان سے آج تک تواتر سے ہمارے دور تک چلا آرہا ہے۔

اس باب میں حضرت عثمان غنیؓ کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ جب انہوں نے اپنے اہتمام میں سات یا گیارہ سرکاری نسخے تیار کروائے تو ہر نسخہ کے ساتھ انہوں نے ایک مستند قاری بھیجا کہ وہ جا کر لوگوں کو یہ نسخہ پڑھائے۔ مدینہ منورہ میں جہاں اصل نسخہ رکھا گیا تھا وہاں حضرت زید بن ثابتؓ خود اس کام کے لیے موجود تھے کہ جو شخص بھی ان سے قرآن پاک پڑھنا چاہے اس کو پڑھا دیں اور اس کی قراءت اور رسم کی مزید وضاحت کر دیں۔ اس طرح مختلف لوگوں کو مختلف علاقوں میں بھیجا جس سے سات مختلف قراءتیں رائج ہوئیں۔ ان قراءتوں پر لوگوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ آج بھی یہ قراءتیں دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔

۱۸۔ آخری چیز رسم عثمانی ہے۔ یعنی وہ اسلوب تحریر جس کے مطابق حضرت عثمان کے حکم سے حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن مجید کو لکھا۔ اس میں کہیں کہیں عربی زبان کے موجودہ رسم الخط اور قرآن مجید کے رسم الخط میں فرق ہے۔ مثلاً کتاب کا لفظ قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر

الف کے بغیر لکھا گیا ہے، صرف ک۔ت۔ب (کتب) لکھا ہے۔ اورت کے اوپر کھڑی زبر ہے' یالیھا کا جہاں لفظ ہے تو ی کے اوپر کھڑی زبر ہے۔ اور لیھا کا الف اس کے ساتھ مل گیا ہے۔ جب ہم عربی میں لکھیں گے۔ تو ی الف اور دوسرا الف ساتھ لکھیں گے، لیکن قرآن مجید میں ایک ہی الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ بعض جگہ ایک حرف قرآن مجید کے رسم الخط میں بڑھا دیا گیا ہے۔ مثلاً جہاں جہاں واو جمع آیا ہے۔ وہاں واو کے بعد الف کا اضافہ ہے، جیسے ملاقوا ربھم۔ یہاں واوٗ کے ساتھ الف بنایا ہے۔ اسی طرح آمنوا کے بعد الف ہے۔ یہ اسلوب حضرت زید بن ثابت نے اختیار کیا اور قرآن مجید کی کتابت میں اس کی پیروی ہو رہی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک حرف کی جگہ انہوں نے دوسرا حرف رکھ دیا ہے۔ صلواۃ، ص۔ل اور و ہے۔ اور ل پر کھڑی زبر ہے۔ زکوۃ بھی اسی طرح ہے۔ بعض جگہ ایک حرف زائد لکھا ہوا ہے۔ مثلا اولئک اس پر پیش کافی ہے۔ لیکن اس میں ہمزہ ہے اور پھر واوٗ ہے اور اس کے بعد ل ہے۔ بعض جگہ دو حرف ہونے چاہیے تھے لیکن وہاں ایک ہی حرف پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

یہ ہے رسم عثمانی جس کے بارے میں مسلمان علماء کا تقریباً ننانوے فی صد اتفاق ہے کہ اس کی پیروی لازمی ہے' اس کی خلاف ورزی جائز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی کتابت ہوئی ہے یا لکھا گیا ہے' اس کی پابندی کو ضروری سمجھا گیا اور اس کی خلاف ورزی کو جائز نہیں سمجھا گیا۔ اگر چہ بہت تھوڑے لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں، کہ رسم عثمانی کی پیروی شرعاً لازمی نہیں، اس کی خلاف ورزی کی جاسکتی ہے۔ اور جہاں ناگزیر ہو رسم عثمانی سے انحراف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس نقطہ نظر کو اکثر و بیشتر اتفاق رائے حاصل نہیں ہوا۔ آج بھی جہاں جہاں قرآن مجید کی طباعت کا سرکاری انتظام ہے، مثال کے طور پر مصر، سعودی عرب اور پاکستان، وہاں آج بھی قانونی طور پر یہ لازم ہے کہ قرآن مجید کو رسم عثمانی کے مطابق لکھا جائے۔ اگر کوئی ایسا نہ کرے تو حکومت قرآن مجید کے ایسے تمام نسخے کو ضبط کرسکتی ہے جو رسم عثمانی کے مطابق نہ ہوں، اور اس طابع کو سزا دے سکتی ہے۔ اور یہ قانون آج سے نہیں بلکہ طویل عرصہ سے چلا آرہا ہے۔ بہتر بھی یہی ہے کہ رسم عثمانی کی پابندی کی جائے تا کہ لوگ اس سے مانوس رہیں اور قرآن مجید کا ہر طالب علم قرآن مجید کو اسی رسم الخط میں پڑھے جس رسم الخط میں صحابہ کرام نے اس کو تحریر کیا اور کرایا تھا۔

خطبہ دہم

نظم قرآن

اور

اسلوب قرآن

۱۷ اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظم قرآن وہ چیز ہے جس نے سب سے پہلے مشرکین عرب اور کفار مکہ کو قرآن مجید کے اعجاز سے روشناس کرایا اور جس کو سب سے پہلے عرب کے بڑے بڑے ادباء، خطباء اور ماہرین لغت نے محسوس کیا، جس نے عربوں کے اعلیٰ ترین ادبی حلقوں سے یہ بات منوائی کہ قرآن مجید کا انداز بیان اور اسلوب ایک منفرد نوعیت کا انداز بیان اور اسلوب ہے۔ یہ وہ اسلوب ہے جس کی مثال نہ عربی شاعری میں ملتی ہے، نہ خطابت میں، نہ کہانت میں اور نہ کسی اور ایسے طرز کلام میں جس سے عرب اسلام سے پہلے مانوس رہے ہوں۔ قرآن مجید میں شعر کی غنائیت اور موسیقیت بھی ہے، خطابت کا زور بیان بھی ہے، جملوں کا اختصار بھی ہے۔ اس میں جامعیت بھی پائی جاتی ہے اور معانی و مطالب کی گہرائی بھی، اس میں حقائق و معارف کی گہرائی بھی ہے اور حکمت و دانائی بھی اس کتاب میں دلائل اور براہین کا تنوع اور استدلال کی جدت اور قوت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ یہ کلام فصاحت اور بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر بھی فائز ہے۔

جب قرآن مجید کے نظم پر بات کی جاتی ہے تو ہمارے سامنے تین بڑے اور نمایاں پہلو آتے ہیں۔ سب سے پہلے خود قرآن مجید کے الفاظ اور کلمات کی بندش، جس کے لیے علماء کرام نے نظم کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ دراصل قرآن مجید کے سیاق و سباق میں نظم کے دو مفہوم ہیں۔ ایک مفہوم تو قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کی باہمی ترتیب اور اندرونی نظام کا ہے، دوسرا مفہوم عبارت اور کلمات کا ہے۔ اس دوسرے مفہوم کے لحاظ سے قرآن مجید میں نظم اس کو کہتے ہیں جس کو ہم عام بول چال میں لفظ یا کلمہ کہتے ہیں۔ چونکہ الفاظ اور کلمات کے لغوی معنی قرآن مجید کے شایان شان نہیں سمجھے گئے اس لیے قرآن مجید کے لیے نظم کی خاص اصطلاح استعمال کی گئی۔ نظم کے معنی ہیں موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دینا۔ گویا قرآن مجید کے الفاظ خوبصورتی میں موتی کی طرح ہیں اور اپنی ترتیب میں بہت سے خوبصورت موتیوں کی طرح ایک لڑی میں پروئے ہوئے

ہیں۔ اگر لڑی سے کسی ایک موتی کو الگ کر دیا جائے تو لڑی کی خوبصورتی متاثر ہوتی ہے، اسی طرح قرآن مجید کے اسلوب کی خوبصورتی متاثر ہو گی، اگر اس کا ایک لفظ بھی آگے پیچھے کر دیا جائے۔ پھر جس طرح ایک لڑی میں پروئے جانے والے موتی اپنی اپنی جگہ خوبصورتی اور نزاکت رکھتے ہیں اس طرح قرآن مجید کے الفاظ بھی اپنی اپنی جگہ خوبصورتی اور نزاکت کے حامل ہیں۔

قرآن مجید کے سیاق وسباق میں ''لفظ'' کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کیا گیا کہ لغوی اعتبار سے اس کا مفہوم پھینکنے اور گرا دینے کا ہے۔ لفظ چوں کہ انسان کے منہ سے گرتا ہے اس لیے اس کو لفظ کہتے ہیں۔ یہ مفہوم ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے شایان شان نہیں تھا۔ کلمہ کی اصطلاح بھی اس لیے استعمال نہیں کی گئی کہ کلم اور کلمہ کے ایک معنی زخمی کر دینے کے بھی ہیں۔ انسان جب زبان سے کوئی سخت بات نکالتا ہے، یا غلط لفظ بولتا ہے تو نامناسب الفاظ سے سننے والے کے احساسات مجروح ہوتے ہیں، اور ایسے مجروح ہوتے ہیں کہ اس کا کوئی تدارک یا مداوا نہیں۔ ایک مرتبہ دل کے آبگینہ پر ضرب لگ جائے تو وہ ضرب مدتوں محسوس ہوا کرتی ہے۔ ایک عربی شاعر نے کہا تھا:

جراحات السنان لها التيام

ولا يلتام ماجرح اللسان

کہ نیزے سے لگایا جانے والا زخم تو مندمل ہو سکتا ہے لیکن زبانوں سے لگایا جانے والا زخم مندمل نہیں ہوتا۔ اس شعر میں کلمہ کے اسی لغوی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ گویا نہ کلمہ قرآن کے شایان شان تھا' نہ لفظ۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے قرآن مجید کے سیاق وسباق میں استعمال کیے جانے کے لائق نہ تھا' اس لیے نظم کا لفظ اختیار کیا گیا۔

لہٰذا آج کی گفتگو کے سیاق وسباق میں نظم کا ایک مفہوم تو ہے قرآن مجید کے الفاظ اور کلمات کی خوبصورتی، حسن ترتیب، اندورنی ساخت، انفرادی بندش اور صوتی جمال، دوسری چیز جو قرآن مجید کے سیاق وسباق میں نظم سے مراد ہوتی ہے وہ قرآن مجید کا اسلوب ہے، جس پر آج گفتگو ہو گی۔ اسلوب سے مراد ہے الفاظ کی آپس کی بندش، کلمات اور آیات کی ترتیب اور اس ترتیب کی حکمت، یعنی اس ترتیب میں کیا چیز ملحوظ رکھی گئی ہے۔

عرب میں کلمات کی ترتیب کا کمال ظاہر کرنے کے تین نمونے رائج تھے۔ خطابت' شاعری اور کہانت۔ قرآن مجید کے الفاظ کی ترتیب اور عبارت کی بندش ان تینوں سے مختلف ہے۔

اس کا اسلوب ان تینوں سے مختلف ہے۔ قرآن مجید کے سیاق وسباق میں لغت اور صرف ونحو کے اعتبار سے کیا چیز پیش نظر رہنی چاہیے، یہ دوسرا مضمون ہے۔ اور تیسرا مضمون وہ ہے جس کو نظام یا مناسبت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ متقدمین نے تناسب آیات اور تناسب سور کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی آیات اور سورتوں کی آپس کی مناسبت۔ بعض حضرات نے نظام کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

نظم کی اصطلاح الفاظ وکلمات کی ترتیب کے لیے، تناسب کی اصطلاح آیات کی باہمی ترتیب کے لیے، جبکہ نظام کی اصطلاح سورتوں کی باہمی ترتیب کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔

یہ تینوں الگ الگ موضوعات ہیں جن پر متقدمین کے زمانہ سے لے کر آج تک لوگ لکھتے چلے آرہے ہیں۔ سب سے پہلے اس پر کس نے کام کیا؟ یہ کہنا بڑا دشوار ہے۔ لیکن جن جن حضرات نے بھی قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت اور قرآن مجید کی عبارت کے اعجاز کو اپنا موضوع بنایا ہے انہوں نے اس موضوع پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ غالباً تاریخ اسلام کی گذشتہ بارہ، تیرہ صدیوں میں سے کوئی صدی ایسی نہیں گزری جس میں ایک سے زائد مفسرین نے قرآن مجید کے اندرونی نظام اور سورتوں کی ترتیب اور تناسب کو اپنی تحقیق کا موضوع نہ بنایا ہو۔

لیکن یہ انتہائی اہم اور دلچسپ بات ہے، جس سے قرآن مجید کے اعجاز کا ایک اور پہلو ہمارے سامنے آتا ہے کہ ایسے حضرات جنہوں نے تناسب اور نظام کا ایک نیا اسلوب اور تصور دیا اور اس ضمن میں نئے نئے حقائق کا پتا چلایا، جنہوں نے نظم اور تناسب کا نیا نظام دریافت کیا، اور ایک مستقل بالذات تصور لوگوں کو دیا ان کی تعداد بھی درجنوں میں ہے۔ کم وبیش بیس پچیس ایسے اہل علم کی تحقیقات آج دستیاب ہیں جنہوں نے قرآن مجید کی آیات کی آپس میں مناسبت، پھر سورتوں کے تناسب اور گویا اندرونی نظام کے بارے میں ایک نیا تصور پیش کیا اور اس تصور کی بنیاد پر انہوں نے پورے قرآن مجید کے نظام کو منطبق کر کے دکھایا۔ خود ہمارے برصغیر میں متعدد حضرات نے قرآن مجید کے اس اہم پہلو کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی نے الفوز الکبیر میں قرآنی نظم پر ایک اصولی اور عمومی گفتگو فرمائی ہے۔

نظام کے بارے میں اس گفتگو سے دو غلط فہمیوں کی تردید مقصود ہے۔ ایک غلط فہمی تو

قرآن مجید کے قاری کو شروع میں ہی پیش آتی ہے۔ جب کوئی قاری پہلی مرتبہ قرآن مجید کھولتا ہے اور اس کتاب کو پڑھنا چاہتا ہے تو بظاہر اس کو یہ لگتا ہے کہ یہ تو ایک غیر مرتب سی چیز ہے، اس لیے کہ کسی جگہ سے بھی اس کتاب کو کھولیں اسی جگہ اس کتاب میں بہت سارے مضامین ایک طرح کے نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید کے کسی صفحہ کو کھول کر دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ وہاں توحید کا مضمون بھی ہے، آخرت کا مفہوم بھی ہے، کسی نبی کا حوالہ بھی ہے، کسی سابقہ قوم کا تذکرہ بھی ہے، کہیں اخلاقی ہدایات بھی ہیں، فقہی احکام بھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے جتنے مضامین ہیں وہ سارے کے سارے قرآن مجید کے ہر ایک صفحہ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ موجود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہے بھی ایسا ہی۔ قرآن مجید کے بنیادی مضامین تقریباً ہر سورت میں اور ہر جگہ بالواسطہ یا بلاواسطہ موجود ہیں۔ ان کو دیکھ کر اکثر نوآموز قارئین کو یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید قرآن مجید میں کوئی خاص ترتیب یا نظام نہیں ہے۔ نظام قرآنی کی اس تحقیق سے ایک تو اس غلط فہمی کی تردید ہو جاتی ہے۔

دوسری غلطی جو اس نظام یا مناسبت یا ترتیب کو نہ سمجھنے سے واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ خیال دل میں بیٹھ جائے کہ قرآن مجید میں کوئی ترتیب یا تناسب نہیں ہے، یا آیات یا سورتوں میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی تو پھر قرآن مجید کا قاری اس کی ہر آیت کو ایک منفرد یا مستقل بالذات مضمون سمجھ کر اس کی تعبیر و تفسیر کرتا ہے۔ اور اس صورت میں بعض اوقات اس کا رابطہ سیاق وسباق سے کٹ جاتا ہے۔ پھر اس رابطہ کے کٹ جانے کی وجہ سے وہ بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود بھی ہیں کہ سیاق وسباق اور موضوع کی مناسبت کا خیال رکھے بغیر کسی آیت کی تفسیر کی گئی اور تفسیر کرنے والا راہ راست سے ہٹ گیا۔ اس لیے ان دونوں غلط فہمیوں کو دور کرنے کی خاطر اور ان دونوں غلطیوں سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی اندرونی ترتیب، نظام اور تناسب آیات وسور کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ قرآن مجید میں یہ چیزیں کس ترتیب سے آئی ہیں۔

اب چونکہ ہمارے سامنے بہت سے نظام ہیں اور بالفاظ دیگر تناسب آیات وسور یا نظام کی متعدد دریافت شدہ تحقیقیں ہیں، اس لیے ان میں سے کوئی بھی ترتیب یا تحقیق سامنے رکھی جائے تو قرآن مجید کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن نظام و تناسب پر گفتگو کا آغاز کرنے سے قبل

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن مجید میں یہ سب مضامین یکجا اور بار بار کیوں بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۃ فاتحہ کو بطور مثال لے لیں۔ اس کا آغاز توحید کے تذکرہ سے ہوتا ہے۔ پھر فوراً ہی بعد آخرت کا ذکر آ جاتا ہے۔ آخرت کے بعد بعد عبادت کا ذکر ہے۔ پھر صراط مستقیم کا ذکر ہے' جو شریعت سے عبارت ہے۔ پھر ان لوگوں کا تذکرہ آ گیا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء کا، صدیقین، کا شہداء کا اور صالحین کا۔ پھر ان لوگوں کے راستے سے بچنے کی دعا بھی کی گئی جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور جو راہ راست سے بھٹک گئے۔ اس طرح نافرمان بندے بھی آ گئے۔ اور جو لوگ گمراہ تھے ان کا بھی ذکر آ گیا، یعنی دونوں قسم کے نافرمان شامل ہو گئے۔

گویا قرآن مجید کے سارے مضامین بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن مجید کی اس سورہ فاتحہ میں موجود ہیں۔ یہی بات آپ قرآن مجید کے ہر صفحہ پر محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس پر غور کیا جائے تو دو مصلحتیں فوری طور پر سامنے آتی ہیں۔ گویا بنیادی طور پر اس میں دو حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی مصلحت یا حکمت تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید چونکہ کتاب ہدایت ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو میں ہدایت فراہم کرتی ہے اس لیے قرآن مجید نے ان سارے پہلوؤں کو بیک وقت پیش نظر رکھا ہے، جہاں جہاں انسان کو ہدایت کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور پڑتی ہے۔ قرآن مجید نے ان سب مضامین پر بیک وقت توجہ دی ہے۔ اگر کسی ایک پہلو یا مضمون پر زور دیا جائے، چاہے وہ کسی خاص سلسلہ گفتگو میں ہی ہو، تو بقیہ پہلو وقتی طور پر نظر انداز ہو جاتے ہیں یا کم از کم، دب ضرور جاتے ہیں اور انسان اس وقت جس مضمون کا مطالعہ کر رہا ہو وہ براہ راست اس مضمون کے نقطہ نظر سے ان واقعات کو دیکھنے لگتا ہے، اور باقی باتیں وقتی طور پر ہی سہی، اس کی نظر سے اوجھل ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

اس کی چھوٹی سی مثال دیکھنی ہو تو دوسرے علوم و فنون کو دیکھیے۔ ہماری جتنی سوشل سائنسز یا ہومنیٹیز ہیں وہ سب کے سب انسان کے انفرادی اور اجتماعی رویوں کو سمجھنے کے لیے ہیں۔ انسانی علوم یا Humanities انفرادی رویوں کو سمجھنے کے لیے اور معاشرتی علوم(سوشل سائنسز) اجتماعی رویے کو سمجھنے کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ دونوں کا مقصد انسان کو مکمل طور پر سمجھنا ہے۔ سوشل سائنسز میں اگر کوئی معاشیات کا طالب علم ہو اور معاشیات ہی پڑھتا ہو تو اس کے رویہ میں ایک خاص انداز یا زاویہ نظر پیدا ہو جاتا ہے، جس کے بارہ میں انگریزی میں

کہہ سکتے ہیں کہ ایک پائپ لائن اپروچ پیدا ہو جاتی ہے۔ جب آپ پائپ لائن سے کسی منظر کو دیکھنا چاہیں گے تو آپ کو صرف چند انچ ہی کا محدود منظر نظر آئے گا اور اس چند انچ کے منظر کے علاوہ کائنات کی ساری وسعت نظروں سے اوجھل رہے گی۔ اس لیے کہ اس طرح آپ کی نظر ایک خاص نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بقیہ علوم کا معاملہ ہے۔ اگر آپ کسی ماہر معاشیات سے پوچھیں کہ اس وقت امت مسلمہ کا سب سے بڑا مسئلہ کونسا ہے تو وہ کہے گا کہ دنیائے اسلام میں جی ڈی پی بہت کم ہے، ترقی کی شرح رکی ہوئی ہے۔ اور سالانہ شرح ترقی (گروتھ ریٹ) کم ہے۔ اگر کسی فلسفی سے پوچھیں کہ امت کا سب سے بڑا مسئلہ کون سا ہے، تو وہ کہے گا کہ مثلاً مسلمانوں کے نظریہ علم میں بڑی خرابی ہے۔ اسی طرح تاریخ کا طالب علم کوئی اور جواب دے گا۔ یہ مثالیں اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ اگر انسانی زندگی کو مختلف شعبوں میں بانٹ دیا جائے تو انسانی زندگی کی کلیت یعنی **totality** نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور انسان اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ رویہ نہ صرف انسان کی بنیادی ضرورت کے خلاف ہے بلکہ اس کے مزاج سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔

اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لیے بائبل کی مثال لیجیے۔ بائبل کی کتابوں کی ترتیب بڑی عجیب وغریب ہے۔ قرآن مجید کے برعکس بائبل کی کتابوں میں اجزاء کو موضوعات کے حساب سے مرتب کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے کتاب پیدائش ہے جس میں بتایا گیا کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی، کن کن مراحل میں پیدا ہوئی، پہلے کیا پیدا ہوا، پھر کیا پیدا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ابتدائی انسانی نسلوں کی پیدائش ہی کی کوئی داستان یا چارٹ ہے۔ اس کے بعد ایک اور حصہ آتا ہے۔ جس کا عنوان اعداد یا گنتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید کوئی مردم شماری کی رپورٹ ہے' یہ حصہ بجائے کسی آسمانی کتاب کے اعداد وشمار کی ایک رپورٹ معلوم ہوتی ہے۔ بائبل کے جس قاری کو ان اعداد وشمار سے دلچسپی نہیں ہے وہ اس حصہ کو نہیں پڑھے گا، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا' جیسا کہ تورات کے بارے میں نکلا' کہ لاکھوں نہیں کروڑوں یہودی اور عیسائی ایسے ملیں گے جنہوں نے کبھی پوری تورات کھول کر نہیں پڑھی۔ اس لیے کہ انہوں نے تورات کے ان حصوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی جو ان کے لیے غیر دلچسپ تھے۔ انہوں نے تورات کا صرف وہی حصہ دیکھا جس کی ان کو ضرورت تھی یا جس سے کسی نہ کسی وجہ سے انہیں واسطہ تھا۔ اس مخصوص حصہ کے علاوہ انہیں کوئی بحث نہیں تھی کہ

تورات میں کیا لکھا ہے اور کیا نہیں لکھا۔

اگر قرآن مجید بھی اسی ترتیب سے ہوتا کہ اس میں مختلف مسائل اور احکام الگ الگ بیان ہوئے ہوتے۔ مثلاً ایک سورہ قانون ہوتی، ایک سورہ عقائد ہوتی، ایک سورہ اخلاق ہوتی۔ تو قرآن پاک سے مسلمانوں کی دلچسپی کا بھی شاید وہی حشر ہوتا جو تورات سے یہودیوں کی دلچسپی کا ہوا۔ مثلاً اگر کسی فلسفیانہ مزاج یا فکر مجرد سے دلچسپی رکھنے والے شخص کو عقائد سے دلچسپی ہوتی وہ سورہ عقائد یاد کر لیتا اور باقی سورتوں کو چھوڑ دیتا۔ جس کی دلچسپی سورۃ قانون سے نہ ہوتی وہ اس کو نہ پڑھتا۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے، بلکہ امر واقعہ ہے، جس کی مثالیں ہم میں سے ہر ایک آئے دن مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ ایک شخص لائبریری میں جاتا ہے تو اپنے مضمون کی کتاب اٹھا کر پڑھ لیتا ہے۔ باقی کتابوں سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اگر آپ کا مضمون کمپیوٹر نہیں ہے تو اگر آپ بیس سال بھی لائبریری میں جاتے رہیں اور وہاں بیس سال بھی کمپیوٹر کے بارہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ فاضلانہ کتابیں رکھی رہیں تو آپ کے لیے بے کار ہیں۔ قرآن مجید نے اس طرح کی موضوعاتی تقسیم کر کے علم کو compartmentalize نہیں ہونے دیا، اجزاء میں تقسیم نہیں ہونے دیا۔ بلکہ علم کو ایک وحدت کے طور پر برقرار رکھا، اور اس وحدت کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں رچا بسا دیا۔ اس لیے قرآن مجید کے جتنے بنیادی مضامین ہیں وہ بیک وقت ہر قاری کی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں۔ اور انسان قرآن مجید کی تلاوت کے وقت ایک لمحہ کے لیے بھی ان سے غافل نہیں ہوتا۔

اس اسلوب کے دو فائدے خاص طور پر پیش نظر رہنے چاہئیں۔ ایک فائدہ تو یہ کہ قرآن مجید کے قاری کے سامنے اس کتاب کے تمام بنیادی مضامین کا مرقع ہر وقت موجود رہتا ہے اور کوئی پہلو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے معانی اور مطالب کے اس طرح حصے بخرے نہیں ہو سکے جس طرح باقی کتابوں کے ہو گئے۔ ہندوؤں میں سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں مذہبی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ ہر فرقے کی اپنی الگ کتاب ہے۔ اب یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اصلاً یہ ایک کتاب تھی یا الگ الگ کتابیں تھیں۔ قرآن مجید کو اس انجام سے محفوظ رکھنے کی خاطر جو اسلوب اختیار فرمایا گیا وہ یہ تھا کہ سارے مضامین ساری کتاب میں رچے بسے رہیں۔

اب اس اسلوب کی وجہ سے ایک سطحی قاری کو یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید میں کوئی نظام نہیں ہے اور اس کی آیات اور سورتوں میں کوئی ترتیب یا مناسبت نہیں ہے۔ حالانکہ اس میں اتنی غیر معمولی ترتیب اور ایسی عجیب وغریب مناسبت پائی جاتی ہے کہ درجنوں مفسرین نے اور بڑے بڑے دماغوں نے یعنی امام رازیؒ اور زمخشریؒ جیسے دماغوں نے اس پہلو پر سال ہا سال غور کیا اور ہر ایک نے ایک نیا نظام دریافت کیا۔ آپ اس سسٹم کی گہرائی اور معنویت میں غور کریں ۔جس کو درجنوں لوگوں نے سالہا سال کے غور وفکر کے بعد دریافت کیا ہے اور نہیں معلوم کہ آئندہ کتنے نظام اور دریافت ہوں گے۔ ایک نظام مولانا اصلاحیؒ کی تفسیر تدبر قرآن میں ملتا ہے۔ اس نظام پر کم وبیش سو برس غور ہوا ہے اور سو سال کے غور وخوض کی بنیاد پر نظم قرآن اور تناسب کے جو اصول منقح ہوئے ان کی روشنی میں انہوں نے اپنی یہ تفسیر مرتب کی ہے۔ اس پوری تفسیر میں انہوں نے اس نظام کو اس طرح سے واضح کر کے سامنے رکھ دیا ہے کہ ہر پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک بالکل بدیہی چیز ہے۔

امام رازیؒ نے سورتوں کی جو مناسبت بیان کی ہے اسے پڑھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تناسب کی حکمتوں کا اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا۔ ایک نظام مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاں ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں مختلف سورتوں کی ترتیب میں پنہاں حکمتوں کی طرف اشارے کیے ہیں اور سورتوں کے مابین مناسبت کو واضح کیا ہے۔ ماضی قریب کے مفسرین میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا محمد شفیع نے بھی سورتوں کے مابین مناسبتوں کی نشاندہی کی ہے۔

پنجاب کے مشہور شہر میانوالی کے قریب ایک گاؤں واں بچھراں کے ایک بزرگ مولانا حسین علی نے پوری زندگی قرآن مجید پر غور کیا۔ پھر اس طویل غور وخوض کے بعد انہوں نے ایک نیا سسٹم دریافت کیا جو سابقہ دریافت شدہ نظاموں سے بالکل الگ اور منفرد ہے۔ ان کے اس اسلوب کے مطابق ان کے شاگرد رشید مولانا غلام اللہ خان نے تفسیر جواہر القرآن مرتب کی جس میں اس پہلو پر بہت زور دیا گیا۔ ان تمام اہل علم کے مطالعہ کا نچوڑ یہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ یا ایک ایک کلمہ آپس میں اس طرح مربوط ہے۔ جیسے کسی زیور میں موتی جڑے ہوتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک موتی کو بھی آگے پیچھے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک موتی بھی ادھر سے ادھر کر دیا

جائے تو زیور کے حسن میں فرق پڑ جاتا ہے۔

اسی طرح ہمارے صوبہ سرحد میں صوابی کے ایک بزرگ نے قرآن مجید کے نظم کا ایک اور انداز دریافت کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر سورت کا ایک دعویٰ ہوتا ہے پھر بقیہ سورت اس دعوے کے شواہد اور دلائل پر مشتمل ہوتی ہے۔ دلائل پر جو اعتراضات ہیں وہ بھی سورت میں شامل ہیں۔ پھر اعتراض کا جواب، پھر اس اعتراض پر اگر کوئی شبہ ہے تو اس شبہ کا ذکر اور شبہ کا جواب۔ غرض پوری سورت ایک دعوے اور سلسلہ دلائل سے عبارت ہے اور انہوں نے ہر سورت پر اس تحقیق کو منطبق کر کے دکھایا ہے۔ یہ بھی ایک غیر معمولی چیز ہے۔

اوپر دو اصطلاحات کا تذکرہ ہوا ہے۔ ایک مناسبت کا، اور دوسرے نظام کا۔ مناسبت کی اصطلاح متقدمین نے اختیار کی ہے۔ نظام کی اصطلاح بعض متاخرین نے اختیار کی ہے۔ خاص طور پر مولانا حمید الدین فراہی نے نہ صرف نظام کی اصطلاح اپنائی ہے، بلکہ اس موضوع پر طویل عرصہ غور و فکر اور مطالعہ کے بعد انہوں نے اپنے تصور نظام کو حتمی شکل دی۔ ان کی ایک کتاب ہے۔ دلائل النظام اس میں انہوں نے اپنے دریافت شدہ نظام کی تفصیلات مثالیں دے کر بیان کی ہیں۔ ان دونوں اصطلاحات میں تھوڑا سا فرق ہے۔ مناسبت تو پورے نظام کا ایک حصہ ہے۔ اور پورے system کو آپ نظام کہہ سکتی ہیں۔ گویا قرآن مجید کے کلمات کی، پھر آیات کی، پھر سورتوں کی ترتیب میں جو حکمت ہے یا جو system کارفرما ہے اس کا مجموعی نام تو نظام ہے اور اس کے اندر جو جزوی تفصیلات ہیں وہ مناسبت کہلاتی ہیں۔ ان دونوں میں یہ لطیف فرق ہے۔ گویا نظام ایک عام اصطلاح ہے، اور مناسبت اس کے ایک حصہ کا نام ہے۔

نظام اور مناسبت کے دونوں تصورات کو سمجھنا بڑا آسان ہو جائے گا اگر آپ یہ ذہن میں رکھیں (صرف سمجھنے کے لیے) کہ جیسے اردو میں ایک نظم ہے، ایک غزل مسلسل ہے۔ دونوں میں مناسبت اشعار کا ایک الگ الگ انداز پایا جاتا ہے۔ غزل میں عام طور پر یہ لگتا ہے کہ کوئی مسلسل مضمون نہیں ہے، بلکہ ہر شعر ایک الگ مضمون ہے۔ بعض جگہ اردو فارسی میں غزل مسلسل کا بھی رواج ہے۔ غزل مسلسل میں بھی بظاہر تو الگ الگ شعر معلوم ہوتے ہیں، لیکن ذرا غور کریں تو سارے اشعار میں ایک گہری معنوی مناسبت پائی جاتی ہے۔ مضامین کی ایک اہم آہنگی ہے۔ جو بات عمومی ہے وہ پہلے شعر میں ہے، پھر دوسرے شعر میں اگلی بات ہے۔ پھر تیسری بات تیسرے

شعر میں ہے۔اور پھر آگے آگے یہ مضمون درجہ بدرجہ چلتا جاتا ہے۔ایک شعر کے دو مصرعوں میں بھی یہی معنوی ترتیب ہوتی ہے۔ جو بات پہلے مصرعہ میں ہونی چاہیے وہ پہلے مصرعہ میں ہوتی ہے اور جو بعد میں ہونی چاہیے وہ بعد میں دوسرے مصرعہ میں ہوتی ہے۔قرآن مجید کا اسلوب (بلا کسی تشبیہ کے عرض ہے) تقریباً غزل مسلسل کا سا ہے' پہلی نظر میں دیکھنے والے کو وہ مضامین الگ الگ معلوم ہوتے ہیں۔لیکن تھوڑا تھوڑا آگے بڑھتے جائیں اور غور کرتے جائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ مضامین جو بظاہر الگ الگ معلوم ہو رہے تھے ان میں بڑی گہری ترتیب اور مناسبت پائی جاتی ہے۔وہ مناسبت اس طرح کی ہے کہ غور کرنے سے جب سمجھ میں آجائے تو روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید کا انداز یہ ہے کہ جب وہ کسی مضمون کو بیان کرتا ہے اور خاص طور پر کسی قدیم واقعہ یا قصہ کو بیان کرتا ہے، کسی شخص یا قوم پر اللہ تعالیٰ کے انعام یا عذاب کا ذکر کرتا ہے تو وہاں قرآن مجید کا اسلوب ایک مورخ کا سا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا انداز اور اسلوب پند و نصیحت کا ہوتا ہے اور ہر واقعہ سے عبرت دلانا مقصود ہوتا ہے۔اس خاص واقعہ میں جو سبق چھپا ہوا ہوتا ہے اس کو نمایاں کرنا ہی اصل مقصد ہوتا ہے۔بعض اوقات قرآن مجید پورے واقعہ کا بھی ذکر نہیں کرتا، بلکہ صرف و اذ کر (ذرا یاد کرو) کہہ کر واقعہ کا ایک جز یاد دلایا جاتا ہے۔اور پھر صرف اتنا ہی حصہ وہاں بیان کیا جاتا ہے جس کے تذکرہ کی اس وقت ضرورت ہوتی ہے۔

اس کی مثال بھی بغیر تشبیہ کے یہ سمجھیں جیسے فلم بنانے والا جب کوئی فلم بناتا ہے تو وہ پچاس سال کے واقعات کو چند منٹ بلکہ بعض اوقات چند سیکنڈ سمو دیتا ہے۔اس کام کے لیے بعض اوقات وہ ایک چھوٹا سا شارٹ لیتا ہے جو صرف آدھے سیکنڈ کا ہوتا ہے۔لیکن اس شارٹ سے پورے دس سال کا دورانیہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شارٹ میں شیر خوار بچہ دکھایا، دوسرے میں اسے کم سن بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دکھایا، پھر تیسرے میں زیادہ بڑا کر کے کرکٹ کھیلتا ہوا دکھایا۔یوں گویا چند سیکنڈ میں پیدائش سے لے کر کرکٹ کھیلنے تک کا زمانہ دکھا دیا۔اس کے بعد وہ بچہ ایک نوجوان کی حیثیت میں ہوائی جہاز میں سوار ہوتا دکھایا جا رہا ہے، ہاتھ میں بریف کیس ہے اور سر پر ہیٹ پہنا ہوا ہے، گویا اب وہ بچہ بڑا ہو کر یہاں کی تعلیم مکمل کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک چلا گیا۔اس طرح ایک منٹ میں یہ سارے مناظر دیکھنے والے کے سامنے آگئے اور اس نے

دیکھ کر سب سمجھ لیا۔

قرآن مجید میں قیامت کے مشاہد و مناظر کا تذکرہ اسی انداز میں ہے۔ جس نے ان مشاہد کی تفصیل قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں وقتاً فوقتاً پڑھی ہو اور وہ اس کے سامنے ہو، تو صرف ایک جملہ سے وہ سارا منظر نامہ اس کے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ایک جملہ آئے گا۔ وقفوھم انھم مسئولون، انہیں ذرا روکو، ان سے باز پرس کی جائے گی، یعنی جب لوگ زندہ کرکے اٹھائے جائیں گے اور اللہ کے حضور پیش ہونے کے لیے جا رہے ہوں گے تو ایک مرحلہ پر حکم دیا جائے گا کہ ان سب کو کھڑا کردو۔ اب حساب کا عمل شروع ہونے والا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے یہاں اس سے زیادہ کچھ تفصیل نہیں ہے، لیکن اس ذرا سے جملہ سے قیامت کے حساب کتاب کا پورا تصور سامنے آجاتا ہے۔ جس کے ذہن میں یہ اسلوب واضح نہ ہو وہ قرآن مجید میں وہ انداز اور اسلوب یا عبارت تلاش کرے گا جو کسی انسان کے مضمون میں یا کسی مصنف کی تحریر میں ہوتی ہے، جہاں پہلے فصل ہوگی، پھر باب ہوگا، پھر عنوان ہوگا۔ قرآن پاک کا انداز ان سب چیزوں سے ماورا ہے۔

تیسری اہم چیز، جو اکثر و بیشتر قرآن مجید کے قاری کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے، یہ ہے کہ قرآن مجید کا انداز اور اسلوب خطیبانہ ہے۔ یہ خطیبانہ اسلوب قدیم عربی خطابت کی طرح نہیں ہے، بلکہ قرآن کی یہ خطابت اس سے بالکل الگ ایک نئے انداز کی خطابت ہے۔ اسلوب سے مراد محض الفاظ اور کلمات کا انتخاب نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد قرآن مجید کا خطاب، طرز بیان، اور طرز استدلال ہے، اس سے مراد قرآن مجید کا انداز خطاب ہے، اس سے مراد قرآن مجید کے discourse کا انداز ہے۔ قرآن مجید کا یہ discourse تقریری ہے، تحریری نہیں ہے ۔ تورات میں بعض جگہ تحریری کتاب کا سا انداز ہے، بعض جگہ قانون کی دفعات کا انداز ہے۔ لیکن قرآن مجید کا انداز ان سب سے مختلف ہے' قرآن پاک کا انداز خطیبانہ اور مقررانہ ہے۔ جب خطیب بول رہا ہوتا ہے تو سننے والے کو پتہ چل جاتا ہے کہ گفتگو کے کس مرحلہ میں مقرر کا رخ کس طرف ہے، اور کس وقت خطیب کا مخاطب کون ہے۔ خطیب کے انداز اور لب و لہجہ سے سامعین و حاضرین کو پتہ چل جاتا ہے کہ کب مقرر کا خطاب براہ راست ان لوگوں سے ہے جو یہاں موجود ہیں اور آیات قرآنی سن رہے ہیں اور کب اس کا مخاطب کوئی اور ہے۔ مقرر جب

گفتگو کرتا ہے تو دوران خطاب میں اس کے مخاطبین مختلف لوگ ہوتے ہیں۔ جب اس کا مخاطب بدلتا ہے تو وہ لہجہ بدل کر بات کرتا ہے۔ اس سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ اس حصہ کے مخاطبین کون ہیں۔ کبھی رخ بدل کر، کبھی کسی کی طرف اشارہ کر کے کوئی خاص بات کہتا ہے تو سننے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب مخاطبین بدل گئے۔ مثلاً میں یہاں حالات حاضرہ پر تقریر کرتے ہوئے آپ سے کہوں کہ آج دنیائے اسلام پر بہت برا وقت آیا ہے، مسلمان بہت پریشان ہیں اور اسی اثناء میں دوران گفتگو ذرا لہجہ بدل کر اور ذرا رخ دوسری طرف کر کے میں کہتا ہوں: ''سن لو ہم تیار ہیں اور ہر جارحیت سے نمٹنے کے لیے آمادہ ہیں''۔ اب ہم سب کو معلوم ہے کہ ''یہ سن لو'' کس سے خطاب ہے اس جملہ کے مخاطب آپ لوگ نہیں ہوں گے بلکہ کوئی اور ہوگا۔ خطاب کے انداز میں اس گفتگو کو کوئی شخص سنے گا تو ہر سننے والے کو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں مخاطب بدل گیا۔ لیکن جب یہی چیز عبارت میں لکھی جائے گی تو درمیان میں یہ جملہ سمجھ میں نہیں آئے گا کہ یہ ''سن لو'' کس کو کہا جا رہا ہے۔ یہ جملہ تو درست نہیں بیٹھتا۔ اس میں تو ربط نہیں ہے یہ ربط سمجھ میں آجائے گا اگر یہ معلوم ہو کہ یہ کسی اور سے خطاب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن مجید لوگوں تک پہنچا رہے تھے تو زبانی تلاوت فر[illegible] پہنچا رہے تھے، کوئی تحریر لکھ کر نہیں دے رہے تھے۔ اگرچہ بعد میں یاد رکھنے کے لیے اور محفوظ کرنے [illegible] لیے لکھوا بھی دیا، لیکن پہنچایا زبانی۔ اب جب اس خطاب کو ہم تحریری شکل میں لائیں گے تو اگر اس کو کتابی تحریر سمجھ کر، کوئی خط سمجھ کر، یا کسی کتاب کا مضمون سمجھ کر ہم اس کے نظم کو دیکھیں گے تو یہ سب سوالات پیدا ہوں گے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے طور پر اس قرآن مجید کو اپنے مخاطبین کے سامنے پیش فرمایا تھا، تو پھر یہ سوالات نہیں پیدا ہوں گے۔

بارہا ایسا کہ ہوا کہ آپؐ تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور نزول وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپؐ نے بجائے اپنی تقریر کے قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ اس کی ایک مثال سورۃ نجم ہے۔ ایک مرتبہ آپ حرم میں تشریف لے گئے۔ کفار مکہ جمع تھے اور آپؐ کے ساتھ استہزاء کر رہے تھے۔ آپؐ ان کو مخاطب فرمانے اور سرزنش کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپؐ نے خطاب کا ارادہ فرمایا ہی تھا کہ سورہ نجم نازل ہونی شروع ہو گئی اور آپؐ نے بجائے خود کوئی تقریر فرمانے کے

سورہ نجم کی تلاوت فرمائی۔

چوتھی چیز جو بڑی اہم ہے اور خاص طور پر مکی سورتوں میں پائی جاتی ہے، وہ قرآن مجید کا غیر معمولی ایجاز ہے۔ اگرچہ مدنی سورتوں میں بھی ایجاز کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں، لیکن مکی سورتوں کے ایجاز کی شان ہی اور ہے۔ اور بعض جگہ ایجاز اتنا ہے کہ ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف میں معانی کا سمندر پنہاں ہے۔ قرآن پاک کی مکی سورتوں کے ایجاز کو ٹیلی گراف یا تار برقی کی زبان سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ ٹیلی گرافک زبان میں الفاظ بہت مختصر ہوتے ہیں، لیکن معانی وسیع ہوتے ہیں۔ بظاہر بہت ہی مختصر الفاظ میں ایک وسیع پیغام منتقل ہو جاتا ہے۔ مخاطب اور پڑھنے والا اس پیغام کے مفہوم، حقیقت اور پس منظر کو پورے طور پر سمجھ جاتا ہے کہ ان الفاظ سے کیا مراد ہے۔ اور ان میں کیا کہا گیا ہے؟

یہ تشبیہ ٹیلی گراف کی میں نے جان بوجھ کر اختیار کی ہے۔ اس لیے کہ جب آپ کسی کو یہ ٹیلی گرام دیں کہ **send money** یعنی رقم بھیج دو، تو بظاہر تو یہ صرف دو لفظ ہیں۔ لیکن ان دو لفظوں کا ایک تفصیلی پس منظر ہے۔ یہ بات صرف ٹیلی گرام کے مخاطب کو معلوم ہے کہ یہ پس منظر کیا ہے۔ اسی کو معلوم ہے کہ کیوں، اور کس مقصد کے لیے، اور کس کو، اور کہاں، کب، اور کتنی رقم بھیج دی جائے۔ یہ سب اس سیاق وسباق کی وجہ سے مخاطب کو پہلے سے معلوم ہے۔ اب صرف مختصر پیغام دیا گیا کہ رقم بھیج دو۔ لیکن اگر وہ ٹیلی گرام لا کر مجھے یا کسی اور غیر مخاطب کو دے دیا جائے اور اصل مخاطب کو نظر انداز کر دیا جائے اور مجھ سے پوچھا جائے کہ اس پیغام سے کیا مراد ہے؟ تو میں لغت میں دیکھ کر تار کی عبارت کا لغوی مطلب تو ضرور بتا دوں گا، لیکن اس کی بقیہ تفصیلات میرے علم میں نہیں ہوں گی۔ وہ اصل مخاطب ہی کو معلوم ہوں گی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سنت رسول میں بیان کردہ تعبیر وتشریح سے الگ کر کے قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو وہ ایسا ہی ہوگا کہ جیسے میں اس ٹیلی گرام کے تفصیلی اور حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کروں جو آپ کو بھیجا گیا ہے۔

مکی سورتوں کے ایجاز کی ایک مثال لیجیے: قرآن مجید کہتا ہے کہ، یا ایھا المدثر۔ قم فانذر۔ وربك فكبر۔ وثیابك فطھر۔ والرجز فاھجر۔ ولا تمنن تستكثر۔ ولربك فاصبر۔ یہاں ہر جملہ ایک ایک لفظ پر مشتمل ہے، بالکل ٹیلی گرافک انداز کی زبان ہے۔ لیکن ان

جملوں کے اولین مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور آپؐ ہی کو معلوم ہے کہ یہاں کس لفظ سے کیا مراد ہے۔ حضورؐ نے ان میں سے ہر جملہ کی تفسیر فرمائی اور صحابہ کرام نے اس تفسیر کو سمجھا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اب اگر کوئی شخص آج اٹھ کر یہ کہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے سنت اور حدیث کی ضرورت نہیں ہے اور محض لغت کی مدد سے قرآن مجید کے معانی متعین کیے جا سکتے ہیں، یا وہ اپنے آپ کو صحابہ کرام کی سند سے آمدہ تعبیر اور تشریح سے مستغنی سمجھے، تو وہ شخص قرآن مجید کو اتنا ہی سمجھ سکے گا جتنا وہ شخص اس ٹیلی گرام کو سمجھتا ہے جو اس کا مخاطب نہیں ہوتا۔

لہٰذا یہ پانچ چیزیں قرآن مجید کے نظم اور اسلوب پر گفتگو کرنے سے پہلے ذہن میں رکھنے کی ہیں یعنی:۔

۱۔ قرآن مجید میں اس کے بنیادی مضامین یکجا کیوں ہیں؟

۲۔ قرآن مجید کے مضامین غزل مسلسل کے انداز میں ہیں۔

۳۔ قرآن مجید نے جگہ جگہ جو مختصر منظر کشی ہے وہاں قرآن مجید اس منظر کو یاد دلانا چاہتا ہے۔ اس کی واقعاتی تفصیلات بیان کرنا مقصد نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ قرآن مجید انسانوں کی ہدایت اور عبرت کے لیے اتارا گیا ہے، اور اس کام کے لیے جزوی اور واقعاتی تفصیلات غیر ضروری ہیں۔

۴۔ قرآن مجید کا انداز خطیبانہ ہے، تالیفانہ نہیں۔ تقریری ہے، تحریری نہیں۔

۵۔ قرآن مجید کا اسلوب انتہائی ایجاز اور جامعیت کا ہے، اس کا انداز بلاتشبیہ ٹیلی گرافک زبان کا سا ہے۔

خطابت اور تقریر کے بھی عربی زبان میں قدیم دور میں دو انداز ملتے ہیں۔ ایک انداز تو وہ تھا جو اسلام کے آغاز میں رائج تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی دعوت کو پیش فرمایا۔ اس وقت خطابت کا ایک خاص اسٹائل تھا۔ اس انداز کی مثالیں ادب جاہلیہ کے قدیم مجموعوں میں ملتی ہیں۔ عربی ادب کے قدیم مجموعوں مثلاً جاحظ کی البیان والتبیین، ابن قتیبہ کی عیون الاخبار، مبرد کی الکامل وغیرہ میں ایسے بہت سے نمونے بکھرے ہوئے ہیں۔ ان سب نمونوں کو ایسی تمام کتابوں سے جمع کر کے یکجا کر دیا گیا ہے۔ اب یہ تمام خطبے جمہرۃ خطب العرب کے نام سے ایک کتاب میں یک جا مل جاتے ہیں۔ بعد میں جب متاخرین میں فن تحریر اور فن خطابت

کے نئے انداز نے رواج پایا۔ تو ایک اور انداز، خطابت کا، سامنے آیا۔ اس کے نمونے دور اموی اور ابتدائی دور عباسی میں نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس انداز کی خطابت بھی نہیں ہے۔ آج جس انداز سے عربی زبان میں تقریریں ہوتی ہیں قرآن مجید کا وہ انداز بھی نہیں ہے۔ اگر چہ کچھ چیزیں ان سب سے ملتی جلتی بھی ہیں۔ اس لیے قرآن مجید کے اس خاص انداز اور اسلوب سے واقفیت ضروری ہے تا کہ قرآن مجید کے اس خصوصی اسلوب کو سمجھا جاسکے۔ یہ عرب جاہلیہ اور صدر اسلام کے انداز کے زیادہ قریب ہے جس میں ایک مختصر ترین جملے میں، بلکہ بعض اوقات ایک مختصر ترین لفظ یا عبارت میں معانی اور مطالب کا ایک سمندر پنہاں ہوتا تھا، اور سننے والے اس سیاق و سباق میں اس کا پورا مطلب سمجھ لیا کرتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی نے الفوز الکبیر میں اور تقریباً ان تمام حضرات کے جنہوں نے قرآن مجید کے انداز اور اسلوب پر بات کی ہے اس مضمون کی طرف اشارے کیے ہیں۔ شاہ صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ علوم وفنون جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں یہ اسلام سے پہلے کے عربوں کے انداز میں بیان ہوئے ہیں، تا کہ وہ اپنے مانوس اسلوب کے ذریعہ سے قرآن مجید کو سمجھ سکیں اور سمجھ کر اپنے اندر سمو سکیں۔ اور اس کے بعد آگے چل کر اسے دوسری نسلوں اور دوسری اقوام تک پہنچا سکیں۔

جہاں قرآن مجید نے فقہی احکام بیان کیے ہیں وہاں قرآن مجید کا اسلوب انسانوں کے بنائے ہوئے کسی قانون کا نہیں ہے۔ آج قانون کا ایک خاص انداز بیان اور اسلوب مقبول ہے، جس کی پابندی قانون دانوں کے حلقوں میں کی جاتی ہے۔ مثلاً قانون کا آغاز اس طرح کی عبارت سے ہوتا ہے۔ ہرگاہ کے قرین مصلحت ہے کہ فلاں قانون بنایا اور نافذ کیا جائے، لہٰذا قومی اسمبلی یہ قانون بناتی اور اور نافذ کرتی ہے۔ اس تمہید کے بعد پھر دفعات کی شکل میں قانون کے احکام بیان کر دیے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں فقہی احکام بیان کرنے کا یہ اسلوب کا نہیں ہے، نہ قرآن اس طرح اور اس زبان و انداز میں فقہی احکام بیان کرتا ہے، جس طرح انسانوں نے ان کو سمجھ کر مرتب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید صرف پاکستان یا بیسویں اور اکیسویں صدی کے لیے نہیں ہے۔ یہ ساتویں آٹھویں صدی عیسوی کے لیے بھی تھا، اور انشاء اللہ پچیسویں یا چھبیسویں بلکہ پچاسویں صدی کے لیے بھی ہوگا۔ اس لیے قرآن پاک کا انداز کسی خاص زمانہ یا

علاقہ کے مروجہ اسلوب میں نہیں ہوسکتا۔ یہ انداز اور اسالیب ہر زمانہ میں بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کسی خاص علاقہ، خاص فن یا کسی خاص علم کی اصطلاح میں بیان نہیں ہوا۔ وہ قانون کی مروجہ اصطلاحات میں بھی نہیں ہے، وہ فلسفہ کی زبان یا علامات و اصطلاحات میں بھی نہیں ہے، اگرچہ قانون اور فلسفہ کے بنیادی مسائل اس میں بیان کیے گئے ہیں۔ وہ معاشیات کی اصطلاح میں بھی نہیں ہے، اگرچہ معاشیات کے احکام بھی اس میں بیان ہوئے ہیں۔

جو اسلوب قرآن مجید نے اپنایا ہے وہ ایک منفرد اسلوب ہے۔ لیکن اس اسلوب کو اپنانے میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ یہ اسلوب صدر اسلام کے عرب یعنی حضورؐ کے براہ راست مخاطبین کے لیے نامانوس نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کے اولین مخاطبین اس کو کیسے سمجھتے۔ وہی اگر نہ سمجھتے تو وہ نسل جو صحابہ کرام کی تیار ہوئی جس نے قرآن مجید کو آگے پہنچانے کا فریضہ انجام دیا، وہ نسل نہ تیار ہوسکتی۔ اس لیے نہ آیات احکام میں، نہ آیات عقائد میں، نہ آیات قصص میں اور نہ کسی اور جگہ کسی فن کے ماہرین کی زبان کا جو فنی اسلوب ہے وہ قرآن مجید میں اختیار نہیں کیا گیا۔ اگر ایسا کوئی اسلوب اختیار کیا جاتا تو اول تو قرآن مجید کسی خاص علاقہ یا زمانہ کے اسلوب بیان کا پابند اور اس زمانہ یا علاقہ تک محدود ہو جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علوم وفنون کی اصطلاحات اور زبانوں کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ جو اصطلاحات آج عام فہم اور مقبول ہیں وہ دس پندرہ سال کے بعد عام فہم نہیں ہوں گی۔ اس کے برعکس قرآن مجید ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ اصطلاحات قرآن پاک میں شامل ہوتیں تو ان اصطلاحات کی وجہ سے بہت سے ایسے لوگ قرآن مجید ہی سے متنفر ہو جایا کرتے جو اس فن کی اصطلاحات سے واقف نہ ہوتے۔ مثلاً اگر کوئی ایسا شخص جو کمپیوٹر کے فن کو بالکل نہ جانتا ہو وہ کمپیوٹر کے ماہرین کی محفل میں جا کر بیٹھے گا تو وہ ان کی گفتگو بالکل نہیں سمجھے گا۔ اس کو اگر وہ زبان جس میں وہ ماہرین بات کر رہے ہوں آتی بھی ہو تو بھی وہ ان کی گفتگو کو نہیں سمجھے گا کہ وہ کیا بات کر رہے ہیں، اس لیے کہ وہ ان کی اصطلاحات سے واقف نہیں ہوگا، ان کا اسلوب اس کے لیے نامانوس ہوگا۔ اس لیے قرآن مجید میں یہ اسلوب نہیں اپنایا گیا۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن مجید کے اسلوب میں دو باتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک تو قرآن مجید کا اپنا ایک الگ اسلوب ہے جو زبان و بیان کی بقیہ سب چیزوں سے منفرد ہے، یہ نہ شعر ہے، نہ

کہانت ہے اور نہ خطابت ہے۔ دوسری چیز قرآن مجید میں یہ پیش نظر رکھی گئی کہ اس کی زبان اور انداز بیان کو اس کے مخاطبین اولین کے فہم سے قریب تر کر کے پیش کیا گیا ہے۔ جہاں عرب کے اسلوب کو قرآن مجید نے اپنایا وہیں اہل عرب کی اچھی عادات کو بھی تسلیم کیا۔ جہاں جہاں ان میں کمزوریاں اور خامیاں تھیں وہاں ان کمزوریوں اور خامیوں کی بھی نشان دہی کی گئی۔

جیسے جیسے قرآن مجید مختلف اقوام میں جاتا جائے گا ان اقوام کی خرابیاں اور خوبیاں اسی طرح سے وحی الٰہی کی روشنی میں دیکھی اور جانچی جائیں گی جیسے قرآن مجید میں عربوں کی خوبیوں اور خرابیوں کو دیکھا گیا۔ اسی لیے قرآن مجید میں اہل عرب کی عادات کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا عربوں کو کیس اسٹڈی کے طور پر لے کر قرآن پاک کے اصول وقواعد کو منطبق کر کے دکھایا گیا اور بتایا گیا کہ آئندہ آنے والی اقوام کی خوبیوں اور کمزوریوں کو اسی طرح دیکھا جائے جیسے قرآن نے عربوں کی خوبیوں اور خامیوں کو دیکھ کر کھرا اور کھوٹا الگ الگ کر دیا ہے۔

بعض ظاہر بیں معترضین اعتراض جڑ دیا کرتے ہیں کہ قرآن مجید اگر تمام انسانوں کے لیے ہے تو آخر اس میں عربوں کا اتنا تذکرہ کیوں آیا ہے۔ یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہو اگر عربوں کے اس تذکرہ کی اصل وجہ اور حکمت پر نظر رہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ قرآن مجید کے اولین مخاطبین عرب تھے۔ انہی کو دوسری اقوام کے لیے حامل قرآن بنانا تھا۔ انہوں نے قرآن پاک پر جو اعتراضات کیے اول تو اسی طرح کے اعتراضات انسان بعد میں بھی کرتا آیا ہے، ان سب اعتراضات کا جواب قرآن میں موجود ہے۔ لیکن اگر کوئی نئے اعتراضات بھی ہوں گے تو ان کا جواب بھی قرآن کے اندر سے پتہ چل جائے گا۔ عربوں کے اعتراضات کے جواب میں قرآن نے جو کچھ کہا ہے۔ اس سے قرآن مجید کے انداز کا پتہ چل جائے گا کہ قرآن مجید نے ان سوالات کا جواب کیسے دیا ہے۔ پھر قرآن مجید کے طلباء اسی انداز سے آئندہ آنے والوں کے اعتراضات کا جواب دیا کریں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ جو شریعت قرآن مجید میں نازل کی گئی اس میں بعض بنیادی احکام عربوں کے اس نظام سے لیے گئے جو حضرت ابراہیم کے زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ اس کے بھی دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بین الاقوامی ہدف دے کر بھیجا۔ ان سے پہلے جتنے بھی انبیاء آئے وہ اپنے علاقہ، اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے

لیے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی قوم کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی بھیجا گیا۔ وہ عراق میں پیدا ہوئے۔ پھر انہوں نے فلسطین میں اسلام کی تبلیغ کی۔ فلسطین کے بعد مصر چلے گئے۔ مصر کے بعد جزیرہ عرب آئے۔ اور بعض روایات کے مطابق یورپ بھی تشریف لے گئے اور بعض اہل علم کے قیاس کے مطابق ہندوستان بھی تشریف لائے۔ انہوں نے ان تمام علاقہ جات میں دعوت دین کا فریضہ انجام دیا۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی اس عالمگیریت اور بین الاقوامیت کی بنیاد رکھ دی تھی جس کو پایہ تکمیل تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا۔ اسی لیے ملت اسلامیہ کو ملت ابراہیمی بھی کہا گیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مسلمانوں کا روحانی باپ بھی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے اسلوب اور انداز کو سمجھنے کے لیے ملت ابراہیم سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اور ملت ابراہیمی کے نظام اور تصور اور ملت ابراہیمی کے اس پیغام اور اس کی عالمگیریت اور ملت ابراہیمی کی بنیادی اساسات کو سمجھے بغیر قرآن مجید کے بہت سے احکام کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔

قرآن مجید کے اسلوب پر جن حضرات نے تفصیل سے گفتگو کی ہے انہوں نے یوں تو بلاغت اور فصاحت کے بے بہا نکتے بیان کیے ہیں، لیکن خاص اسلوب قرآن پر غور کرنے سے درج ذیل امور قابل توجہ نظر آتے ہیں:

۱۔ التفات
۲۔ تصریف آیات
۳۔ حذف
۴۔ ایجاز
۵۔ تفصیل بعد الاجمال
۶۔ عود علی البدء
۷۔ تمثیلات
۸۔ تقابل
۹۔ قسم
۱۰۔ جملہ معترضہ

اب میں ان سب امور کے بارہ میں اختصار سے ضروری باتیں بیان کرتا ہوں۔

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، قرآن مجید کا اسلوب اردو اور فارسی کی غزل مسلسل کے قریب قریب ہے۔ اس اسلوب میں آیات کا باہمی معنوی ربط ایک سلسلہ بیان میں تو بہت نمایاں اور واضح ہوتا ہے۔ لیکن جب ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف انتقال ہو تو وہ بہت لطیف اور غیر محسوس انداز میں ہوتا ہے۔ مختلف مجموعہ ہائے آیات میں باہمی ربط اور مناسبت بھی انتہائی لطیف اور گہری معنویت کی حامل ہوتی ہے۔

عرب میں یہ 'لطافت' کلام کی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ عرب قصائد میں بھی ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف انتقال جتنا لطیف اور غیر محسوس ہوتا تھا اتنا ہی کلام کی خوبی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ خاص طور پر قصائد میں جب شاعر تشبیب سے گریز کا مضمون باندھتا تھا تو اس میں جتنی لطافت اور گہرائی ہوتی تھی اتنا ہی قصیدہ کی خوبی میں اضافہ سمجھا جاتا تھا۔ پھر گریز کے بعد مدح وغیرہ کے مضامین میں ایک بات سے دوسری بات نکلتی چلی جاتی تھی۔ قریب قریب یہی بات قرآن مجید میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ انتقال مضمون یا گریز ہی سے ملتی جلتی ایک چیز وہ ہے جس کو ماہرین بلاغت بالعموم اور ماہرین بلاغت قرآن بالخصوص التفات کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔

التفات قرآن مجید کے اسلوب اور انداز خطاب کے ایک خاص پہلو کا نام ہے جس کا مقصد بیک وقت متعدد سامعین سے خطاب کرنا ہوتا ہے۔ ایک معاصر محقق کے الفاظ میں قرآن کی حیثیت ایک آسمانی بلکہ کائناتی خطیب کی ہے جو پوری انسانیت سے بیک وقت مخاطب ہے، اس کا خطاب بیک وقت روئے زمین کے تمام انسانوں سے ہے۔ وہ کبھی ایک طرف رخ کر کے بات کرتا ہے ،کبھی وہ دوسری طرف رخ کر کے مخاطب ہوتا ہے۔ کبھی اس کے مخاطب اہل ایمان ہوتے ہیں، اور کبھی اہل کفر۔ کبھی اس کا روئے سخن مخلصین کی طرف ہوتا ہے تو کبھی منافقین کی طرف۔ ان حالات میں خطاب کا انداز اور صیغہ بار بار بدلتا رہتا ہے۔ اس پیہم تبدیلی کو التفات کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔ التفات کا یہ انداز عربی زبان کے مدحیہ قصائد اور مناجاتوں میں بھی پایا جاتا تھا۔

قرآن مجید میں جابجا التفات کے ذریعہ سے خطاب کیا گیا ہے۔ ان آیات میں جہاں التفات کے اسلوب سے کام لیا گیا ہے بیک وقت ایک سے زیادہ لوگوں خطاب کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ انبیاء کے آغاز میں ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے

کہ ہم نے آپؐ سے پہلے ان حضرات کے علاوہ کسی کو رسول بنا کر نہیں بھیجا جن کی طرف ہم نے وحی کی۔ یہاں تک حضورؐ سے خطاب تھا، پھر یک بیک روئے سخن کفار مکہ کی طرف ہو جاتا ہے کہ اگر تمہیں شک ہے اور تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھو۔ گویا ایک ہی آیت میں پہلے خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا، پھر فوراً ہی اگلے جملہ میں خطاب مشرکین مکہ سے ہو گیا۔

ایک اور مثال سورۃ عبس کی ابتدائی آیات کی ہے۔ یہ سورت بارہا آپ نے پڑھی ہوگی۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ سورت کب نازل ہوئی اور کن حالات میں نازل ہوئی۔ اس میں ایک خاص انداز ہے جس میں بیک وقت اظہار محبت بھی ہے اور اظہار عتاب بھی۔ عتاب کا مضمون براہ راست صیغہ مخاطب میں بیان کر کے ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا کہ اس میں زیادہ سختی ہے، بلکہ عتاب کا مضمون صیغہ غائب میں ذکر کیا، ارشاد ہوتا ہے: تیوری چڑھائی اور روگردانی کی، اس لیے کہ نابینا آ گیا۔ اس کے بعد اگلا جملہ جس میں انداز محبت اور شفقت کا ہے صیغہ مخاطب میں ہے۔ ارشاد ہے: تمہیں کیا معلوم شاید وہ تزکیہ کے لیے آیا ہو یا وہ یاد دہانی حاصل کر لے اور نصیحت سے فائدہ اٹھا لے۔ آپ دیکھیے کہ ایک ہی جملے میں دو مختلف اسلوب استعمال فرمائے گئے ہیں۔ حالانکہ مخاطب دونوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ ایک میں مصلحت کی خاطر صیغہ غائب استعمال فرمایا گیا ہے، اور فوراً ہی دوسرے جملہ میں دوسری مصلحت کی خاطر صیغہ حاضر استعمال ہوا ہے۔ عام نثری تحریروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایسا انداز یا تو غزل مسلسل میں ہوتا ہے، یا پھر خطابت اور گفتگو میں ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید میں جو التفات ہے، یعنی ایک صیغہ سے دوسرے صیغہ میں منتقل ہونا، جمع سے واحد، اور واحد سے جمع میں منتقل ہونا، یہ سارا کا سارا التفات کی وجہ سے ہے۔

بعض اوقات اگر عام انداز میں یہ مضمون بیان کیا جائے تو آپ کو کوئی نہ کوئی فعل محذوف ماننا پڑے گا کہ یہاں فلاں یا فلاں بات حذف ہے۔ مثلاً یہ آیت مبارکہ کہ ہم نے ہر انسان کا نامہ اعمال اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے، و کل انسان الزمنه طائره فی عنقه اس کے فوراً بعد آتا ہے: اقرأ کتابك، پڑھو اس کتاب کو (کہ یہاں کیا لکھا گیا ہے)۔ اب یہاں بات اس طرح نہیں کی گئی کہ ہم ان سے کہیں گے کہ اس کو پڑھو، بلکہ یہ براہ راست اس شخص سے خطاب ہے جس کو یہ نامہ اعمال دیا جائے گا۔ اور تھوڑے سے التفات سے جو مضمون بیان کرنا تھا وہ

اداہو جائے گا۔ بلاغت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی ادا کر دیے جائیں۔ یہ بھی بلاغت کی ایک شان ہوتی ہے۔ یہ چیز قرآن مجید میں التفات کے اسلوب کے ذریعہ سے اختیار کی گئی۔

التفات کے اس اسلوب میں کئی فوائد محسوس ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ سننے والا تھوڑا سا بیدار ہو جائے۔ اور دوسرے سلسلہ بیان میں اچانک اپنے کو مخاطب پا کر بات کو زیادہ توجہ سے سنے۔ یہ ایک نفسیاتی اسلوب ہے جس سے مخاطب کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ بعض اوقات کسی بعید شخص کو جو موجود نہیں ہے قریب فرض کر کے خطاب کیا جاتا ہے۔ گویا دوسرے حاضرین اور مخاطبین کو اس خاص بات کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے۔ بعض اوقات مخاطب کی عظمت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یعنی مخاطب دراصل تو غیر حاضر اور دور ہے لیکن ہم نے قریب فرض کر کے یہ بات بیان کی تاکہ دوسرے سننے والوں تک یہ پیغام پہنچے کہ ہم اس کو اپنے سے بہت قریب سمجھتے ہیں، اور اس کو یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ ایک صاحب عظمت شخص ہے۔ بعض اوقات قرآن مجید میں کفار مکہ اور مشرکین وغیرہ کے حوالے ہیں۔ خطاب تو دراصل ان سے ہی ہوتا ہے۔ لیکن ان کا ذکر صیغہ حاضر میں نہیں ہوتا، بلکہ صیغہ غائب میں ہوتا ہے۔ بعض اوقات جب آدمی کسی سے ناراض ہو جاتا ہے تو اس سے براہ راست مخاطب نہیں ہوتا، بلکہ صیغہ غائب میں اس کو خطاب کرتا ہے۔ اس انداز خطاب میں بھی بہت سی حکمتیں ہوتی ہیں۔

قرآن مجید کا ایک اور اسلوب جس سے قرآن مجید کا ہر قاری مانوس ہے' وہ تصریف آیات ہے، كذلك نصرف الايات...... یعنی اس طرح ہم ان آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ تصریف کے معنی تکرار کے نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں تکرار نہیں ہے، بلکہ تصریف آیات ہے۔ تصریف آیات ایک مضمون کو پھیر پھر کر نئے نئے انداز میں بیان کیے جانے کا نام ہے۔ بظاہر سطحی طور پر پڑھنے والوں کو تکرار معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ تکرار نہیں ہوتی۔ چنانچہ اگر آپ ان واقعات کو غور سے دیکھیں جو قرآن مجید میں بہت کثرت سے بیان ہوئے ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ، یا حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ، تو پتا چلے گا کہ قرآن میں ہر جگہ ان واقعات کو ایک نئے پہلو سے بیان کیا گیا ہے ۔اگر آپ ان تمام آیات کا تقابل کریں جہاں جہاں یہ مضامین بیان ہوئے ہیں تو آپ کو ہر جگہ

واقعہ کا ایک نیا پہلو نظر آئے گا۔ یہ فرق اس ہدف کے نقطہ نظر سے ہوگا جو اس خاص سلسلہ بیان میں پیش نظر ہے۔

مثلاً آدم و ابلیس کے قصہ میں بعض اوقات اہل ایمان مخاطب ہوتے ہیں جن کو یہ بتایا جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی کمزوری پر اگر اظہار ندامت کر کے توبہ کر لی جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والے ہیں۔ اور معاف کر کے بڑے بڑے درجات اور بلندیوں پر فائز کرتے ہیں۔ بعض جگہ اس واقعہ کے ذریعہ سے انسان کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا تو مٹی سے کیا لیکن اس کو روحانی اور اخلاقی اعتبار سے بہت اونچا درجہ عطا فرمایا۔ جہاں کرامت انسان اور بلندی آدم کا بیان ہے وہاں آدم کے علم کا ذکر ہے، فرشتوں سے اللہ تعالیٰ کی گفتگو کا بھی ذکر ہے۔ آدم کے جواب دینے اور فرشتوں کے جواب نہ دے سکنے کا بھی ذکر ہے۔ انسان کی خلافت کا تذکرہ ہے۔ ان سب مقامات پر وہ حصے زیادہ نمایاں ہیں جن کے ذریعہ سے انسان کی بڑائی اور اس کی خوبیاں بتانا مقصود ہے۔ بعض جگہ شیطان کی برائی اور مذمت یاد دلانا مقصود ہے تا کہ انسان ہر وقت یہ بات یاد رکھے کہ ابلیس اللہ تعالیٰ کی بدترین مخلوق ہے۔ ایسے ہر سیاق و سباق میں شیطان کی برائیاں کھول کھول کر بیان ہوئی ہیں۔

اس لیے ذرا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک میں کہیں بھی تکرار نہیں ہے۔ بلکہ تصریف آیات ہے، اور ایک ہی مضمون کو نئے نئے انداز میں پھیر پھیر کر بیان کیا گیا ہے۔ مضمون ایک ہی ہے، لیکن مقصد مختلف ہے اور ہدف اور ہے۔ مخاطبین میں بھی ہر جگہ تنوع ہے۔ تصریف کی وجہ یہ بتائی کہ لوگ ان واقعات میں پنہاں عبرتوں اور علامتوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایک جگہ ایک پہلو سمجھ میں آ جائے اور دوسری جگہ دوسرا پہلو سمجھ میں آ جائے۔ یہ مضامین جو جگہ جگہ بیان ہوئے ہیں یہ سب مل کر واقعہ یا مضمون کے مختلف پہلوؤں کو سمجھا دیں گے اور جب آخر میں پورا قرآن مجید مکمل ہوگا تو سارے پہلو اور سارے مضامین سمجھ میں آ چکیں گے۔

قرآن مجید میں جس طرح آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرنے کا ذکر ہے اسی طرح ہواؤں کو بھی پھیر پھیر کر لانے کا بیان ہوا ہے۔ ہوا کو پھیر پھیر کر لانے میں کیا حکمت ہے۔ ہوا تو ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہر مرتبہ اس کے چل پھر کر آنے میں ایک نئی حکمت ہوتی ہے۔ کبھی وہ بادلوں کو لاتی ہے اور کبھی لے جاتی ہے۔ کبھی اس کے ساتھ گرج چمک آتی ہے۔ کبھی صرف بارش آتی ہے۔ کبھی

نہ بارش ہوتی ہے، نہ گرج اور چمک ہوتی ہے۔صرف سایہ آتا ہے۔کبھی دھوپ کی ضرورت ہوتی ہے تو ہوا آئی اور بادلوں کو لے کر چلی گئی، یوں پودوں کو دھوپ مل گئی۔کبھی پودوں کو دھوپ کی ضرورت نہیں۔تو ہوا بادلوں کو کھینچ کر لے آئی اور پودے دھوپ سے بچ گئے۔اب آپ دیکھیے کہ اس تصریف ریاح کے درجنوں مقاصد ہیں۔اسی طرح تصریف آیات کے مقاصد بھی مختلف ہیں۔اس لیے ان کے انداز میں بھی فرق ہوتا ہے۔

پھر جہاں جہاں تصریف آیات کا تذکرہ ہے وہاں ایک چیز بڑی نمایاں اور قابل ذکر ہے۔وہ یہ ہے کہ آیات کی یہ تصریف قصص اور واقعات میں زیادہ ہے احکام میں کم ہے، اور عقائد میں اس سے بھی کم ہے۔عقائد اور احکام میں تصریف کی زیادہ ضرورت پیش نہیں آتی۔ قانون ایک مرتبہ دے دیا، لوگوں نے سمجھ لیا اور اس پر عملدرآمد شروع کر دیا۔اس کو بار بار دہرانے کی زیادہ ضرورت پیش نہیں آتی۔لیکن جو چیزیں اسلامی معاشرہ کے مزاج کی تشکیل کرتی ہیں یا جن سے معاشرہ کی عمومی ہیئت کا تعین ہوتا ہے، مثلاً عبادات اور اخلاق و کردار۔ان کا بیان بار بار ہوا ہے اور مختلف انداز میں ہوا ہے۔اس کے باجود تصریف کی زیادہ مثالیں قصص اور واقعات میں ملتی ہیں جن کا اصل ہدف عبرت کا حصول اور کردار کی تشکیل ہے، دوسرے موضوعات میں تصریف کی مثالیں کم ملتی ہیں۔

تصریف آیات ہی کی ایک شکل ترجیعات ہے۔ترجیع سے مراد ہے قرآن مجید کے ایک ہی لفظ یا ایک ہی عبارت کو بار بار دہرانا۔تصریف کا مطلب تو ہے ایک مضمون کو دہرانا۔اس میں کبھی الفاظ مختلف ہوتے ہیں، کبھی نہیں ہوتے۔ترجیع تصریف ہی کی ایک شکل بلکہ اس کی ایک قسم ہے۔اس میں ایک لفظ یا ایک جملہ کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔جیسے فبای الاء ربکما تکذبان۔ اب یہ جملہ ایک خاص انداز اور وقفہ سے بہت دفعہ استعمال ہوتا ہے۔لیکن ہر جگہ سیاق و سباق کے لحاظ سے اس کا مفہوم الگ ہوگا۔بعض مترجمین نے آلاء کا ترجمہ نعمت سے کیا ہے، اور یہ ترجمہ کیا ہے کہ پھر تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔لیکن سورۃ رحمان میں ہر جگہ آلاء کا ترجمہ نعمت صحیح نہیں بیٹھتا۔بلاشبہ آلاء کا ایک ترجمہ نعمت بھی ہے، لیکن ہر جگہ آلاء کے معنی نعمت کے نہیں ہیں۔ آلاء کا صحیح اور جامع ترجمہ اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب شان ہے۔گویا ان آیات کے ترجمہ میں اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب شان، اس کی حکمت اور مصلحت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔اس لیے ہر آیت کے

اپنے سیاق وسباق میں آلاء کا الگ مفہوم متعین ہوگا۔

اس طرح کی ترجیعات سورۃ رحمٰن میں بھی ہیں، سورہ مرسلات میں بھی اور سورہ شعراء میں بھی ہیں، ان فی ذلک لآیہ بار بار آیا ہے۔ اسی طرح اور جگہ بھی ترجیعات ہیں۔ بعض اوقات قافیہ اور غنائیت میں مزید خوبصورتی پیدا کرنے اور ایک خاص طرح کے نغمہ کو ایک سطح پر برقرار رکھنے کے لیے بھی یہ ترجیعات آتی ہیں۔

ایک اور اسلوب جو قرآن مجید میں بار بار آیا ہے وہ حذف کا اسلوب ہے جو دراصل ایجاز اور جامعیت ہی کی ایک شکل ہے۔ حذف سے مراد یہ ہے کہ جہاں کوئی لفظ کہے بغیر کام چل سکتا ہو، وہاں قرآن مجید اس لفظ کو صراحۃً ذکر نہیں کرتا۔ یہ بات قرآنی معیار بلاغت کے خلاف ہے کہ جس بات کو ذہن اور ذوق زبان سے آراستہ قاری بغیر بیان کیے سمجھ سکتا ہو اس کو کھول کر بیان کیا جائے۔ قرآن مجید میں اسلوب ایسا اپنایا گیا ہے کہ الفاظ پڑھنے والوں کو خود ہی سمجھ میں آجائیں گے کہ کہاں کیا چیز مراد ہے اور کیا اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے۔ چونکہ قرآن مجید برقی زبان میں ہے لہٰذا جس طرح ٹیلی گرام دیتے وقت بہت سے الفاظ محذوف ہو جاتے ہیں اسی طرح قرآن میں بھی بہت سے الفاظ محذوف ہوتے ہیں۔ وہ چیزیں جو مخاطب کے افہام کے لیے ضروری نہیں ہیں یا مخاطب اس لفظ کی صراحت کے بغیر بھی بات سمجھ جاتا ہے، یا جہاں سیاق و سباق سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں کون سا لفظ محذوف ہے۔ وہاں اس لفظ کو بیان کرنا تحصیل حاصل کے مترادف ہے۔

مثال کے طور ایک جگہ آیا ہے، **فاذاقها الله لباس الجوع والخوف**، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھوک اور خوف کا لباس چکھایا۔ اب اذاق (چکھایا) کا لفظ بھوک کے ساتھ تو مناسبت رکھتا ہے خوف کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا، اور لباس کا لفظ خوف سے مناسبت رکھتا ہے، بھوک سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ چونکہ یہ مناسبت اور عدم مناسبت پوری طرح واضح ہے اس لیے یہاں کچھ الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں۔ گویا اصل عبارت یوں ہوتی تھی فاذاقها الله طعم الجوع و البسها لباس الخوف۔ لفظی ترجمہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھوک کا مزہ چکھایا اور خوف کا لباس پہنایا۔ لیکن اختصار اور جامعیت کی خاطر وہ الفاظ حذف کر دیے گئے جن کو حذف کرنے سے ذہین قاری کو مفہوم سمجھنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ اس انداز کے حذف کی بے شمار مثالیں قرآن مجید میں

ملیں گی۔

قرآن مجید میں ایک اسلوب ایجاز کا بھی ہے کہ ایک چیز کو بہت تھوڑے اور مختصر ترین الفاظ میں اس طرح بیان کر دیا جائے کہ پڑھنے والا جتنا غور کرنا چاہے اس کے نئے نئے مطالب اس کے سامنے آتے جائیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کے خدا ہونے کے غلط عقیدہ کی تردید کی گئی ہے۔ گفتگو کا سیاق اور سباق یہ ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور حضرت مریم کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور بیوی مانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ توحید کے اسلامی تصور کے خلاف ہے۔ وہ انسان ہونے کی حیثیت سے کیسے الوہیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس عقیدہ کے جواب میں لمبے چوڑے دلائل اور تفصیلات میں جانے کے بجائے صرف اتنا کہا گیا کانا یا کلان الطعام۔ وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔

اب آپ غور کریں تو واضح ہوگا کہ یہ مختصر جملہ اس عقیدہ کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کو کھانے کی ضرورت ہوگی وہ زمین اور آسمان کی ہر چیز کا محتاج ہوگا۔ زمین اور آسمان کی بے شمار چیزوں کی محتاجی کے بغیر ایک وقت کی روٹی ہمارے پیٹ میں نہیں جا سکتی۔ ہم سورج کے محتاج ہیں کہ وہ نکل کر غلہ کو پکا دے۔ غلہ اس وقت تک نہیں پک سکتا جب تک سورج نہ نکلے، اور سورج کا وجود ممکن نہیں ہے جب تک پورا نظام کہکشاں موجود نہ ہو۔ سورج ہو اور پانی نہ ہو تب بھی گندم نہیں پک سکتی۔ پانی کی فراوانی کے لیے بادلوں اور بارشوں کا پورا نظام چلایا گیا۔ چنانچہ انسان ان سب کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ پھر گندم کو پکانے کے لیے آگ کا محتاج ہے۔ گویا آگ، پانی، دریا، سورج، سمندر، ہوا، بادل، غرض کوئی شے ایسی نہیں کہ جس کا انسان محتاج نہ ہو۔ تو جو شخص اپنی دو وقت کی روٹی کے لیے پوری کائنات کا محتاج ہو وہ اس کائنات کا خالق و مالک کیسے ہو سکتا ہے؟ خالق بھی ہو اور مخلوق کا محتاج بھی ہو! یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس ایک جملہ نے کہ وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے اس پورے سلسلہ استدلال کو جسے آپ گھنٹوں میں بھی نہ بیان کر سکیں ایک جملہ میں بیان کر دیا۔

اگر ہم مکی سورتوں پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مکی سورتیں اس ایجاز کا بہت عمدہ نمونہ ہیں۔ مکی سورتوں میں یہ چیز بڑی نمایاں ہے کہ ایک چھوٹے سے لفظ میں قرآن مجید نے ایسی ایسی چیزیں بیان کر دی ہیں جن کا بیان کرنا کسی انسان کے لیے بڑا دشوار ہے۔

قرآن مجید کے ایک اسلوب کو علوم قرآن کے ماہرین نے تفصیل بعد الاجمال کی اصطلاح سے یاد کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک چیز کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا، بعد میں تفصیل آ گئی۔ قرآن مجید میں پہلے اجمال آتا ہے اور گویا مضمون کو ایک مختصر ترین جملہ میں سمو دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ اسلوب سورت کے آغاز میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ سورۃ کی اٹھان اس شان کی ہوتی ہے کہ اس کا پورا مضمون سامنے آ جاتا ہے۔ اس ایک ابتدائی جملہ ہی سے سورت کا بنیادی مضمون یا سورت کا بنیادی تصور، یا مولانا اصلاحی کے الفاظ میں اس کا عمود اور ستون سامنے آ جاتا ہے جس پر اس کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ کتاب احکمت آیاته ثم فصلت من لدن حکیم خبیر۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات سب سے پہلے ایک محکم اور پختہ انداز سے بیان کی گئی ہیں، ان کو محکم کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے، اور پھر ان کی تفصیل بیان کی جاتی ہے اس ذات کی طرف سے جو حکیم اور دانا بھی ہے اور خبیر بھی۔

اجمال کے بعد تفصیل کے اس اسلوب کے اہل علم نے متعدد فوائد بیان کیے ہیں۔ ایک بڑا فائدہ اس اسلوب کا یہ ہے کہ پہلے اجمالی طور پر ایک حقیقت بیان کر دینے سے مضمون کی جڑ ہاتھ آ جاتی ہے۔ اور پوری بات کا خلاصہ یا عمود ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ پھر جب تفصیل بیان کی جاتی ہے تو اس کو سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے اور یاد رکھنے میں بھی دقت نہیں ہوتی۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اجمالی حکم جو در حقیقت اصول و کلیات پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے بیان کر دینے سے حکمت شریعت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور قرآن مجید کا سنجیدہ طالب علم آہستہ آہستہ کتاب الٰہی کے کلیات اور اس کی حکمت تشریع سے باخبر ہوتا چلا جاتا ہے۔

قرآن مجید کے نمایاں اسالیب میں ایک چیز عود علی البدء کہلاتی ہے، یعنی ابتداء میں جو مضمون بیان ہو رہا تھا، آخر میں پھر اسی مضمون پر بات ختم کی جائے۔ درمیان میں جگہ جگہ موضوع کی مناسبت اور حالات نزول کی ضرورت سے دیگر مضامین بھی آتے رہتے ہیں، لیکن اصل مضمون نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اس اسلوب کی مثالیں یوں تو ہر سورت میں ملتی ہیں۔ اور ذرا سا غور کرنے سے سامنے آ جاتی ہیں، لیکن چھوٹی سورتوں میں یہ اسلوب کثرت سے ملتا ہے۔

قرآن پاک کے اسلوب میں ایک اور اہم چیز قرآن مجید کی تمثیلات ہیں۔ تمثیل دراصل تشبیہ کی ایک قسم ہے جو قرآن مجید میں جابجا استعمال ہوتی ہے۔ تمثیلات کا استعمال نہ صرف

قرآن مجید میں کثرت سے ہوا ہے۔ بلکہ دیگر آسمانی کتابوں میں بھی تمثیل کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔قرآن مجید میں تمثیل کے دو فائدے بتائے گئے ہیں ایک تذکیر، یعنی یاد دہانی اور نصیحت، دوسرے تفکر، یعنی غور وفکر۔

تقابل نہ صرف اسالیب قرآن میں بلکہ ہر بلیغ کلام کے اسلوب میں ایک اہم اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ دو متضاد اور متعارض چیزوں کو آمنے سامنے رکھ کر بیان کرنا تقابل کہلاتا ہے۔اس سے نہ صرف بات واضح ہو جاتی ہے، بلکہ مخاطب کے ذہن میں پوری طرح راسخ ہو جاتی ہے۔قرآن مجید کے سرسری مطالعہ سے ہی اس اسلوب کی بے شمار مثالیں سامنے آجاتی ہیں۔ارض وسماء،نور وظلمت، خیر وشر، کفر وایمان،فرعون وموسیٰ، اور ایسی ہی بے شمار چیزوں کا تقابل قرآن پاک کے اسالیب میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔اس سے نہ صرف کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ مخاطب کے سامنے اصل موضوع پورے طور پر واضح اور منقح ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں جابجا قسمیں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ یہ بھی بلاغت قرآنی کا ایک پہلو ہے۔قرآن مجید میں قسموں سے مراد استشہاد ہے۔کہیں کہیں اس سے غرض کسی خاص مضمون میں استدلال کرنا ہوتا ہے۔مثلاً سورۃ والعصر میں زمانہ کی قسم کھا کر گویا زمانہ کو گواہ بنایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان سراسر خسارہ میں ہے، جس کو شک ہو وہ زمانہ کو دیکھ لے کہ کیوں کر سراپا خسارہ اور مسلسل کمی سے عبارت ہے۔

یہ ہیں قرآن پاک کے چند اہم اسالیب جن کی طرف میں نے انتہائی اختصار سے اشارے کیے ہیں۔ان اسالیب میں کم وبیش ہر ایک کا نمونہ کلام عرب میں ملتا ہے۔گویا کلام عرب میں حسن وخوبی اور فصاحت و بلاغت کے جو اسالیب اپنائے جاتے تھے۔وہ سب کے سب بدرجہ اتم قرآن پاک میں موجود ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابتداء میں تفصیل سے عرض کیا تھا کہ قرآن مجید میں سارے مضامین بیک وقت ہر سورت میں یک جا ملتے ہیں۔ان میں جب ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف انتقال ہوتا ہے تو وہ بڑے لطیف انداز کا ہوتا ہے۔اگر آپ نے قدیم جاہلی عربی قصائد پڑھے ہوں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں ابتدائی مضمون کو تشبیب کہتے ہیں۔تشبیب سے شاعر اصل مقصد کی طرف گریز کرتا ہے۔ یہ جو گریز ہوتا ہے یہ بھی نہایت لطیف ہوتا ہے اور جتنا یہ گریز

لطیف ہوا تنا ہی اس قصیدہ کو اونچا مانا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں جہاں ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف گریز ہے وہ اتنا لطیف ہوتا ہے کہ بعض اوقات محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اب دوسرا مضمون شروع ہو گیا۔ لیکن اگر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں سے مضمون بدل کر دوسری طرف جا رہا ہے، اور وہاں سے پھر ادھر آ رہا ہے۔ مضامین کی اس آمد کی مثال ایک ڈیزائن کی سی ہے۔ جیسے آرٹ کا ایک ایسا ڈیزائن ہوتا ہے جس میں خطوط ایسے بنے ہوں کہ بظاہر ایسا لگے کہ یہ پیچیدہ اور آپس میں لاتعلق خطوط ہیں، لیکن اگر غور کریں تو اس کا پورا نظام معلوم ہو جائے اور پتہ چل جائے کہ یہ ایک گرافک ڈیزائننگ ہے۔

مولانا اصلاحی نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں جو نظام پیش کیا ہے وہ نہایت رواں اور آسان اردو زبان میں دستیاب ہے۔ قرآن مجید کا ہر اردو داں طالب علم اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ مولانا اس نظام کا خلاصہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی جتنی سورتیں ہیں وہ سب آپس میں جوڑے جوڑے ہیں۔ سورۃ فاتحہ کے علاوہ باقی ساری سورتیں جوڑا ہیں۔ یہاں وہ قرآن مجید ہی کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔ بعض جگہ غور کریں تو وہ جوڑا صاف نظر آتا ہے۔ مثلاً آخری دو سورتیں، جن کے بارہ میں ہر مبتدی کو بھی بالکل ایسا لگتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا جوڑا ہیں۔ یا جس طرح سورہ والضحیٰ اور الم نشرح جوڑا ہیں۔

سورۃ بقرہ اور آل عمران کے مضامین میں اتنی مشابہت ہے کہ صاف پتہ چلتا ہے کہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کا جوڑا ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان دونوں سورتوں کو حدیث میں الزہراوین کہا گیا ہے۔ یعنی دو پھول۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ان دونوں سورتوں کو یاد کرے گا تو قیامت کے دن یہ دونوں سورتیں اس پر سایہ کیے رہیں گی۔ اور ساری مشکلات اور پریشانیوں سے نجات دلائیں گی۔ سورہ بقرہ میں یہودیوں پر تبصرہ ہے۔ اور سورہ آل عمران میں عیسائیوں پر تبصرہ ہے۔ سورۃ بقرہ میں احکام زیادہ ہیں۔ سورۃ آل عمران میں اخلاقی ہدایات زیادہ ہیں۔ بقرہ میں وہ چیزیں بتائی گئیں جو یہودیوں کے دین سے انحراف کا سبب بنیں تاکہ مسلمان ان سے بچیں۔ آل عمران میں وہ چیزیں بتائی گئیں جو عیسائیوں کے انحراف کا سبب بنیں تاکہ مسلمان ان سے بھی بچیں۔

گویا یہ دو بڑی اقوام ہیں۔ جن سے آئندہ چل کے مسلمانوں کو واسطہ پیش آنا تھا۔ ان دونوں سے سابقہ پیش آنے پر کیا کرنا چاہیے۔ اور کیسے ان سے عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ اس کی تفصیل ان دونوں سورتوں میں بتائی گئی ہے۔ چونکہ اسلام ایک بین الانسانی پیغام ہے اور مسلمانوں کا کردار ایک عالمگیر کردار ہے، اس لیے آغاز میں یہی دونوں سورتیں ہونی چاہئیں، تاکہ یہ اپنی راہنمائی آغاز ہی میں فراہم کردیں اور اس عالمگیر بین الانسانی کردار کے لیے اور اس کردار کی انجام دہی میں جو قوتیں رکاوٹ ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلمانوں کو فکری اور تربیتی اسلحہ فراہم کریں۔ علمی، فکری اور روحانی اسلحہ سے ان کو پہلے ہی لیس کردیں۔

مولانا اصلاحی کا کہنا ہے کہ ہر سورت جوڑا جوڑا ہے۔ پھر قرآنی سورتوں کے سات بڑے گروپ ہیں۔ اور ہر گروپ کا ایک بنیادی مضمون ہے۔ کہیں شریعت ہے، کہیں ملت ابراہیمی کی تاریخ ہے، کہیں نبوت اور اور نبوت پر اعتراضات کا جواب ہے۔ کہیں سابقہ اقوام کے عروج و زوال کا تذکرہ ہے اور کہیں لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ اس طرح سے یہ سات مختلف موضوعات ہیں اور ہر گروپ کا ایک بنیادی موضوع ہے۔ ہر گروپ کی پہلی سورت مدنی ہے۔ اور آخری سورت مکی، جس پر گروپ ختم ہوجاتا ہے۔ ہر گروپ کی ہر سورت کا جوڑا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ جو دو سورتیں جوڑا جوڑا ہیں ان میں بعض اوقات ایک مضمون کا ایک پہلو ایک سورۃ میں بیان ہوا ہے اور دوسرا پہلو دوسری سورۃ میں بیان ہوا ہے۔ بعض اوقات دعویٰ ایک سورت میں ہے۔ اور دلیل دوسری سورۃ میں بیان ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایک بات ایک سورت میں ہے، اس کی تکمیل دوسری سورت میں ہے۔ اس طرح سے یہ سورتیں ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتی ہیں۔ سورۃ بقرہ آل عمران کی تکمیل کرتی ہے۔ ایک میں نظام شریعت کے ظاہری پہلو پر زور دیا گیا ہے اور دوسری میں داخلی پہلو پر۔ اس طرح یہ دونوں پہلو مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کریں گے۔

یوں جب غور کرتے چلے جائیں تو ایک عجیب و غریب نقشہ سامنے آتا ہے کہ وہ آیات جو ۲۳ سال میں مختلف اوقات میں نازل ہوئیں وہ جب سورتوں کی شکل میں مرتب ہوئیں تو خود بخود سورتوں کے ایسے گروپ بن کر سامنے آئے جن کی حکمت اور معنویت پر جتنا غور کریں نئے نئے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔

سورتوں کے ایسے گروپ سات ہیں اور ہر گروپ کا الگ تھیم ہے۔ یہ بات اگر ذہن میں رکھی جائے کہ قرآن مجید کی مختلف آیات مختلف اوقات میں مختلف معاملات کے جوابات میں نازل ہوئی تھیں تو پھر یہ نظام جتنا سامنے آتا جائے گا قرآن مجید کے اعجاز کا ایک نیا عالم وا ہوتا چلا جائے گا۔ پھر جس طرح اب تک نظم قرآن کے درجنوں نظام دریافت ہوئے ہیں۔ اسی طرح آئندہ بھی ایسے نظام درجنوں کی تعداد میں سامنے آتے چلے جائیں گے۔ یہ قرآن مجید کی حقانیت کی ایسی واضح دلیل ہے جو روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

خطبہ یازدہم

قرآن مجید کا موضوع اور اس کے اہم مضامین

۱۸۔ اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج کی گفتگو کا موضوع ہے: قرآن مجید کا بنیادی موضوع اور اس کے اہم مضامین۔

قرآن مجید کے اہم مضامین پر گفتگو کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ قرآن مجید کا اصل مضمون اور بنیادی موضوع کیا ہے۔ یہ دیکھنا اس لیے ضروری ہے کہ دنیا کی ہر کتاب کا کوئی نہ کوئی موضوع ہوتا ہے۔ جس سے وہ بنیادی طور پر بحث کرتی ہے۔ بقیہ مباحث کے بارے میں اس کتاب میں گفتگو یا تو ضمنی ہوتی ہے یا صرف اس حد تک ان مباحث پر گفتگو کی جاتی ہے جس حد تک ان کا تعلق کتاب کے بنیادی موضوع سے ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا بنیادی مضمون یا بنیادی موضوع کیا ہے۔

اگر قرآن کے بنیادی موضوع کا تعین کرنے کے لیے اس کے مندرجات کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں فلسفیانہ مباحث بھی ہیں۔ تو کیا قرآن مجید کو فلسفہ کی کتاب کہا جا سکتا ہے؟۔ جن سوالات سے فلسفہ بحث کرتا ہے کہ انسان کا آغاز کیا ہے، یہ آغاز کیوں اور کیسے ہوا، آدم اور آدمیت کی حقیقت کیا ہے، وجود کسے کہتے ہیں، وجود کا مظاہر سے کیا تعلق ہے، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں علم فلسفہ میں سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں۔ قرآن مجید کے ایک سرسری مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان سوالات کا جواب قرآن مجید نے بھی دیا ہے تو کیا قرآن مجید کو فلسفہ کی کتاب قرار دیا جائے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں قانون سے متعلق بہت سے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ قرآن مجید میں بہت سے دستوری اور قانونی احکام دیے گئے ہیں۔ زندگی کے وہ گوشے جو قانون کے ذریعہ سے مرتب اور منظم ہوتے ہیں ان کو مرتب اور منظم کرنے کے لیے قرآن مجید میں بہت سی ایسی ہدایات دی گئی ہیں جن کو عدالتوں اور ریاستوں کے ذریعے سے نافذ

کیا جانا ضروری ہے۔تو کیا قرآن مجید کو اس مفہوم میں قانون کی کتاب قرار دیا جاسکتا ہے جس مفہوم میں مثلاً پاکستان پینل کوڈ، قانون کی کتاب ہے۔ کیا قرآن مجید بھی اسی انداز اور اسی مفہوم میں قانون کی کتاب ہے؟۔

اسی طرح قرآن مجید میں علم معاشیات کی دلچسپی کے مسائل بھی ہیں۔ دولت کیا ہے؟ دولت کیسے پیدا ہوتی ہے؟۔ دولت کا مصرف کیا ہے؟ اس سے مزید دولت کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ یہ فلسفہ معاشیات کے اہم مسائل ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید معاشیات کی کتاب ہے تو یہ درست نہیں ہوگا۔

دراصل یہ کہنا کہ قرآن مجید فلسفہ، قانون، معاشیات یا ایسے ہی کسی اور مضمون کی کتاب ہے، یہ بات کتاب الٰہی کے درجہ کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ کتاب الٰہی کا درجہ ان انسانی علوم و فنون کی کتابوں سے بہت اونچا ہے۔ یہ تمام کتابیں جو کسی بھی انسانی یا اجتماعی مضمون سے تعلق رکھتی ہوں یہ سب کی سب کتاب الٰہی کی محتاج ہیں۔ جس حد تک یہ کتابیں کتاب الٰہی میں دی گئی ہدایات کے مطابق ہیں اس حد تک درست ہیں، اور جس حد تک یہ کتاب الٰہی کی ہدایات سے متعارض ہیں اس حد تک نا قابل قبول ہیں۔ ہم بلا تامل اور بلا خوف تردید ان سب کو غلط قرار دیتے ہیں۔

لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ خود اس کتاب کا اپنا موضوع اور مضمون کیا ہے۔ تھوڑا سا غور کرنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ کتاب کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ اس زندگی میں انسان کی صلاح اور اخروی زندگی میں انسان کی فلاح کو کیسے یقینی بنایا جائے۔ پورے قرآن مجید میں اسی بنیادی مضمون سے بحث ہوئی ہے۔ وہ تمام امور جو بالواسطہ یا بلا واسطہ اس زندگی میں انسان کی حقیقی (روحانی اور اخلاقی) کامیابی کے ضامن ہیں اور وہ تمام امور جو اخروی زندگی میں انسان کی دائمی اور حقیقی کامرانی کے لیے ضروری ہیں ان سب سے قرآن مجید میں بالواسطہ یا بلا واسطہ بحث کی گئی ہے۔ جو موضوعات و مباحث اس بنیادی مضمون سے زیادہ گہرا اور قریبی تعلق رکھتے ہیں ان سے اس کتاب میں زیادہ بحث کی گئی ہے، اور جو مباحث اس مرکزی موضوع سے براہ راست اور زیادہ گہرا تعلق نہیں رکھتے ان سے زیادہ مفصل بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ صرف سرسری اشارے کرنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے کسی صفحہ پر بھی کوئی ایک آیت بھی آپ کو ایسی نظر نہیں آئے گی جس کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ اس دنیاوی زندگی میں انسان کی

صلاح اور اُس اخروی زندگی میں انسان کی فلاح سے نہ ہو۔ یہ ایک بنیادی چیز ہے جسے قرآن مجید کے ہر طالبعلم کے سامنے رہنا چاہیے۔

لیکن یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب ہم یہ طے کر لیں اور یہ سمجھ لیں کہ قرآن مجید کا بنیادی مضمون اِس زندگی کی صلاح اور اُس زندگی کی فلاح ہے تو یہ مضمون تو اور بھی بہت سے علوم وفنون کا ہے۔ کئی انسانی علوم فنون ایسے ہیں جو بنیادی طور پر یہی بحث کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی کو کس طرح کامیابی سے ہمکنار کیا جائے۔ معاشیات بھی یہی بتاتی ہے کہ انسان معاشی کامیابی حاصل کرنے کے لیے کیا کرے۔ تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ انسان تاریخ کے نشیب وفراز سے کس طرح سبق حاصل کر کے اپنے مستقبل کو بہتر بنائے، علم الانسان بھی انسان کو یہی بتاتا ہے کہ انسان کیونکر ترقی کر سکتے ہیں۔ گویا ایک طرح سے تمام علوم وفنون خاص طور پر اجتماعی علوم (سوشل سائنسز) اور انسانیات (ہیومینیٹیز) یہ سب کے سب انسان ہی کی زندگی سے بحث کرتے ہیں اور انسان ہی کی کامیابی ان سب کا مقصد ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان علوم وفنون میں اور قرآن مجید میں کیا فرق ہے۔ اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو دو بہت بڑے فرق ہمارے سامنے آتے ہیں جو قرآن مجید میں اور دیگر تمام علوم و فنون میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلا اور بنیادی فرق تو یہ ہے کہ قرآن مجید نے انسان کو ایک جامع، متکامل اور متوازن وجود قرار دیا ہے، اور انسان سے ایک کلی وجود ہی کے طور پر بحث کی ہے۔ قرآن مجید نے انسانیات اور علوم اجتماعیہ کی طرح انسان کو مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا۔ معاشیات انسانی زندگی کا محض ایک حصہ ہے۔ سیاسیات انسانی سرگرمیوں کا محض ایک حصہ ہے، قانون پورے انسان سے بحث نہیں کرتا، بلکہ انسانی سرگرمیوں کے صرف ایک حصہ سے بحث کرتا ہے۔ علم کے یہ سب شعبے انسانی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ ان میں کوئی بھی بحیثیت مجموعی پورے انسان سے اس طرح بحث نہیں کرتا کہ اس میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا کامیابی سے احاطہ کر لیا گیا ہو۔ اس کے برعکس قرآن مجید انسان سے بحیثیت مجموعی ایک کامیاب، متکامل اور متوازن وجود کے طور پر بحث کرتا ہے۔ ایک بڑا فرق تو یہ ہے۔

دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ وہ علوم وفنون جو انسان سے بحیثیت انسان بحث کرتے ہیں۔ مثلاً علم الانسان یعنی انسان کا مطالعہ بحیثیت انسان۔ ان کے بارہ میں خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ

یہاں تو قرآن مجید اور علم الانسان کا مضمون ایک ہو گیا۔ پھر قرآن مجید اور دوسرے علوم میں فرق کیا رہا؟ اس سوال پر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں بھی دو بڑے بنیادی فرق پائے جاتے ہیں۔ علم الانسان یا اس طرح کے دوسرے علوم بنیادی طور پر انسانی زندگی کے صرف ایک حصہ سے بحث کرتے ہیں۔ ان علوم کو اصل دلچسپی اس سوال سے ہوتی ہے کہ انسان کا ارتقاء کیسے ہوا اور وہ کہاں سے آیا ہے۔ باقی ان علوم کو اس سوال سے کوئی غرض نہیں کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور اس کو بالآخر کہاں جانا ہے۔ یہ علوم صرف اس سوال سے بحث کرتے ہیں کہ اس وقت وہ کیا کرتا ہے۔

اس کے برعکس قرآن مجید کی اصل بحث یہ ہے کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ اور اسی بحث کے حوالہ سے وہ اس پر بھی بحث کرتا ہے کہ انسان کیا کرتا ہے۔

دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ یہ سارے علوم فنون اکثر و بیشتر انسان کے ماضی سے بحث کرتے ہیں کہ وہ ماضی میں کیا تھا؟ بندر تھا یا کیڑا تھا؟ اس کے علاوہ انسان کے رویہ، اس کی ذمہ داریوں اور اخلاقی اور روحانی کردار سے کسی کو زیادہ بحث نہیں۔ اس کے برعکس قرآن مجید نہ صرف انسان کے ماضی کا تذکرہ کرتا ہے، بلکہ اس کی اصل دلچسپی انسان کے مستقبل سے ہے۔ قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ انسان کے ماضی کے بارے میں جو تفصیلات جاننا ضروری ہیں ان کی طرف اشارے کر دیے جائیں تا کہ انسان مطمئن ہو جائے کہ اس کا وجود کسی منفی طرز عمل یا منفی پس منظر سے عبارت نہیں ہے۔ دنیا کی بہت سی اقوام میں انسان کے وجود اور آغاز کے بارے میں منفی پس منظر پایا جاتا ہے۔ ان مذاہب کے نزدیک کسی انسان نے ماضی میں کوئی بڑی غلطی کر دی تھی۔ ایسی غلطی کہ ہمیشہ کے لیے اس کی نسلیں اس غلطی کا خمیازہ بھگت رہی ہیں اور ہر شخص پیدائشی مجرم بن گیا ہے، ہر انسان کی پیشانی پر جرم کا ایسا دھبہ لگ گیا ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔ یہ انسان کے ماضی کے بارے میں کوئی خوش آئند بات نہیں ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان اپنے ماضی میں کتا، بلی، یا بندر تھا اور عارضی طور پر اسے ایک بہتر لباس دیا گیا۔ یہ وہ تصور ہے جس کو اواگون کہتے ہیں۔ جیسے آپ کسی خستہ حال اور بیمار شخص کو اچھا لباس پہنا دیں۔ جب تک اس کے اوپر اچھا لباس رہے گا اس کی حالت اچھی نظر آئے گی۔ جب یہ بشری جامہ اتارے گا تو پھر کتا، بلی یا بندر بن جائے گا۔ یہ انسانی زندگی کے آغاز کا اس سے بھی بدتر تصور ہے۔ اس سے بھی برا وہ تصور ہے جس کی رو سے

انسان کا آغاز کیڑے مکوڑوں سے ہوا۔

صرف قرآن مجید وہ واحد کتاب ہے جس نے انسان کے ماضی کے بارے میں ضروری تفصیلات بیان کر کے یہ بتا دیا کہ انسان کا آغاز ایک انتہائی قابل احترام حالت میں ہوا ہے۔اس کی پیدائش سے پہلے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی آمد کی خوش خبری سنادی تھی، اور اعلان فرما دیا تھا کہ وہ زمین میں اپنا جانشین پیدا فرمانے والا ہے۔اللہ تعالیٰ نے آدم کی پیدائش کے ارادہ کے اظہار کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کو نہ صرف خلافت کا اعزاز عطا کیا جائے گا، بلکہ اس کو علم اور فکر کی دولت سے بھی مالا مال کیا جائے گا۔ پہلے دن ہی یہ اعلان بھی فرما دیا گیا تھا کہ ،انی جاعل فی الارض خلیفہ،یعنی زمین میں اپنا جانشین بھیجنا مطلوب ہے۔اب یہ کہنا یا یہ سمجھنا کہ انسان کو جنت سے سزا کے طور پر نکالا گیا تھا یا کسی کم تر درجہ کی وجہ سے بلند مقام سے دھتکارا گیا تھا' درست نہیں ہے۔

یہ تصور دینے کے بعد پھر قرآنِ مجید انسانیت کے آغاز کی مزید تفصیلات سے بحث نہیں کرتا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ یہ بحث اور تفصیل قرآن مجید کے دائرہ بحث سے باہر ہے۔قرآن مجید کی دلچسپی انسان کے مستقبل سے ہے۔اس لیے کہ مستقبل کو انسان بگاڑ بھی سکتا ہے اور سنوار بھی سکتا ہے۔ ماضی کو نہ بگاڑا جاسکتا ہے' نہ سنوار جاسکتا ہے۔اگر آپ سے آج کہا جائے کہ آپ اپنے ماضی کو بنالیں تو آپ نہیں بنا سکتے۔اس لیے کہ ماضی تو ہمارے اور آپ کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ہم اپنے ماضی کے بارے میں اب کچھ نہیں کر سکتے،سوائے اس کے کہ اگر ہمارا ماضی خراب ہے تو اس پر اظہار ندامت کریں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں۔اور اگر ہمارا ماضی اچھا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکرادا کریں۔آج اگر ہم کچھ کر سکتے ہیں تو اپنے مستقبل کے لیے کر سکتے ہیں۔ہم اس کو سنوار بھی سکتے ہیں اور بگاڑ بھی سکتے ہیں۔اس لیے قرآن مجید کا زیادہ زور انسان کے اس پہلو پر ہے جو انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔اسی پر گفتگو کرنا مفید بھی ہے،اسی کے بارے میں بحث نفع بخش اور ثمر آور ہوگی۔جو چیز ثمر آور نہیں ہے اس کے بارے میں معلومات کا انبار لگانا قرآن مجید کی دلچسپی کا میدان نہیں ہے۔غالباً یہی وہ چیز ہے جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے:۔

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں' میری انتہا کیا ہے

ابتداء کے بارے میں نہ تو خردمندوں سے زیادہ پوچھنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ایک حد سے زیادہ خود غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ مستقبل کے بارے میں خود بھی غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے اور خردمندوں سے بھی پوچھنے کی ضرورت ہے کہ اپنے مستقبل کو کیسے بہتر بنایا جائے۔

اب اگر قرآن مجید کا بنیادی مضمون یعنی دنیوی زندگی میں صلاح اور اخروی زندگی میں فلاح آپ کے سامنے ہو تو پھر آپ دیکھیں گے کہ اس بنیادی مضمون سے بہت سے دوسرے موضوعات منسلک ہیں۔ اس سے بہت سی چیزوں کا تعلق بنتا ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیسی ہونی چاہیے؟، گھریلو زندگی کیسی ہو؟ انسان کا تعلق اپنے پروردگار سے کیسا ہو؟ انسان کا اپنے ماحول سے کیا تعلق ہو؟ انسان کے افکار وخیالات کیا ہوں؟ اس کا اپنے افکار اور خیالات کے ساتھ کیا رویہ ہو، انسان کے جذبات وعواطف اور کے احساسات کیا ہوں؟ یہ ساری چیزیں اس بنیادی مضمون سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے قرآن مجید نے ان تمام موضوعات سے بحث کی ہے۔

وہ مضامین جو قرآن مجید کے بنیادی موضوع سے گہرا تعلق رکھتے ہیں ان کو مختلف اہل علم نے مختلف انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مضامین قرآن مجید کے اساسی موضوعات یا بنیادی مباحث قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ ان اساسی موضوعات یا بنیادی مباحث کے ساتھ ساتھ کچھ اور موضوعات ایسے ہیں جن کا براہ راست تو اس اصل موضوع سے تعلق نہیں ہے، لیکن وہ عام انسان کے مشاہدہ کی چیزیں ہیں، انسان ان کا مشاہدہ کر کے ایک خاص حقیقت کا ادراک حاصل کر لیتا ہے۔ اس ادارک کے بعد اس کے لیے دوسری بہت سی چیزوں کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے بطور مثال اور شواہد ان چیزوں کو بھی بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید سائنس اور علوم تجربی کی کتاب نہیں ہے، اور نہ ہی قرآن مجید سائنسی ایجادات میں ممد ومعاون بننے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یہ کام انسان اپنی عقل اور تجربہ سے خود کر سکتے ہیں۔ پہلے بھی وہ یہ کام کرتے رہے۔ جب قرآن مجید نازل نہیں ہوا تھا اس وقت بھی غور وخوض کا یہ عمل جاری تھا۔ اور جو لوگ قرآن کو نہیں مانتے وہ بھی کرتے ہیں، اور جو مانتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں۔

تاہم بعض سائنسی حقائق ایسے ہیں جن کا مشاہدہ انسان ہر وقت کرتا ہے، لیکن ان سے وہ سبق حاصل نہیں کرتا جو قرآن مجید اس سے حاصل کروانا چاہتا ہے۔ اس لیے کہیں کہیں یاد دہانی

کے طور پر قرآن مجید میں بعض ایسے بیانات بھی ہیں جو سائنسی نوعیت کے ہیں، کیمیا، فزکس، فلکیات اور طبی علوم میں اہمیت رکھتے ہیں' ان کا تذکرہ قرآن پاک میں اس لیے کیا گیا کہ ان چیزوں کو انسان ہر وقت دیکھتا ہے۔ ان پر انسان ذرا غور و فکر سے کام لے تو ان کے ذریعے سے انسان آسانی سے ان حقائق تک پہنچ سکتا ہے جو قرآن مجید انسان کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔ ان اسباب اور حکمتوں کی وجہ سے ضمناً بعض ایسے مباحث بھی قرآن پاک میں آگئے ہیں جو اگرچہ اصل مباحث سے براہ راست تو کوئی تعلق نہیں رکھتے لیکن اصل مباحث کو سمجھنے اور ان کا ادراک حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ قرآن مجید کے بنیادی مضامین کو مختلف اہل علم نے مختلف انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ایک انداز حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کا ہے جس کی طرف میں مختصر اشارہ کروں گا جس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ شاہ صاحب قرآن مجید کے ان مضامین کو کس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ ایک لفظ ''تذکیر'' کا استعمال کرتے ہیں جس کے معنی ہیں یاد دلانا، اور یہ لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ قرآن مجید نہ صرف سابقہ آسمانی کتابوں میں دی گئی ہدایت الٰہی کی یاد دہانی ہے بلکہ خود قرآن مجید کے اپنے مضامین اور اساسی تعلیمات کی اس میں بار بار یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ اس لیے قرآن مجید کے مضامین کے سیاق و سباق میں تذکیر کا لفظ برمحل ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک قرآن مجید کے بنیادی مباحث یہ ہیں:۔

۱۔ تذکیر باحکام اللہ: یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو یاد دلانا۔ شاہ صاحب کی اصطلاح میں یہ قرآن مجید کا ایک بہت اہم اور بنیادی مضمون ہے۔ امت مسلمہ میں جو حضرات قرآن مجید کے اس مضمون میں زیادہ دلچسپی لیتے رہے اور جنہوں نے قرآن مجید کے اس پہلو پر گہرائی سے غور کر کے ان احکام کو زیادہ مرتب کیا وہ فقہائے اسلام کہلاتے ہیں۔ ان حضرات نے قرآن مجید میں بیان کیے گئے ان احکام کو اپنی زندگی کا ایک اختصاصی مضمون بنایا اور فقہ اسلامی کا ایک وسیع ذخیرہ پوری لائبریری کی شکل میں مرتب کر کے رکھ دیا۔ یہ فقہی احکام جو قرآن مجید میں بیان ہوئے جن کی مزید تفصیل حدیث میں آئی اور جن کے بارے میں مزید شرح و بسط سے فقہائے اسلام نے کام لیا اس کو شاہ صاحب نے چار اہم ذیلی عنوانات کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

۱۔ایک عنوان ہے عبادات کا، یعنی وہ اعمال جو انسان اور اللہ کے درمیان تعلق کو مضبوط کرتے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

۲۔ دوسرا عنوان ہے معاملات کا۔ یعنی وہ احکام جو انسان کے انسانوں کے ساتھ تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ ان احکام میں انسان کی گھریلو زندگی، نکاح، طلاق، خرید وفروخت اور جنگ اور صلح وغیرہ کے قوانین شامل ہیں۔ معاملات میں وہ سب چیزیں شامل ہیں جو قانون کا موضوع سمجھی جاتی ہیں۔

۳۔ احکام کا تیسرا شعبہ شاہ صاحب کے نزدیک تدبیر منزل ہے۔ یعنی انسان کی عائلی زندگی کی ترتیب اور نظم۔ یہ خاندانی روابط کا وہ معاشرتی پہلو ہے جس کی پاسداری کرکے ہی خاندان اور معاشرہ کے اداروں کو کامیابی سے چلایا جاسکتا ہے۔ خاندانی اور معاشرتی روابط کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پہلو قانونی حقوق وفرائض کا ہوتا ہے۔ جن کے حصول اور دادرسی کے لیے انسان عدالت میں جاتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی گھریلو زندگی کے بے شمار امور ایسے ہوتے ہیں جو عدالتی چارہ جوئی کے بجائے آپس کی افہام وتفہیم اور ہم آہنگی سے چلتے ہیں۔ ان کے لیے آدمی ہر وقت عدالتوں کا رخ نہیں کرتا۔ آپس کے حقوق وفرائض کو سمجھنا اور ان کا خیال رکھنا ہی خاندانی اور معاشرتی زندگی کے تحفظ کا ضامن ہوتا ہے۔

۴۔ چوتھی اور آخری چیز تدبیر مدن ہے۔ یعنی حکومتوں کے نظام کو چلانا اور اس میں ہدایات اور رہنمائی فراہم کرنا۔ یہ چار بڑے شعبے ہیں جنہیں شاہ صاحب احکام کی چار بڑی شاخیں قرار دیتے ہیں۔ گویا تذکیر باحکام اللہ جو قرآن مجید کے پانچ بڑے موضوعات میں سے ایک ہے۔ مذکورہ بالا چار ذیلی شاخوں پر مشتمل ہے۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک قرآن مجید کا دوسرا بنیادی مضمون مخاصمہ ہے۔ مخاصمہ سے مراد یہ ہے کہ دوسری اقوام یا دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے جو مکالمہ ہو اس کا اسلوب کیا ہو، اور اس کے قواعد اور مندرجات کیا ہوں۔ اس مکالمہ، یا قرآنی اصطلاح میں مخاصمہ، کا ایک خاص اسلوب قرآن مجید میں آیا ہے۔ دوسری اقوام کے غلط عقائد پر تبصرہ، ان غلطیوں کی اصلاح اور ان کی جگہ صحیح عقائد کی یاددہانی۔ اگر ان کی طرف سے کوئی اعتراض آئے تو اس اعتراض کا جواب اور اعتراض کی کمزوری کی وضاحت کہ وہ اعتراض کس غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس غلط فہمی کی تشریح۔ یہ

ساری چیزیں مخاصمہ کے ضمن میں آتی ہیں۔علماء اسلام میں وہ حضرات جواس مضمون سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور جنہوں نے اس پر زیادہ توجہ دی وہ متکلمین اسلام کہلاتے ہیں۔مخاصمہ کے ضمن میں قرآن مجید نے جہاں جہاں ضرورت سمجھی ہے وہاں گمراہ فرقوں کے عقائد کی تردید بھی کی ہے۔

گمراہ فرقوں میں قرآن مجید نے چار کو بہت اہمیت دی ہے۔ان میں سے دو کا ذکر اختصار کے ساتھ کل ہو چکا ہے، یہودی اور عیسائی۔ یہودیوں میں گمراہی کی کون سی شکلیں رائج ہیں اور ان کے اسباب کیا تھے۔اسی طرح عیسائیوں میں گمراہی کی کون سی شکلیں رائج ہیں اور ان کے اسباب کیا تھے۔ان سوالات پر قرآن مجید میں جابجا مباحث موجود ہیں۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے بعد قرآن مجید میں مشرکین کے عقائد پر تبصرے ہیں۔ مشرکین میں وہ تمام اقوام شامل ہیں جو بت پرستی کے کسی نہ کسی مرض میں گرفتار ہیں اور کسی آسمانی مذہب کی کوئی بدلی ہوئی شکل نہیں ہیں۔ان سب کو مشرکین کے ایک عمومی زمرہ میں رکھا گیا ہے۔

چوتھا اور آخری گروہ منافقین کا ہے۔قرآن مجید کی مدنی سورتوں میں ان کی زیادہ تفصیل ہے۔ خاص طور مدنی دور کے اہم واقعات ،مثلاً غزوہ احد، واقعہ افک،غزوہ مریسیع اور غزوہ احزاب کے ضمن میں منافقین کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے اندر نفاق کا جو مرض پیدا ہوا وہ کیونکر پیدا ہوا اور اس کے کیا عوامل اور محرکات تھے۔ یہ طرز عمل کس طرح اور کن اسباب سے پیدا ہوا۔اور مسلمان اس سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ یہ چار وہ طبقات یا مذہبی فرقے ہیں جن پر قرآن مجید نے تبصرہ کیا ہے اور یہ مخاصمہ کا خصوصی موضوع ہیں۔

تیسرا مضمون وہ ہے جس کو حضرت شاہ صاحب تذکیر بآلاء اللہ کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ یہ ایک اعتبار سے توحید اور عقائد ہی کا ایک مہتم بالشان شعبہ ہے۔ایک اعتبار سے یہ عقائد کا ایک پہلو ہے، اور ایک دوسرے اعتبار سے اپنی انفرادی شان بھی رکھتا ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی خالقیت اور اس کی قدرت کاملہ اور بندے پر اللہ تعالیٰ کے جو خاص انعامات ہیں ان کا تذکرہ اور بار بار یاددہانی خود اپنی جگہ ایک اہمیت کی حامل ہے۔ بندوں کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے جو عجیب وغریب نمونے دکھائے ہیں ان کو قرآن مجید میں آلاء کے جامع لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ان سب کی مسلسل یاددہانی اور تذکیر ضروری ہے تاکہ انسان ان میں غور وخوض کرے۔ان آلاء کی عظمتوں کا احساس کرے اور یوں اپنے اندر

شکر کا جذبہ پیدا کرے۔ جب شکر کا جذبہ پیدا ہوگا تو پھر عبادت کا ذوق پیدا ہوگا۔ اور جب عبادت کا ذوق پیدا ہوگا تو انسان فلاح کے اس راستہ پر چل پڑے گا جو قرآن مجید کی منزل مقصود ہے۔

تذکیر بآلاء اللہ میں وہ نعمتیں بھی شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے پہلے سے تیار کر دی تھیں۔ تخلیق آدم سے پہلے سے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو سامان تیار کیا ہوا تھا اور روئے زمین پر انسان کی راحت اور آرام کے جو اسباب فراہم کر دیے تھے ان کا تذکرہ جابجا قرآن مجید میں موجود ہے۔ انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کی خدمت کے لیے چاند، سورج، دریا، پہاڑ، سمندر، ہوا، پانی، جمادات، نباتات اور حیوانات سب موجود تھے، ان سب کو پیدا کر کے آخر میں انسان کو بھیجا گیا کہ اب سارا اسٹیج تیار ہے، جاؤ اور منصب خلافت سنبھالو۔ خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے پورا ماحول تیار کرنے کے بعد ہی حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا کہ اب آپ جا کر چارج لے لیں اور اپنی ذمہ داری سنبھال لیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں یا اس کے عجائب قدرت کے وہ کرشمے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے پہلے سے تیار کر کے رکھ دیے تھے۔ ان کا بھی تذکرہ ہے۔ ان کے علاوہ کچھ نعمتیں وہ ہیں جن کا ظہور اللہ تعالیٰ کی صفات سے مسلسل ہو رہا ہے۔ اور انسان ان کے ثمرات سے مستفیض ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت، اس کی صفت رحمت، اس کی صفت ربوبیت وہ چند اہم صفات ہیں جن کی برکات و ثمرات کا مشاہدہ ہر وقت ہر انسان کر رہا ہے۔ جن کے ثمرات سے ہر وقت ہر انسان متمتع ہو رہا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی عمومی نعمتوں کی یاددہانی، یہ حضرت شاہ صاحب کی نظر میں قرآن مجید کا تیسرا بنیادی مضمون ہے۔

قرآن مجید کا چوتھا بنیادی مضمون وہ ہے جس کو حضرت شاہ صاحب تذکیر بایام اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یعنی دین پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے نقطۂ نظر سے انسانیت کی تاریخ اور اس کا نشیب و فراز۔ ماضی میں جتنے اچھے انسان ہوئے، یا برے انسان ہوئے، ان کے واقعات۔ ان کو اس لیے بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے اچھے راستے کو اختیار کریں اور برے راستے سے بچیں۔

پانچواں اور آخری مضمون جو شاہ صاحب کے نزدیک قرآن مجید کا بنیادی مضمون ہے وہ تذکیر بالموت و مابعد الموت ہے۔ یعنی موت اور موت کے بعد آنے والے تمام واقعات کی یاد

دہانی۔ یوں تو یہ عقائد کا ایک حصہ ہے، لیکن چونکہ مرنے کے بعد کی زندگی کا عقیدہ ایک بہت اہم اور بنیادی عقیدہ ہے اس لیے اس کو ذہن نشین کرانے کا قرآن مجید میں خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر شاہ صاحب نے اس کو ایک الگ بنیادی مضمون کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔

یہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے بیان کردہ علوم خمسہ ہیں۔ جن میں انہوں نے قرآن مجید کے مضامین کو ایک خاص انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم اپنی سمجھ کے مطابق اگر جائزہ لیں تو شاہ صاحب کے بیان کردہ علوم خمسہ کی طرح ہمیں بھی قرآن پاک میں پانچ بنیادی مضامین نظر آتے ہیں۔ ان پانچوں میں سے ہر مضمون قرآن مجید کے ہر صفحہ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ موجود ہے، جس کا ہر قاری خود مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس سے کل والی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ قرآن مجید یہ چاہتا ہے کہ اس کی کل حقیقت بیک وقت قرآن کے قاری کے سامنے رہے۔ اور قرآن مجید کی کوئی اہم چیز کسی وقت بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ خاص طور پر جب قرآن مجید میں کسی خاص پہلو کو ذہن نشین کرایا جا رہا ہو تو بقیہ چیزیں کلیتہً نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائیں، بلکہ ان پر بھی نظر رہے۔

ان میں سب سے پہلا مضمون عقائد کا ہے۔ عقائد عقیدہ کی جمع ہے۔ عقیدہ قرآن مجید کی تعلیم کا وہ حصہ ہے جو انسان کی فکری سرگرمیوں کو مثبت اور بامعنی جہت عطا کرتا ہے اور اس کے فکری مشاغل کو صحیح خطوط پر منظم کرتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو انسان کی بنیادی قوتیں تین ہیں۔ ایک عقل اور فکر کی قوت ہے، جس کا مرکز دماغ ہے۔ دوسری اس کے احساسات اور جذبات کی قوت ہے جن کا مرکز دل ہے اور تیسری قوت اس کے ظاہری اعمال ہیں، جن کا مظہر انسان کے اعضاء اور جوارح ہیں۔ اکثر و بیشتر انسانی سرگرمیاں انہی تینوں میں سے کسی ایک کے دائرہ میں آتی ہیں۔ بعض اوقات عقلی اور فکری قوت کام کر رہی ہوتی ہے جسم ساتھ نہیں رہتا۔ جیسا امام شافعیؒ والے واقعہ میں ہم نے دیکھا کہ بظاہر ساکت بستر پر لیٹے ہوئے ہیں، لیکن ان کی عقل مسلسل کام کر رہی ہے۔ اور صبح تک سینکڑوں مسائل مستنبط کر چکی تھی۔ اسی طرح بعض اوقات دل میں جذبات کا ایک طوفان برپا ہوتا ہے مگر جسم پر کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جسمانی اعمال ہر وقت ہوتے رہتے ہیں اور ہر ایک کو نظر آتے ہیں۔

ان میں سے جو چیز انسان کی فکر سے تعلق رکھتی ہے اس کو منضبط کرنا عقائد کا کام ہے۔ عقیدہ کے لفظی معنی بہت دلچسپ ہیں۔ ان معانی سے عقیدہ کی نوعیت، اس کے دائرہ کار اور اس کے مقاصد کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کائنات کے بارے میں جو بنیادی سوالات کسی انسان کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کا جواب دے دیا ہے۔ انسان اس کائنات میں جب بھی کوئی نظام وضع کرے گا وہ پہلے یہ طے کرے گا کہ اس زندگی میں انسان کا بنیادی کردار کیا ہے۔ وہ کہاں سے آیا ہے اور کیوں آیا ہے۔ جب تک ان سوالات کا کوئی واضح جواب نہیں ملے گا اس وقت تک اس کا بنیادی کردار متعین نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنے ماحول سے اپنا تعلق معلوم ہو۔ اور اس کو یہ پتہ ہو کہ اس کو یہاں کتنے دن رہنا ہے اور پھر کہاں جانا ہے۔ یہ سب کچھ جانے بغیر نہ کوئی رویہ طے کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نظام تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ کل سے آپ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں آجائیں اور کام کریں تو آپ کے لیے وہاں اس وقت تک کام کرنا دشوار ہوگا جب تک آپ کو معلوم نہ ہو کہ آپ کا وہاں کیا کام ہوگا، کیا عہدہ ہوگا، اور کتنے دن آپ کو وہاں رہنا ہوگا، کس کے آگے آپ جوابدہ ہوں گے، اساتذہ، طلباء اور ملازمین کے ساتھ آپ کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔ ان سوالات کا جواب معلوم کیے بغیر آپ کے لیے کوئی کام بھی کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بھیجا تو اسے ان بنیادی سوالات کا جواب مرحمت فرمانا بھی ضروری سمجھا۔

اب ان بنیادی سوالات کے جواب میں تین شکلیں ہو سکتی ہیں۔ اور عقلاً تین ہی ممکن ہیں۔ چوتھی کوئی شکل ممکن نہیں ہے۔

ان سوالات کا جواب دینے کی ایک شکل تو یہ ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ فرماتے کہ ہم نے تمہیں ذہن دے دیا اور عقل دے دی۔ اب تم اپنے ذہن سے کام لو اور اپنے لیے ایک نظام زندگی بناؤ۔ لیکن اس صورت میں لازمی نتیجہ وہ نکلتا۔ جو کہ لا مذہبی معاشروں میں نکل رہا ہے کہ جتنے دماغ ہوتے اتنے ہی تصورات ہوتے، اور جتنے تصورات ہوتے اتنے ہی نظام ہوتے۔ نظام زندگی جو اس مقصد کے لیے ہوتا ہے کہ لوگوں کو نظم کی ایک لڑی میں پرو دے وہ افراتفری اور انتشار کا ذریعہ بنتا۔ اس لیے یہ طریقہ تو اللہ تعالیٰ نے اختیار نہیں فرمایا۔

یہاں ذرا ٹھہر کر انسانی دماغ کی حدود و قیود کو بھی دیکھ لیں۔ انسانی دماغ ایک کمپیوٹر کی

طرح ہے اور یہ انسانی کمپیوٹر اتنا sophisticated کمپیوٹر ہے کہ ابھی تک اس جیسا کوئی کمپیوٹر نہیں بنایا جاسکا۔ آج تک بننے والے سب کمپیوٹر اسی انسانی کمپیوٹر کی نقلیں ہیں۔ اصل یہی انسانی دماغ ہے اور کمپیوٹر اس کی نقل ہے۔ نقل کبھی بھی اصل کے برابر نہیں ہوسکتی۔ لیکن جس طرح ہر کمپیوٹر کسی نہ کسی ڈیٹا کا محتاج ہوتا ہے اسی طرح یہ کمپیوٹر بھی ڈیٹا کا محتاج ہے۔ اگر کسی کمپیوٹر کو فراہم کیا جانے والا ڈیٹا درست ہے تو وہ کمپیوٹر بھی درست جواب دے گا۔ اور اگر اس کو فراہم کیا جانے والا ڈیٹا ہی غلط ہے تو کمپیوٹر بھی غلط جواب دے گا۔

اگر آپ دنیا بھر سے بہترین کمپیوٹر تلاش کر کے لے آئیں اور اس میں غلط معلومات ڈال دیں، مثلاً آپ اس میں یہ فیڈ کر دیں کہ آپ کا نام چشمہ بیگم ہے اور آپ کے والد کا نام چاند الٰہی ہے، تو بڑے سے بڑے کمپیوٹر میں یہی ''معلومات'' محفوظ ہو جائیں گی۔ اب جب بھی آپ کمپیوٹر سے دریافت کریں گی کہ آپ کا نام کیا ہے تو وہ آپ کا نام چشمہ بیگم اور آپ کے والد کا چاند الٰہی بتائے گا۔ اس میں کمپیوٹر کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ وہ تو بالکل ٹھیک اور تازہ معلومات دے رہا ہے۔ اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

یہی حال دماغ کے کمپیوٹر کا ہوتا ہے۔ اس میں بھی اگر آپ صحیح معلومات ڈالیں گی تو یہ کمپیوٹر صحیح جواب دے گا۔ اور اگر غلط معلومات ڈالیں گی تو غلط جواب دے گا۔ اگر کمپیوٹر میں سرے سے کوئی معلومات ہی نہ ڈالی جائیں اور اس سے پوچھا جائے تو وہاں سے کوئی جواب نہیں آئے گا، سادی اور صاف اسکرین ہی آتی رہی گی، اس لیے کہ جس ڈیٹا کی ضرورت تھی وہ فراہم نہیں کیا گیا۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ انسانی دماغ اور عقل فی نفسہٖ کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ انسانی دماغ سے جواب لینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس پہلے سے درست معلومات کا ایک مناسب اور ضروری ذخیرہ موجود ہو۔

دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ دنیا میں آنے والے تمام انسانوں کے تمام سوالات کے جوابات دیے جائیں گے اور اس کائنات میں انسان کے مقام و مرتبہ کے بارہ میں جو جو سوالات اور شبہات انسانوں کے دماغوں میں آسکتے ہیں ان سب کا حل قرآن میں بیان کیا جائے گا۔ اگر یہ آپشن اختیار کیا جاتا تو لازماً اس کے دو نتیجے نکلتے۔ ایک نتیجہ تو یہ نکلتا کہ پھر انسان کا دماغ بے کار اور بے مصرف ثابت ہو جاتا اور اس کی حیثیت ایک روبوٹ سے زیادہ کی نہ

ہوتی، اور اسے محض ایک مشین کی طرح چلایا جاتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی جتنی مخلوقات ہمارے مشاہدہ میں آئی ہیں ان میں شاید انسانی دماغ سے اونچی کوئی چیز اب تک پیدا نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے کہ انسان بہترین مخلوق ہے اور بہترین مخلوق اپنے دماغ ہی کی وجہ سے ہے۔ اس دوسری صورت میں یہ انسانی دماغ بے کار ٹھہرتا۔ اس سے بھی بڑھ کر اس آپشن کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ نکلتا کہ پھر اللہ تعالیٰ قرآن مجید جیسی مختصر اور جامع کتاب کے بجائے ایک پوری لائبریری نازل فرماتے جو شاید کئی ہزار بلکہ کئی لاکھ کتابوں پر مشتمل ہوتی۔ نہ اس کتاب کو انسان یاد کر سکتے اور نہ یوں آسانی سے ہدایت حاصل ہوتی جس طرح قرآن پاک سے حاصل ہوئی۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ آپشن بھی اختیار نہیں فرمایا۔ ان دونوں امکانات کے ناقابل قبول قرار پانے کے بعد پھر تیسرا اور درمیانی طریقہ یہی تھا کہ ان تمام بنیادی سوالات کا جواب دے دیا جائے جو انسان خود اپنی عقل سے معلوم نہیں کر سکتا، جن چیزوں کا وہ تجربہ نہیں کر سکتا، جن امور کا وہ مشاہدہ نہیں کر سکتا اور جن باتوں کو وہ حواس خمسہ سے معلوم نہیں کر سکتا۔ ان سب کے بارہ میں قرآن مجید کے ذریعے سے اس کی رہنمائی کر دی جائے۔ پھر ان جوابات کے دائرہ کار میں انسان کی عقل کو آزادی دے دی جائے کہ جہاں تک جا سکے جائے، جہاں تک مرضی ہو وہ اپنے ذہن اور فکر کے گھوڑے کو دوڑائے، فکر و دانش کا میدان اس کے سامنے کھلا ہو اور جہاں تک وہ جانا چاہے جائے۔

یہ تیسرا آپشن ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اختیار کیا۔ اسی تیسرے آپشن کو منظم اور مربوط انداز میں بیان اور واضح کرنے کے لیے قرآن مجید نے عقیدے کی اساس اور اس کے بنیادی اصول عطا فرمادئے۔ عقیدہ کے لغوی معنی ہیں گرہ۔ عقدہ بھی اسی سے ہے۔ جب آپ دو رسیوں میں گرہ لگا کر ان دونوں کو ایک بنادیں اور پھر اس گرہ کو کھینچ کر مضبوط بھی کر دیں تو اس مضبوط گرہ کو عقیدہ کہتے ہیں اور بہت سی رسیوں کو جوڑ کر ایک بنادیں تو انہیں عقائد کہیں گے۔ اب سوال پیدا ہوگا کہ گرہ سے عقیدہ کا کیا تعلق ہے اور دونوں کے درمیان کیا نسبت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نسبت بڑی غیر معمولی اور بڑی دلچسپ نسبت ہے۔

اگر آپ سے کہا جائے کہ کسی ایسے بڑے ریگستان میں سفر کر کے منزل مقصود پر پہنچ جائیں جہاں نہ راستہ کی واضح نشان دہی ہو اور نہ یہ پتا ہو کہ کس سمت میں جانا ہے، صرف اتنا علم ہو

کہ اس ریگستان کے ایک طرف منزل مقصود ہے تو آپ کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہوگا کہ منزل کس طرف ہے۔ ہر سمت ایک جیسی نظر آئے گی۔ اگر اس ریگستان میں آپ کو راستہ نہ بتایا جائے تو انسانی ذہن بری طرح بھٹک جائے گا۔ عقیدہ سے مراد وہ رسیاں ہیں۔ جن کو باندھ کر کسی خاص راستہ کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ چلنے والا خود ہی چلتا ہے، رسیوں کا کام صرف راستہ کی نشان دہی کرنا ہے۔ جو ان رسیوں کے اندر اندر چلے گا۔ وہ راستہ پالے گا اور جو رسیوں کے اندر نہیں چلے گا وہ صحیح راستہ نہیں پائے گا۔ صحرا کی وسعتوں اور ریگستان کی پنہائیوں میں گم ہونے سے بچانے کے لیے جس طرح راستے کی نشاندہی کی جاتی ہے اسی طرح فکری صحراؤں اور عقلیات کے ریگستانوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے راستہ کی نشان دہی کردی ہے۔ یہی راستہ عقیدہ کہلاتا ہے۔

اسی طرح ہماری فکر بھی ان عقلی صحراؤں کی وسعتوں میں گم ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔ عقل کی راہنمائی اور ہدایت کے لیے دونوں طرف نشان لگا دیا گیا ہے۔ اس سے ایک واضح راستہ متعین ہو جاتا ہے، جس کے بعد بھٹکنے کا امکان نہیں رہتا۔ پھر آپ جتنا مرضی چلتے جائیں آپ کے لیے منزل مقصود پر پہنچنا آسان ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عقیدہ کو بیان کر کے انسانی فکر کو ایک واضح راستہ اور نہج عطا فرمایا ہے۔ یہ راستہ اتنا واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ میں ایک ایسا راستہ لے کر آیا ہوں جو نہایت سیدھا ہے' جس پر آنکھ بند کر کے بھی چلا جائے تو منزل مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ بہت آسان راستہ ہے۔ انتہائی نرم ہے، راستے میں کوئی اینٹ پتھر نہیں ہے۔ جب مہمانوں کے لیے راستہ بنایا جاتا ہے تو اسے صاف اور نرم بھی رکھا جاتا ہے۔ چٹانوں پر سے پھلانگ کر تو مہمان نہیں جایا کرتے۔ اس راستہ میں اتنی روشنی ہے کہ لیلھا کنہارھا۔ اس کی راتیں بھی اتنی روشن ہیں جیسے اس کے دن۔ اس راستہ میں کوئی الجھاؤ اور پریشانی نہیں۔ یہ راستہ انسانی فکر کو مثبت اور تعمیری رخ پر ڈالنے کے لیے قرآن مجید میں دیا گیا ہے۔

عقیدہ کی تین بنیادیں ہیں جن کا قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے۔ توحید، رسالت اور معاد۔ معاد کے لفظی معنی ہیں وہ جگہ یا وہ وقت جہاں آپ کسی سے ملاقات کا وقت مقرر کریں۔ معاد کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان سے اور ہر قوم سے ملاقات کا ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اس ملاقات کی تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ توحید، رسالت اور معاد کا آپس میں گہرا

منطقی ربط ہے۔ جب انسان کائنات پر تھوڑا سا بھی غور کرتا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہونا چاہیے اور ہے۔ اگر خالق ہے تو وہ حکیم بھی ہے۔ اس کو بڑا دانا، اور دانشمند ہونا چاہیے، کوئی بے عقل اور نادان تو یہ سارا نظام اس طرح نہیں چلا سکتا جس طرح چل رہا ہے۔ جب وہ دانا خالق ہوگا تو وہ دانا مدبر بھی ہوگا۔ اس لیے کہ وہ اس کارخانہ کو بنا کر ایک جانب بیٹھ نہیں گیا بلکہ ہر وقت اور ہر لحہ اس کو چلا بھی رہا ہے۔ وہ علیم بھی ہے، کہ علم کے بغیر کائنات کو چلانا ممکن نہیں ہے۔ اس طرح وہ ساری الٰہی صفات جو قرآن مجید میں اسماء حسنیٰ میں بیان ہوئی ہیں وہ اس ایک عقیدہ کے منطقی نتیجہ کے طور پر ایک ایک کر کے سامنے آتی چلی جائیں گی۔ اور انسانی عقل بھی یہ تسلیم کرتی چلی جائے گی کہ بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ عقل سلیم بھی اس کو تسلیم کرے گی۔

جب ایک دفعہ توحید کا عقیدہ انسان مان لے تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہم کام کیسے کریں۔ جب ہر جگہ اسی کی مرضی چل رہی ہے، آفتاب اور ماہتاب اس کی مرضی کے بغیر ذرہ برابر نہیں ہل سکتے، کائنات کی کوئی قوت اس کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کر سکتی تو ہم کیسے اس کی مرضی کے بغیر حرکت کر سکتے ہیں اور ہمیں کیوں ایسا کرنا چاہیے۔ لہٰذا ہمیں اس کی مرضی معلوم کرنی ہوگی۔ یوں ذرا غور کرنے سے رسالت اور نبوت پر یقین آگیا کہ وہ بھی ضروری ہے۔

جب نبوت اور رسالت پر عملدرآمد شروع کر دیں گے، تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ جو نیکوکار ہوں گے ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا رویہ کیا ہوگا۔ اور جو بدکار ہوں گے ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ یوں یہاں سے معاد پر یقین پیدا ہو گیا۔ گویا یہ تینوں عقائد آپس میں نہ صرف کلی طور پر مربوط ہیں بلکہ ایک دوسرے کا منطقی نتیجہ بھی ہیں۔ ایک پر یقین آ جائے تو باقی سب پر بھی ایک ایک کر کے یقین آتا چلا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس سارے غور و خوض کو انسان کی فطرت کا تقاضہ بتایا گیا ہے۔ عقائد میں صرف بنیادی چیزیں بتائی گئی ہیں۔

قرآن مجید کوئی علم الکلام کی کتاب نہیں ہے، البتہ اس میں اساسی اصول اور عقیدہ کی بنیادیں بتا دی گئی ہیں جو انسان کے طرز عمل کی بنیادیں بن سکتی ہیں۔ اور بلاشبہ بنی ہیں۔ بقیہ معاملات میں انسان کو آزادی حاصل ہے۔ عقیدہ کو سادہ اور واضح انداز میں سمجھنا اور سمجھانا چاہیے۔ قرآن مجید کی حدود میں رہ کر بیان کرنا چاہیے۔ کسی قدیم یا جدید فلسفے کے مباحث عقیدہ کو

کسی دور کی زبان میں بیان کرنے میں مدد تو دے سکتے ہیں، اور ان سے یہ کام لیا جا سکتا ہے، لیکن ان کو عقیدہ کا جز بنالینا درست نہیں۔

انسانی عقل و فکر کو اللہ تعالیٰ نے رد کا نہیں ہے، اس پر نہ کوئی قدغن ہے، نہ کوئی بندش، مگر اسے مناسب حدود کا پابند ضرور ہونا چاہیے، عقیدہ نے چند حدود مقرر کر کے انسانی عقل کو اپنی مناسب حدود کا پابند کر دیا ہے۔ جن تہذیبوں میں عقائد نہیں ہیں۔ یعنی جن انسانی تہذیبوں میں عقلی کاوشوں کو نشانات منزل نہیں بتائے گئے، یا سنگ میل کی نشاندہی نہیں کی گئی وہاں انسانی فکر ہر طرف بھٹکی ہے، اور مسلسل بھٹک رہی ہے۔ جو سوال پہلے دن اٹھائے گئے وہ آج بھی اٹھائے جا رہے ہیں۔ مغربی افکار کی تاریخ پر ہی نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ ہر مغربی مفکر اپنا نیا نظام فکر و فلسفہ لاتا ہے اور از سر نو ان تمام مسائل پر بحث اور کلام کرنا ضروری سمجھتا ہے جو روز اول سے ہزاروں لاکھوں بار زیر بحث آ چکے ہیں۔ یوں فکر کی کشتی مسلسل اس گرداب میں پھنسی رہتی ہے جہاں وہ تین ہزار سال سے پھنسی ہوئی ہے۔ اس کے برعکس مسلمان مفکرین کی بنیاد اور اساس ایک ہی ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں وہ فکری الجھنیں پیدا نہیں ہوئیں جن سے دوسری بہت سی اقوام کو سابقہ پیش آیا۔ اس کے باوجود اسلامی فکر کے ارتقاء میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ انسانی فکر میں جتنا تنوع ممکن ہے وہ عقیدہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے اسلامی فکر میں موجود ہے۔

جب قرآن مجید توحید کے بنیادی عقائد کا ذکر کرتا ہے تو اس کے پیش نظر یہ بات بھی رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں ماضی میں کن کن راستوں سے گمراہیاں آئی ہیں۔ قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ ایسی گمراہیوں کو پہلے ہی روک دیا جائے۔ مثال کے طور پر ہماری پڑوسی قوم کروڑوں خداؤں کو مانتی ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشن جو ہندوؤں کے نامور مفکر اور بیسویں صدی کے بہت بڑے فلسفی تھے اور ہندوستان کے صدر بھی رہے انہیں اپنے تمام تر تعقل اور تفلسف کے باوجود یہ بات بالکل عجیب نہیں لگی کہ ان کی قوم کروڑوں خداؤں کو مانتی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب انڈین فلاسفی میں اپنے عقیدہ کی نہ صرف فلسفیانہ توجیہہ کی بلکہ اس بت پرستی کا عقلی دفاع کرنے کی بھی کوشش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ خدائے مطلق کی صفات اور اس کے مظاہر اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا صحیح تصور واضح کرنے کے لیے اتنے بہت سے خداؤں کا ماننا ضروری ہے، یہ غلط فہمی کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ انہوں نے اپنی دانست میں اپنی قوم کے مشرکانہ رویہ کی عقلی

تعبیر کرنے کی کوشش کی کہ خدائے کبیر کو سمجھنے کے لیے اس کے لاتعداد حسی وجودوں کا ماننا بے حد ضروری ہے۔

آپ نے ہندوستان کے ڈاک کے ٹکٹ پر تری مورتی کی تصویر دیکھی ہوگی۔ یہ ہندوستان کا سرکاری نشان ہے۔ ہندوستان کے وزیر اعظم کی رہائش گاہ کا نام بھی تری مورتی ہاؤس ہے، حالانکہ ویسے وہ یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ وہ سیکولر ہیں اور ہندوستان میں پائے جانے والے تمام مذاہب کو برابر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔۔ تری مورتی سے مراد خدا کی تین بنیادی صفات اور ان کے مظاہر ہیں۔ خدائے خالق، خدا محی، خدائے ممیت۔

قرآن مجید نے اس غلط عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ خالق کائنات ایک ہی ہے، البتہ اس کے بہت سے خوبصورت نام ہیں۔ قرآن مجید میں صفات کی اصطلاح بھی استعمال نہیں کی گئی، بلکہ اسماء الحسنیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ پاکیزہ نام اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ ہم نے آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ پایا جاتا ہے اسے کسی کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ ہم نے اسے بامقصد اور حق پر مبنی ہدف کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ذہن میں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ کون کہتا ہے کہ کھیل کے طور پر بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ عربوں میں کوئی شخص یہ فضول اور بیہودہ عقیدہ رکھتا تھا، نہ عرب میں آباد دیگر مذاہب میں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا۔ لیکن ایک قوم دنیا میں موجود ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ سارا سنسار رام کی لیلا ہے۔ رام نے کھیل کے طور پر یہ کائنات پیدا کی ہے اور یہ جہاں بنایا ہے۔ یہ دنیا اس نے خوش طبعی اور وقت گذاری کے لیے بنائی ہے۔ جب اس کا دل بھر جائے گا تو اس کو توڑ پھوڑ دے گا۔ جیسے بچے ریت کے گھروندے بناتے ہیں، ان سے دل بہلاتے ہیں اور جب دل بھر جاتا ہے تو ان کو توڑ پھوڑ کر دوسری دلچسپ مصروفیات کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ ہندو علم الاصنام کے نزدیک اس تصور کی بنیاد پر کائنات کا پورا انظام بنا ہوا ہے۔ قرآن مجید نے اس مہمل نظریہ کو ایک لفظ میں مسترد کر دیا کہ یہ ساری کائنات حق کے ساتھ پیدا کی گئی ہے، اس کی بنیاد میں کوئی غیر سنجیدہ محرک یا عنصر شامل نہیں ہے۔

یہودیوں میں یہ عقیدہ نہ جانے کب سے چلا آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دن فلاں

مخلوق کو پیدا کیا، دوسرے دن فلاں مخلوق کو پیدا کیا اور تیسرے دن فلاں مخلوق کو پیدا کیا۔ اس طرح چھ دن کی مخلوقات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ساتویں دن اس نے آرام کیا، نعوذ باللہ وہ تھک گیا۔ قرآن مجید نے ایک لفظ میں اس سارے تصور کو غلط قرار دے دیا۔ ولم یعی بخلقھن۔ وہ ان سب کو پیدا کر کے تھکا نہیں۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح قرآن مجید نے ایک ایک دو دو الفاظ میں بڑے بڑے باطل افکار اور کافرانہ تصورات کو غلط قرار دیا۔ یہ اسلوب ہے، جو قرآن مجید نے عقائد کی وضاحت اور تعین کے لیے اختیار کیا ہے، انسانی فکر کی منزلیں متعین کرنے کے لیے گویا یہ راستے مقرر کر دیے۔ جہاں جہاں سے انحراف کے راستے کھل سکتے تھے وہ راستے بند کر دیے۔ جہاں کہیں گڑھے تھے اور انسان کا پاؤں دھنس سکتا تھا وہ گڑھے اور سوراخ بند کر دیے۔

ایک اور چیز عقائد کے بارے میں خاص طور پر قرآن مجید میں آئی ہے جو ماضی میں بڑی غلط فہمی کا ذریعہ بنتی رہی ہے۔ اس باب میں اگر الجھن پیدا ہو جائے تو انسان بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑی غلط فہمی انسان کو اپنے بارے میں ہو جاتی ہے۔ کبھی سمجھتا ہے کہ میں سب سے بڑا ہوں تو اپنے کو خدا سمجھ کر فرعون بن جاتا ہے۔ ہمارے اس زمانے میں بھی ایک افریقی ملک کا صدر تھا اس کے ماننے والے اس کو خدا سمجھتے تھے۔ ہر صبح اس کا چہرہ دیکھنا عبادت سمجھا جاتا تھا۔

اس کے برعکس کبھی ایک اور غلط فہمی انسان کو یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں تو کیڑوں مکوڑوں سے بھی بدتر ہوں۔ دنیا کی ہر چیز مجھ سے برتر اور افضل ہے۔ ہر چیز جو مجھ سے افضل ہے وہ میرے لیے خدا ہے۔ ہر وہ چیز جو مجھے نفع یا نقصان پہنچائے وہ میرے لیے خدا کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ بندر ہو، چھپکلی ہو، پیپل کا درخت ہو، گنگا اور جمنا کے دریا ہوں۔ ان سب کو معبود ٹھہرایا گیا ہے۔

قرآن مجید نے ان دونوں غلط فہمیوں کی تردید کر دی اور بتایا کہ انسان کا درجہ ہم نے اپنی تمام مخلوقات سے بلند کیا ہے۔ ولقد کرمنا بنی آدم و حملنا ھم فی البر والبحر ورزقنا ھم من الطیبات وفضلنا ھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔ یعنی ہم نے بنی آدم کو مکرم بنایا، بر و بحر میں ان کو سواریاں عطا کیں، ان کو پاکیزہ اور ستھری چیزوں پر مشتمل رزق عطا فرمایا اور اپنی

بہت سی مخلوقات پر ان کو بڑی فضیلت اور برتری عطا کی۔ لہٰذا جب ہم نے اکرام عطا کیا ہے تو دنیا کی کسی چیز کو دیوتا نہ مانو، ہر چیز سے تمہارا درجہ بلند ہے اور ہر چیز تمہارے لیے مسخر کی گئی ہے۔

اب دور جدید کے انسان نے ایک شخص کو تو خدا بنانا چھوڑ دیا ہے۔ البتہ ایک سے زائد اشخاص پر مشتمل گروہوں اور جماعتوں کو خدائی کا مقام ہمارے اس جدید دور میں بھی دیا جاتا ہے، مثال کے طور پر برطانوی پارلیمنٹ کو لے لیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ کو اختیار مطلق حاصل ہے ۔ وہ جو چاہے کرے، سوائے اس کے کہ وہ کسی مرد کو عورت نہیں بنا سکتی اور کسی عورت کو مرد نہیں بنا سکتی۔ یہ وہ قدرت کاملہ ہے جسے ہم اللہ تعالیٰ کے لیے مانتے ہیں۔ یہ پارلیمنٹ کو فرعون کے مقام پر فائز کرنے کے مترادف ہے، جس کو وہ جائز سمجھے وہ جائز ہے اور جسے ناجائز سمجھے وہ ناجائز ہے۔ جو حیثیت اہل عراق نے نمرود کو اور اہل مصر نے فرعون کو دی تھی وہ حیثیت اہل انگلستان نے پارلیمنٹ کو دے دی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلوں نے یہ خدائی حیثیت ایک فرد کو دی تھی اور پچھلوں نے ایک گروہ کو دے رکھی ہے، بعض اوقات گمراہی ایک شخص کی طرف سے آتی ہے تو محدود ہوتی ہے۔ لیکن اگر بہت سے انسانوں کی طرف سے گمراہی آئے تو اس کے اثرات بہت بڑھ جاتے ہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق عقائد سے ہے۔ قرآن مجید میں یہ سارے مضامین سورۃ فاتحہ سے لے کر والناس تک بیان ہوئے ہیں۔

قرآن مجید کا دوسرا بڑا مضمون احکام ہے۔ یعنی قرآن مجید کی وہ ہدایات اور تعلیمات جو انسانی زندگی کے ظاہری اعمال کو منظم کرتی ہیں۔ یہاں بھی قرآن مجید نے انسانوں کو غیر ضروری اصول و قواعد کے بوجھ تلے نہیں دابا، اور نہ ہی یہ قرآن مجید کا منشا ہے۔ قرآن مجید نے سابقہ اقوام کے اس طرز عمل کو غلط قرار دیا ہے، جس کے بموجب انہوں نے قانون کا غیر ضروری بوجھ لوگوں کے اوپر اتنا لاد دیا تھا کہ ان کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔

قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم اور شریعت کے اوصاف اور خوبیاں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یضع عنهم اصرهم والا غلل التی کانت علیهم۔ یہاں یہودیوں کی طرف بھی بالواسطہ اشارہ ہے کہ ان کے ربیوں اور راہبوں نے عوام الناس پر غیر ضروری ضابطوں اور لاتعداد اصول اور قواعد کا اتنا بوجھ لاد دیا تھا کہ لوگ اس سے اکتا گئے تھے۔

قرآن مجید نے واضح اور دوٹوک اعلان کیا کہ دین میں نہ کوئی سختی ہے اور نہ تنگی۔ ما جعل علیکم فی الدین من حرج، الدین یسر، اور ایسے ہی دوسرے اصول وقواعد شریعت کے احکام کی بنیاد ہیں۔

جس طرح عقائد میں بعض بنیادی ہدایات دی گئی ہیں اسی طرح احکام میں بھی بنیادی ہدایات دی گئی ہیں۔ براہ راست احکام پر مبنی آیات قرآن مجید میں صرف دو سو یا سوا دو سو ہیں، اور اتنی ہی مزید ہیں جو احکام سے بالواسطہ تعلق رکھتی ہیں۔ بقیہ چھ ہزار ایک سو آیات دوسرے معاملات سے متعلق ہیں۔ یہ حدود جو قرآن مجید نے دی ہیں یعنی حلال، حرام، مستحب، وغیرہ، ان کے اندر رہتے ہوئے امت کے اہل علم اپنے اجتہاد اور اجماع سے ضروری تفصیلات طے کر سکتے ہیں۔ ان تفصیلات کی قیامت تک کوئی انتہا نہیں ہوگی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک کئی منزلہ عمارت بنائی جائے اور اس کی گہری بنیادیں رکھی جائیں۔ تکمیل کے بعد اس عمارت کی اندر سے تزئین وآرائش اور زیب وزینت ہوتی رہے، اندر سے سامان تبدیل کیا جاتا رہے، اس کی جزوی ترتیب وآرائش بدلی جاتی رہے۔ باقی عمارت کا ڈھانچہ اور بنیادیں وہی رہیں، اس کا رنگ وروغن تبدیل ہوتا رہے، حالات کے لحاظ سے اندرونی اور جزوی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ موسم کے لحاظ سے، علاقے کے لحاظ سے، اور زمانہ کے لحاظ سے لوگ حسب ضرورت جزوی ردوبدل کرتے رہیں۔ احکام کے باب میں قرآن مجید کا یہی انداز ہے۔ احکام کے لیے فقہ کی اصطلاح مروج ہے۔

فقہ کے لفظی معنی ہیں گہری سمجھ۔ آپ سوچیں گے کہ گہری سمجھ کا اور قانون کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ ذرا سا غور کریں تو پتا چل جاتا ہے کہ ان دونوں میں بہت گہرا تعلق ہے۔ قرآن مجید میں جو آیات احکام ہیں وہ تو دو ڈھائی سو آیات سے زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ چند سو آیات لامتناہی حالات ومسائل پر منطبق ہو رہی ہیں۔ انسانی زندگی میں بے حد وحساب اور بے شمار کیفیات اور لاتعداد معاملات ہر وقت اور ہر لمحہ ہر شخص کو پیش آرہے ہیں۔ یہ سارے کے سارے معاملات ان ڈھائی سو نصوص سے منضبط ہو رہے ہیں۔ ان محدود نصوص کو لامحدود حالات پر منطبق کرنے کے لیے گہرے غور وفکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب تک عمیق فہم سے کام نہ لیا جائے اس وقت تک ان ڈھائی سو نصوص کو زندگی کے لامتناہی گوشوں میں منطبق کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا فقہ یعنی گہری فہم و بصیرت اس سارے عمل کا لازمی حصہ ہے۔ یہ قرآن مجید کا دوسرا بنیادی مضمون تھا۔

تیسرا بنیادی مضمون ہے اخلاق، تزکیہ اور احسان۔ یعنی وہ چیز جو انسان کے جذبات اور احساسات کو منضبط کرے وہ اخلاق، تزکیہ اور احسان ہے۔ تزکیہ کی اصطلاح قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہے و یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم۔ تزکیہ سے مراد ہے روحانی پاکیزگی کا ایسا عمل جس کے نتیجہ میں انسان اندر سے پاکیزہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق اتنا مضبوط ہو جائے جتنا ہونا چاہیے۔ اس عمل کا نام جو تربیت کے ایک پورے نظام عمل سے عبارت ہے 'تزکیہ' ہے۔ جب انسان پاکیزگی اور تزکیہ کے اس طویل عمل سے گزرتا ہے تو وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ جو احسان کا مقام کہلاتا ہے۔ اس کا ذکر اس مشہور حدیث میں ملتا ہے جو حدیث جبریل کہلاتی ہے۔ اس حدیث کے بموجب احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، اس لیے کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

یہ احساس کہ میں ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہوں اور وہ کسی وقت بھی، ایک دقیقہ اور ایک ثانیہ کے لیے بھی، میرے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ احساس انسان کے اندر ایک انقلابی قوت اور غیر معمولی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے پھر انسان اگر اپنی سابقہ کیفیت کا موجودہ کیفیت سے موازنہ کرے تو اسے زمین اور آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ پہلی زندگی حیوانات کی زندگی تھی اور اب اصل زندگی شروع ہوئی ہے۔ جب یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے تو پھر انسان کا ہر عمل، خواہ، وہ تنہائی میں ہو یا رات کی تاریکی میں، صرف اللہ رب العزت کی رضا کے لیے ہو جاتا ہے، اسی سے وہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے کہ ایک نوجوان خاتون رات کی تاریکی میں یہ سوچ کر دودھ میں پانی نہیں ملاتی کہ اگر عمر نہیں دیکھ رہا تو عمر کا خدا تو دیکھ رہا ہے۔ یہ احسان کا مقام ہے جو تزکیہ کے نتیجہ میں دودھ فروخت کرنے والی لڑکیوں تک میں پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ قرآن مجید کا تیسرا بنیادی مضمون ہے۔ تزکیہ اور احکام کے باب میں ایک چیز اہم ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک احکام کا تعلق ہے وہ اکثر و بیشتر مدنی سورتوں میں نازل ہوئے۔ مکی سورتوں میں احکام نہیں ہیں۔ اخلاق و تزکیہ کی ہدایات دونوں جگہ ہیں۔ سورۃ مومنون اور سورۃ فرقان میں' جو دونوں مکی سورتیں ہیں اخلاقی احکام دیے گئے ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ اخلاق پر عمل کرنے کے لیے نہ کسی ریاست کی ضرورت ہے۔ نہ قانون کی اور نہ کسی سیاسی ادارے کی۔ تمام

اہل ایمان قرآن مجید کی اخلاقی ہدایات پر عمل کرنے کے پابند ہیں، چاہے ریاست کا وجود ہو یا نہ ہو، اخلاق اور روحانیات ہی میں عبادات بھی شامل ہیں اور ہر جگہ ہر فرد پر ان کی پابندی لازم ہے۔ ان امور پر علمدرآمد کے لیے کسی اسلامی حکومت یا مسلم معاشرہ کا وجود ضروری نہیں ہے۔

قرآن مجید کا چوتھا بڑا مضمون امم سابقہ کا تذکرہ ہے، جس میں قصص القرآن بھی شامل ہے۔ اس تذکرہ میں قرآن مجید نے دو قسم کے تذکرے کیے ہیں۔ ایک تذکرہ تو ان حضرات کا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نبی اور مقرب بندے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات دوسروں تک پہنچا کر اور ان کی پیروی کر کے دنیا سے چلے گئے۔ ان کے بارے میں قرآن مجید کا کہنا ہے کہ ان میں سے بعض کے واقعات ہم نے آپ سے بیان کیے اور بعض کے بیان نہیں کیے۔ ایسا کیوں ہے؟ اگر انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے، تو پھر صرف ۲۵ انبیاء کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ اگر سب کا نہ سہی تو کم از کم دو چار سو کا ذکر تو ہوتا۔

یہ واقعی ایک اہم سوال ہے جس پر غور کرنا چاہیے۔ اگر میری ایک سابقہ گفتگو کو ذہن میں رکھا جائے جس میں میں نے عرض کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتیں دراصل دو ہیں۔ ایک براہ راست بعثت جو عربوں کے لیے تھی، دوسری بعثت جو عربوں کے واسطے سے غیر عربوں کے لیے تھی۔ اسلوب کے ضمن میں میں نے بتایا تھا کہ قرآن مجید میں بہت سے مضامین خاص عربوں کی رعایت سے آئے ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جس سے عرب واقف تھے، اور نہ صرف واقف تھے بلکہ ان میں سے بہت سے امور ان کے مزاج اور ثقافت کا حصہ تھے۔ چنانچہ جن انبیاء کرام کے ناموں سے عرب لوگ مانوس تھے ان کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ وہاں یہ منوانا مقصود نہیں تھا کہ فلاں فلاں اشخاص جو مثلاً ہندوستان، جاپان یا چین میں بھیجے گئے تھے وہ واقعتاً نبی تھے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو عربوں کے لیے ایک دوہرا شاخسانہ کھڑا ہو جاتا۔ لوگ اصل بات کو نظر انداز کر کے یہ بحث شروع کر دیتے کہ فلاں صاحب جن کا نام آیا ہے وہ فی الواقع نبی تھے کہ نہیں تھے، یہ ایک خالص مؤرخانہ سوال ہوتا جو قرآن مجید کے مقصد سے غیر متعلق ہے۔

چونکہ وہاں مقصود صرف نبوت کا اصول اور منصب منوانا تھا اس لیے صرف انہی انبیاء کا نام لیا گیا جن کو قرآن کے اولین مخاطبین، یعنی عرب لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ وہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام سے اس حد تک واقف تھے کہ یہ دونوں بہت عظیم بادشاہ گذرے

ہیں۔ بتایا گیا کہ وہ نبی بھی تھے۔ وہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کے نام لیوا تھے۔ اس لیے ان کے حوالہ سے دین کی بہت سی باتیں ذہن نشین کرانا مناسب تھا۔ دیگر متعدد پیغمبروں کے ناموں سے مانوس تھے۔ ان کو بتایا گیا کہ وہ سب بھی توحید پرست تھے۔

غیر عربوں کی مثالیں دینے سے دیگر الجھنیں بھی پیدا ہوسکتی تھیں۔ مثال کے طور اگر ہندوستان میں کوئی کرشن جی نبی آئے ہوں تو عربوں کے لیے قرآن مجید کے اولین مخاطب کے طور پر یہ ماننا ضروری نہیں تھا کہ واقعی ہندوستان کے لیے بھیجے جانے والے نبی کا نام کرشن جی تھا۔ اس وقت اصل مقصود نبوت کا منصب ان سے منوانا تھا، اس لیے ان کے جانے پہچانے انبیاء ہی کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔ اور چونکہ نبوت کی آخری کڑی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لیے آپؐ کی سیرت و کردار کی تفصیل بیان کردی گئی۔

سابقہ انبیاء میں سے ہر نبی نام بنام جاننا مسلمان ہونے کے لیے ضروری نہیں ہے، صرف یہ جاننا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اور جہاں اور جس کو نبی بنا کر بھیجا وہ سچا اور برحق تھا۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ اصل مقصد پر نظر مرکوز رہے اور مقصد سے ہٹ کر غیر ضروری مباحث نہ شروع ہوجائیں۔ اس سے ایک اور سبق یہ بھی ملتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے میدان میں غیر ضروری بحث اٹھانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

ان انبیاء کرام کے تذکرہ کی ایک وجہ تو یہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید محض تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ قرآن کو ان واقعات سے اس انداز کی دلچسپی نہیں ہے جس انداز کی ایک مورخ کو ہوتی ہے۔ قرآن صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ انبیاء کی تعلیمات کیا تھیں۔ اور ان کا رویہ اور طرزِ عمل کس طرح کا تھا، تاکہ دوسرے بھی اسی طرح کا رویہ اختیار کریں۔ اس تذکرہ میں قرآن مجید نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ان انبیائے کرام کے تذکرہ کو ترجیح دی ہے جو اہم مکارم اخلاق کی خصوصی طور پر نمائندگی کرتے تھے۔ قرآن صبر، شکر، ہجرت، قربانی اور جابر حکمرانوں کے سامنے جرات سے حق بات کہہ دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ انبیاء کرام جن کا قرآن پاک میں ذکر آیا ہے خاص طور پر ان اوصاف کا عملی نمونہ تھے۔ صبر کی نمائندگی جتنی حضرت ایوب علیہ السلام کی زندگی میں نظر آتی ہے اتنی دوسری جگہ نہیں ملتی، اگرچہ صبر کی یہ صفت تمام انبیاء میں موجود تھی۔ مگر جتنی واضح ہوکر ایوب علیہ السلام کی زندگی میں نمایاں ہوئی اتنی کسی اور کے ہاں نمایاں نہیں ہوئی۔ شکر حضرت

سلیمان علیہ السلام کی زندگی میں جتنا ملے گا اتنا کسی اور نبی کے ہاں نمایاں ہو کر نہیں آئے گا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسی نعمتیں بھی کسی کو عطا نہیں ہوئیں۔ قربانی ہر نبی نے دی ہے، مگر جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات مبارک میں یہ چیز منعکس ہو رہی ہے اس طرح کسی اور کی ذات میں نہیں ہو رہی ہے۔ ظالم بادشاہ کے سامنے بہت سے نبی کلمہ حق لے کر کھڑے ہوئے۔ مگر جس جرات کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے سامنے کھڑے ہوئے وہ ضرب المثل بن گئی، ہر فرعونے راموسیٰ جیسی ضرب الامثال دنیا کی ہر مسلم زبان میں ملتی ہیں۔ اتنی جراءت کردار کہ انسان کا نام ضرب المثل بن جائے بہت کم انسانوں کو نصیب ہوتی ہے۔

اس طرح یہ پچیس کے پچیس انبیاء کرام خاص خاص انسانی اوصاف کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کچھ نبیوں کا ذکر صرف چند الفاظ میں ہی آیا ہے۔ مثلاً حضرت عزیر علیہ السلام۔ ان کے اوپر موت طاری ہوگئی تھی، اللہ تعالیٰ نے طویل عرصہ بعد انہیں دوبارہ زندہ کر کے کھڑا کر دیا اس لیے اس غیر معمولی واقعہ کی وجہ سے ان کا تذکرہ آ گیا۔

یہ انبیاء کرام کی سیرت کا تذکرہ ہے جو قرآن مجید میں جا بجا بکھرا ہے۔ جب قرآن مجید کا قاری یہ تذکرے بار بار پڑھتا رہے گا تو اس کے سامنے یہ سارے انسانی اوصاف اور اخلاقی خصائل متشکل ہو کر آتے رہیں گے۔ قرآن مجید کا پڑھنے والا انبیاء کرام کی روحانی معیت میں زندگی گزارے گا۔ ہر وقت اس کے سامنے یہ مناظر رہیں گے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے کیسے صبر کیا، حضرت سلیمانؑ نے کیسے شکر کیا، حضرت ابراہیمؑ نے کیسے قربانی دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیسے حق بات کہی۔ انسانی ذہن اور کردار سازی پر اس کا جو اثر ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے وہ واضح ہے۔

ان تمام خوبیوں اور کمالات کا مجموعہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ آپؐ کا تذکرہ قرآن مجید میں بقیہ تمام انبیاء کرام سے زیادہ ہے۔ آپؐ کی زندگی کے تمام اہم ترین واقعات قرآن مجید میں محفوظ ہیں، غزوات، ہجرت، فتح مکہ، وغیرہ۔ قرآن پڑھنے والا واقعتاً یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ سیرت کے ماحول میں زندگی گزار رہا ہے۔ اگر قرآن کا قاری قرآن پاک کو سمجھ کر پڑھتا ہے تو روحانی طور پر وہ انبیاء کرام کی معیت میں زندگی گزارتا ہے۔ اس کا اثر انسان کے کردار میں اتنا غیر معمولی اور غیر محسوس طریقے سے پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اندازہ ان لوگوں سے

تقابل کر کے ہو سکتا ہے جو قرآن مجید کو اس طرح نہیں پڑھتے جیسا کہ پڑھنا چاہیے۔

یہ ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو قرآن مجید کی نظر میں مثبت رول ماڈل ہیں۔ دوسرا تذکرہ امم سابقہ کے حوالہ سے ان منفی کرداروں کا ہے جو گمراہی اور انحراف کا نمونہ ہیں۔ گمراہی اور انحراف انسان کی زندگی میں جتنے راستوں سے آتا ہے وہ دو ہیں۔ انحراف کی ذیلی قسمیں تو بے شمار ہیں، لیکن یہ دو بڑے بڑے راستے ہیں۔ ایک انحراف آتا ہے کسی نعمت کے آنے کے بعد اور دوسرا انحراف آتا ہے نعمت کے چھن جانے بعد۔ بعض اوقات نعمت آتی ہے تو انسان پھولا نہیں سماتا۔ مثلاً اقتدار مل جائے تو فرعون اور نمرود بن جاتا ہے بعض اوقات اقتدار تو نہیں ملتا۔ لیکن اقتدار کی مصاحبت ملتی ہے تو وہ ہامان بن جاتا ہے۔ اور بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا۔ ہامان کا وقت کے حکمران سے بڑا قرب تھا۔ اس لیے اس قرب کے نشہ میں مبتلا ہو گیا اور راہ راست سے بھٹک گیا۔

بعض اوقات انسان دولت کے نشے میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس نشہ میں راہ راست سے بھٹکتا ہے۔ اس کے لیے قارون کی مثال دکھائی گئی۔ کبھی نہ دولت ہوتی ہے نہ اقتدار ہوتا ہے، نہ اقتدار سے قربت ہوتی ہے۔ لیکن کسی بڑے آدمی سے رشتہ داری کی بناء پر انسان بہک جاتا ہے۔ انسانی تاریخ میں ہزاروں لاکھوں بڑے بڑے انسان گذرے ہیں۔ انبیاء کرام سے بڑا کون ہو گا۔ اس غرض کے لیے انبیائے کرام کے رشتہ داروں کی مثالیں دی گئیں، اور ایسے رشتوں کا انتخاب کیا گیا جن کی بدولت انسان بہکتا ہے۔ یعنی حضرت نوح اور حضرت لوط علیہم السلام جیسے جلیل القدر ہستیوں کی بیویاں۔ دو مقرب بندوں کی بیویاں، جنہوں نے جب بے وفائی کی تو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ان کے شوہران کے کچھ کام نہ آ سکے، بلکہ ان سے کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ جہنم کی آگ میں داخل ہو جاؤ۔ نیک بیوی اور بدکار شوہر کے طور پر فرعون اور آسیہ کی مثال دی گئی۔ کسی کے باپ کا ذکر ہے۔ اور کسی کے بیٹے کا ذکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے اہل خاندان تھے اور آپ کے تمام قریبی اعزہ آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے۔ صرف ایک بدبخت چچا تھا جو اسلام کا شرف حاصل نہ کر سکا۔ ابولہب کا ذکر قرآن مجید میں نام لے کر کیا گیا۔ تنبیہ کی گئی کہ اگر حضورؐ جیسی ذات اقدس کا چچا بھی گمراہ ہو گا تو اس کو کڑی سزا دی جائے گی۔

یہ وہ مضامین ہیں جو امم سابقہ کے حوالہ سے قرآن مجید میں آئے ہیں۔ایک اعتبار سے یہ عقیدہ ہی کی تکمیل ہیں کہ ان واقعات کے تذکرہ سے عقیدہ مضبوط ہوتا ہے۔ایک اعتبار سے یہ احکام کی تکمیل ہیں کہ ان سے احکام پر عمل کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور ایک اعتبار سے یہ اخلاق کی تکمیل ہیں کہ ان سے اخلاق روشن ہوتے ہیں۔اس طرح یہ دراصل گذشتہ تینوں بنیادی مضامین کا یعنی، عقائد، احکام اور اخلاق کا تکملہ اور تتمہ ہیں اور ان تینوں کو reinforce کرنے کے لیے ہیں۔

آخری چیز جو ان چاروں کو reinforce کرتی ہے وہ موت اور مابعد الموت کا تذکرہ ہے۔یعنی مناظر موت، ان مناظر و مشاہد کے بارے میں گذشتہ دنوں کی وہ گفتگو ذہن میں رکھیے جس میں میں نے عرض کیا تھا کہ جیسے فلم کا ایک شارٹ ہوتا ہے۔اور مختصر ترین وقت میں بڑے بڑے مناظر دکھا دیے جاتے ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں مختصر ترین الفاظ میں یہ امور بتائے گئے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ قیامت کی ہولناکی کے منظر کو ذہنوں میں بیدار اور تازہ رکھا جائے۔اس لیے کہیں حساب کتاب کا منظر ہے۔کہیں حشر کا منظر ہے اور کہیں جنت اور دوزخ کا ذکر ہے۔

ایسا تو بارہا ہوا ہے کہ کسی سورت یا سلسلہ بیان میں صرف جنت کا تذکرہ ہے۔اور دوزخ کا نہیں ہے۔لیکن ایسا کہیں نہیں ہے کہ صرف دوزخ کا ذکر ہو اور جنت کا تذکرہ نہ ہو۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے۔جنت اس کی رحمت کا شاہکار ہے۔اور دوزخ اس کی سزا اور غضب کی نشانی ہے۔اللہ تعالیٰ نے جہنم کے ساتھ جنت کا تذکرہ ضروری قرار دیا، لیکن جنت کے ساتھ جہنم کا تذکرہ ضروری نہیں ہے۔

یہ ہیں قرآن مجید کے وہ بنیادی مضامین جو اس کے اصل موضوع سے براہ راست متعلق ہیں۔یعنی انسان کی اس موجودہ زندگی میں صلاح اور اس آئندہ زندگی میں فلاح کو کیسے حاصل کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کا جانشین کیوں کر بن کر دکھایا جائے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے مسائل اور موضوعات قرآن پاک میں آئے ہیں۔بعض جگہ طبی نوعیت کے مسائل ہیں۔بعض جگہ ماحولیات کا تذکرہ ہے یہ سارے مسائل بھی انہی پانچ مضامین کو ذہن نشین کرانے کے لیے ہیں۔اور اور بالا آخر ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ قرآن مجید کا اصل مضمون انسان کے سامنے تازہ اور بیدار رہے۔

خطبہ دوازدہم

تدریس قرآن مجید

دور جدید کی ضروریات اور تقاضے

۱۹۔اپریل ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک اعتبار سے تدریس قرآن مجید کی ضروریات اور تقاضے ہر دور میں یکساں رہے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا، جس میں انہیں درس قرآن کی ضرورت نہ رہی ہو، اور اس کے تقاضوں اور ضرورت پر گفتگو نہ ہوئی ہو۔ اسلام کی ابتدائی بارہ تیرہ صدیوں میں کوئی صدی ایسی نہیں گذری جب مسلمانوں کے نظام تعلیم اور ان کے نظام تربیت میں قرآن مجید کو بنیادی اور اساسی اہمیت حاصل نہ رہی ہو۔ پھر مختلف ادوار، مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں مسلمانوں کے ذہن میں جو سوالات وحی اور نبوت کے بارے میں پیدا ہوتے رہے ہیں، وہ کم وبیش ہر دور میں یکساں رہے ہیں۔ بلکہ وحی و نبوت اور حیات بعد الممات جیسے بنیادی عقائد کے بارے میں منکرین خدا جن شبہات واعتراضات کا اظہار کرتے رہے ہیں ان کی حقیقت بھی ہر دور میں کم وبیش ایک جیسی ہی رہی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک تک قرآن مجید نے مختلف لوگوں اور مختلف شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ان شخصیات کے ہم عصر لوگوں اور ان کے زمانہ میں رائج خیالات اور باطل عقائد کی تردید بھی کی ہے۔ یہ غلط خیالات اور باطل عقائد تقریباً ایک جیسے ہی ہیں۔

دراصل ہر دور میں خاص عوامل اور خاص محرکات مختلف قسم کے اعتراضات کو جنم دیتے رہے ہیں۔ مثلاً ایک بڑا اعتراض قرآن مجید اور اس سے قبل آنے والی وحی پر عموماً یہ رہا ہے کہ اس پیغام کو ماننے والے اور اس کو لے کر اٹھنے والے اکثر وبیشتر معاشرہ کے کمزور اور بے اثر لوگ ہیں۔ معاشرہ کے بااثر اور ذی اقتدار لوگ زیادہ تر مخالفت ہی پر کمربستہ رہے۔ اس طبقہ کے ہر شخص کے اندر یہ تعلّی ہوتی ہے کہ چونکہ مجھے مادی وسائل حاصل ہیں اور مال ودولت بھی میسر ہے اس لیے عقل وفہم بھی مجھے وافر مقدار میں ملی ہے۔ یہ غلط فہمی ہر دور کے انسان کو رہی ہے۔ آج بھی یہ غلط فہمی وسیع

پیمانہ پر پائی جاتی ہے کہ جس شخص کے پاس مادی وسائل زیادہ ہوں تو یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ عقل و فہم بھی اس کے پاس زیادہ ہے۔ قرآن مجید نے اس اعتراض کا جو جواب دیا ہے وہ ہر دور اور ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے ہے۔

اسی طرح سے ایک خاص خطرہ لوگوں کو یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جب دین کا نظام آئے گا اور وحی پر مبنی حکومت قائم ہوگی تو رائج الوقت نظام بدل جائے گا۔ فرعون نے بھی یہی کہا تھا کہ یہ دونوں حضرات، یعنی حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیہما السلام، تمہارے اس مثالی نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں جو تمہارے ہاں رائج ہے، اس کی جگہ یہ لوگ ایک نیا نظام لانا چاہتے ہیں۔ گویا ہر موجود اور رائج الوقت نظام سے کچھ لوگوں کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ اس نظام کے علمبردار یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر اس نظام میں کوئی تبدیلی کی گئی تو ہمارے مفادات پر ضرب لگے گی۔ ان لوگوں کے خیالات اور شبہات بھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پھر ان کے جوابات بھی ایک جیسے ہی ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک اعتبار سے درس قرآن مجید کی ضروریات اور تقاضے ہمیشہ یکساں رہے ہیں:

زمانہ ایک' حیات ایک' کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہء جدید و قدیم

یہ سمجھنا کہ جدید دور کے تقاضے اور ہیں اور قدیم دور کے تقاضے کچھ اور تھے، کم فہمی کی دلیل ہے۔ لیکن ایسا ہوسکتا ہے کہ بعض خاص حالات میں، یا خاص زمانوں میں خاص ضرورتوں کے پیش نظر کسی وقت کسی پہلو سے کوئی ضرورت بڑھ جائے یا کم ہو جائے۔ ضرورتوں میں یہ کمی بیشی اور تقاضوں میں یہ جزوی ردوبدل ہوتی رہتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ نظام تعلیم قرآن مجید کی اساس پر قائم تھا۔ تمام علوم وفنون قرآن مجید کے حوالہ سے پڑھے اور پڑھائے جاتے تھے۔ جب ایک طالبعلم اپنی تعلیم مکمل کر کے نکلتا تھا تو اول تو وہ پورا قرآن مجید اس طرح پڑھ چکا ہوتا تھا جس طرح ایک اسلامی معاشرہ میں پڑھا جانا چاہیے۔ لیکن اگر کسی سے کوئی کوتاہی رہ بھی جاتی تھی تو نظام تعلیم کے مختلف حصے اس کوتاہی کا ازالہ کر دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر، جیسے آج انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہے۔ اسی طرح اس

زمانہ میں عربی زبان کی تعلیم اسلامی نظام تعلیم کا ایک لازمی حصہ تھی۔ ہر طالب علم اتنی عربی ضرور جانتا تھا کہ اس زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کر سکے اور وہ اتنی عربی ضرور سیکھ لیتا تھا کہ قرآن مجید کے متن اور تفسیری ادب کو سمجھنے میں، کم از کم زبان کی حد تک، اس کو کوئی دقت نہ ہو۔ یوں اس کے لیے قرآن مجید کا سیکھنا اور آگے چل کر اس کے علوم تک رسائی حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن آج یہ بات نہیں رہی۔ آج ہمارے نظام تعلیم میں ایسا کوئی خودکار بندوبست نہیں ہے کہ اس کے نتیجے میں لوگ قرآن مجید سے اس طرح واقف ہو جائیں جس طرح کہ انہیں واقف ہونا چاہیے۔ ان حالات میں اس عوامی انداز کے درس قرآن کی یا نظام تعلیم سے ہٹ کر ایک خارجی نظام کے تحت قرآن مجید کی تعلیم وتدریس کی اہمیت اب پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

ایک بڑی وجہ تو دور جدید میں عمومی درس قرآن مجید کے حلقوں کی اہمیت کی یہ ہے۔

دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ دین کی تعلیم کی کمی کی وجہ سے دین کے تصورات اور دین کے نظام میں احکام وہدایات کی جو ترتیب ہے نہ صرف اس کی فہم میں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں اس کا لحاظ رکھنے میں بڑی غلطی واقع ہو رہی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام میں ایک توازن پایا جاتا ہے۔ اور اسلام میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ہدایات موجود ہیں۔ جو شخص جس پہلو سے اپنی زندگی کو مرتب کرنا چاہے' اس پہلو کے لیے قرآن مجید میں ہدایات موجود ہیں۔ مثلاً کوئی تاجر بننا چاہے تو اس کے لیے ہدایات موجود ہیں۔ کوئی معلم بننا چاہے تو اس کے لیے رہنمائی موجود ہے۔ اور کوئی شخص کوئی بھی پیشہ اختیار کرنا چاہے تو اس کے اختیار کردہ پیشے کے متعلق کیا چیز جائز ہے۔ اور کیا ناجائز ہے؟ یہ سب قرآن مجید میں اور اس کی تفسیر وتشریح۔ یعنی احادیث میں، اور احادیث کی تشریح وتفسیر، یعنی فقہ اور اسلامی ادب اور اسلامی قانون کے ذخائر میں موجود ہے۔ لیکن اگر عامۃ الناس تک اس پیغام کے ایصال اور افہام کا کوئی نظام نہ ہو تو پھر ضرورت پیش آتی ہے کہ ایک متبادل نظام کے تحت کم از کم قرآن مجید کی تعلیم کو لوگوں تک پہنچایا جائے۔ مزید برآں جو ترتیب دین کی تعلیم میں ہے اس ترتیب کو یاد دلانے کی کوشش کی جائے۔ میں اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دین کی بنیادی تعلیم میں جو تدریج ہے' وہ کیا ہے اور اس تدریج کو نظر انداز کرنے اور اس کو بھول جانے کی وجہ سے جو خرابیاں معاشرہ میں پیدا ہو رہی ہیں، وہ کیا ہیں۔

مسلم معاشرہ کے بارے میں نظری طور پر تو یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ اس میں دین اور دنیا کی تفریق موجود نہیں ہے۔اس کی تعلیم میں بنیادی نکتہ توحید اور وحدت ہے، نہ صرف دین و دنیا کی وحدت۔ بلکہ علوم وفنون کی وحدت اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب وتمدن کی اساس ہے۔اس تعلیم پر کامل ایمان کے علاوہ ذات رسالت مآبؐ سے وابستگی امت مسلمہ میں وحدت کی بنیاد ہے۔دین کی تعلیم کو جتنا فروغ دیا جائے گا اتنا ہی مسلم معاشرہ میں وحدت فکر ونظر پیدا ہوگی۔ نظری اعتبار سے تو سب لوگ یہ بات مانتے ہیں۔لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عملاً ایسا نہیں ہورہا ہے۔دینی تعلیم کے بہت سے مراکز ایسے ہیں کہ وہاں سے دین کے نام پر جو تعلیم آرہی ہے وہ معاشرہ کو مسلکوں اور فرقوں کے نام پر مختلف حصوں میں بانٹ رہی ہے۔اگر تھوڑا سا غور کر کے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ مسلم معاشرہ میں پہلے سے جتنے گروہ یا فرقے موجود تھے ان میں مزید اضافہ ہورہا ہے۔جیسے جیسے مذہبی تعلیم کا یہ خاص رنگ اور انداز پھیل رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں تقسیم اور تفریق میں مزید اضافہ ہورہا ہے۔اب یا تو آپ یہ کہیں کہ دین اسلام اور قرآن مجید مسلمانوں میں وحدت کا ضامن نہیں ہے جو بالکل بے بنیاد اور خلاف حقیقت بات ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اسلوب تعلیم میں ہی کوئی خامی ہے۔ہم جس انداز سے دین کی تعلیم دے رہے ہیں جس میں بنیادی زور مسلکی آراء اور فقہی اجتہادات پر دیا جاتا ہے۔اس طرز عمل میں بہت کچھ اصلاح اور نظر ثانی کی ضرورت ہے۔مزید برآں ہمارے ہاں دین کے حوالہ سے جو ذمہ داریاں ہیں وہ مختلف سطحوں کی ہیں۔ان سطحوں کو جب تک اپنی جگہ پر برقرار نہ رکھا جائے اس وقت تک اس سے وہ نتائج برآمد نہیں ہوسکیں گے، جو دین پیدا کرنا چاہتا ہے۔

کل ہی آپ میں سے کسی بہن نے سوال کیا تھا کہ دین اور مذہب میں کیا فرق ہے؟ میں نے جواب میں عرض کیا تھا کہ دین سے مراد حق تعالیٰ کی عطا کردہ وہ بنیادی تعلیم ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک ایک ہی انداز میں چلی آرہی ہے، جس میں وقت کے گذرنے، حالات کے بدلنے سے کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔دین کی بنیادی اساسات یعنی عقائد، توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان، ان کے مقتضیات پر ایمان اور مکارم اخلاق ہر دور میں ایک ہی رہے ہیں۔قوموں کے آنے جانے، اقوام وملل کے نشیب وفراز سے ان عقائد میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں لقمان کی زبان سے صادر ہونے والی حکمت کے تذکرہ میں بھی اسی بات کی طرف سے اشارہ ملتا ہے کہ ہزاروں سال قبل بھی مکارم اخلاق یہی تھے جو آج ہیں۔ اخلاقی خوبیاں جو کل تھیں وہی آج بھی ہیں۔ اور مکارم اخلاق کی جو تشریح اور توضیح اللہ تعالیٰ کے ماننے والوں نے مختلف ادوار میں کی ہے' وہ ایک ہی رہی ہے اور اس میں کبھی بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ یہی سبب ہے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کے خلاصہ کو قرآن مجید میں بیان کرنے کا۔ ان تذکروں اور تبصروں سے جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے بارہ میں جا بجا قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں' یہ بات ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ دین کی تعلیم ہر دور میں ایک ہی رہی ہے۔ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں جہاں ایک ہی جگہ بہت سے انبیاء کرام کی تعلیمات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں غور کرنے سے یہ بات واضح طور معلوم ہو جاتی ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے مابین شریعتوں میں فرق رہا ہے۔ ان کے لائے ہوئے عملی احکام میں حالات اور زمانہ کی رعایت ہمیشہ پیش نظر رکھی گئی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جس قوم اور جس علاقے میں جو شریعت بھیجی گئی وہ اس قوم کے مزاج، ماحول اور زمانہ کے لحاظ سے بھیجی گئی۔ کہیں سختی کی ضرورت تھی۔ کہیں نرمی کی ضرورت تھی۔ کہیں تعلق مع اللہ کو مضبوط کرنے کی ضرورت تھی۔ کہیں قوانین کے ظاہری پہلو پر زور دینا ضروری تھا اور کہیں قوانین کی روح اور ان کے اندرونی پہلو کو نمایاں کرنا مقصود تھا۔ یہ مختلف ضروریات تھیں جن کے لحاظ سے شریعتوں کا نزول ہوا ،اسی وجہ سے ان میں فرق ملحوظ رکھا گیا۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے جو شریعت ہم تک پہنچی ہے' وہ رہتی دنیا تک لیے ہے۔ وہ ہر زمانہ، ہر علاقہ اور ہر قوم کے لیے ہے۔ وہ زمان اور مکان سے ماورا ہے۔ اس لیے وہ تمام خصائص جو سابقہ شریعتوں میں الگ الگ اقوام کے لیے پیش نظر رکھے گئے وہ سب کے سب قرآنی شریعت میں یکجا موجود ہیں۔

ہماری سب سے پہلی ذمہ داری تبلیغ دین کی ہے۔ غیر مسلموں کو اور دین سے برگشتہ مسلمانوں کو دین ہی کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ آپ نے کسی جگہ بھی اسلامی ادب میں تبلیغ شریعت یا تبلیغ فقہ کا لفظ نہیں پڑھا ہوگا، بلکہ تبلیغ دعوت کے حوالہ سے دین ہی کا لفظ پڑھا ہوگا۔ یاد رکھیے تبلیغ' ہمیشہ دین کی ہوتی ہے۔ صحابہ کرام نے دین کی تبلیغ دنیا کے گوشہ گوشہ میں کی۔ وہ چین تک تشریف لے

گئے، وسطی ایشیا تک پہنچے اور دنیا میں جہاں جہاں تک فتوحات ہوئی ہیں وہاں تک صحابہ کرامؓ پہنچے اور ہر جگہ دین ہی کی تبلیغ کی، کسی جگہ بھی کسی فقہی مسلک یا فقہی رائے کے بارے میں یہ سوال نہیں اٹھایا کہ جب غیر مسلموں کو دین کی طرف بلائیں تو کس مخصوص فقہی رائے کی طرف بلانے کی کوشش کریں۔ کسی فقہی یا کلامی رائے کے بجائے انہوں نے دین کی اساسات ہی کی طرف بلایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، روز آخرت کی جزا اور سزا اور مکارم اخلاق۔ یہی چیزیں صحابہ کرام اور صدر اسلام میں اہل دعوت کی دعوت کا موضوع ہوا کرتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو نظام لے کر آئے ہیں اس کی پیروی بلاشبہ ناگزیر ہے، اور یہ چیز نبوت کے تصور میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ صحابہ کرامؓ نے کسی فقہی، کلامی یا تفصیلی معاملہ کی طرف کسی کو دعوت نہیں دی۔ دعوت صرف دین کی دی جاتی ہے۔ دعوت شریعت یا دعوت فقہ کبھی نہیں ہوئی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان فقہی یا کلامی معاملات میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کرتا تھا۔ ان کے درمیان آراء کا اختلاف بلاشبہ موجود تھا۔ کسی خاص فقہی مسئلہ کے بارے میں کسی صحابی کی ایک رائے تھی اور کسی اور صحابی کی دوسری رائے تھی۔ بعض صحابہ سمجھتے تھے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن کچھ صحابہ کا خیال تھا کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اب یہ ایک فقہی رائے ہے۔ ایک بزرگ کے خیال میں اس سے وضو ٹوٹتا ہے اور دوسرے بزرگ کے خیال میں نہیں ٹوٹتا۔ یہ اختلاف دین میں نہیں ہے۔ فقہی احکام میں ہے۔ ایک صحابی بیان کیا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنی ہے کہ میت پر رونے سے میت کو عذاب ہوتا ہے۔ کسی نے جا کر حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: بالکل غلط، کسی کی غلطی کی سزا کوئی دوسرا کیسے بھگت سکتا ہے۔ قرآن مجید میں تو آتا ہے لاتزر وازرۃ وزر اخری۔

گویا ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ صحابہ کرام کے درمیان کسی آیت قرآنی یا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھنے میں اختلاف ہوا۔ ایک صحابی نے حکم شریعت کو ایک طرح سمجھا اور دوسرے صحابی نے دوسری طرح سمجھا۔ دونوں نے اپنی انتہائی فہم و دانش کے مطابق انتہائی اخلاص سے قرآن اور حدیث کی نصوص کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بعض اوقات جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس قسم کا اختلافی مسئلہ پیش کیا گیا تو کبھی تو آپؐ نے ایک رائے کے بارے میں فرمایا

کہ یہ درست ہے اور دوسری رائے کی غلطی واضح فرمادی۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تو غلطی والی رائے سے رجوع کرلیا گیا اور صحیح حکم پر سب نے اتفاق رائے کرلیا۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی آراء کو بیک وقت درست قرار دیا اور دونوں فریقوں سے فرمایا کہ تم نے بھی درست کیا اور تم نے بھی درست کیا۔

ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔ غزوہ احزاب کے بعد جب کفار واپس چلے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ بنوقریظہ کے یہودیوں کو سزا دی جائے۔ جنہوں نے اندر سے بغاوت اور غداری کی کوشش کی تھی۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا لایصلین احدکم العصر الافی بنی قریظه۔ یعنی تم میں سے کوئی شخص بنوقریظہ کے علاقے میں پہنچنے سے پہلے ہرگز عصر کی نماز نہ پڑھے۔ اس موقع پر صحابہ کرام کی تعداد ۱۵۰۰ کے قریب تھی۔ سب کو یہی ہدایت تھی کہ تم میں سے کوئی شخص ہرگز اس وقت تک نماز عصر ادا نہ کرے جب تک بنوقریظہ کے علاقے میں نہ پہنچ جائے۔ اب آپ دیکھ لیجیے کہ یہ انتہائی تاکید کا صیغہ ہے۔ جو لوگ عربی زبان جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ نون تاکید ثقیلہ میں تاکید کا بہت گہرا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس تاکید کے واضح معنی یہ ہیں کہ اس کے علاوہ کرنے کی بالکل گنجائش نہیں ہے، نماز عصر لازماً وہیں جا کر ادا کرنی ہے۔

یہ واضح اور دوٹوک حکم سن کر صحابہ کرامؓ روانہ ہوگئے۔ کوئی گروہ کسی راستے سے روانہ ہوگیا اور کوئی اور گروپ کسی اور راستے سے۔ جب راستہ میں عصر کا وقت تنگ ہونے لگا تو بعض صحابہ کرامؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ نہیں تھا کہ عصر کی نماز تاخیر سے پڑھنا یا چھوڑ دینا، بلکہ مقصد یہ تاکید فرمانا تھا کہ عصر سے قبل وہاں پہنچنا۔ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد اسی نقطہ نظر کی حامل تھی، یعنی اس موقع پر حضورؐ کے حکم کی تشریح میں اختلاف پیدا ہوا۔ اور بظاہر یعنی ظاہری الفاظ کے لحاظ سے صحابہ کرام کی ایک جماعت نے حکم کی خلاف ورزی کی اور نماز راستے میں پڑھ لی۔ کچھ دوسرے لوگوں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ عصر کا وقت کون سا ہے اور مغرب کا وقت کون سا ہے۔ ہم سے انہوں نے پہلے یہ فرمایا تھا کہ عصر فلاں وقت پڑھا کرو، آج ان کا ہی ارشاد ہے کہ عصر وہاں جا کر پڑھو، اس لیے ہم تو وہیں جا کر پڑھیں گے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک عاشقانہ انداز تعبیر ہے اور وہ دوسری تعبیر عاقلانہ تھی۔ چنانچہ ایک جماعت نے عصر کی نماز قضاء کی اور بنوقریظہ کے علاقہ میں جا کر ہی ادا کی۔ اگلے روز دونوں گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں حاضر ہوئے اور ساری صورتحال آپؑ کے سامنے رکھی۔ آپؐ نے دونوں سے فرمایا، لقد اصبتم، یعنی تم نے ٹھیک کیا۔ یوں دونوں کے طرزِ عمل کو حضورؐ نے پسند فرمایا اور کسی کو بھی غلط نہیں کہا۔

یہ وہ چیز ہے جس کو آپ فہم شریعت کہتے ہیں۔ یہ تحقیق، فتویٰ اور درس و تدریس کا موضوع تو ہوگی، لیکن دعوت و تبلیغ کا موضوع نہیں ہوگی۔ جب دعوت دی جائے گی تو وہ صرف دین کی ہوگی۔ اور تبلیغ ہوگی تو صرف دین کی ہوگی۔ جو لوگ دین کو قبول کر لیں گے ان کو تعلیم کے ذریعے سے شریعت کے احکام بتائے جائیں گے۔ یہ تعلیم، تعلیم شریعت ہوگی۔ جو لوگ مسلمان ہوتے جائیں گے۔ ان کے لیے تعلیم شریعت کی ضرورت پیش آتی جائے گی۔ اس طرح شریعت کی تمام تعبیرات سامنے آئیں گی۔ جو دین کے بعد کا مرحلہ ہے۔

اس کے بعد شریعت کے احکام کو سمجھنے میں ایک سے زائد آراء ہوسکتی ہیں۔ جیسا کہ صحابہ کرام کے درمیان تھیں۔ جب یہ مرحلہ آئے گا تو تحقیق کا سوال پیدا ہوگا۔ تحقیق کے موضوعات اور اس کے نتائج صرف محققین کی دل چسپی کے موضوعات ہوتے ہیں۔ ایک صاحب علم یا فقیہ کی تحقیق میں ایک مفہوم درست ہے اور دوسرے کی نگاہ میں دوسرا مفہوم درست ہے۔ اس حدیث سے پتہ چلا کہ بیک وقت دو مفہوم بھی درست ہوسکتے ہیں۔ ہمارے یقین اور بصیرت کی حد تک ایک مفہوم درست ہے، اور دوسرے فقیہ کی فہم اور بصیرت کی حد تک دوسرا مفہوم درست ہے۔ اس کا امکان ہر وقت موجود ہے کہ ہماری رائے درست نہ ہو، دوسری رائے درست ہو۔ اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا، ان اللہ شرع شرائع و فرض فرائض و حرم اشیاء و سکت عن اشیا من غیر نسیان رحمۃ من عندہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جہاں احکام شریعت نازل فرمائے، بہت سے امور کو فرض قرار دیا، بہت سی چیزوں کو حرام ٹھہرایا، وہیں بہت سی باتوں کے بارہ میں سکوت اختیار فرمایا، یعنی بطور رحمت اور شفقت کے، بعض چیزوں کے بارے میں حکم نازل نہیں فرمایا۔ گویا اس بات کی آزادی دی گئی کہ ان حدود کے اندر اندر تم اپنی فہم اور بصیرت کے مطابق فیصلہ کرو اور جس نتیجہ پر پہنچو اس پر عمل کرو۔

مثال کے طور پر ایک صحابی حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہم لوگ ریگستان کے رہنے والے ہیں۔ وہاں پانی کی کمی ہوتی ہے۔ کسی جگہ گڑھے یا تالاب میں اگر پانی جمع ہو اور ہمیں

مل جائے تو ہمارے لیے بڑی نعمت ہوتی ہے۔لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس پانی میں کسی درندے نے تو منہ نہیں ڈال دیا، یا اس میں کوئی نجاست تو نہیں گر گئی، معلوم نہیں کہ وہ پانی ہمارے لیے پاک بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ ہمیں ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا الماء الکثیر لاینجس، زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔آپؐ افصح العرب تھے۔آپؐ سے زیادہ فصیح و بلیغ' دشمنوں کے اعتراف کے مطابق بھی' جزیرہ عرب میں کوئی پیدا نہیں ہوا۔آپ کو معلوم تھا کہ سوال کرنے والے کا منشاء کیا ہے۔تو آپؐ نے بالارادہ وہ صیغہ اور اسلوب استعمال فرمایا جس کی بے شمار تعبیرات ہوسکتی ہیں۔

صحابہ اور تابعین کے بعد جب احکام کتابی شکل میں مرتب ہونے لگے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ الماء الکثیر سے کیا مراد ہے۔ کتنے پانی کو ماء کثیر کہیں گے۔ امام مالکؒ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے، جہاں صرف دو یا تین کنویں موجود تھے۔لہٰذا ان کے خیال میں ماء کثیر سے مراد اتنا پانی تھا جو بڑے دو مٹکوں میں آجائے۔ امام ابو حنیفہ کوفہ کے رہنے والے تھے جہاں ایک طرف دریائے دجلہ بہہ رہا تھا اور دوسری طرف دریائے فرات بہہ رہا تھا۔ پانی کی کوئی کمی نہیں تھی۔لہٰذا ان کے ذہن میں زیادہ پانی کا جو تصور آیا وہ یہ تھا کہ اگر پانی کا اتنا بڑا تالاب ہو کہ اگر ایک طرف سے اس کا پانی ہلایا جائے تو دوسری طرف کا پانی نہ ہلے وہ ماء کثیر ہے۔لغت میں ان دونوں معانی کی گنجائش ہے۔حدیث مبارک کے الفاظ میں دونوں کی گنجائش ہے۔

یہ تو ہوسکتا ہے اور مسلسل ہوتا رہا ہے کہ کوئی صاحب علم اپنی فہم، اپنی تحقیق اور اپنی دلیل سے ایک رائے کے بارے میں یہ رائے قائم کریں کہ یہ مجھے زیادہ صحیح اور درست معلوم ہوتی ہے۔ اور دوسری رائے درست معلوم نہیں ہوتی، یا بالعکس۔لیکن بہر صورت یہ تحقیق کا موضوع ہے اور تحقیق ہی کا موضوع رہنا چاہیے۔اس سے بحث فقہ، اعلیٰ تعلیم اور تحقیق سے وابستہ لوگوں کے حلقہ تک ہی محدود رہے گی۔ ایک صاحب علم اپنے دلائل سے تحقیق کرے گا اور اس کے مطابق رائے قائم کرے گا۔ یہ نہ عمومی اور ابتدائی تعلیم کا موضوع ہے نہ تبلیغ کا اور نہ دعوت کا۔یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی فقیہہ اسلام نے کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا ہو کہ اے عراق والو! خبردار! احمد ابن حنبلؒ کی فلاں تحقیق غلط ہے، لہٰذا اس باب میں ان کی بات مت ماننا۔یا کسی ایک فقیہہ نے کھڑے ہو کر کبھی دوسرے کے خلاف بیان بازی کی ہو۔ان حضرات نے ان اعلیٰ فنی اور تحقیقی موضوعات کو تحقیق کے

دائرہ تک محدود رکھا اور جب بھی دعوت دی دین کی دعوت دی، جو تمام انبیاء کے زمانہ سے ایک ہی چلا آرہا ہے۔ اور یہی دعوت دین امت مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔

جب لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں تو انہیں شریعت کی تعلیم دی جائے گی۔ جو لوگ علم شریعت حاصل کرتے جائیں گے۔ تو عملی مسائل میں اس طرح کی تفصیلات میں جہاں ایک سے زائد رائے پائی جاتی ہیں وہاں وہ محققین سے رجوع کریں گے اور جس صاحب علم وتقوی کی تحقیق سے انہیں اتفاق ہوگا اس کی تحقیق کو قبول کرلیں گے۔

تحقیق کے بعد ایک چیز اور ہوتی ہے جو کسی خاص صاحب علم کا ذوق ہوتی ہے۔ اسلام نے کسی شخص کے ذوق کو ختم نہیں کیا، ہر شخص کا ذوق اور مزاج مختلف ہوتا ہے۔ صحابہ کرام میں ہر ذوق کے لوگ موجود تھے۔ کچھ ایسے حضرات تھے جو ہر چیز کو بڑے منطقی اور عاقلانہ انداز میں دیکھتے تھے۔ اور کچھ حضرات تھے جن کا انداز بڑا والہانہ قسم کا تھا، ان کے ہاں عاشقانہ جذبات پائے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں خطاب فرما رہے تھے۔ کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ آپؐ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جو لوگ کھڑے ہیں وہ بیٹھ جائیں۔ مسجد سے باہر گلی میں چلتے ہوئے کچھ ایسے لوگوں کے کان میں بھی آپؐ کی آواز پڑی جو ابھی مسجد میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ وہ اسی وقت اسی جگہ گلی میں بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب تو ان لوگوں کے لیے تھا جو مسجد میں موجود تھے۔ جو حضرات ابھی مسجد سے باہر تھے وہ اس ہدایت کے مخاطب نہ تھے۔ لیکن انہوں نے دل میں کہا ہوگا کہ ہم کچھ نہیں جانتے، ہمارے کانوں میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز آئی کہ بیٹھ جاؤ اور ہم بیٹھ گئے۔ یہ ایک عاشقانہ انداز ہے۔ یہ دونوں دو مختلف ذوق کے نمونے ہیں۔

صحابہ کرامؓ میں بلاشبہ ذوق کا اختلاف موجود تھا۔ کسی صحابی کا ذوق تھا کہ زندگی بھر تلوار لے کر میدان جنگ میں جہاد کرتے رہے اور کبھی درس وتدریس کا مشغلہ اختیار نہیں فرمایا۔ مثال کے طور پر حضرت خالد بن ولیدؓ نے زندگی میدان جنگ ہی میں گذار دی۔ کبھی کوئی حلقہ درس قائم نہیں فرمایا۔ کبھی احادیث کی روایت کے لیے نہیں بیٹھے۔ وہ میدان جہاد کے شہسوار تھے ان کا ذوق شمشیر زنی اور خارا شگافی تھا۔ وہ زندگی بھر اسی میدان میں دین کی خدمت کرتے رہے۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے صحابہ کرام کا ذوق تھا کہ زندگی بھر درس حدیث دیتے رہے اور برائے نام ہی

کبھی تلوار اٹھائی، جیسے حضرت ابو ہریرہؓ۔ انہوں نے کبھی کوئی شہر فتح نہیں کیا۔ جہاد کے فضائل اپنی جگہ اور حدیث کی نشرواشاعت کی اہمیت اپنی جگہ۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ابو ہریرہؓ کو دیکھو جہاد کے فضائل جانتا ہے پھر بھی کبھی تلوار نہیں اٹھاتا، کبھی جہاد میں حصہ نہیں لیتا۔ اور نہ ہی کبھی حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ کہا کہ خالد بن ولیدؓ نے حدیث کی کوئی خدمت نہیں کی۔ یہ تو اپنا اپنا ذوق تھا۔ کسی کے اندر کوئی ذوق تھا اور کسی کے اندر کوئی۔ ہاں کچھ صحابہ کرام تھے جن کے اندر بڑی جامعیت پائی جاتی تھی۔ ہر دور میں جامعیت رکھنے والے لوگ بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ اسلام اس لیے نہیں آیا کہ لوگوں کے ذوق کو کچل کر رکھ دے۔ اسلام کا کام لوگوں کے ذوق کو جلا بخشنا اور افراد کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہے۔ اسلام کا جذبہ صادق ہر شخص سے اس کی صلاحیتوں اور ذوق کے مطابق خدمت لیتا ہے۔

بعض اوقات اسی ذوق کی وجہ سے کسی دینی شخصیت کا ایک مزاج بن جاتا ہے۔ اس کے ماننے والوں، شاگردوں اور تلامذہ میں سے بہت سے لوگ اس کے ذوق کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ آپ نے جس سے دین سیکھا ہے اگر وہ آپ کا آئیڈیل اور رول ماڈل ہے تو اگر آپ اس کے ذوق کو اختیار کرنا چاہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ دین کی تعلیمات کے اندر اندر ہو۔ لیکن اگر آپ دوسروں سے بھی یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیں کہ سب اس شخصیت کے ذوق کی پیروی کریں اور اس کے ذوق کی تبلیغ کرنی شروع کر دیں تو یہ غلط ہوگا۔ ذوق تو کسی صحابی کا بھی واجب التعمیل نہیں ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی ذوق کے بارے میں بھی وضاحت کر دی گئی کہ یہ آپؐ کا ذاتی ذوق ہے، جس کا جی چاہے اختیار کرے اور جس کا جی نہ چاہے اس کو اختیار نہ کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی ذوق کی بھی مثال پیش کر دیتا ہوں۔ ایک مرتبہ آپؐ دسترخوان پر تشریف فرما تھے۔ کوئی خاص قسم کا گوشت دسترخوان پر موجود تھا۔ آپؐ نے اسے کھانے سے اجتناب فرمایا اور یہ عذر فرمایا کہ میرا ذوق اسے کھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ جو صحابہ کرام اس دسترخوان پر آپؐ کے ساتھ شریک طعام تھے انہوں نے اس گوشت کو کھایا اور آپؐ کے ذوق کی پیروی کرنے کو ضروری نہیں سمجھا۔ گویا ذوق کی پیروی اپنے شوق کی چیز ہے۔ جسے شوق ہو وہ ذوق کی پیروی کرے اور جسے نہ ہو وہ نہ کرے۔ یہ تبلیغ اور دعوت کا موضوع نہیں ہے۔

اس کی تبلیغ نہیں کرنی چاہیے۔

یوں یہ چار چیزیں، دین، شریعت، فقہ اور ذوق ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان میں دعوت اور تبلیغ صرف دین کی ہوگی۔ شریعت کی عمومی تعلیم اور فقہ کی اعلیٰ تعلیم ہوگی۔ یہ طویل تمہید میں نے اس لیے عرض کی کہ جب ہم درس قرآن کی مجالس منعقد کریں تو ہمارے سامنے درس قرآن کے صرف پہلے دو مقاصد ہونے چاہئیں، یعنی جو لوگ دین بالکل علم نہیں رکھتے ان کے سامنے صرف دین کی اساسات کو رکھیے۔ دین کے عقائد، اسلام کے مکارم اخلاق اور دین کا پورا نظام انہیں بتانے کی ضرورت ہے۔ اگر مخاطبین وہ لوگ ہیں جو دین سے تو وابستہ ہیں لیکن انہیں شریعت کے علم کی ضرورت ہے تو شریعت کا علم ان تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اور قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں پہنچانا چاہیے۔ قرآن مجید میں جو چیز مجملاً آئی ہے حدیث مبارک میں اس کی تفصیل آ گئی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں طیبات اور خبیثات کا ذکر ہے۔ اب ان سے کون سی چیزیں مراد ہیں اور ان کی علامات کیا ہیں۔ یہ سب تفصیل حدیث میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فحشاء اور منکر کو حرام قرار دیا ہے۔ اب کیا فحشاء ہے اور کیا منکر ہے۔ یہ سب تفصیل حدیث میں ملے گی۔ یہ سب چیزیں شریعت کی اساسات ہیں اور یہ قرآن مجید میں شامل ہیں۔

ہمارے درس قرآن کے یہی دو مقاصد ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے بعض مخاطبین صرف پہلی سطح کے مخاطبین ہوں۔ افسوس کہ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو دین کی بنیادی باتوں سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دین کی بنیادی تعلیمات ان تک پہنچائیں اور کسی غیر ضروری بحث میں نہ پڑیں۔

اگر آپ کے مخاطبین ایسے لوگ ہیں جو دین کے بنیادی عقائد سے تو واقف ہیں لیکن انہیں شریعت کے بنیادی امور سے واقفیت نہیں ہے تو درس قرآن کے دوران میں شریعت کی تعلیم کی بھی ضرورت پڑے گی۔ ایسے مخاطبین کو شریعت کی تعلیم بھی دی جائے۔ لیکن کسی ایسے معاملہ کو نہ اٹھایا جائے جس میں صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین اور علماء کرام کے درمیان ایک سے زیادہ آراء رہی ہوں۔ کسی رائے کے بارے میں یہ کہنا کہ صرف یہی درست ہے باقی سب غلط ہے، یہ دین اور شریعت دونوں کے مزاج کے خلاف ہے۔

خود شریعت نے اس بات گنجائش رکھی ہے کہ بعض احکام میں ایک سے زائد آراء

ہوں۔ ایسا اس لیے ہے کہ شریعت زماں اور مکان سے ماورا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک تعبیر بعض خاص حالات میں زیادہ برمحل ہو اور دوسری تعبیر دوسرے حالات میں زیادہ موزوں ثابت ہو۔ اسی طرح تفسیرات وتعبیرات بھی بدلتی رہتی ہیں۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں یہودیوں کے ذکر میں آیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو چند سکوں کے عوض بیچ ڈالتے ہیں، ویشترون بایتی ثمنا قلیلا۔ جس زمانہ میں صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ تھا، خیر القرون تھا اور ایک سے ایک تقویٰ شعار شخصیت موجود تھی، انہوں نے اس کے معنی یہ لیے کہ جو شخص قرآن مجید پڑھانے پر اجرت لیتا ہے' وہ جائز نہیں ہے۔ بلاشبہ انہوں نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے اس آیت مبارکہ کے بالکل ٹھیک معنی لیے۔ لیکن پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر قرآن مجید پڑھانے کے لیے کچھ لوگوں کو کاروبار اور روزگار کے جھمیلوں سے فارغ نہ کیا جائے اور انہیں اس خدمت کی اجرت نہ دی جائے تو قرآن مجید کی تعلیم رک جائے گی۔ اس لیے کہ پہلے جس طرح لوگ رضا کارانہ طور پر اس کام کو کیا کرتے تھے، اس جذبہ سے اس کام کے کرنے والے اب نہیں رہے۔ جبکہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ کل وقتی معلمین قرآن ہوں جن کا کوئی اور کام نہ ہو اور وہ قرآن مجید کی تعلیم دیا کریں۔ انہوں نے قرآن مجید کی ایک اور آیت سے اور دیگر نصوص سے یہ رائے قائم کی کہ اس طرح کے لوگوں کو جن کا کام صرف تعلیم قرآن ہو اور وہ تعلیم قرآن کی مصروفیت کی وجہ سے کوئی اور کام نہ کر سکتے ہوں ان کو معاوضہ دیا جا سکتا ہے اور اس خدمت کا یہ معاوضہ ان آیات کی وعید میں نہیں آئے گا جہاں قرآن مجید کی آیات پر قیمت لینے کا ذکر آیا ہے۔ اب دیکھیے کہ ایک ہی آیت ہے، لیکن دو مختلف تعبیرات دو زمانوں کے لحاظ سے اسی ایک آیت سے اخذ کی گئی ہیں۔

فرض کیجیے کہ اگر بعد کے فقہا یہ تعبیر نہ نکالتے تو آج کتنے لوگ ہوتے جو بلا معاوضہ یہ خدمت کرنے کے لیے آمادہ ہوتے، اور قرآن مجید کل وقتی طور پر پڑھایا کرتے۔ ایسے بے لوث حضرات کی عدم موجودگی میں قرآن مجید کی تعلیم کتنی محدود ہو کر رہ جاتی۔ آج مساجد میں جگہ جگہ قرآن کی تعلیم ہو رہی ہے۔ دینی مدارس اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے کھلے ہوئے ہیں اور اساتذہ کو تنخواہ بھی مل رہی ہے۔ ایسا اس لیے ممکن ہو سکا کہ بعد کے مفسرین قرآن نے اپنے زمانہ کے تقاضوں

اور تعبیرات کا لحاظ کر کے آیات قرآنی کی وہ تعبیر کی جو نئے حالات میں زیادہ قابل عمل تھی۔

آج امام ابوحنیفہؒ جیسے لوگ موجود نہیں ہیں۔ وہ فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے مکتب کے سامنے ایک نانبائی کی دکان تھی۔ ایک غریب اور بیوہ عورت اپنا بچہ نانبائی کی دکان پر بٹھا گئی کہ یہ یہاں مزدوری بھی کرے گا اور کام بھی سیکھے گا۔ نانبائی نے اس سے روزانہ کی حقیری اجرت بھی طے کر لی۔ بچے کا نانبائی کی دکان پر دل نہیں لگا اور وہ وہاں سے بھاگ کر امام صاحب کے حلقہ درس میں جا بیٹھا۔ جب ماں بچہ کی خیر خبر لینے کے لیے نانبائی کی دکان پر گئی تو پتا چلا کہ بچہ تو نان بائی کے پاس آنے کے بجائے امام صاحب کے درس میں جا کر بیٹھتا ہے۔ ماں امام صاحب کے گھر گئی اور بچہ کو ڈانٹ ڈپٹ کر دوبارہ نانبائی کی دکان پر بٹھا کر چلی گئی۔ بچہ ایک مرتبہ پھر بھاگ کر چلا گیا۔ دوسری مرتبہ جب ماں بچہ کو لینے گئی تو امام صاحب نے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ بچہ کی ماں نے شکایت کی کہ غربت اور پریشانی کی وجہ سے بچہ کو روزگار میں لگانا چاہتی ہوں۔ لیکن اپنے مزاج کی وجہ سے بچہ کام نہیں سیکھتا۔ امام صاحب نے اس خاتون کو اپنے پاس سے ایک بڑی رقم عنایت فرمائی اور آئندہ کے لیے اپنے پاس سے وظیفہ مقرر کر دیا۔ خاتون سے کہا کہ بچہ کو ان کے مکتب میں بیٹھنے دیا جائے۔ وظیفہ بہت معقول تھا۔ اس لیے ماں نے رضامندی ظاہر کر دی اور بچہ امام صاحب کے ہاں تعلیمی منازل طے کرنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ بچہ بڑا ہو کر قاضی ابو یوسف بنا۔ وہ اسلامی تاریخ کے پہلے قاضی القضاہ بنے اور ان کی کتاب ''کتابُ الخراج'' مالیاتی قانون پر دنیا کی پہلی کتاب ہے۔

اس طرح کے لوگ آج موجود نہیں ہیں۔ اگر علمائے اسلام اور فقہاء کرام سابقہ فتویٰ اور تفسیر پر ہی کاربند رہتے تو آج درس و تدریس کے لیے لوگ کہاں سے آتے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دین کے کچھ احکام کی تعبیر اور تشریح فقہائے اسلام اپنے اپنے حالات اور اپنے اپنے زمانوں کے لحاظ سے کرتے چلے آئے ہیں، اس لیے کسی ایک رائے کی بنیاد پر مسلمانوں کی تغلیط و تفسیق درست نہیں۔ ایسے معاملات کی بنیاد پر جو امت کے لیے باعث رحمت ہیں اگر امت مسلمہ میں تفریق پیدا کر دی گئی تو جو چیز امت مسلمہ کی سہولت کے لیے بھیجی گئی تھی، وہ امت مسلمہ کی تفریق کا ذریعہ بن جائے گی۔ اور یہ دین کے مزاج کے خلاف ہے۔

امت کی وحدت تو نص قرآنی سے ثابت ہے، ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ۔ انّ

تاکید کا صیغہ ہے اور یہ آیت قرآن مجید میں انہی الفاظ کے ساتھ کئی مرتبہ آئی ہے۔ پھر امت کی دعا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مانگی ہے: ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک۔ جو امت قرآن مجید کی نص سے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شب و روز کی محنت سے قائم ہوئی ہے، جس کی وحدت اور حفاظت کی دعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راتوں کو جاگ کر فرمائی ہیں، کیا اس کی وحدت کو زید، عمر، بکر کی رائے کی بنا پر افتراق میں مبتلا کر دیا جائے؟۔ یہ سراسر شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ کہ ہم نے دعوت، تعلیم، تحقیق اور ذوق ان چاروں چیزوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا ہے۔ تحقیق اور ذوق کی نہ دعوت ہوتی ہے اور نہ تبلیغ ہوتی ہے۔ جو شخص اپنے ذوق کی دعوت دے رہا ہے وہ غلط کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسی چیز لوگوں پر مسلط کر رہا ہے جس کی طرف کبھی نبی نے بھی نہیں بلایا۔ آپؐ نے نہیں فرمایا کہ گوہ کا گوشت کھانا میرا ذوق کا نہیں ہے لہٰذا تم بھی مت کھاؤ۔ اس لیے ایسے معاملات میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

یہ تو اس مقصد کی بات تھی جس کے لیے ہمیں درس قرآن کے حلقے منظم کرنے ہیں۔ یعنی لوگوں کو دین کے بنیادی عقائد پر جمع کرنا اور شریعت کی تعلیم اس طرح دینا کہ جہاں جہاں خود شارع نے اختلاف کی گنجائش رکھی ہے اس اختلاف کو آپ تسلیم کریں۔

اب ہوتا یہ ہے جو بالکل درست نہیں ہے کہ ایک عالم کا درس قرآن ہوتا ہے، اس میں صرف اُس خاص مسلک کے لوگ ہوتے ہیں جو ان عالم کا اپنا فقہی یا کلامی مسلک ہوتا ہے۔ دوسرے مسلک کا کوئی آدمی حاضرین و سامعین میں موجود نہیں ہوتا۔ ترجمہ قرآن بھی اپنے مسلک ہی کے عالم کا مخصوص ہوتا ہے۔ یوں تو کسی ترجمہ یا تفسیر کو مخصوص کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ ایک اعتبار سے بہتر اور مناسب یہی ہے جس سے آپ کا ذوق ملے اسی عالم کے ترجمہ اور تفسیر کو آپ پڑھ لیں۔ لیکن اگر اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا جائے کہ فلاں ترجمہ اور تفسیر ہی کو پڑھا جائے، اس کے علاوہ کسی اور ترجمہ یا تفسیر کو نہ پڑھا جائے تو یہ بات غلط ہوگی۔ کسی کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ لوگوں کو زبردستی اپنے ذوق پر جمع کرے۔

دوسری اہم بات ان خواتین و حضرات کے لیے ضروری ہے جو ان لوگوں کے روبرو درس قرآن دے رہے ہیں جو باعمل مسلمان ہیں اور دین کی بنیادی باتوں سے واقف ہیں۔ ایسے

سامعین کو شریعت کے احکام اور تفصیلات جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب جو لوگ شریعت کی تعلیم دے رہے ہیں اور کسی ایسے معاملہ پر پہنچتے ہیں جہاں فقہاء کرام کا اختلاف نظر آتا ہے تو درس میں کسی خاص رائے کی خصوصی تائید اور دوسری آراء کی خصوصی تردید سے اجتناب کرنا چاہیے اور اس اختلاف کی گنجائش رکھنی چاہیے۔ اس لیے کہ خود فقہائے اسلام نے اس اختلاف کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے نقطۂ نظر کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے اور برابر اس پر زور دیا ہے کہ ہماری ایک رائے ہے اور ہمیں اپنے علم اور بصیرت کی بنیاد پر پورا یقین ہے کہ یہ رائے درست ہے۔ لیکن اس رائے کے غلط ہونے کا امکان بہر حال موجود ہے۔ اسی طرح سے وہ رائے جو کسی دوسرے محترم فقیہہ کی ہے ہم اس کو اپنی انتہائی بصیرت کے مطابق صحیح نہیں سمجھتے، لیکن اس کے درست ہونے کا امکان بہر صورت موجود ہے۔ فقہائے اسلام کی یہی سوچ رہی ہے اور یہی انداز رہا ہے۔

امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے درمیان بہت سے معاملات میں اختلاف ہے۔ ان کے متبعین کے درمیان ہمیشہ سے مباحثے جاری ہیں۔ دیگر فقہاء کے مابین بھی مباحثے ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن ان میں سے کسی فقیہہ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں نے جو رائے قائم کی ہے، یہی دین ہے اور یہی شریعت ہے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہوتا تھا کہ یہ میری فہم ہے، اس کے مطابق میں نے شریعت کو سمجھا ہے۔ دین کی بنیادوں اور ضروریات میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ شریعت کے بعض احکام میں اختلاف کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس اختلاف میں ان کا طرز عمل کیا ہوتا تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے:

امام شافعیؒ یہ سمجھتے تھے کہ فجر کی نماز میں دوسری رکعت میں رکوع سے کھڑے ہو کر قنوت پڑھا جانا چاہیے۔ وہ نماز فجر میں قنوت پڑھنے کو لازمی سمجھتے تھے، اور آج بھی جہاں جہاں شوافع کی اکثریت ہے جیسے انڈونیشیا، ملائیشیا اور مصر وغیرہ۔ وہاں فجر کی نماز میں قنوت پڑھا جاتا ہے۔ ایک عجیب رنگ ہوتا ہے جب امام قنوت پڑھتا ہے اور لوگ آمین کہتے ہیں تو ایک عجیب سماں ہوتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اندر سے دل ہل رہا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اس کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے میں جن احادیث سے نماز فجر میں قنوت پڑھا جانا معلوم ہوتا ہے وہ ایک خاص واقعہ کے متعلق تھیں، ان سے کوئی دائمی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ امام شافعیؒ کا بغداد تشریف لانا ہوا۔ ان کے دوران قیام میں ایک روز انہیں اس جگہ

نماز فجر پڑھائی تھی جہاں امام ابو حنیفہؒ درس دیا کرتے تھے۔ یہ مسجد کوئی معمولی مسجد نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں تعمیر کی گئی تھی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی رسول وہاں درس دیا کرتے تھے۔ ان کے بعد انؓ کے شاگرد علقمہ نے وہاں درس دینا شروع کیا۔ ان کے بعد ان کے شاگرد ابراہیم نخعی وہاں درس دیا کرتے تھے، پھر امام صاحب کے استاد حماد بن ابی سلیمان نے وہاں سالہا سال درس دیا۔ ان کے بعد حماد کے شاگرد حضرت امام ابو حنیفہؒ وہاں درس دیا کرتے تھے۔ یہ بڑی تاریخی مسجد تھی۔ لوگوں نے امام شافعیؒ سے درخواست کی کہ آپ نماز پڑھائیں۔ لوگوں کو جب پتہ چلا کہ امام شافعیؒ مصر سے تشریف لائے ہیں اور یہاں نماز پڑھائیں گے۔ تو بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے۔ خاص طور پر لوگوں کو اشتیاق تھا کہ خود امام شافعی کی زبان سے قنوت سنیں گے۔ فقہائے اربعہ میں امام شافعیؒ واحد فقیہہ ہیں جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہے۔ اس وجہ سے بھی لوگوں کو ان سے خاص عقیدت تھی۔ لیکن لوگوں کی توقعات کے برعکس امام شافعیؒ نے قنوت نہیں پڑھا۔ حالانکہ وہ اس کو لازمی سمجھتے تھے۔ نماز فجر کے بعد جب لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے قنوت کیوں نہیں پڑھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اس صاحب قبر کی رائے کے احترام میں نہیں پڑھا۔ یہ ہے اسلام کا اور شریعت کا اصل مزاج۔

ایک اور چیز جو درس قرآن کے حلقوں کو منظم اور مرتب کرنے میں پیش آتی ہے اور جس پر تھوڑی سی گفتگو کی ضرورت ہے وہ قرآن مجید کا متن اور ترجمہ ہے۔ یاد رکھیے کہ عربی متن ہی دراصل قرآن ہے۔ اور جو ترجمہ ہے وہ بھی دراصل تفسیر ہی کی ایک شاخ ہے۔ یعنی ایک مترجم نے اپنی فہم کے مطابق قرآن پاک کو سمجھا اور اس کا ترجمہ کیا۔ قرآن مجید کے ترجمہ کے لیے بھی وہ تمام تقاضے اور ذمہ داریاں نباہنے کی ضرورت ہے جن کا میں نے تفسیر کے ضمن میں ذکر کیا تھا۔ تفسیر کے لیے جو چیزیں درکار ہیں وہی قرآن مجید کے ترجمہ کے لیے بھی درکار ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص عربی زبان نہیں جانتا تو وہ براہ راست قرآن مجید کا ترجمہ نہیں کر سکتا۔

ایک اہم چیز یہ ہے کہ اگر درس قرآن سے ہمارا مقصد دین کی دعوت اور شریعت کی تعلیم ہے تو دونوں صورتوں میں قرآن مجید سے طالب علم کی وابستگی پیدا کرنا ناگزیر ہے۔ جب تک پڑھنے والے کی براہ راست وابستگی قرآن مجید کے ساتھ نہیں ہوگی اس وقت تک یہ کوشش نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگی۔ یہ وابستگی متن سے ہونی چاہیے، کتاب الٰہی کے الفاظ سے ہونی چاہیے۔ کسی

مترجم یا مفسر کے ترجمہ سے وابستگی ضروری نہیں۔ ترجمہ قرآن مجید خدمت کے لیے ہے، وہ قرآن کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اصل چیز قرآن مجید کا متن ہے جو معجز ہے، منزل من اللہ ہے، معانی اور مطالب کا سمندر ہے۔

اگر متن کو نظر انداز کر دیا جائے اور ساری توجہ ترجمہ پر مرکوز کر دی جائے تو گویا ایک طرف تو ہم نے ایک انسان کی فہم کو قرآن مجید کے قائم مقام کر دیا جو بہت بڑی جسارت بلکہ بے ادبی ہے۔ دوسری طرف ہم نے قرآن کی وسعتوں کو ترجمہ کی تنگنائیوں میں محدود کر ڈالا۔ کوئی کتنا ہی بڑا انسان ہو حتیٰ کہ حضرت عمر فاروقؓ جیسا صحابی جلیل کیوں نہ ہو۔ اس سے قرآن کے سمجھنے میں غلطی ہو سکتی ہے اور غلطی سے کوئی مبرا نہیں ہے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ محسوس کیا کہ لوگوں نے مہر مقرر کرنے میں بہت زیادہ اسراف سے کام لینا شروع کر دیا ہے، اونچے اونچے مہر مقرر کیے جانے لگے ہیں اور اونچے مہر مقرر کرنا بڑائی کی دلیل سمجھا جانے لگا ہے۔ آپ نے مسجد میں کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ آج کے بعد مہر کی ایک خاص مقدار مقرر کر دی گئی ہے۔ اور کوئی شخص اس سے زیادہ مہر نہ رکھے۔ بڑے بڑے جید صحابہ کرام اس موقع پر موجود تھے۔ سب نے اس فیصلہ کو درست قرار دیا۔ نماز کے بعد جب حضرت عمر فاروق مسجد سے باہر نکلے تو ایک بوڑھی خاتون ملیں اور حضرت عمرؓ سے کہنے لگیں کہ تم نے جو مہر کی حد مقرر کی ہے وہ بالکل غلط ہے اور تم قرآن کو نہیں سمجھتے۔ قرآن مجید میں تو آیا ہے، وان آتیتم احدٰھن قنطاراً فلاتاخذو شیئا۔ کہ اگر تم نے دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دیا ہو تو واپس مت لو۔ یعنی قرآن مجید تو ڈھیر کے امکان کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ گویا دولت کا ڈھیر بھی مہر میں دیا جا سکتا ہے، لہٰذا تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس مقررہ رقم سے زیادہ نہ دیا جائے۔

حضرت عمر فاروق نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔ وہ خلیفہ راشد تھے۔ حضورؐ کے جانشین تھے۔ آپؐ نے ان کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کی بارہا تائید فرمائی تھی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ان کی جگہ ہمارے دور کا کوئی مذہبی لیڈر، مولوی یا پیر ہوتا تو اعتراض کرنے والی خاتون کو ڈانٹ کر خاموش کر دیتا۔ لیکن وہ حضرت عمر تھے، انہوں نے سب لوگوں کو دوبارہ مسجد میں واپس بلا لیا۔ جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو آپ منبر پر چڑھے اور فرمایا، اخطا عمر و اصابت امرأۃ۔ عمر نے غلطی کی اور ایک عورت نے سچ کہا۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ گویا ایک اتنے بڑے

انسان سے جو دین کا اتنا بڑا مزاج شناس ہے کہ قرآن مجید کی ۱۷ آیات اس کی توقع اور اندازہ کے مطابق نازل ہوئیں اس سے بھی فہم قرآن میں غلطی یا تسامح کا امکان ہے۔ قرآن مجید میں سترہ مقامات ایسے بتائے جاتے ہیں جہاں حضرت عمر نے اندازہ کیا کہ دین کا مزاج یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہاں ایسے ہونا چاہیے اور اسی طرح ہو گیا۔ جب اس مقام و مرتبہ کے آدمی سے غلطی ہو سکتی ہے اور وہ علی الاعلان اس کا اعتراف کر سکتے ہیں تو پھر اور کون کس شمار قطار میں ہے۔

درس قرآن میں بنیادی چیز قرآن مجید کے الفاظ اور ان کی تلاوت ہے۔ یہ بات میں نے اس لیے عرض کی کہ کبھی درس قرآن میں متن کی تلاوت کرنے کے بجائے صرف ترجمہ پڑھنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک مشہور دینی شخصیت کو دیکھا کہ وہ صرف ترجمہ کی مدد سے درس قرآن دے رہے تھے۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب لگی اور انتہائی ناگوار محسوس ہوئی کہ اصل درس تو قرآن مجید کا دینا مقصود ہے۔ لیکن اکتفاء ترجمہ پر کیا جا رہا ہے۔ کم از کم پہلے قرآن مجید کے الفاظ کی تلاوت کی جائے۔ لوگوں کو اس کے الفاظ سے مانوس کروایا جائے۔ اور یہ کوشش کی جائے کہ لوگ جس حد تک سمجھ سکیں اس کو سمجھیں اور یہ بھی کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔

اگر آپ کے مخاطبین اردو زبان اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں تو ان کے لیے بغیر عربی زبان سیکھے بھی قرآن مجید کے عمومی مفہوم کو کم از کم ۵۰ فی صد سمجھ لینا آسان ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے جتنے بھی الفاظ آئے ہیں ان میں جو مادے استعمال ہوئے ہیں وہ سارے کے سارے ۱۵۰۰ کے قریب ہیں۔ ان میں ۱۴۰۰ سے زائد مادے وہ ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ۱۴۰۰ مادے اگر پڑھنے والے کے ذہن میں رہیں تو قرآن مجید کا عمومی مفہوم اس کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اور بار بار ترجمہ پڑھنے اور بار بار درس سننے سے خود بخود ایک ذوق اور فہم پیدا ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر سورۃ فاتحہ میں حمد، رب، عالمین، رحمٰن، رحیم، مالک، یوم، دین، عبادت، استعانت، ہدایت، صراط مستقیم، انعام، غضب، ضلال۔ یہ سب الفاظ عام طور پر معروف ہیں۔ ان میں سے کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو اردو میں استعمال نہ ہوتا ہو۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کے بیشتر الفاظ کسی نہ کسی صیغہ میں اردو زبان میں مستعمل ہیں۔ اگر انہیں نمایاں کر دیا جائے تو پڑھنے والا بڑی آسانی سے قرآن مجید کے مطلب تک پہنچ سکتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ جتنے لوگوں نے بھی کیا ہے ظاہر ہے کہ بہت اخلاص اور دردمندی کے ساتھ کیا ہے، اور کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کے پیغام کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ اس طرح کرنا کہ کتاب اللہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ جوں کا توں پڑھنے والے تک منتقل ہو جائے، یہ ممکن نہیں ہے۔ نہ صرف اردو بلکہ کسی بھی زبان میں ایسا کر دکھانا ممکن نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں ان الفاظ میں معانی کا اتنا بے پایاں سمندر پنہاں ہے کہ قرآن مجید کے لفظ کا متبادل دنیا کی کسی بان میں مل ہی نہیں سکتا۔ کسی بھی اور لفظ میں وہ جامعیت موجود نہیں ہے جو قرآن مجید کے الفاظ میں ہے۔ اس لیے محض ترجمہ پر اکتفا کرنا قرآن مجید کے پیغام کو نامکمل طور پر پہنچانے کے مترادف ہے۔ جب تک اصل الفاظ سے تعلق قائم نہ ہو، قرآن مجید کی روح تک رسائی ممکن نہیں۔

بعض اوقات قرآن مجید کا ترجمہ کرنے میں کچھ ایسی چیزیں ملحوظ نہیں رہتیں جن کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ کچھ حضرات نے تو جان بوجھ کر ان امور کو ملحوظ نہیں رکھا، اور کچھ حضرات نے ملحوظ رکھنا چاہا تو اس کی حدود ان سے برقرار نہ رہ سکیں۔ اس میں کسی بدنیتی کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید کے الفاظ کی جامعیت اور معانی کی وسعت کے علاوہ قرآن مجید کا اسلوب اپنے اندر وہ انفرادیت رکھتا ہے جس کو کسی اور زبان میں منتقل ہی نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ میں نے آغاز ہی میں عرض کیا تھا کہ قرآن مجید کا اسلوب خطابت اور تقریر کا ہے، خطابت اور تقریر کے اسلوب میں بہت سی چیزیں محذوف ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ محذوفات عربی زبان کے اسلوب کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ اب جب ایک شخص قرآن مجید کا ترجمہ کرتا ہے، مثلاً شاہ رفیع الدین نے کیا۔ انہوں نے اپنے غیر معمولی تقویٰ کی وجہ سے یہ اہتمام کیا کہ قرآن مجید کے الفاظ کا اردو میں ترجمہ جوں کا توں کر دیا، یعنی ہر لفظ کا ترجمہ اس کے نیچے لکھ دیا۔ جیسے ساتھ نام اللہ کے جو رحمٰن ہے رحیم ہے۔ گویا کوشش یہ کی کہ ترجمہ میں کوئی لفظ اصل سے آگے پیچھے نہ ہونے پائے، اور قرآن مجید کے مفہوم میں کسی ذاتی رائے کا ذرہ برابر دخل نہ ہونے پائے۔ احتیاط اور تقویٰ کے لحاظ سے تو بلاشبہ یہ بہت اونچی بات ہے۔ لیکن اس سے تبلیغ و ابلاغ کا وہ مقصد پورا نہیں ہوتا جو درس قرآن میں پیش نظر ہے۔

شاہ رفیع الدین کے زمانہ کے بعد اس انداز کے ترجمے کثرت سے آئے تو لوگوں نے

محسوس کیا کہ اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا جو ان ترجموں سے پیش نظر تھا۔ محسوس یہ کیا گیا کہ قرآن مجید کو اس طرح کی زبان میں بیان کرنا چاہیے کہ عام آدمی اس کو اپنے دل کے اندر اترتا محسوس کرے۔ چنانچہ اس احساس کے پیش نظر لفظی ترجمہ کے بجائے قرآن مجید کے بامحاورہ ترجمہ کا رواج شروع ہو گیا۔

بامحاورہ ترجمہ کے علم بردار بزرگوں میں سے ایک گروہ نے یہ مناسب سمجھا کہ جس زبان کا جو محاورہ ہے اسی کے لحاظ سے ترجمہ ہونا چاہیے۔ ان حضرات میں شاید سب سے نمایاں نام مرزا حیرت دہلوی اور مولوی نذیر احمد کے ہیں۔ مولوی نذیر احمد، جو ڈپٹی نذیر احمد کے نام سے بھی مشہور ہیں، دہلی کے رہنے والے تھے، اردو زبان کے صف اول کے ادیبوں میں شمار ہوتے تھے۔ بلکہ اردو زبان کے جو چار ستون مانے جاتے ہیں ان میں سے ایک تھے۔ انہوں نے قرآن مجید کا بامحاورہ زبان میں ترجمہ کیا، اس لیے دہلی کے محاورہ کی زبان اختیار کی۔

اس پر بعض محتاط اہل علم کو خیال ہوا کہ محاورہ کی پابندی کی یہ کوشش حد سے باہر چلی گئی ہے اور گویا اردو زبان کی ضرورت کو قرآن پاک کے الفاظ اور اسلوب پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوا کہ کسی کسی جگہ انہوں نے قرآن مجید کے الفاظ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً انہوں نے زخرف القول کا ترجمہ کیا ہے چکنی چپڑی باتیں۔ اب زخرف کے معنی ہیں ملمع کی ہوئی چیز، بنائی سنواری ہوئی بات۔ مراد یہ ہے کہ کفر باتوں کو اس قدر خوبصورت بنا کر پیش کرتے ہیں کہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں۔ اب اس کا لفظی ترجمہ چکنی چپڑی باتیں نہیں ہے۔ چکنی چپڑی باتوں سے ہو سکتا ہے کہ یہ مفہوم کسی حد تک ادا ہو جائے، لیکن زخرف کے معنی نہ چکنے کے ہیں اور نہ چپڑے کے۔ محتاط بزرگوں کا خیال تھا کہ یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ لغت قرآن سے تجاوز ہے۔

اگر لغت قرآن کے اندر رہ کر محاورہ کی پابندی کی جائے تو پھر ٹھیک ہے۔ کوشش یہ کی جائے کہ لغت قرآن کی بھی پابندی ہو اور زبان کا محاورہ بھی استعمال کیا جائے۔ لیکن اس میں بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اور لغت کے اندر رہ کر اردو محاورہ کا لحاظ رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ محاورہ قرآن مجید کے چوکھٹے سے نکل نکل پڑتا ہے۔ بعض دوسرے اہل علم نے اس کا ایک اور حل نکالا۔ ان بزرگوں نے یہ طرز اختیار کیا کہ جہاں ضرورت پیش آئی وہاں قوسین لگا دیا جائے اور وہاں وضاحت کر دی جائے، قرآن مجید کے الفاظ تو ترجمہ میں جوں کے توں برقرار

رہیں۔ اور جن الفاظ کا اضافہ کرنا مقصود ہو ان کو قوسین میں دے دیا جائے۔ لیکن اس سے ترجمہ میں ایک کمزوری یہ پیدا ہوتی ہے کہ وہ طلبہ اور اہل علم جو عربی زبان کے اسلوب سے براہ راست واقف نہیں ہیں اور صرف ترجمہ پڑھتے ہیں ان کے لیے بعض اوقات یہ تعین دشوار ہو جاتا ہے کہ قوسین میں جو چیز آئی ہے۔ وہ کہاں مترجم کا اپنا فہم ہے اور کہاں قرآن مجید کے محذوفات کا اظہار ہے اور کہاں وہ اضافہ کسی حدیث یا اثر سے ماخوذ ہے۔ اب یا تو قوسین میں بیان کردہ ان سب چیزوں کو ایک سطح پر رکھ کر اسی طرح مستند مان لیا جائے جس طرح قرآن مجید کے اپنے محذوفات ہیں۔ یا ان سب کو مفسر کی تعبیر سمجھ کر متن قرآن سے باہر کی چیز قرار دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بہت سی اہم چیزیں غیر اہم ہو جائیں گی۔

اس پر کچھ لوگوں نے کہا کہ قرآن مجید کے ترجمہ میں قوسین نہیں ہونے چاہئیں۔ کچھ لوگوں نے یہ اسلوب نکالا کہ ہر لفظ پر ایک حاشیہ دے دیا جائے اور وہاں اصل مفہوم کی وضاحت کر دی جائے۔ یہ بھی ایک اچھا طریقہ ہے، لیکن حاشیہ میں پڑھنے والے قارئین کو بڑی کو دقت پیش آتی ہے۔ آپ ترجمہ رواں اور مسلسل انداز میں پڑھنا چاہتے ہیں، درمیان میں ہر لفظ پر حاشیہ آ رہا ہے، اس سے آپ کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ روانی اور تسلسل ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

ترجمہ کی ایک اور مشکل قرآن مجید میں ضمائر کا ترجمہ ہے۔ عربی زبان میں تثنیہ کی ضمیر اور ہے۔ جمع کی اور ہے۔ مونث کی اور ہے۔ اور مذکر کی اور۔ اردو میں تثنیہ اور جمع کی ضمیریں ایک ہیں۔ قرآن مجید میں تو ضمیر سے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ اشارہ کس طرف ہے۔ مثال کے طور پر ا ہما میں آپ اس اور ان ترجمہ کریں گے۔ وہ چاہے مذکر ہو یا مونث۔ اب اردو میں پڑھنے والے کی سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے کہ یہاں ان یا اس سے کون مراد ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ جہاں ضمیر ہے وہاں ضمیر کے بجائے اصل لفظ کو بیان کر دیا جائے۔ لیکن جہاں ایک ضمیر کے ایک سے زائد مراجع ممکن ہیں وہاں مترجم کو اپنی فہم کے لحاظ سے ایک مرجع متعین کرنا پڑے گا۔ جب وہ اپنی فہم کے لحاظ سے مرجع متعین کر کے ترجمہ کرے گا تو وہ ترجمہ ترجمہ نہیں رہے گا بلکہ تفسیر ہو جائے گی۔ یہ وہ نزاکتیں ہیں جو قرآن مجید کے ترجمہ میں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

اس بات کی وضاحت کے لیے میں یہاں ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ کی مثال دیتا ہوں۔ قرآن مجید میں آیا ہے، لكل امرى منهم يومئذ شان يغنيه، یعنی ان میں سے ہر شخص کی اس

دن ایک خاص حالت ہوگی جو اسے دوسروں سے مستغنی کردے گی۔ اس آیت کے لفظی معنی تو یہ ہوئے۔ اب بامحاورہ ترجمہ کے علم بردار ایک مترجم نے تو اس کا ترجمہ یہ کیا کہ اس دن ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ اس سے مفہوم تو منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ترجمہ میں قرآن مجید کے کسی ایک لفظ کا بھی لفظی ترجمہ نہیں آیا۔ کیا اس طرح کا ترجمہ ہونا چاہیے؟ بعض محتاط بزرگوں کی رائے ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے، ان کی رائے میں یہ قطعاً ناجائز ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے ایسا ترجمہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ چاہے یہ لفظی ترجمہ نہ ہو، لیکن اس سے مفہوم تو منتقل ہو جائے گا۔ اور اگر پڑھنے والا اردو زبان کا مزاج شناس ہے تو یقیناً اس سے اثر لے گا۔ تیسری رائے یہ ہے کہ ترجمہ تو لفظی ہو، لیکن معانی کی ضروری تفصیل حاشیہ میں بیان کردی جائے۔ ایک اور بزرگ نے مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ کیا کہ اس روز ہر شخص اپنے اپنے حال میں مگن ہوگا۔ اس سے بھی آیت مبارکہ کی مراد تو بڑی حد تک سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن لفظی ترجمہ یہ بھی نہیں ہے۔

جہاں تک قرآن مجید کے ترجمے کا تعلق ہے اس کی چار شکلیں یا چار سطحیں ممکن ہیں، اور سچی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے یا سمجھانے کے لیے وہ چاروں شکلیں ضروری ہیں۔ آج اردو کے جتنے تراجم بھی دستیاب ہیں جن کی تعداد تقریباً ساڑھے تین سو ہے وہ انہی چاروں میں سے کسی نہ کسی سطح کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ ترجمہ کی ایک سطح تو تحت اللفظ اور لفظی ترجمہ کی ہے۔ یعنی قرآن مجید کے ایک لفظ کے نیچے دوسرا لفظ رکھ دیا جائے، جیسا کہ شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کی مثال میں بیان ہوا، بڑی حد تک شیخ الہند مولانا محمود حسن کا ترجمہ بھی لفظی ہی ہے۔ ان ترجموں میں عربی لفظ کے نیچے اس کا اردو مترادف لکھ دیا گیا ہے۔

لیکن بعض جگہ اردو مترادف سے کام نہیں چلتا۔ مثلاً کسی جگہ عربی لفظ کے تین یا چار مفہوم نکلتے ہیں اور مترجم نے ترجمہ میں اردو کا ایک ہی مترادف لکھ دیا ہے تو ایسا کرنے سے قرآن مجید کے معانی محدود ہو جاتے ہیں۔ تحت اللفظ ترجمہ کی یہ بنیادی کمزوری ہے۔ لیکن یہ انتہائی محتاط اور محفوظ راستہ ہے کہ قرآن مجید میں کم از کم اپنی رائے سے کوئی بات نہ کہی جائے۔ اگرچہ کسی حد تک رائے اس میں بھی آجاتی ہے۔

دوسرا اسلوب یہ ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرتے وقت نحوی تقاضوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ نحوی تقاضہ سے مراد یہ ہے کہ جملے کی ساخت اور ترکیب میں ترجمہ کی زبان کا لحاظ رکھا

جائے۔عربی زبان میں جملہ کی ترتیب اور ہے اور اردو میں ترتیب اور ہے۔عربی زبان میں جملہ فعل سے شروع ہوتا ہے۔ضرب زید عمرا۔اردو میں جملہ فاعل سے شروع ہوتا ہے، فعل آخر میں آتا ہے۔اب کچھ لوگوں نے یہ کیا کہ ترجمہ الگ الگ الفاظ وکلمات کی حد تک تو لفظی ہو مگر نحوی ترتیب کے لحاظ سے اردو کے اسلوب کی پیروی کی جائے۔اور جملے کو اس ترتیب سے رکھا جائے جس ترتیب سے اردو زبان میں جملے آتے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ ترتیب' قرآن مجید کی ترتیب سے مختلف ہوگی جو اردو میں مروج نہیں ہے۔یہ گویا نحوی ترجمہ ہوا۔

ترجمہ کی ایک اور قسم یا سطح جس کو ہم اسلوبی ترجمہ کہہ سکتے ہیں یہ ہے کہ قرآن مجید کے اسلوب کو اختیار کر کے اردو میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتے۔اور لوگ قرآن مجید کے اسلوب سے واقف ہو جائیں اور انہیں وہ ترجمہ اوپرا نہ لگے۔

ایک سطح ترجمہ کی وہ ہے کہ جس کو مولانا مودودیؒ ترجمانی کہتے ہیں۔قرآن مجید کی ایک آیت کو لے کر اس انداز سے اس کی ترجمانی کی جائے کہ نہ تو وہ لفظی ترجمہ ہو اور نہ ہی بامحاورہ ترجمہ ہو، بلکہ اسے ترجمہ کہا ہی نہ جائے اور ترجمانی کا نام دیا جائے۔اس میں تھوڑی سی آزادی مترجم کو مل جاتی ہے کہ وہ ایک جملہ کے مفہوم کو کئی جملوں میں بیان کر دیتا ہے۔مولانا مودودیؒ نے یہ وضاحت فرمائی تھی کہ انہوں نے تفہیم القرآن میں قرآن مجید کی ترجمانی کی ہے ترجمہ نہیں کیا، اس لیے پڑھنے والوں کو بھی یہ سمجھ کر پڑھنا چاہیے کہ یہ قرآن مجید کا ترجمہ نہیں ہے، بلکہ اس کے مفہوم کی وضاحت اور تبیین ہے۔

ایک عام سوال جو قرآن مجید کے بہت سے نوآموز طلبہ کرتے ہیں' یہ ہے کہ قرآن مجید کے بے شمار تراجم اور تفاسیر میں سے کس کو بنیاد بنایا جائے۔اور درس دیتے وقت کس کو پیش نظر رکھا جائے۔سچی بات یہ ہے کہ جن حضرات نے بھی قرآن مجید کے ترجمہ اور تفسیر کا کام کیا ہے وہ انتہائی غیر معمولی لوگ تھے۔کوئی معمولی لوگ نہیں تھے، انہوں نے انتہائی اخلاص کے ساتھ آدھی آدھی صدی قرآن مجید کے مطالعہ میں گزاری، اس کے بعد یہ عظیم الشان کام سرانجام دیا۔لیکن ان سب کاوشوں کے انتہائی احترام کے باوجود یہ ساری کاوشیں ایک فرد یا چند افراد کے فہم قرآن کی ترجمان ہیں۔

تفہیم القرآن کا درجہ جدید تفسیری ادب میں بہت اونچا ہے۔لیکن بہر حال وہ مولانا

مودودی کا فہم قرآن ہے۔ تدبر قرآن بہت اونچی تفسیر ہے۔ لیکن وہ مولانا اصلاحی اور مولانا فراہی کی فہم وبصیرت پر مبنی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی بیان القرآن اور مولانا مفتی محمد شفیع کی معارف القرآن بڑے اونچے پائے کی تفسیریں ہیں۔ لیکن بہرحال مولانا تھانوی اور مفتی شفیع کی فہم پر مبنی ہیں۔ ان میں سے کوئی کاوش بھی خود قرآن کے قائم مقام نہیں ہوسکتی۔

اگر غلطی ابوبکر صدیقؓ سے ہوسکتی ہے تو پھر کوئی شخص بھی غلطی سے مبرا نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ سے فہم قرآن میں چوک ہوتی ہے اور وہ اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں آج کل یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ سے غلطی ہوگئی، ہمارے لیے یہ کہہ دینا بھی بہت سہل ہے کہ امام شافعی نے فلاں جگہ غلطی کی۔ اور یہ کہہ دینا بھی بہت آسان ہے کہ امام مالک نے فلاں بات صحیح نہیں سمجھی۔ ہماری دینی درسگاہوں میں روز یہ تنقیدی تبصرے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہنے کی کسی کی مجال نہیں ہے کہ مولانا تھانوی یا مولانا مودودی یا مولانا احمد رضا خان سے غلطی ہوئی۔ کوئی ذرا یہ جرات کر کے دیکھے! ان کے مریدین سر توڑ دیں گے۔ اور اسلام سے خارج کر کے دم لیں گے۔

لیکن ان میں سے ہر ترجمہ میں بعض خصائص ہیں جو دوسرے ترجموں میں نہیں ہیں۔ اس لیے بہتر اور محفوظ راستہ یہ ہے کہ بجائے ایک ترجمہ کو بنیاد بنانے کے ایک سے زائد ترجموں کو بنیاد بنایا جائے۔ ایک لفظی ترجمہ لے لیں، ایک بامحاورہ ترجمہ لے لیں اور ایک ترجمانی کا نمونہ لے لیں۔ ان سب کو سامنے رکھ کر درس قرآن کی تیاری کریں، تاکہ حتی الامکان غلطی سے بچ سکیں، جو اس آیت کا بہترین مفہوم ہے جسے تین بڑے مفسرین نے بیان کیا ہو اس طرح مطالعہ کرنے سے اس آیت کا جوہر سامنے آجائے گا۔

ان مترجمین میں سے ہر ایک کو ان مشکلات کا اندازہ تھا۔ جو ترجمہ کرتے وقت پیش آتی ہیں۔ کون اس مشکل سے کس طرح عہدہ برآ ہوا؟ یہ خود اپنی جگہ ایک علمی کام ہے اور اس سے راستہ آسان ہوجاتا ہے۔ یہی معاملہ تفسیر کا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر ان بزرگوں میں سے ہر ایک نے ایک خاص ضرورت کو پیش نظر رکھ کر لکھی ہے۔ مثلاً مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ ان کے پیش نظر علوم اسلامیہ کے طلباء یا علماء دین نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے پیش نظر جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہے۔ یہ طبقہ مشکلات القرآن اور بڑے بڑے فنی مسائل میں نہیں پڑنا چاہتا، بلکہ

قرآن مجید کے پیغام کو سیدھی سادھی زبان میں سیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ مولانا مودودی کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر میں اس طبقہ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ اب یہ متعین ہو گیا کہ مولانا کے مخاطبین کون لوگ ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد نے جب قرآن مجید کا کیا تو انہوں نے کہا کہ میں قرآن مجید کو اس اردو دان طبقہ تک پہنچانا چاہتا ہوں جو اردو کا ذوق رکھتا ہے، اور اردو محاورہ کے ذریعے سے زیادہ آسانی سے قرآن مجید کو سمجھ سکتا ہے۔ یوں ان کے مخاطبین بھی متعین ہو گئے۔ مولانا اصلاحیؒ نے لکھا ہے کہ میں یہ تفسیر ان لوگوں کے لیے لکھ رہا ہوں جو عربی ادب کا ذوق رکھتے ہیں اور عربی زبان کے محاسن اور فصاحت و بلاغت کو بھی سمجھنا چاہتے ہیں۔ ان کے مخاطبین بھی متعین ہو گئے۔

اب اگر میرے سامنے درس دیتے وقت تفہیم القرآن اور تدبر قرآن دونوں ہوں تو میرے سامنے تفسیر کے دو اسلوب اور فہم قرآن کے دو رجحان آ گئے۔ علوم قرآن اور مشکلات قرآن میں ۹۹ فی صد پر تو یہ دونوں مفسرین قطعی طور پر متفق ہوں گے۔ جہاں ان میں اختلاف ہو گا اس سے کم از کم مجھے اتنا معلوم ہو جائے گا کہ یہاں قرآن مجید کی تشریح میں ایک سے زائد تعبیرات ممکن ہیں۔ اب اگر مجھے ذوق ہو گا تو میں مزید تفاسیر دیکھ لوں گا اور میرے سامنے ایک واضح شکل آ جائے گی۔ اس لیے تفسیر قرآن میں بھی ایک سے زائد تفاسیر کو پیش نظر رکھنا نہ صرف مناسب بلکہ ناگزیر ہے۔ جن اہل علم سے آپ کا ذوق ملتا ہو اور جن کے علم، تقویٰ اور فہم دین پر آپ کو اعتماد ہو انہی میں سے تین بزرگوں کی تفاسیر لے لیجیے۔ کوئی سے تین تراجم اور کوئی سی تفاسیر آپ منتخب کر لیں اور ان کو بنیاد بنا کر آپ درس قرآن کی تیاری شروع کریں۔

ایک آخری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی سی تین تفاسیر اگر منتخب کی جائیں تو آخر کون سی کی جائیں۔ یہاں آپ کو اپنے مخاطبین کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ فرض کیجیے کہ آپ کے مخاطبین اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر وہ اس قسم کے مسائل نہیں اٹھائیں گے جو قدیم تفاسیر میں ملتے ہیں۔ مثلاً اشاعرہ، ماتریدیہ اور معتزلہ کے مسائل سے نہ وہ باخبر ہیں اور نہ ان سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ تفاسیر آپ کے دائرہ سے خارج ہو گئیں جن میں اس قسم کے مباحث آئے ہیں۔ یہاں وہ تفاسیر زیادہ کارآمد ہوں گی جو جدید مغربی مفکرین کے اعتراضات اور شبہات کا جواب دیتی ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کی تفسیر ماجدی۔

اگر آپ کے طلباء میں عربی کا ذوق رکھنے والے ہیں تو پھر آپ مولانا اصلاحی کی تفسیر

لے لیں۔ اس طرح اگر آپ مخاطبین کی سطح اور ان کا ذوق دیکھ کر تفسیر کا انتخاب کریں تو ان کے لیے زیادہ آسان اور مفید ہوگا۔ اس لیے کہ اگر مقصد دین اور اور شریعت کی تعلیم ہے تو پھر مخاطب کی ضرورت کا خیال رکھنا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ سوال کرنے والے کی سطح اور پس منظر کے مطابق جواب ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے مختلف مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ بہترین عمل کون سا ہے تو آپؐ نے مختلف جوابات عطا فرمائے اور ہر ایک کی ضرورت کو مدنظر رکھا۔

اپنے مخاطبین میں قرآن مجید کے متن سے وابستگی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کام اس وقت زیادہ آسانی سے ہوسکتا ہے جب مخاطبین اور طلبہ قرآن مجید کے بیشتر حصہ کے حافظ اور اس کے الفاظ سے اچھی طرح مانوس ہوں۔ آج کل یہ کام بہت آسان ہوگیا ہے۔ بڑے بڑے قراء کے کیسٹ موجود ہیں۔ قوت سماعت سے کام لیں، بار بار سننے سے لہجہ بھی درست ہو جائے گا۔ اور بہت سا حصہ قرآن مجید کا حفظ بھی ہو جائے گا۔ بہت آسانی کی بات میں نے اس لیے کی ہے کہ آج کل ہمارے ہاں ماہرین حفظ کی ایک سعودی ٹیم آئی ہے جس نے کوئی خاص تکنیک ایجاد کی ہے کہ وہ ایک ماہ میں بچہ کو پورا قرآن مجید حفظ کروا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ تمام جدید مشینری استعمال کرتے ہوں گے۔ اور بچے کی بھی ساری قوتیں استعمال کی جاتی ہوں گی۔ اس سے یہ ضرور اندازہ ہوا کہ جدید وسائل سے کام لے کر قرآن مجید کو بہت اچھی طرح سیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔

یہاں میں اپنی بات ختم کرتا ہوں اور آپ کو وہ حدیث سناتا ہوں جس کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ اس بارہ دن کی گفتگو کو آپ اس حدیث کی شرح سمجھیے۔

حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ سے روایت ہے جس کو امام ترمذیؒ نے باب فضائل القرآن میں نقل کیا ہے، مجھ سے فضائل القرآن پر بھی بات کرنے کو کہا گیا تھا، تو اس حدیث مبارک میں فضائل القرآن بھی آگئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كتاب الله فيه نبأ من قبلكم، و خبر ما بعد كم، و
حكم ما بينكم ، هوالفصل ليس بالهزل، من تركه من جبارٍ

قصمه الله، ومن ابتغى الهدى فى غيره اضله الله، وهو حبل الله المتين، وهو الذكر الحكيم۔ وهو الصراط المستقيم ،وهو الذى لا تزيغ به الاهواء، ولا تلتبس به الالسنة، ولا يشبع منه العلماء، ولا يخلق على كثرة الرد، ولا تنقضى عجائبه، وهو الذى لم تنته الجن اذسمعته حتى قالو ا انا سمعنا قرانًا عجباً يهدى الى الرشد فامنابه ولن نشرك بربنا احدا۔ من قال به صدق، ومن عمل به أجر، ومن حكم به عدل۔ ومن دعا اليه هدى الى صراط مستقيم۔